خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
اکتوبر 2014
معراج رسول
طاہر جاوید مغل
کے قلم سے نئی داستان ستاروں کی گمکند
اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں
WWW.PAKSOCIETY.COM

گزری کل کے قصے، آج کی باتیں اور مستقبل
کے اندازے ایک دانش ور کی زبانی

سسپنس کی مجلس مشاورت دستارئین کی تلخ و
شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

کھلے آسمانوں کی جستجو میں
بھٹکنے والے طائروں کی تلاش

رقیبوں کی زہریلی چالوں...... پیار کی مدھر تانوں
اور بدلتی رتوں کا رومان انگیز طویل سلسلہ

رشتوں کو ٹھیس پہنچانے والے
ایک روایت شکن کا احوال

ایک چھوٹی سی نیکی سے ملنے والے
اجر عظیم کا ایک اثر انگیز واقعہ

مثبت اور منفی سوچوں میں الجھے
ایک مسافر کی بے خبری کا عالم

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

جلد 44 • شمارہ 10 اکتوبر 2014 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: وسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

محبتوں کے اسیر...... کسی کی چاہ
میں فقیر بننے والوں کا ماجرا

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ محبت کی
عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل رُبا سلسلہ

بلند و بانگ دعوے کرنے والوں
کے لیے تاریک لمحوں کا فسانہ

آنسوؤں کی لہروں میں ڈوبنے،
ابھرنے والے دلوں کا عبرت اثر منظر

نمرود سے ٹکرانے اور اللہ کی آزمائشوں پر پورا
اترنے والے جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات

چہروں پر چہرے سجانے
والے چور سپاہی کی دوستی کا سنگین احوال

جذباتی استحصال کا شکار......
رشتوں کا عجب گورکھ دھندا

زمانے کی ستم ظریفیوں سے نبرد آزما اور گمشدہ خوابوں
کی تلاش میں سرگرداں ایک مسافر کی روداد

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے،
اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

اندازہ

جو سماج افلاس اور جہالت کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو وہ زندگی کا کوئی صحت مند خواب نہیں دیکھ سکتا اور نہ شاید اس کا حق ہی رکھتا ہے۔ ہم بار بار تعمیر و ترقی کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تعمیر و ترقی کی باتیں اسی قوم کو زیب دیتی ہیں جو معاشی استحکام اور تعلیمی ترقی کے ایک خاص نقطے تک پہنچ چکی ہو۔ اس سے پہلے تعمیر و ترقی کے امکانات پر غور کرنا دماغی عیاشی اور ذہنی بدکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہم قومی حیثیت سے افلاس اور جہالت کے جس نقطے پر کھڑے ہیں، وہاں سے تعمیر و ترقی کی منزل اتنی دور ہے، اتنی دور ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اپنے آپ کو ہمت شکنی اور زبوں ہمتی کے آزار میں مبتلا کرنا ہے۔ ہم اپنی اس پسماندگی و درماندگی کے سلسلے میں قابلِ ملامت بھی ہیں، قابلِ رحم بھی اور ایک حد تک قابلِ معافی بھی کیونکہ ہماری موجودہ زندگی کے پس منظر میں صرف غلامی ہی کی ایک صدی نہیں، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی انحطاط کی بھی کئی صدیاں شامل ہیں اور ہمیں ماضی کے اس زبردست نقصان کی تلافی کے لیے جو مہلت ملی ہے وہ یقیناً بہت مختصر ہے اور اسی مختصر مہلت میں ہمیں صدیوں اور نسلوں کے قرضے چکانا ہیں لیکن اس معقول عذر کے باوجود ہم اپنی غیر ذمے داریوں کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔ یہ عذر صرف اسی صورت میں قابلِ سماعت تھا جب ہم نے اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کیا ہوتا، اصلاحِ حال کے لیے ہر وہ کوشش کی ہوتی جو ممکن تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ قوم کے بعض طبقوں نے تو اس نازک دور میں وہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اختیار کیے ہوئے ہیں جس کو سہہ لینا ایک پس ماندہ اور پریشاں حال قوم کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس موقع پر کس کس سے مواخذہ کیا جائے۔ کس کس کا نام لیا جائے کہ یہ سیاہ نامہ بہت طویل الذیل ہے مگر ایک خاص طبقے کا ذکر کیے بغیر چارہ بھی نہیں۔ ہمارا اشارہ قوم کے دولت مند طبقے کی طرف ہے۔ ہمارے اس رعایت یافتہ اور برگزیدہ طبقے نے آزادی کے بعد جس مجنونانہ اور مجرمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی، ان حضرات نے لکھ پتی سے کروڑ پتی بننے کی جو شان دار مہم تھوڑے ہی عرصے میں سر کر لی ہے، اسے دوسرے شاید صدیوں میں بھی سر نہیں کر سکتے، پاکستان میں اگر کسی طبقے نے اپنی غیر معمولی اور قابلِ رشک صلاحیتوں سے دنیا کو مبہوت کر ڈالا ہے تو وہ یہی طبقہ ہے۔ اس کی موجودگی میں جو لوگ علمی و ادبی، تہذیبی اور سماجی میدانوں میں پاکستانی قوم کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اور انہیں اس ہونہار قوم کا کوئی عرفان حاصل نہیں۔ اگر اس قوم کی استعداد اور کارکردگی کا اندازہ لگانا ہے تو اس کے لیے دولت کشی اور منفعت اندوزی کے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے کہ یہی تو ایک شعبہ ہے جس میں ہماری قوم نے حیران کن فتوحات انجام دی ہیں اور محیر العقول معجزے دکھائے ہیں۔ سماج کا یہی وہ ادارہ ہے جس کے حوصلہ مند نمائندوں نے ایک ایک رات میں بنجر زمینوں سے محل اگائے ہیں اور ایک ایک دن میں دولت و ثروت کی فصلیں کاٹی ہیں۔ یہ بات انہی لوگوں نے ثابت کی کہ آزادی ایک نعمت ہے اور غلامی ایک لعنت۔ اگر یہ ارجمندانِ دولت نہ ہوتے تو پاکستان میں کوئی بھی آزادی کی نعمتوں اور برکتوں کا قائل نہ ہوتا۔ ہمیں اس موقع پر عبارت آرائی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، ہمارا فرض ہے کہ اس ضمن میں پوری متانت اور سنجیدگی سے کام لیں۔ اس گروہ نے سماج کی صحت مند قدروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ ''زرگری'' اور زر پرستی کے علاوہ کوئی قدر نہیں مانتے، ان کا صرف ایک نصب العین ہے یعنی دولت کھینچنا قوم جہنم میں جائے۔ انہیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ ان کے نزدیک تعمیر و ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ کوٹھیوں کے نئے نئے ڈیزائنوں اور کاروں کے نئے سے نئے ماڈلوں کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جائے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستان کی فاقہ کش، فلاکت زدہ اور درماندہ قوم ان مجنونانہ حرکات اور مجرمانہ رجحانات کی آخر کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے۔ واقعی ہمیں اپنی قوتِ برداشت کا اندازہ لگانا چاہیے۔

محترم قارئین

السلام علیکم!

اکتوبر 2014ء کا شمارہ آپ کی تسکینِ ذوق کے لیے حاضر ہے۔ حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ملک کے سیاسی حالات و واقعات دلی افسوس کا باعث بنتے جا رہے ہیں۔ عوامی مفاد کے نام پر ذاتی مفاد کی جنگ ہر طبقۂ فکر میں تشویش کا سبب ہے جبکہ خوش امیدی، خوش حالی اور خوش گوار مستقبل کی ضمانت سے عوام کا دامن ہنوز خالی ہے اور خوش مزاجی ہے کہ کہیں روٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ عالمی دنیا کے منظرنامے پر نظر ڈالی جائے تو طاقت کی رسا کشی با اختیار طبقے کے لیے ایک دلچسپ کھیل سہی لیکن یہ فرق بھی نمایاں نظر آتا ہے کہ کہیں بھی اس کھیل سے عوام براہِ راست متاثر ہوتے نظر نہیں آتے۔ بالخصوص طالب علم طبقہ، تعلیمی ادارے اور اساتذہ کے حلقے ان کھیلوں کے نتائج اور مضر اثرات سے بے پروا اور دور نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹرز اپنی ذمے داریاں اسی لگن اور جستجو سے ادا کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نہ تو معیشت تباہ ہوتی ہے نہ ترقی کے تناظر میں کوئی تنزلی محسوس ہوتی ہے جبکہ ہمارے یہاں آئین اور ملک و قوم کے مفاد میں اقتصادی ترقیاتی کام چوپٹ ہو جاتے ہیں۔ ظلم و درندگی کی مذمت کے ساتھ ساتھ اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں ملک کے مختلف حصوں میں شدید بارشوں کا سلسلہ خطرناک صورتِ حال کا باعث بنا رہا۔ اس دوران مختلف حادثات میں کتنی قیمتی جانوں کا زیاں ہوا...... اور یہ کوئی نئی بات نہیں ایسا تو ہر سال ہوتا ہے۔ ایک طرف دولت کا بے دریغ استعمال اور دوسری جانب بارشوں کے باعث پھوٹنے والے وبائی امراض کا شکار، بھوک و افلاس کی زندہ تصویریں...... بے گھر کرنے والے سیلابی ریلوں کی تباہی سے نمٹنے کے حفاظتی انتظامات مفقود...... پناہ کی تلاش میں بے چارے عوام آخر کب تک حسرت و یاس کی تصویر بنے رہیں گے...... ہم سب کا فرض ہے کہ اس مشکل گھڑی میں اپنی ذات کو بھلا کر ان کی مدد کی جائے...... دوسروں کی مثالیں پیش کرنے اور دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے بہتر ہے کہ اپنی ذات کو مثال بنا کر پیش کر دیا جائے...... ''شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات'' عقلمندوں کے لیے اشارہ کافی ہے...... اور جناب اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اس طرف جہاں عقلمندوں کی ایک اور جماعت ہماری منتظر ہے۔

✠ مسافر دیوانہ، ساہیوال سے شریکِ محفل ہیں ''صبح ہی سے طبیعت بوجھل بوجھل سی ہے۔ وطنِ عزیز کے حالات کو دیکھتا ہوں تو دل ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ ہمیں ہدایت دے۔ میدانِ شاعری چونکہ ہمارا پسندیدہ اور من پسند میدان ہے لہٰذا سب سے پہلے ہم شعر و سخن پر تبصرہ کریں گے۔ ان صفحات کو غالب، ندیم اور فراز کے اشعار نے یونیک بنا دیا۔ بدر منیر، جنید احمد ملک، مہرین ناز، محمد اصغر ساجد کا انتخاب عمدہ ہے۔ سوئے سرورق جب نظر منعطف ہوئی تو عجب کشمکش سے دوچار ہوئے۔ اس صورت کو حسینہ کہیں یا قرینہ خوف؟ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کو ان کا منفرد اور شستہ و رفتہ چناؤ الفاظ لکھاریوں میں بلند مقام بخشتا ہے۔ ماروی، خشمگیں واقعات و حالات کا مرقع ہے۔ محبوب کو عمر نو کا رانجھن کہا جائے تو بجا ہوگا۔ مرینہ کی آہ و بکا عبث ہے۔ مراد گدھا گاڑی والا اپنی ماروی کو کیونکر بھلا سکتا ہے؟ جناب منظر امام، ہمدردی جیسی سوغات کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ ہمدرد، واقعی سسپنس کے لیے تحفے سے کچھ کم نہیں۔ خدا لگتی تو یہ ہے کہ منظر امام کی تحریریں سسپنس کے اوراق کو کشت زعفران بنا چھوڑتی ہیں۔ گو ان کی کہانی مختصر ہوتی ہے لیکن ان جیسی کہانی ہر کوئی لکھ نہیں سکتا۔ سسپنس کو ان جیسے لکھاری کا میسر آنا کسی اعزاز سے کم نہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی جگہ پر رضوانہ ساجد کا نام پا کر اچنبھا ہوا۔ مگر تحریر یہ بھی نادر بلکہ بہت ہی نادر ہے۔ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ یہ ایک ایمان افروز تحریر ہے۔ خدا مصنف کو اجر دے۔ آخری صفحات پر وہرا جرم کے عنوان پر نشور ہادی کی تحریر شامل ہے۔ فی الحال پڑھی تو نہیں لیکن توقع ہے من کو بھائے گی۔ طاہر جاوید مغل کہ جن کے اعجاز احمد راحیل سچے عاشق ہیں، ہمیں اپنے قلم شربار میں مسحور کیے رکھتے ہیں۔ راحیل صاحب ہمارے شہر کے ہیں۔ وہ مغل جی کے بڑے معتقد ہیں تو ہم ان کے۔ مغل جی واقعی فی زمانہ فنِ تحریر میں حاذق و طاق ہیں۔ منظر کشی میں انہیں واقعی ملکہ حاصل ہے۔ راقم بھی مغل جی کی تحریروں کا عاشق ہے۔ مجھ میں اور راحیل صاحب میں فرق صرف یہ ہے کہ میں مغل کی تحاریر کا دیوانہ ہوں اور وہ خود مغل کے دیوانے ہیں۔ چندے ماہتاب الیاس سیتا پوری، واہ! مزہ ہی کرا دیا۔ بہ نوکِ خنجر...... عنوان ہی اعلیٰ ہے۔ ش م جمیل کی تیز تر، سنسنی سے بھرپور اور مفرح تحریر ہے۔ جون ایلیا مرحوم، کیا ہوا ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ وہ اپنی پُرتخیل تحریروں میں تو حیات ہیں۔ محفلِ یاراں میں قدرت اللہ نیازی خستہ حال کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔ مگر لگتا ہے یہ کرسی ایک ماہ سے زیادہ وقت نہ نکالے گی۔ محمد خواجہ کا مہر آمیز خط زیرِ نظر ہے۔ میاں، بجلی کا رونا کاہے کو روتے ہو، یہ مقدر ہے پوری قوم کا۔ فقط تمہارا نہیں۔ مسافر جیسی کبھی نہ بھولنے والی کہانی کے تخلیق کار ناصر ملک تو گویا عید کا چاند ہو گئے ہیں۔ ادارے سے عرض ہے کہ ان سے کوئی سلسلہ وار کہانی لکھوائی جائے۔''

✠ شوکت شہریار، گورنمنٹ کالونی، اوکاڑہ سے چلے آ رہے ہیں ''اگرچہ مصروفیاتِ زندگی بے تحاشا ہیں لیکن اپنی پسندیدہ محفل

سے غیر حاضر رہنا گوارا نہیں ہے۔ سو ہمت باندھی ہاتھ میں قلم اٹھایا اور لکھنے بیٹھ گئے سسپنس میں ایک خط۔ اس مرتبہ تو سسپنس کا پورا شمارہ کمال کا ہے۔ سرورق کی حسینہ ردگی روئی آنکھوں سے کہیں دیکھ رہی ہے اور پیچھے ایک آدمی اپنی شیطانی مسکراہٹ لیے موجود بیٹھا ہوا ہے۔ محفلِ یاراں میں حاضر ہوئے تو اپنے بھائی قدرت اللہ نیازی کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ نیازی بھائی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اعجاز احمد راحیل یار یہ آپ (ماہی ماہی) کب سے ہو گئے ہو؟ السیلی صاحبہ یہ تین اور تیرہ کس کو سنا رہی ہیں آپ؟ محفل میں اپنی پیاری بہن سعدیہ بخاری اور زویا اعجاز کی کمی بہت زیادہ محسوس ہوئی۔ سید شکیل کاظمی صاحب پلیز آپ بھی غصہ تھوک دیں اور محفل میں حاضر ہوں ورنہ......؟ کہانیوں میں سب سے پہلے بہ نوکِ خنجر پڑھی۔ اس کا انجام کچھ ادھورا سا لگا ہے۔ خیر بہلول نے بڑی کامیابی سے محمد شاہ کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ کاشف زبیر کی قاتل محبت ایک بہترین کہانی تھی۔ ریتا کو پتا ہی نہ تھا کہ شین اور مارش قاتل ہیں۔ بہرحال اینڈرسن کی ہمت کی داد دینی پڑے گی جس نے ریتا کو یقینی موت سے بچا لیا۔ ستاروں پر کمند کی یہ قسط پڑھی اور بے اختیار طاہر جاوید مغل کے ہاتھ اپنے تصور میں لائے اور چوم لیا ان کے ہاتھوں کو۔ آخر میں عادل ایک سازش کا شکار ہوا اور اب بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ چاند گہن میں مراد خان جیسے یار مار کے بارے میں پڑھ کر افسوس کرنے کے ساتھ ساتھ وحید علی کی عقل پر ماتم کیا، بہرحال مرزا صاحب اس بار بھی اپنے موکل کو صاف بچا کے لے گئے۔ انتظار میں راشد کی ایک غلط فہمی اس کا گھر برباد کر گئی اور فرحت بے چاری کو ایک ناکردہ گناہ کی سزا ملی۔ محفل شعر و سخن میں سوبیہ اقبال، مہرین ناز، السیلی اور مولا بخش کے اشعار اچھے تھے۔ تیز تر میں ٹونی واقعی تیز نکلا اور اسکرو کو فیکٹری میں بھی مات دے دی۔ ہمدرد میں زاہد علی کی لوٹ مار دیکھ کے بہت حیرانی ہوئی کہ کیسے کیسے فراڈ لوگ ہیں اس دنیا میں۔ دہرا جرم آخری صفحات پہ ایک اچھی کہانی پڑھنے کو ملی۔ روحی اور صبور کا ملن اور سلطانہ کا کردار بہت پسند آیا۔''

✠ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں ''سسپنس کی بروقت دید ہوئی۔ سرورق بھی ذاکر صاحب جیسے آرٹسٹ کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اندر انشائیے میں حکمت و دانش کے موتی چنے۔ اداریے نے سوچ کے در وا کیے یوں اپنی محفل میں وارد ہوئے جہاں سرِفہرست نظر آ رہے تھے قدرت اللہ نیازی، سو مبارک باد قبول کریں۔ اپنی حاضری نظر نہیں آئی جو یقیناً محکمۂ ڈاک کی کوتاہی کے سبب ممکن نہ ہو سکی۔ سب نئے پرانے دوستوں کی بھرپور شرکت نظر آ رہی تھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے الیاس سیتا پوری کی بہ نوکِ خنجر پڑھی جو بہلول لودھی کے حالات و واقعات سے مزین تھی۔ بلاشبہ بہلول لودھی بہادر اور ارادے کا پکا تھا جو کسی بھی انسان کو بامِ عروج پر پہنچانے کا بنیادی عنصر ہے۔ دوسری کہانی طاہر جاوید مغل کی ستاروں پر کمند تھی جو اپنی تحریر کی پہچان کے سبب طاہر جاوید مغل صاحب کا نام اجاگر کرتی نظر آتی ہے۔ جس میں ایڈونچر اور رومان کی گرم جوشی بھی ہے۔ محی الدین نواب کی تحریر ماروی بھی بس اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہے مگر معذرت کے ساتھ کہ دلچسپی کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ بہرحال تحریر محی الدین نواب کی ہے تو پڑھنا تو ہے۔ امید ہے آگے چل کر سلسلہ دلچسپ ثابت ہوگا۔ قاتل دوست میں ریتا کی زندگی باقی تھی جو وہ سفاک قاتل سے بچ گئی اور اینڈرسن کا بے لوث جذبۂ محبت جس کے باعث ان کو آزادی جیسی نعمت ملی جس کا کوئی مول نہیں۔ اگر وہ دونوں اپنی جان بچانے کی ہمت نہیں کرتے تو شین کے ہاتھوں دونوں بے مارے جاتے۔ فکشن کہانی ماہر تولید بھی اثر انگیز رہی۔ چاند گہن بھی بس گزارہ تھی۔ انتظار ڈاکٹر ساجد امجد کی ایک عبرت انگیز کہانی تھی جہاں راشد اور فرحت کی زندگی میں شک نے اپنا بیج بویا نتیجتاً زندگیاں برباد ہو گئیں۔ شک کا زہر انسانوں کی زندگیوں کو برباد کر دیتا ہے۔ اللہ ہر انسان کو شک کے زہریلے ناگ سے بچائے۔ شعر و سخن میں اچھے اور معیاری اشعار تھے۔ اشعار نے کافی محظوظ کیا۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے بھی لطف دوبالا کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی مقابلہ بھی اچھی لگی جس میں یہ احساس ہوا کہ زندگی وہ اچھی نہیں جو اپنے کسی منفی عمل سے دوسرے لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہو جائے بلکہ اچھا انسان وہ ہے جو مثبت عمل سے دوسرے انسانوں کے لیے راحت کا سبب بن جائے۔ تیز تر بھی اچھی کہانی تھی۔ منظر امام کی ہمدرد بھی اچھی لگی کہ زاہد علی نے ٹھگ کر لاکھوں روپے بٹور لیے اور تین چار گنا پیسے بنا لیے۔ اللہ کے برگزیدہ نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات و واقعات نے دل کو ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ میٹھا زہر میں ثابت ہوا کہ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ محبت انسان سے وہ کروا دیتی ہے جو عام حالت میں ناممکن ہے۔ آخری صفحات کی کہانی بھی بہترین تھی۔''

✠ ابرار وارث، سندیلیانوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اس ماہ ٹائٹل سرورق پر دوشیزہ کا انداز جانے کیوں ایسا لگا جیسے جاسوسی کا سرورق ہو۔ راکھ یا دھواں سر سے گزر گیا میں تم اور ہم میں...... محفلِ خطوط میں قدرت اللہ بھائی کا خط پہلے نمبر پر تھا۔ کرسیٔ صدارت کی مبارک باد۔ بھائی قدرت آپ کا اور میرا مسئلہ بالکل مشترک ہے۔ ہم پر بھی شریکِ حیات کی طرف سے پابندی ہے کہ سسپنس نہیں خریدنا لیکن ہم بھلا کہاں رک سکتے ہیں۔ طلحہٰ رحمان فرام سندیلیانوالی...... مبارک ہو طلحہٰ خط شائع ہو گیا۔ میں آپ قارئین و رسالے کے توسط سے اپنے شاگرد طلحہٰ تک خط کی مبارک باد اور نویں کلاس میں پہلی پوزیشن لینے پر مبارک باد دیتا ہوں طلحہ کو بہت مبارک ہو۔ اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ طاہرہ آپی اور رضوان بھیا کا خط نظر نہ آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ستاروں پر کمند پڑھی...... یہ کہانی تھی یا سنسنی خیز فلم بہت مزہ آیا پڑھ کے...... طاہر صاحب! یہ کیا کر دیا؟ عادل کا اتنا سفر طے کرنے کے بعد خالی ہاتھ واپسی؟ عادل کے ساتھ بہت برا ہوا۔ آخر میں بے چارہ خود پھنس گیا...... منظر امام کی ہمدرد بھی بہت پسند آئی۔ ہمدردی کی آڑ میں سب کو زاہد علی لوٹ لے گیا اور اگلی منزل پر ہمدردی کرنے پہنچ بھی گیا۔ ماروی ابھی تک ویسی کی ویسی ہے۔ ہاں ایک جگہ مرینہ کی بروقت انٹری پسند آئی۔ کمبخت مراد کو لے گئی...... آخری صفحات پر بھی نشور ہادی کی تحریر متاثر

کن تھی۔ بہرحال آخر میں کچھ تشنگی برقرار رہی...... ثاقب سے سوت مارا گیا۔ صبوحی نے گناہ کیا تھا خود بھی تو ذمے دار تھی۔''

※ علی رحمٰن، سندیلیانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''میں دو سال تک اپنے پیارے سسپنس کا خاموش قاری بنا رہا ہوں اور اب پہلا خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے خوش آمدید کہا جائے گا (خوش آمدید) ماہ شمارہ ستمبر معمول سے کافی لیٹ 19 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر بنی کشش لڑکی کو دیکھ کر مدہوش سا ہو گیا مگر یہاں مایوسی کی انتہا ہو گئی جب یاد آیا میری عمر ابھی بارہ سال ہے۔ خیر سید کی لمبی تان لگا کے خطوں کی محفل میں پہنچے۔ قدرت نیازی صاحب کو کرسی پر براجمان دیکھا، بڑی مبارک ہو۔ خطوں میں طلحہٰ رحمٰن، ابرار وارث اور سید اکبر شاہ کے خط بڑے اچھے لگے۔ طلحہٰ رحمٰن کو سالگرہ مبارک ہو۔ سب سے زیادہ پسندیدہ رائٹر طاہر جاوید مغل کے نئے ناول ستاروں پر کمند پڑھا، یہ قسط شاندار رہی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری کی کہانی نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ کاشف زبیر کی مغربی کہانی قاتل محبت بہت اچھی لگی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی بوری تھی۔ منظر امام کی کہانی بھی اچھی لگی۔ محی الدین نواب کی ماروی بڑی اچھی لگی۔ مرینہ کے ٹھیک ہونے پر بڑا دکھ ہے۔ آخری صفحات پر نشور ہادی کی کہانی اچھی لگی۔ نشور ہادی اچھا لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی کہانی بھی اچھی لگی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی الفاظ کا چناؤ بڑے اچھے طریقے سے کرتے ہیں۔ کاشف زبیر کی قاتل محبت میں مارش کا کردار اچھا لگا۔''

※ سعدیہ بخاری، اٹک سے تشریف لائی ہیں ''خوب صورت اور لائٹ رنگوں سے سجا سسپنس ستمبر کا شمارہ 20 تاریخ کو موصول ہوا۔ اداس اداس سی ٹائٹل گرل بہت ہی دلکش اور معصوم لگی۔ ساتھ میں صنف مخالف کی موجودگی سے سرورق مکمل مکمل سا لگ رہا ہے۔ اداریے میں ایڈیٹر کے تجزیے سے میں مکمل اتفاق کرتی ہوں، اللہ کرے وہ وقت جلد آئے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ تمام امت مسلمہ اپنے اندرونی و بیرونی مسائل سے چھٹکارا پا سکے اور دنیا میں مضبوط قوم کی حیثیت سے اپنا آپ منوا سکے۔ اس دعا کے ساتھ رخ کرتے ہیں اپنی محفل کا جہاں امن کے ساتھ پھیکا پن غالب ہے کہ بقول غالب ''ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے، وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' خطوط میں پہلے نمبر پر رہے قدرت اللہ نیازی خانیوال سے، تبصرہ اچھا تھا۔ احمد خان توحیدی نے اچھے اور جامع انداز میں حالات حاضرہ پر روشنی ڈالی۔ منظہر سلیم کا تبصرہ بہت جاندار اور شاندار تھا۔ ویلڈن منظہر سلیم۔ تفسیر عباس آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا رہا لیکن تھوڑا سا چینج لائیں، یکسانیت محسوس ہوتی ہے۔ فلسطین کے موجودہ حالات پر آپ کی شاعری نے بہت متاثر کیا جو کہ فیس بک پر پڑھنے کو ملی۔ زویا اعجاز مجھے بلا کر آپ کہاں غائب ہو گئیں؟ دیگر خطوں میں محمد خواجہ مدنی نے اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ کہانیوں کا آغاز خلاف معمول ستاروں پر کمند سے کیا۔ یہ قسط بھی تھرل اور ایڈونچر سے بھرپور رہی۔ اب آگے ایکشن شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہیں عادل کیا حشر کرتا ہے اپنے رقیب روسیاہ کا۔ کہانی دلچسپ اختتامی مراحل میں ہے۔ منظر نگاری بہت عمدہ ہے۔ چاند گہن میں بیگ صاحب نے اپنی پیشہ ورانہ چالوں اور ماہرانہ دلیلوں سے آستین میں چھپے سانپ کو مارا اور عمران علی، اس کی بہن اور باپ کو مشکلات سے نکالا۔ ماروی نے بہت بور کیا اور آخری صفحات پر دہرا جرم نے اس سے کہیں زیادہ مایوس کیا۔ صبور کا ایکسیڈنٹ کے بعد اپنی گاڑی کو چھوڑ کر ٹیکسی لینا، روحی کا اس سے سابقہ تعلق اور سلطانہ کا اتنا قربانی والا رویّہ غیر حقیقی تھا۔ یہ نوک خنجر میں بہلول کا کردار بہت پسند آیا۔ ایک حکمران کو اتنا ہی دوراندیش، عقل مند اور اصولوں میں بے لچک لیکن رویے میں لچک دار ہونا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات زندگی پر مشتمل اسلامی تاریخی واقعات رضوانہ ساجد کی نہایت عمدہ کاوش تھی۔ مختصر اور طبع زاد کہانیوں میں کاشف زبیر کی قاتل محبت میں رینا کے ہاتھوں قتل کے دو پرانے واقعات منظرعام پر آئے۔ یہ انکشاف حیرت انگیز تھا کہ شین اور مارش قاتل ہیں۔ اینڈرسن کا کردار زبردست تھا۔ منظر امام کی ہمدرد میں زاہد علی نے گاؤں والوں کی سادہ لوحی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انتظار میں ڈاکٹر ساجد امجد نے راشد نسیم کی بے وقوفیوں کا احوال بیان کیا اس لیے کہا جاتا ہے کہ شک دیمک کی طرح کھا جاتا ہے خوشیوں کو۔ میناز ہر کافی پُراثر تحریر رہی۔ خاموش چاہتوں کی تصوراتی رفاقتوں کا منظر دلچسپ تھا۔ ماہر تولید اور مقابلہ درمیانے درجے کی کہانیاں تھیں۔ محفل شعر و سخن میں تمام قارئین کا انتخاب عمدہ تھا۔ تفسیر عباس کا انتخاب سب سے منفرد ہوتا ہے دیگر میں ماہا ایمان، احمد خان توحیدی اور طالب حسین کا انتخاب بیسٹ رہا۔ مراسلات کا معیار اب ہمیشہ معیاری ہوتا ہے۔''

※ محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ستمبر کا شمارہ بڑی مشکلوں سے 20 تاریخ کو ملا۔ پاکستان کے سیاسی حالات کی وجہ سے اسلام آباد سے کوئی چیز آجا نہیں رہی تھی اس لیے شمارہ کلرکہار میں دیر سے پہنچا۔ بہرحال سرورق کو ایک خوب صورت حسینہ اور ایک ہینڈسم مرد سے سجایا گیا۔ اس دفعہ کہانیوں کے ناموں کو ایک دفعہ پھر بہترین طریقے سے سجایا گیا۔ جون ایلیا صاحب کے پاس پہنچے تو راکھ یا دھواں کو ایک خوب صورت پیرائے میں پروتے نظر آئے اور ہر انسان کو جگاتے نظر آئے کہ مردہ ضمیر زندہ ہو جائے۔ اگر یہی حال رہا تو یقیناً آپ نے سچ کہا کہ کوئی بھی زمین فلسطین کا نقشہ بن سکتی ہے۔ اپنی محفل میں انٹری ماری تو اپنے ہی شہر کے برادرم بھائی قدرت اللہ نیازی کو کرسی صدارت پر براجمان دیکھا، بہت ہی اچھا تبصرہ تھا۔ مبارک ہو جی۔ پھر انعم ریاض اور محی الدین اشفاق مختصر تبصرے کے ساتھ موجود۔ طلحہٰ رحمان، شوکت شہریار اور افتخار حسین کا تبصرہ بھی نائس ہے۔ میں احمد خان توحیدی کی بات سے ایگری کرتا ہوں کہ پاکستان کی ممتاز شخصیات کے بارے میں پڑھنے کو ملنا چاہیے۔ بھائی اعجاز احمد راحیل کا تبصرہ اچھا ہے لیکن لفظوں میں وہ کاٹ نظر نہیں آئی جو راحیل کے تبصرہ کا حصہ ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ماروی پڑھی۔ اب تو ہم اس طرح ڈوب کے پڑھتے ہیں آس پاس کیا ہو رہا ہے کوئی پتا نہیں۔ اللہ خیر کرے۔ مراد کو قسمت

کہاں سے کہاں لے گئی ہے، محبت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ کہاں گدھا گاڑی چلانے والا مراد اور کہاں بڑے بڑے سورماؤں کی لاشیں گرانے والا مراد۔ پھر ستاروں پر کمند پڑھی، شکر ہے سرمد صاحب اینڈ کمپنی صحیح سلامت واپس پہنچی اور اب عادل نئی مصیبت میں پھنس گیا۔ یہاں سے کس طرح نکلتا ہے، اگلی قسط کا انتظار کرتے ہیں۔ کاشف زبیر کی قاتل محبت پڑھی، بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ جیسمین کی روح نے رینا کی مدد سے آخرکار اپنے آپ کو بے نقاب کیا۔ چاند گہن میں بیگ صاحب نے پھر ایک مرتبہ اپنے موکل کو باعزت بری کرایا اور اصل مجرم کو جیل پہنچایا۔ انتظار میں راشد نے اپنے ساتھ بھی برا کیا اور بیوی بچوں کے ساتھ بھی، ایک پُراثر تحریر تھی۔ اس دفعہ محفل شعر و سخن بیسٹ تھی۔ مقابلہ بھی گزارے لائق تھی۔ منظر امام کی ہمدرد ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔ زاہد علی نے کس طرح بے وقوف بنایا۔ حضرت ابراہیم کا واقعہ پڑھا۔ ایمان تازہ ہو گیا۔ میناز ہر بھی بس گزارے کی تھی۔ نشور ہادی کی دہرا جرم سلطانہ کی بے لوث محبت اور ایثار نے متاثر کیا اور صبور کے غلط فیصلوں نے اسے اور روحی کو جیل پہنچایا۔''

※ محمد یوسف سانول، نورپور تھل، ضلع خوشاب سے محفل میں شریک ہیں ''1998ء سے سسپنس کا خاموش قاری ہوں لیکن خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہا ہوں کیونکہ میرا گاؤں شہر سے بہت دور ہے اور جب تک سسپنس مجھے ملتا ہے تو خط لکھنے کی تاریخ گزر جاتی ہے۔ آج کل میں راولپنڈی میں جاب کر رہا ہوں اس لیے سوچا کہ ایک کوشش کر کے دیکھ لی جائے، ہو سکتا ہے کہ ہمیں بھی سسپنس میں جگہ مل جائے۔ (خوش آمدید) سسپنس کا معیار بہت ہی اچھا جا رہا ہے، سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند پڑھی۔ یقین کریں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ان کرداروں کے ساتھ ساتھ ہوں، کرشل کی بے باکی، عادل کی محنت اور جرأت، سرسرمد کے سمجھانے کا انداز یقین کریں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد محی الدین نواب صاحب کی ماروی پڑھی، اچھی کہانی ہے اور ان کے لکھنے کا انداز ہی منفرد رہا ہے۔ ڈاکٹر عدیلہ کی انٹری اس قسط میں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد مرزا امجد بیگ صاحب کی چاند گہن پڑھی بہت ہی اچھی لگی۔ مراد، نامراد جیسے کردار ہمارے معاشرے میں ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گے اور ان کی سرکوبی کے لیے مرزا صاحب جیسے لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی انتظار پڑھی اور دل اداس ہو گیا کہ راشد نسیم جیسے بندے کو تو والد بننا ہی نہیں چاہیے تھا۔ حاجی صاحب کا کردار بہت پسند آیا۔ آخر میں نشور ہادی کی دہرا جرم پڑھ کر دیر تک سوچتا رہا کہ بدلتا ہے روپ انسان کیسے کیسے۔ محفل خطوط میں محمد قدرت اللہ نیازی کو کرسی صدارت پر مبارکاں، تمام دوستوں کے تبصرے اچھے لگے۔ تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے نوک جھوک کا سلسلہ بحال کیا جائے۔ رضوان تنولی کی غیر حاضری ہضم نہیں ہو رہی۔ محفل شعر و سخن میں محمد اشفاق سیال کا شعر بہت پسند آیا۔''

※ اشوک کمار، میرپور خاص سے چلے آ رہے ہیں ''ہر بار وہ نئے رنگ و روپ میں پہلے سے نکھر کر آتا ہے۔ ہم رستہ اگر بھولتے ہیں تو وہ صحیح راہ دکھاتا ہے۔ ملک کے ذہین ہیروز سے ملاتا ہے، خط غیروں کے ہمیں دکھا کے غیرت دلاتا ہے۔ گھر بیٹھے دنیا کی سیر کراتا ہے یہ ہے ہمارا پیارا سسپنس ڈائجسٹ۔ (بہت شکریہ جناب) ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر حاضر ہیں۔ دراصل میں دہلی اپنی بہنوں کو راکھی باندھنے کی رسم کے لیے گیا ہوا تھا۔ گو کہ وہاں کی عوام بہت پُرخلوص ہے لیکن اپنے وطن پاکستان کی بات ہی الگ ہے۔ سسپنس 16 اگست کو مل گیا۔ سرورق اور اداریے سے مستفید ہونے کے بعد اپنی سونی جاگتی محفل میں انٹر ہوئے۔ صدارت پر نیازی بھائی کا قبضہ اچھا لگا۔ مبارک باد۔ کبھی ہمیں بھی یہ شرف دے دیا کریں، ادارے والو! اس محفل میں جو اکثریت کی رائے آئے گی ویسے ہی ہوگا اور ہمارے کافی ہمنوا بن گئے ہیں۔ محفل تہذیب کے دائرے میں اپنے عروج پر آئے گی۔ لعل ماسٹر طلحہٰ کو سالگرہ مبارک۔ بشریٰ افضل جی، الیلی صاحبہ کو اب اپنا اصل نام بتا ہی دینا چاہیے۔ مہرین ناز جی میں آپ کے ٹیلنٹ کی قدر کرتا ہوں، ہر بار تبصرہ پسند آتا ہے۔ اسٹوریز کی ابتدا اپنے دل پسند رائٹر جناب طاہر جاوید مغل جی کی ستاروں پر کمند سے کی۔ اس کہانی میں دل کو موہ لینے والے مناظر بے حد اچھے لگتے ہیں۔ آخر عادل اچھا کوہ پیما بن کر لوٹ آیا۔ اب چودھری ناصر کے چنگل میں پھنس گیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ محی الدین نواب کی ماروی تڑپتے دلوں کی کسک اور منتشر خیالات کا مجموعہ ہے۔ مراد علی منگی مشکلات کا بہادری سے مقابلہ کر رہا ہے۔ اس کا انڈیا جانا اسٹوری میں ایک نیا ٹوئسٹ آ گیا۔ چاند گہن میں مرزا امجد بیگ نے سود اور دشمن نما دوست مراد خان کا پول کھول دیا۔ مراد خان جیسے بے ضمیر لوگ اس دور میں بہت ہیں۔ سود بھی ایک لعنت ہے۔ میناز ہر میں تنویر ریاض صاحب ایک اچھوتی محبت کے ساتھ آئے۔ اسکوئیک نے اپنی وفاداری دکھائی۔ اسٹوری پسند آئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے بھی خوب مقابلہ کیا۔ برائی کے خلاف عزیز بیگ نے جو گڑھا دوسروں کے لیے کھودا، اس میں خود ہی گرا۔ برے کا برا انجام۔ آخر میں نشور ہادی کے دہرا جرم سے انصاف کیا۔ کہتے ہیں نا کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں تو بالکل اسی طرح ایک غلطی کو چھپانے کے لیے صبور کو مزید غلط کام کا سہارا لینا پڑا اور اس کا جرم سنگین ہوتا گیا۔''

※ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی سے شریک محفل ہیں ''لیجیے خوب صورت فہرست تو دل و دماغ پر چھا گئی۔ ایسے ایسے قلم کار اکٹھے کیے ہیں آپ لوگوں نے کہ پھر میگزین پسند نہ کیا جائے، اس سے بڑا بدذوق اور کون ہوگا۔ اس میں زرا قلم کار ستاروں

معذرت

گزشتہ شمارے میں ایک ناموزوں شعر سہواً شائع ہو گیا ہے جس کے لیے ادارہ تہِ دل سے معذرت خواہ ہے۔

کی محفل دیکھیں جس میں ش م جمیل ہوں، منظر امام بہترین منظر پیش کرتے ہوں۔ ڈاکٹر ساجد امجد اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی جیسے لکھاری جمع ہوں اور پھر الیاس سیتاپوری اور کاشف زبیر چار چاند لگا رہے ہوں اور..... اور سونے پر سہاگا دو مستند، نامور و ناقابل تسخیر مصنف جناب محی الدین نواب اور طاہر جاوید مغل انمٹ احساسات چھوڑنے والی کہانیاں لا رہے ہوں۔ بھلا کب کوئی ناپسند کرسکتا ہے؟ جی ہاں انشائیہ وہ بھی جون ایلیا کا کہ دل کو چھو لیتا ہے۔ آپ کے خط کی محفل بھی قارئین کے بہترین خیالات اور چھیڑ چھاڑ سے سجی ہے اور پڑھ کر تو مزہ ہی آگیا۔ محمد قدرت اللہ نیازی کا جامع تبصرہ، واقعی صدارت کا حق دار تھا۔ سیریل اور کہانیوں میں انمٹ نقوش چھوڑنے والے دونوں سلسلے ستاروں پر کمند اور ماردی پہلے دن ہی ہضم کرلیے کہ ان کے بغیر تو سخت ذہنی ناآسودگی محسوس ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ پھر نشور ہادی کا تانا بانا کہانی دہرا جرم کی خوب صورت تحریر اور واقعات میں کھو گیا۔ منظر امام بھی کمال کی تحریریں لائے ہیں جو مدتوں یاد رکھی جائیں گی۔ ش م جمیل کا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ تیز تر بے حد اچھی کہانی رہی۔ کاشف زبیر کے سدابہار قلم سے ایک اور خوب صورت، پراثر کہانی قاتل محبت! الیاس سیتاپوری کی بہ نوک خنجر تو دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ شعروسخن محفل بے حد اچھے شعروں سے سجی تھی۔ باقی زیر مطالعہ ہے۔"

⊛ حسن سردار رانا، دیکھے تارڑ سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں "19 اگست کو رسالہ ملا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ہمارے سیاسی راہنماؤں کو ہدایت دے اور ملک پاکستان پر اپنی خاص رحمتیں نازل فرمائے۔ (آمین) سرورق نہایت خوب صورت تھا۔ صفحہ پلٹا تو محترم جون ایلیا کا انشائیہ راکھ یادھواں، جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ الیاس سیتاپوری صاحب کی تاریخی کہانی (بہ نوک خنجر) افغان قوم کی بہادری اور جرأت واقعی قابل مثال تھی۔ کاشف زبیر صاحب کی قاتل محبت بھی خوب صورت کہانی تھی۔ شین اینڈرسن اور ولن رینا کا انجام خوب تھا۔ آگے آگئی جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند تیسری قسط میں برفبار پہاڑوں کی مہم یقین کریں اتنی دلچسپ تھی، باوجود لوڈشیڈنگ کے ایک ہی نشست میں پڑھی کیونکہ عادل، سرمد صاحب اور کرنل کی مہم جوئی واقعی تعریف کے قابل تھی۔ اینڈ پر عادل کی واپسی اپنے گاؤں آنا اور لڑائی کے بعد عادل کا بے ہوش جانا بڑا ٹریجڈی اینڈ تھا، کہانی کا۔ امید ہے کہانی آگے جا کر قارئین کو متاثر کرے گی۔ مرزا امجد بیگ صاحب حسب روایت اپنے کیس کی تہ تک پہنچ کر انصاف دلاتے نظر آئے۔ ماردی بھی اپنی دلچسپیوں کے ساتھ آگے خوب صورت انداز میں بڑھتی جارہی ہے۔ محبوب اور مراد اپنی محبت اور قربانیوں میں ایک دوسرے سے آگے جانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ محترم منظر امام صاحب کی کہانی ہمدرد آج کل کے دور کے فراڈ اور بے ایمان لوگوں کی نشاندہی کرتی نظر آئی۔ وہ لوگ جو پیسے کمانے کی خاطر مدرسوں اور مساجد کے نام پر عوام سے پیسے بٹورتے ہیں، ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی کاوش انتظار بڑی متاثر کن کہانی تھی۔ چھوٹی سی غلط فہمی نے...... میاں بیوی کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی۔ ابوضیا اقبال صاحب کی ماہر تولید مغربی سائنسدانوں کے تجربات اور انجام بڑا اچھا تھا۔ نشور ہادی صاحب کی آخری صفحات پر دہرا جرم، جرم و سزا کے اپنے خوب صورت انجام کے ساتھ متاثر کر گئی۔ کہانی میں میاں بیوی کی انڈراسٹینڈنگ نے ایک تیسرے کردار صبوحی کو مرنے سے بچالیا ویسے تھوڑی کہانی فلم ہیلی سے ملتی جلتی نظر آئی جس میں ایک بیوی اپنے شوہر کی محبت کو ایک ہیلی پر قربان کرتی نظر آئی۔ درمیان میں شیما اور وڈیرے کا کردار حسب دستور کہانی کو آگے بڑھاتا نظر آیا۔ آخر میں اپنے قاری دوست ثاقب تبسم نگینہ فرام علی پور چٹھہ کا مشکور ہوں جنہوں نے پہلی پوزیشن پر مبارک باد دی۔"

⊛ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے تبصرہ کررہے ہیں "ستمبر کا سسپنس اب اس کے بعد 3 ماہ رہ گئے پھر نیا سال اور نئے سال میں سسپنس کا سالنامہ زبردست ہونا چاہیے تاکہ ہمیشہ یاد رکھا جائے اور کوشش کرے انسان تو کیا کام ہے مشکل۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بہت عمدگی سے لکھا گیا ہے دوسری قسط کا انتظار ہے۔ بیگ صاحب کی کہانی انہی کی زبانی اس دفعہ قدرے مختلف رہی۔ مراد خان وہی روایتی حریف دھوکا، مکر فریب اور جعلسازی آخر میں قاتل قانون کے کٹہرے میں۔ عمران کی خوش قسمتی بیگ صاحب کہ یہ کیس آپ کے پاس آگیا اور ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ سسپنس یہ سب شائع کررہا ہے اور ہم بڑے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ تیز تر بہت زبردست کہانی تھی۔ اسی طرح ہمدرد بھی خوب رہی منظر صاحب کی زبانی ماہر تولید معاشرتی کہانی مگر کافی پیچیدگیاں بنے۔ ستاروں پر کمند ابھی صرف تین ہی اقساط آئی ہیں مگر کہانی زبردست ہے۔ ستاروں پر کمند آگے کیا ہوتا ہے بڑی ہی بے صبری سے انتظار ہے کیونکہ طاہر صاحب نے ختم ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ بے چینی بڑھ گئی ہے۔"

⊛ جنید احمد، کورنگی، کراچی سے حاضر ہوئے ہیں "ستمبر کا شمارہ 20 اگست کو بک اسٹال .... سے لیا۔ سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ انشائیہ میں جون ایلیا نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں مجموعی انسانی رویوں کی عکاسی کی۔ اداریے میں جہاں ایک طرف یوم دفاع کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا، وہیں دوسری طرف وطن عزیز کو درپیش مسائل کا ذکر کرکے ان سے نجات کی دعا مانگی۔ رب کائنات سے دعا ہے کہ پاکستان کی حفاظت فرمائے اور ہمیں ہدایت دے کہ ہم پاکستان... کو صحیح معنوں میں مملکت خداداد بنانے میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔ آمین۔ ایک تاریخی جملہ ہے کہ تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ہم تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ محفل دوستاں میں محمد قدرت اللہ نیازی کا خط اپنے تمام تر حقوق کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان تھا۔ مبارک ہو نیازی صاحب۔ ویسے نیازی صاحب آپ سچ کہہ رہے ہیں، میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی شریک حیات سے نوازا ہے۔ آپ کے لیے دعا گو ہوں۔ دیگر تمام تبصرے بہت اچھے رہے لیکن اعجاز احمد

راحیل، سید اکبر شاہ اور تنسیر عباس بابر کے تبصرے اپنے الفاظ کے چناؤ کی وجہ سے نمایاں رہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ بہ نوک خنجر میں الیاس سیتاپوری نے تاریخ کے کچھ نادیدہ چہروں سے پردہ اٹھایا۔ کاشف زبیر کی قاتل محبت کا انجام خاصا غیر متوقع اور حیران کن رہا۔ ستاروں پر کمند کی تیسری قسط شاندار رہی۔ طاہر جاوید مغل کی کہانی پر مکمل گرفت ہے۔ عادل اتنا روپیا کہاں سے لائے گا، یہ ابھی تک واضح نہیں ہوسکا۔ لیکن کہانی بہت دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ماہر تولید میں ڈاکٹر ایمیٹ نے اپنی کہی ہوئی بات کو ثابت کردیا کہ سائنس برے نتائج پیدا نہیں کرتی، انسان کرتے ہیں۔ چاند گہن میں بیگ صاحب نے انسان کے بھیس میں شیطان کو بے نقاب کیا۔ سمجھ نہیں آتا کہ مراد خان جیسے لوگ اپنے ضمیر کو اپنے ان افعال کی کیا دلیل دیتے ہوں گے۔ کترنوں میں اس دفعہ ریاض بٹ کا بول بالا رہا۔ محفل شعروسخن میں صوبیہ اقبال کا انتخاب بہت اچھا اور یقینی طور پر اول آنے کا حق دار تھا۔ انتظار اور مقابلہ ایوریج کہانیاں رہیں۔ ش م جمیل کی تیز تر میں اسکو کوٹونی نے نہیں بلکہ اس کی منفی سوچ نے ہرایا۔ ہمدرد منظر امام کی اچھی تحریر تھی۔ رضوانہ ساجد نے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے حالات زندگی تحریر کیے۔ آخری صفحات پر نشور ہادی کی دہرا جرم کے اختتام نے تھوڑا مایوس سا کیا، بہتر تھا کہ مجرم کو قرار واقعی سزا ملتی۔"

⊛ اعجاز احمد راحیل، ماڑی، ضلع ساہیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں "ہجر و فراق کے لیے کتنے ہی طویل کیوں نہ ہوں..... ہم ملن رتوں کی آس دل میں جگائے رکھتے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں آخر تمام ہو ہی جاتی ہیں۔ بہرکیف اس دفعہ من موہنے سسپنس کے لیے کچھ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سرورق پر موجود محبوبہ دلنواز کی یاسیت بھری آنکھیں قابل توجہ ٹھہریں..... جون ایلیا کے قلم سے بکھرے موتی راکھ یادھواں، در اصل محبت کی ایک عمدہ کوشش نگران کے لیے جو محبت کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ حقائق پر مبنی اداریہ اور ملک پاکستان کے لیے کی گئی دعا پر ہم دل و جان سے آمین کہتے ہیں..... برادر قدرت اللہ نیازی صاحب کو صدارت کی مبارک باد۔ بشریٰ افضل جی آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں..... بھائی تنسیر عباس بابر، محمد خواجہ اور البیلی کے تبصرے اچھے لگے۔ سب سے پہلے جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند بصد شوق ملاحظہ کی۔ منظر نگاری اتنی عمدہ ہے کہ بے ساختہ منہ سے تعریفی کلمات نکل پڑے۔ عادل کی کوہ پیمائی کے خوب صورت لمحات دل و ذہن پر نقش ہو کے رہ گئے ہیں۔ سرمد کی ہمت اور فہم و ادراک باعث حیرت اور قابل تعریف و توصیف ہیں۔ چودھری ناصر کی سازش گو کہ کامیاب ہوگئی مگر عادل نے بھی کچھ پل سرمد صاحب کی تربیت میں گزارے ہیں۔ آئی لو یو مغل صاحب..... مخدوش حالات، تڑپتے دلوں کی چاہتیں اور خود کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑنے والے مراد علی منگی کی بھارت میں انٹری اب ماردی کچھ عجب موڑ پہ آگئی ہے۔ محی الدین نواب صاحب بہت شکریہ..... عہد گزشتہ کے یادگار لمحات میں سے ایک خوب صورت انتخاب جو کہ الیاس سیتاپوری نے بہ نوک خنجر کی صورت پیش کیا۔ بہلول اور ثریا کی محبت بھری روداد اچھی لگی..... آخری صفحات کا گوہر نایاب دہرا جرم نشور ہادی کی عمدہ کاوش ہے۔ انسان اگر زندگی میں کی گئی ایک غلطی سے نگاہیں پھیرے تو سو غلطیوں کے در وا ہوجاتے ہیں۔ صبور کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور روحی کی محبت قابل تعریف ہے..... عبدالرب بھٹی کا مقابلہ کافی سنسنی خیز رہا۔ خود کو عقل کل سمجھنے والے عزیز بیگ جیسے لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہر عمل کا رد عمل بھی ہوتا ہے..... تنویر ریاض کی میٹھا زہر چاہت و محبت پہ مبنی عمدہ تحریر ہے۔ محبت واقعی میٹھا زہر ہے جو دھیرے دھیرے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اسکو بیگ نے رسم؛ قاعدگی سے نبھائی۔ مرزا امجد بیگ کی چاند گہن ہمارے معاشرے میں موجود انسان نما درندوں کی کتھا عمدہ لفظوں میں بیان کی گئی۔

⊛ وحشت خیال، خواب نگر سے محفل میں چلے آرہے ہیں "ستمبر کا سسپنس اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہونے کے باعث اپنی خوش بختی پر نازاں ہے۔ ٹائٹل پر نو کمنٹس..... انشائیہ راکھ یادھواں، سیدھا دل میں اتر گیا۔ پھر جھانکا خطوط میں، جہاں قدرت اللہ کرسی صدارت پر براجمان خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ہارٹ فیورٹ تبصرہ نگار ہمایوں سعید کچھ عرصے سے گمشدہ ہوگئے ہیں۔ "او کتھے او جی؟" سب سے پہلے ہم نے شہنشاہ رائٹرز مغل اعظم کے ہمراہ ستاروں پر کمند ڈالی۔ اس کے بارے میں فقط اتنا ہی کہ "لوگ نادان ہیں کہ سورج کو دکھاتے ہیں چراغ..." منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری غرض مغل اعظم کے کردار جیتے جاگتے سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں اور ہم کو بھی اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ پھر ہم پلٹنی کھا کر زبیر کی قاتل محبت کی طرف آئے۔ رینا کا کردار اچھا رہا۔ آخری صفحات پر نشور ہادی کی دہرا جرم اچھی تحریر تھی۔ روحی کی عشق کی انتہاؤں کو چھوتی محبت نے آنکھیں نم کر ڈالیں۔ سلطانہ کا اعلیٰ ظرف کردار بھی خوب رہا۔ احسان سحر کے لیے..... اللہ آپ کو تندرستی اور اطمینان قلب عطا فرمائے۔"

⊛ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں "گزشتہ ماہ محفل میں حاضر نہ ہوسکا۔ میں علیل تھا، ویسے بھی میری غیر حاضری سے محفل میں کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا (آپ سب اس کیاری کے خوب صورت پھول ہیں) اس بار سرورق پسند نہیں آیا۔ البتہ فہرست

اِنتقال پُرمَلال

ادارے سے طویل وابستگی کے بعد تقریباً گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے والے مقبول قلم کار علیم الحق حقی 26 اگست کو طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جاملے۔ ادارہ پس ماندگان کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین

کی تزئین کاری بہت خوب تھی۔ دہرا جرم میں فاضل مصنفہ نے بے جا طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے ٹو دی پوائنٹ بات بیان کی ہے، یہی چیز اس کہانی کی خصوصیت ہے۔ میناز ہر محبت کے موضوع پر ایک منفرد کہانی تھی، خوب لطف آیا۔ ہدرد اختتام سے پہلے ہی میں سمجھ گیا کہ زاہد علی فراڈیا ہے۔ تیز تر، یہ کہانی جتنی مختصر تھی اتنی ہی پُرلطف بھی تھی۔ ماروی اس کہانی کے کیا کہنے۔ ستاروں پر کمند ایک خالص رومانی کہانی ہے مگر اب مغل صاحب اس میں مار دھاڑ بھی شامل کر رہے ہیں جس سے کہانی میں مزہ آنے لگا ہے۔ مقابلہ، میں کچھ لطف نہیں آیا۔ انتظار، طبع زاد کہانیوں میں سب سے بہترین ہے، اس کا پلاٹ بہت عمدہ ہے۔ چاند گہن، بیگ صاحب کو اس بار بڑا کیس ملا، عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ ماہر تولید، یہ سائنسی کہانی بہت پسند آئی۔ قاتل محبت، بھی محبت کے موضوع پر ایک منفرد کہانی تھی جو بہت پسند آئی۔ تاریخی کہانی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ محفل شعر وسخن کے تمام اشعار قابلِ داد تھے۔ انشائیہ حسب روایت تیخ و ترش۔ آپ کے خط، محمد قدرت اللہ نیازی اول نمبر پر ہیں۔ مبارک باد۔ دیگر تبصروں میں محمد خواجہ صاحب، احمد خان توحیدی، اعجاز احمد راحیل اور تفسیر عباس بابر کے تبصرے پسند آئے۔"

⊠ بشریٰ افضل، بہاولپور سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "19 اگست کو سسپنس ملا۔ کونے میں استراحت فرماتے بازو پر سر رکھے صنف مخالف کسی گہری سوچوں میں ہیں جبکہ صنف نازک گہری فکر میں غلطاں ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا نے خوب صورتی سے اپنی بات ہم تک پہنچائی۔ اپنی محفل میں پہنچے۔ انکل کی کھری اور سچی باتوں کے ہم قائل ہیں۔ کرسی صدارت پر محمد قدرت اللہ نیازی براجمان تھے، مبارک ہو۔ نوک جھوک پر پابندی لگا کر محفل کو بور کر دیا ہے۔ یہ بھی تفریح ہی تو ہے جو ہم مسکرا لیتے ہیں۔ انتظار لمحہ بہ لمحہ سسپنس سے بھرپور شاہکار کہانی تھی، ذرا سی غلط فہمی نے فرحت کو کس حال میں پہنچا دیا۔ بچوں کو حاجی صاحب کی وجہ سے باپ کی محبت اور شفقت نصیب ہوئی، بیٹا بنا کر تو سب کے دل ہی جیت لیے۔ مقابلہ، اس مقابلے کی دوڑ میں ہمسایوں کے آرام کا خیال تو رکھنا چاہیے تھا نا! اپنی کامیابی کے نشے میں دوسروں کا جینا حرام کر دیا اور اپنا ہی نقصان کروالیا۔ تیز تر، اسکوٹونی کی وجہ سے جرم کا ارتکاب کرنے سے بچ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان افروز واقعات سے دل منور ہو گیا۔ ایسے ہمدرد بھی ہوتے ہیں۔ کس خوب صورتی سے لوگوں کو لوٹتے ہیں اور اپنی عزت بناتے ہیں۔ محفل شعر وسخن میں خوب صورت شعروں کا انتخاب تھا۔"

⊠ محمد اکبر تاجک، لودھراں سے تشریف لائے ہیں "ستمبر 2014ء کا سسپنس 18 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل بھی شاندار لگا۔ میرے فیورٹ تبصرہ نگار سید شکیل حسین کاظمی صاحب، بھائی اعجاز احمد راحیل، باجی مہرین ناز اور زویا اعجاز سسٹر ہیں اور ان کا انداز تحریر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ محفل میں سب دوستوں کے تبصرے اچھے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری کی بہ نوکِ خنجر جیسی خوب صورت تحریر پڑھنے کو ملی۔ بہلول کی فہم و فراست قابل ستائش ہے۔ زیبا کا کردار پسند آیا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند نے دل خوش کر دیا۔ باگڑی چولی کے دلکش نظارے بھی ملاحظہ کیے۔ ماروی اس دفعہ قدرے بہتر تھی مگر اسٹوری میں وہ جان نہیں جو نواب صاحب کے قلم کا خاصہ ہے۔ حسام بٹ صاحب کی چاند گہن میں مرزا امجد بیگ نے مراد خان جیسے شاطر انسان کو قانون کی گرفت میں دے ہی دیا۔ نشور ہادی کا دہرا جرم ایک منفرد اسٹوری ہے۔ سوچوں کے در وا کر گئی۔ انسان سے غلطی ہو جائے تو اس کا ازالہ ضروری ہوتا ہے اگر ہم اس کو چھپائیں گے تو مزید غلطیاں ہوتی جائیں گی...... قاتل محبت، انتظار بھی عمدہ کہانیاں تھیں، پسند آئیں۔ محبت کے موضوع پر لکھی گئی کہانی میناز ہر بہت اچھی لگی۔ واقعی محبت میناز ہر ہوتی ہے جو انسان اپنی خوشی سے پی جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی سوانح حیات ایمان تازہ کر گئی۔ آخر میں ادارے والوں سے گزارش ہے کہ ناصر ملک صاحب کو سسپنس میں لایا جائے۔"

⊠ مہرین ناز، حیدرآباد سے محفل میں حاضر ہوئی ہیں "ہماری بصارتوں کے رزق کا انتخاب ہر بار کسی سیپ سے نکالا گیا گوہر ہوتا ہے۔ انشائیہ پڑھ کر دعا کی، اے رب کریم! ہمیں ایسے راکھ یا دھواں سے دور رکھ۔ اداریے میں اور عالمی افق کے تحت دکھائے گئے حالات حاضرہ پر پاکستان کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، اس پر بس افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اپنی سندر اور امن و شانتی والی محفل، گر اب وانر پلی کر کچھ جان پکڑتی جا رہی ہے۔ نیازی بھائی دعائیں کرنا ہمارا کام ہے آگے قبول کرنا رب سائیں کا۔ کہانیوں کی ابتدا الیاس سیتاپوری کی بہ نوکِ خنجر سے کی۔ اسٹوری کا نام ہی بہت کلاسک ہے۔ ماضی کے شب و روز کی انتھک بھاگ دوڑ کے واقعات سے پردہ اٹھایا گیا۔ بہلول اور زیبا اپنی اپنی جگہ بہترین کردار تھے۔ کہانی اچھی لگی۔ دہرا جرم نشور ہادی، ہمیشہ ہمارے لیے دلچسپی کا سامان لاتے ہیں۔ انسان سے جب غلطی ہو جاتی ہے تو اس کی پردہ پوشی بہت سی غلطیوں کو آواز دیتی ہے۔ مجبور بھی کچھ ایسے ہی معاملات میں الجھتا گیا۔ میناز ہر تنویر ریاض صاحب کی بہتر کاوش ہے۔ محبت اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی مقابلہ اچھی لگی۔ عزیز بیگ کی طرح جو کسی کے بارے میں برا سوچتا ہے تو وقت خود اس سے انتقام لیتا ہے۔ کیسے انکا، کب یہ قدرت جانے۔ ماروی میں محی الدین نواب صاحب نے اس بار کچھ ہماری تسکین کا سامان پیدا کیا، مراد منگی کو انڈیا بھیج کر۔ اب ہماری دلچسپی بحال ہو رہی ہے۔ ہر دل عزیز رائٹر جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند لازوال داستان ہے۔ کبھی کبھی انسان اپنی چاہت کو پانے کے لیے بہت کچھ کر جاتا ہے اور عادل کے کوہ پیمائی کے مناظر قابل توصیف و تعریف ہیں، سر سرمد کی ہمت قابل داد ہے۔"

⊠ ذاکم علی گورچانی، واہل سے چلے آرہے ہیں "دیدہ زیب سرورق دل کو بہت راس آیا۔ جون ایلیا کا انشائیہ حکمت کے موتی بکھیر

رہا تھا۔ سب سے پہلے تو ہم نے دوڑ لگائی ستاروں پر کمند کی جانب۔ بلاشبہ محبتوں کے سفیر محبتوں کے اسیر، طاہر جاوید مغل صاحب ایک مہان انسان ہیں۔ اسٹوری بڑی حد تک لاجواب اور وِنڈر فل جا رہی ہے۔ محفل شعر وسخن میں تمام اشعار اچھے تھے۔ محفل دوستاں میں ابرار وارث آف منڈی بہاؤالدین کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں، بھائی کیا وجہ ہے۔ میرے ایک دوست جو کہ 1985ء سے سسپنس کے قاری ہیں۔ آج تک سسپنس سے لگاؤ میں انہوں نے کوئی کمی پیشی روا نہ رکھی لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اتنے عرصے سے وہ سسپنس سے صرف خاموش ناتا جوڑے ہوئے ہیں لیکن انہوں نے اپنی اس محبت کا اظہار کبھی بھی ادارے کو خط لکھ کر کیوں نہیں کیا؟ اب تو یہ حال ہے کہ وہ ایک ماہ کے سسپنس کو دو ماہ میں پڑھتے ہیں کیونکہ عمر کے ساتھ ساتھ بینائی بھی کمزور ہو رہی ہے لیکن میں نے اس سے پہلے کسی ادارے کے ساتھ اتنی محبت نہیں دیکھی۔ ان کی خواہش ہے کہ مغرب سے درآمد کتھاؤں کا حال تھوڑا مختصر ہونا چاہیے۔ بہرحال ابھی ہماری سسپنس سے محبت کو تو تین ہی سال ہوئے ہیں۔ اس بار کا شمارہ باقی شماروں کی نسبت بہت ہی دلچسپ اور دلفریب تھا۔ آج پاکستان نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ تمام دوستوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کے رقیب رو سیاہ بننے کے بجائے دلوں میں موجود عداوتیں، بغض، کینے، سب کچھ مٹا دیں اور محبتوں کے پھولوں کی آبیاری کریں۔"

⊠ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "ستمبر 2014ء کا شمارہ بروقت موصول ہو گیا۔ سرورق گزارے لائق بھی نہ تھا۔ اداریہ مستقبل کی خوش گمانیوں سے مزین نظر آیا، ہماری بھی دلی تمنا ہے کہ پاکستان امن و استحکام حاصل کرے اور ترقی کی منازل طے کر کے ایک اچھی مثال بنے۔ کرسی صدارت پر خود کو بیٹھے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ حسب معمول ستاروں پر کمند سب سے پہلے پڑھی۔ آخرکار سرمد صاحب کی تربیت و راہنمائی سے .... عادل نے "باگڑی" چوٹی سر کر ہی لی۔ تاہم انسانوں کی سازشوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ابھی تک کامیاب نہ ہو سکا۔ چودھری ناصر نے عادل کو بہت مشکل صورت حال میں پھنسا دیا ہے جس کا حقیقی دنیا میں انجام صرف موت ہے تاہم یہاں کہانی میں مغل انکل کا قلم یقیناً اپنے ہیرو کو اس مشکل سے نکالے گا۔ آخری صفحات پر نشور ہادی دہرا جرم لے کر آئے۔ کہانی کا تھیم اچھا تھا تاہم غیر معمولی طوالت اور غیر ضروری وضاحتی مکالمے بوریت پیدا کرنے کا سبب بنے۔ ماروی میں مراد کو اب عالمی مجرموں سے برسرپیکار دکھایا جا رہا ہے۔ عالمی طاقتوں کی تحریر میں شمولیت ہی شاید کہانی کو دلچسپ بنا دے۔ ابوضیا اقبال کی ماہر تولید میں چھ فٹ کے خرگوش کا ذکر پڑھا۔ جب تصور کیا تو واقعی حیرت ہونے لگی۔ تحریر کلوننگ اور اس پر ہونے والے اعتراضات کی یاد تازہ کرتی، دلچسپ رہی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی انتظار کئی ڈرامائی جوڑ کی حامل تحریر تھی۔ شک کے ناگ راشد نسیم کی زندگی کو جہنم بناتے گئے۔ حاجی صاحب سے ملاقات اور اس کے بعد کے واقعات فلمی انداز لیے ہوئے تھے۔ کاشف زبیر کی قاتل محبت حقیقت میں قاتل ثابت ہوئی۔ تاہم چند ماہ سے کاشف زبیر اس قسم کی تحریریں مسلسل لکھتے نظر آرہے ہیں۔ محفل شعر وسخن میں عثمان اشرف، کوٹ لکھپت جیل کا انتخاب بہترین رہا۔"

⊠ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے شریک محفل ہیں "ذاکر صاحب کا کمال حسینہ ٹائٹل نے حسیناؤں کو شرما دیا۔ انشائیہ، جون ایلیا، راکھ یا دھواں، نفرت کی ماچس سے جلائی جانے والی آگ نہ بھی جلے دھواں پھر بھی نکلتا ہے۔ اداریہ میں آپ نے 7-6 ستمبر کا حوالہ دیا۔ ستمبر کے حوالے سے کسی ادیب نے کوئی کہانی نہ لکھی۔ قدرت اللہ نیازی تاج و تخت پر قبضہ مبارکاں جی۔ ستاروں پر کمند عادل کو پہاڑ سر کرنے کے بعد مغل صاحب نے شہزادی کے سامنے پٹوا دیا۔ میم کی ڈائری میں ماروی سے ملے۔ مراد منگی مرینہ کی حراست سے ہتھکڑیاں کاٹ کر فرار ہو گیا۔ چاند گہن، مس مراد جیسے لوگ بیگ صاحب سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ سسپنس پڑھتے بوڑھے ہو گئے بیگ صاحب اور ملک صاحب کو ناکامی کی چند کہانیوں سے نوازیں، نوازش خاص ہو گی۔ ڈاکٹر ساجد کی انتظار، اس قسم کی نس بندی کے واقعات واقعی ہو چکے ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ منتظر امام کے قلم کی کاٹ لاجواب ہمدردی۔ رضوانہ ساجد کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں مفصل تحریر بہت اچھی تھی...... بچوں نے بہت پسند کی۔ میناز ہر بالکل پسند نہ آئی۔ دہرا جرم، نکاح سے قبل ماڈرن طبقے میں عام بات ہے۔ روحی کو حد سے نہیں گزرنا تھا۔ حادثے پر صبور کو بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ سلطانہ کا ایثار لاجواب ہے۔ بہ نوکِ خنجر، اچھی تاریخی تحریر۔ سیتاپوری صاحب، ایدھی، انصار برنی، جون ایلیا اور معراج رسول کے حالات زندگی لکھیں۔ ماہر تولید، قاتل محبت، تیز تر، لائق گزارہ تحریریں ہیں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

راجہ افتخار علی انی، چوآسیدن شاہ۔ امجد اقبال بھٹی، ضلع ساہیوال۔ محمد رشید سیال، روہڑی۔ محمد صفدر، خانیوال۔ اعجاز حسنی، لیہ۔ .... اور یس احمد، مصر، کورنگی کراچی۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ مسعود احمد خانزادہ، نوشہرو فیروز۔ افتخار حسین اعوان، مظفرآباد، آزاد کشمیر۔ ایم کامران خالد، چھب اٹک۔

سانحہ ارتحال

آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کے روح رواں اور صدر جناب حمید ہارون کی والدہ 10 ستمبر کو خالق حقیقی سے جا ملیں انا للہ و انا الیہ راجعون ادارہ پس ماندگان کے غم واندوہ میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ رب العزت مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

تصویرِ زوال

ایچ اقبال

تاریخ نے ثابت کیا ہے، اگر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ انسان جیسے جیسے عروج کی جانب قدم بڑھاتا ہے درحقیقت اپنی ذات کی کمزوریوں... زندگی کے نازک لمحات اور ضعف سے قریب تر ہوتا جاتا ہے... حتیٰ کہ وہ عروج کی مطلوبہ منزل کو چھو لیتا ہے اور جب وہ پلٹ کر چاروں جانب دیکھتا ہے تو سب کو پیچھے چھوڑ کر خوش ہوتا ہے لیکن درحقیقت خود کو تنہا پاتا ہے... اسے اپنی آواز بھی دور سے آتی سنائی دیتی ہے... تب جاکر اسے اپنے عروج میں چھپے زوال کا احساس ہوتا ہے... وہ منظر بھی بامِ عروج کو چھونے والے ایک عہد کے زوال کی تصویر بن کر رہ گیا تھا جب سلطنتِ عثمانیہ کے فرمانروا سلطان سلیمان کے خوشحال اور مضبوط دورِ حکومت نے کتنی آنکھوں کو سنہرے سپنوں کا عادی بنا دیا تھا۔ دلوں کی تالوں پر تھرکتے قصے عجب کیف و مستی کو دعوت دیتے تھے کہ اچانک وزرا کی تبدیلی نے تاج و تخت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا پھر حالات و واقعات کی بگڑتی ترتیب نے تمام ترکیبوں کو بے اثر کر ڈالا... ماضی کے اوراق جب جب پلٹتے ہیں، ایک الگ ہی سبق آموز ماحول میں لے جاتے ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

شہزادی مہرماہ سلطان نے اپنی خواب گاہ میں بستر پر کروٹ لی۔ کچھ دیر سے وہ اسی طرح کروٹیں بدل رہی تھی جیسے کسی کروٹ چین نہ آرہا ہو۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ دماغ میں مسلسل یہ سوال گردش کر رہا تھا کہ اسے عشقیہ خط لکھنے کی جسارت کس نے کی تھی۔ اس خط کی وجہ سے ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ خط اس کے بڑے بھائی شہزادہ بایزید کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ مہرماہ نے اسے یقین دلانے کی ہرممکن کوشش کی تھی کہ وہ نہ تو کسی سے محبت یا عشق کرتی ہے اور نہ اسے اندازہ ہے کہ اسے وہ خط کس نے لکھا تھا مگر شہزادہ بایزید کو یقین نہیں آیا تھا۔ خط وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور بڑی سنجیدگی سے کہہ گیا تھا کہ یہ مسئلہ وہ سلطان سلیمان خان کے علم میں ضرور لائے گا۔ مہرماہ سلطان اسی بات سے پریشان تھی کہ جب وہ اپنے بھائی کو اپنی بات کا یقین نہیں دلا سکی تھی تو اپنے باپ کو کس طرح یقین دلا سکے گی۔

سلطان سلیمان خان، ترکی کی عثمانی سلطنت کا دسواں عظیم فرماں روا تھا جس کی سپاہ یورپ کی متعدد سلطنتوں کو روند چکی تھی اور جہاں ابھی اس کے قدم نہیں پہنچے تھے، وہاں کے بادشاہ اس کے نام سے بھی شدید نفرت کرتے تھے۔

شہزادی مہرماہ سلطان اس کی بہت چہیتی بیٹی تھی جو ملکہ خرم سلطان کے بطن سے تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی شہزادہ جہانگیر پیدائشی طور پر ہڈیوں کا مریض تھا۔ خصوصاً ریڑھ کی ہڈی بھربھراہٹ کی طرف مائل تھی۔ خرم سلطان کے دو اور بیٹے بھی تھے جن میں شہزادہ سلیم بڑا تھا مگر ملکہ خرم سلطان اس سے چھوٹے شہزادہ بایزید کو زیادہ پسند کرتی تھی۔

مہرماہ سلطان کو باپ کی بہ نسبت اپنی والدہ کا زیادہ خوف تھا کیونکہ وہ شہزادہ بایزید کی بات پر جلدی یقین کرلیتی۔ بایزید نے کہا تو یہی تھا کہ یہ مسئلہ سلطان سلیمان خان کے علم میں لایا جائے گا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ سلطان اس بارے میں ملکہ خرم سلطان کو بھی بتاتا۔

مہرماہ سلطان کو اس اعتبار سے نوعمر کہا جاسکتا تھا کہ ابھی اسے سنِ بلوغ میں قدم رکھے چند مہینے ہی گزرے تھے لیکن اس کی اٹھان بہت اچھی تھی۔ اس کا جسم بھرا بھرا ہونے کے باوجود نہایت متناسب تھا۔ نقش و نگار بھی غیر معمولی تھے۔ سلطان سلیمان خان کئی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ وہ اپنی خوب صورت ماں پر گئی تھی۔

اس سے کوئی انکار بھی نہیں کرسکتا تھا کہ قصرِ شاہی میں خرم سلطان سے زیادہ خوب صورت کوئی دوسری عورت نہ

تھی۔ جوان اولادوں کی ماں بن جانے کے بعد بھی اس کے جسمانی تناسب اور نقش و نگار میں کچھ نمایاں منفی تاثر نہیں آیا تھا۔ فرق آیا تھا تو صرف اتنا کہ اب وہ نہایت باوقار اور پُرتمکنت نظر آنے لگی تھی جبکہ قصر شاہی میں قدم رکھتے وقت وہ ایک شوخ اور الہڑ دوشیزہ تھی۔

سلطان سلیمان خان نے جب روس کی ایک ریاست فتح کی تھی تو وہاں سے قیدی بنا کر لائے جانے والوں میں وہ بھی شامل تھی۔ اس کی خوب صورتی ہی کو دیکھ کر والدہ سلطان نے اسے محل سرا کی کنیزوں میں شامل کرلیا تھا۔

عثمانی ترکوں میں یہ خاصا پرانا رواج تھا کہ فرماں روائے وقت کی ماں کو "والدہ سلطان" یا "والدہ ماجدہ" کہا جاتا تھا۔ لہٰذا اس پر اعتراض کرنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں ہوسکتی تھی کہ اس لڑاکا لڑکی کو کنیزوں میں کیوں شامل کیا گیا۔

اسے "لڑاکا" اس لیے کہا جانے لگا تھا کہ وہ خود سے حسد کرنے والی ان کنیزوں کے بال نوچ ڈالتی تھی جو اس پر کبھی کوئی فقرہ کس دیا کرتی تھیں۔ عموماً وہ جھگڑا کنیزوں کی سربراہ رقیہ بیگی کی وجہ سے رفع دفع ہوجاتا تھا۔

فقرہ کسنے والی کنیزیں ملکہ گل بہار کی شہ پر ایسا کیا کرتی تھیں۔ دراصل گل بہار کو یہ خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ محل سرا میں آنے والی وہ قیامت کی خوب صورت کنیز کہیں سلطان سلیمان خان کے دل کو نہ بھا جائے۔ گل بہار چاہتی تھی کہ کسی بہانے سے اس نئی کنیز کو محل سرا سے نکلوادے۔ وہ خود بھی ایک خوبصورت کنیز تھی جو سلطان سلیمان خان کو اتنی بھائی تھی کہ اس کے بیٹے شہزادہ مصطفیٰ کی ماں بن چکی تھی۔

عثمانی ترک فرماں رواؤں کے قانون اور اصول کے مطابق شہزادہ مصطفیٰ ہی بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے سلطنت کا ولی عہد ہوتا، اس کے باوجود گل بہار اس روسی کنیز کی وجہ سے اندیشوں کا شکار ہوگئی تھی۔ مشہور تھا کہ اس روسی اور عیسائی کنیز کا نام "روکسے لانا" تھا۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب سے انداز میں رقص بھی کیا کرتی تھی۔ جب کسی خوشی کے موقع پر کنیزیں جشن منایا کرتی تھیں، وہ موم شمع کے قریب اپنے ہاتھ اس طرح نچاتی کہ دیوار پر روایتی دیو کا سایہ رقص کرتا نظر آتا۔ ابتدا میں اسے بہت کم جیب خرچ ملتا تھا اس لیے وہ اپنے جوڑے میں فیتہ باندھ لیتی تھی اور نیلے مخمل کی ٹوپی پہنتی تھی کیونکہ دوسری کنیزوں کی طرح اس کے پاس بال باندھنے کے لیے ملکہ گل بہار کی عطا کردہ موتیوں کی مالا تھی، نہ زریں اطلس کی ٹوپی! لیکن اس حالت میں بھی وہ نہایت خوب رو ہونے کے باعث تمام کنیزوں میں نمایاں نظر آتی۔

پھر ایک دن وہی ہوا جس کا ملکہ گل بہار کو خدشہ تھا۔ وہ روسی کنیز سلطان سلیمان خان کی نظر میں آگئی اور اس نے رقیہ بیگی کو ہدایت کی کہ اس رات اس کی خلوت میں اسی کنیز کو بھیجا جائے۔

خلوت کی وہ رات اس روسی کنیز کی زندگی میں انقلاب لے آئی۔ سلطان سلیمان خان نے اس کے لیے "خرم" کا نام تجویز کیا۔ دوسرے دن رقیہ بیگی کو حکم سلطانی ملا کہ خرم کو اب تمام کنیزوں کے ساتھ رکھنے کے بجائے اس کے لیے ایک آراستہ پیراستہ، پُرآسائش کمرا مخصوص کیا جائے۔ ملکہ گل بہار کے کلیجے میں آگ لگ گئی لیکن وہ دل مسوس کر رہ جانے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ کسی میں بھی اتنی مجال نہیں تھی کہ سلطان کے سامنے اف بھی کرسکے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خرم کی اہمیت بڑھتی ہی چلی گئی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ ملکہ گل بہار کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی کنیز، سلطان کی خلوت میں جاتی رہتی تھی لیکن پھر یہ ہوا کہ جب بھی سلطان امور سلطنت سے تھک جاتا تو صرف خرم ہی کو اپنی خلوت میں طلب کرتا۔

اب ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد خرم نہ صرف کئی شہزادوں اور ایک شہزادی کی ماں بن چکی تھی بلکہ مسلمان ہونے کے بعد سلطان کی منکوحہ بھی تھی جبکہ گل بہار اب بھی غیر منکوحہ ہی تھی۔ قصر شاہی میں اس کی اہمیت کا سبب صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ ولی عہد سلطنت شہزادہ مصطفیٰ کی ماں تھی۔

اس سارے عرصے میں ملکہ گل بہار اور ملکہ خرم سلطان کے تعلقات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے تھے۔ سلطنت کے وزیراعظم ابراہیم پاشا کو بھی ملکہ خرم سلطان سخت ناپسند کرتی تھی جبکہ سلطان سلیمان خان کے بعد وہ سلطنت کا سب سے مقتدر شخص تھا۔ سلطان سلیمان خان کی شہزادگی کے وقت وہ اس کا مصاحب خاص بھی تھا اور سلطان سلیمان کی ایک ہمشیرہ سے اس کی شادی بھی ہوچکی تھی۔

شہزادی مہر ماہ کو یہ اندازہ تو تھا کہ ملکہ گل بہار اور اس کی والدہ کے تعلقات میں کشیدگی کیوں تھی لیکن یہ اس کے علم میں نہیں تھا کہ ابراہیم پاشا سے اس کی والدہ کے شدید اختلافات کیوں تھے۔ لیکن اس وقت مہر ماہ بستر پر کروٹیں لیتی ہوئی ان سب باتوں کے بجائے صرف اس خط کی وجہ سے پریشان تھی جو شہزادہ بایزید اس لیے لے گیا تھا کہ سلطان سلیمان کو دکھاسکے۔ اپنی اس الجھن سے وہ اس وقت نکلی جب اس نے کمرے کے باہر دوڑتے بھاگتے ہوئے

قدموں کی آوازیں سنیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور اس نے اپنی کنیز خاص فروزاں کو پکارا جو متصل کمرے میں موجود تھی۔ وہ دوڑی ہوئی آئی۔

"یہ بھاگ دوڑ، یہ شور کیسا ہے معلوم کرو۔" شہزادی مہر ماہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

فروزاں نے مؤدبانہ انداز میں سرخم کیا اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

مہر ماہ اب بستر سے اتر چکی تھی۔ وہ ٹہلنے لگی۔ فروزاں جلد ہی واپس لوٹی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"غضب ہوگیا شہزادی حضور!" وہ بولی۔ "کسی نے شہزادہ بایزید کو خنجر مارا ہے۔"

"کیا!" مہر ماہ چیخ سی پڑی۔

☆☆☆

شہزادہ بایزید اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات تھے۔ بائیں بازو پہ کپڑے کی ایک دھجی بھی نہیں تھی۔ اس کا لباس اس طرح پھاڑا گیا تھا کہ بازو، شانے تک برہنہ ہوگیا تھا۔ بازو پر مونڈھے کے قریب تانت اتنی کس کر باندھی گئی تھی کہ شاید ذرا اور زور سے باندھی جاتی تو کھال پھاڑ کر گوشت میں پیوست ہوسکتی تھی۔

ایک خون آلود خنجر قریب ہی ایک طشت میں پڑا تھا جو یقیناً شہزادے کے بازو سے نکالا گیا تھا۔ اس زخم پر کسی دوا کا لیپ لگانے کے بعد طبیب بازو پر پٹی باندھ رہا تھا۔

چند شاہی طبیب جو باب ہمایوں کے بہت قریب رہتے تھے، یہ طبیب انہی میں سے ایک تھا۔

کمرے میں اس وقت سلطان سلیمان خان کے علاوہ ملکہ خرم سلطان، شہزادہ سلیم اور مہر ماہ سلطان بھی موجود تھے۔

"تمہارے چہرے پر اب تکلیف کے تاثرات کیوں ہیں میرے بہادر بیٹے!" سلطان سلیمان خان نے کہا۔ "تمہارے زخم پر دوا کا لیپ کیا جاچکا ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں آرام ملنا چاہیے۔"

شہزادہ بایزید سے پہلے طبیب بول پڑا۔ "میرے آقا!...... اس لیپ ہی کی وجہ سے کچھ دیر تکلیف رہے گی، پھر آہستہ آہستہ ختم ہوجائے گی۔"

"تم نے رئیس الاطبا کو کیوں بلوایا ہے؟"

ملکہ خرم سلطان اس وقت بستر پر شہزادہ بایزید کے سرہانے جابیٹھی تھی اور محبت سے شہزادے کے بکھرے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"تم نے بازو پر تانت کیوں باندھی ہے؟ اور پھر اتنی زور سے؟"

اس سے پہلے کہ سلطان سلیمان کو اپنے سوال کا جواب ملتا، رئیس الاطبا تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ شاہی خاندان کے سامنے وہ احتراماً جھکا پھر طبیب کی طرف متوجہ ہوا۔ طبیب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے رئیس الاطبا کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ دونوں کشادہ کمرے کے ایک سرے پر چلے گئے جہاں سے ان کی آواز وہاں موجود کسی شخص کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

طبیب کے اس رازدارانہ انداز کے باعث خانوادۂ شاہی کے تمام افراد کے چہروں پر تشویش کے تاثرات میں اضافہ ہوا۔ طبیب دھیرے دھیرے کچھ بتارہا تھا اور رئیس الاطبا اثبات میں سر ہلا رہا تھا پھر وہ واپس سب کے قریب آئے۔

"شاہِ معظم!" رئیس الاطبا نے سلطان سلیمان سے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ آپ کے علاوہ باقی سب لوگ باہر چلے جائیں، کچھ دیر کے لیے۔"

"میں اس وقت اپنے بیٹے کے پاس سے پل بھر کے لیے بھی نہیں ہٹوں گی۔" خرم سلطان بول پڑی۔ اس کا لہجہ بڑا مستحکم تھا۔

سلطان سلیمان کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے شہزادہ سلیم اور مہر ماہ سلطان سے کہا۔ "تم دونوں باہر جاؤ۔"

وہ دونوں مؤدبانہ جھکے اور پھر کمرے سے نکل آئے۔ وہاں ان دونوں کے علاوہ ان کے دو دو محافظین کے ساتھ سلطان سلیمان اور خرم سلطان کے محافظ بھی موجود تھے۔ ان کے ساتھ مہر ماہ کی خصوصی کنیز اور وہ دونوں کنیزیں بھی موجود تھیں جو ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتی تھیں۔

مہر ماہ سلطان، شہزادہ سلیم کو ان لوگوں سے کچھ دور ہٹا لے گئی اور پریشان لہجے میں بولی۔ "میں بعد میں آئی تھی یہاں۔ آپ غالباً یہاں پہلے پہنچے ہوں گے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ کیسے ہوا؟"

"ہاں۔" شہزادہ سلیم نے جواب دیا۔ "بایزید اس وقت اپنے محافظوں کے ساتھ پہلے اور دوسرے دیوان خانے کے درمیان سے گزر کر حرم سلطانی کی طرف بڑھ رہا تھا جب اوپری منزل کی راہداری سے اس پر خنجر پھینکا گیا۔ بایزید نے اپنی طرف آتے ہوئے خنجر کی چمک دیکھی تو تیزی سے خود کو بچانے کے لیے ایک طرف جھکا۔ خنجر سامنے کی

جانب سے پھینکا گیا تھا۔ یقیناً نشانہ تو بایزید کے سینے ہی کا لیا گیا ہوگا لیکن اس کے ایک طرف جھک جانے کی وجہ سے وہ خنجر اس کے بازو میں لگا۔ خنجر پھینکنے والا محل ہی کا ایک حبشی خواجہ سرا تھا۔ بایزید کے محافظ فوراً جھپٹے تاکہ اوپر کی راہداری میں موجود خنجر پھینکنے والے کو پکڑیں لیکن اسی وقت کسی جانب سے آنے والا تیر اس حبشی خواجہ سرا کی گردن میں پیوست ہوگیا۔ وہ تڑپ کر اسی وقت مرگیا۔''

''یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے سلیم بھائی!'' مہرماہ نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''محل میں یہ اس قسم کی پہلی واردات ہے۔''

اسی وقت ان دونوں نے وزیرِ سلطنت ابراہیم پاشا کو تیزی سے قریب آتے دیکھا۔ اس کے چہرے سے بھی پریشانی ہویدا تھی۔ وہ قریب آتے ہی ادب سے جھکنے کے بعد بولا۔ ''میں اس حادثے کی اطلاع ملتے ہی آرہا ہوں۔''

وہ شام کا وقت تھا جب وزیرِ سلطنت ابراہیم پاشا کو قصرِ سلطان میں کوئی کام نہیں ہوتا تھا تو وہ اپنے محل میں چلا جاتا تھا جو کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

☆☆☆

شہزادہ بایزید کی خواب گاہ میں رئیس الاطبا کے اشارے پر طبیب نے کسی عرق کے دو چمچے شہزادے کو پلائے۔ اس عرق کے گلے سے اترتے ہی شہزادے کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے میرے بیٹے کو؟'' خرم سلطان جلدی سے بولی۔

''گھبرائیے نہیں ملکہ!'' رئیس الاطبا نے کہا۔ ''یہ عرق انتہائی سریع الاثر ہے۔ یوں سمجھیے کہ شہزادہ والا تبار نصف شب کے بعد خود ہی جاگ جائیں گے۔ اس طرح انہیں اتنی دیر تک تکلیف کا احساس نہیں ہوگا۔''

''لیکن خنجر کا زخم اتنا تکلیف دہ تو نہیں ہوسکتا رئیس!'' سلطان سلیمان خان نے کہا۔ ''میرا بہادر بیٹا اتنی تکلیف آسانی سے برداشت کرسکتا ہے۔''

''تکلیف زخم کی نہیں ہے شاہِ معظم!'' رئیس الاطبا نے جواب دیا۔ ''بس ذرا سا توقف فرمائیں۔ پھر میں آپ کو ایک اہم بات بتاؤں گا۔''

''اہم؟'' سلطان سلیمان خان چونکا۔ یہی کیفیت خرم سلطان کی بھی ہوئی تھی۔

''گستاخی معاف!...... میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ذرا سا توقف فرمائیں۔''

''یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سلطان سلیمان کی نظر شہزادہ بایزید کے بازو پر بندھی پٹی پر تھی۔ ''اگر اس میں زخم کا خون جذب ہو رہا ہے تو یہ سبزی مائل سیاہ کیوں ہے؟''

''یہی بات میرے لیے اطمینان بخش ہے شاہِ معظم!'' رئیس الاطبا نے کہا۔ ''اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے پٹی کھلوا کر دوسرا لیپ لگوانا پڑتا۔''

سلطان سلیمان کا منہ کھلا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، کوئی خیال اس کے ذہن میں آیا تھا لیکن وہ خرم سلطان کی طرف دیکھ کر چپ رہ گیا۔ خرم سلطان اس وقت آبدیدہ تھی۔ سلطان سلیمان آہستہ آہستہ چلتا ہوا خرم سلطان کے قریب پہنچا اور پشت سے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر نہایت نرم لہجے میں بولا۔ ''خرم! جب رئیس الاطبا خود یہاں موجود ہیں تو فکرمند ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ ہمارا بیٹا بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔''

''انشاء اللہ۔'' رئیس الاطبا اور طبیب کے منہ سے بیک وقت نکلا پھر رئیس الاطبا نے طبیب سے کہا۔ ''اب پٹی کھولو۔''

طبیب پٹی کھولنے لگا۔ رئیس الاطبا کی نظر اس پر جمی رہی۔ وہ ترک مملکت کا سب سے اچھا طبیب سمجھا جاتا تھا اور اسی لیے سلطان سلیمان خان نے اسے رئیس الاطبا کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ وہ نہ صرف طبیبوں کا سربراہ تھا بلکہ تمام شفاخانے اور دوائیں بنانے والے ادارے اسی کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ وہ شاہی خانوادے کے علاوہ کسی بھی مریض کو دیکھنے نہیں جاتا تھا۔

پٹی اتارنے کے بعد جب طبیب نے زخم صاف کیا تو رئیس الاطبا اس پر جھک کر غور سے دیکھنے لگا پھر اس کے ہونٹوں پر نہایت اطمینان بخش مسکراہٹ نظر آئی۔ اس نے طبیب سے کہا کہ اب وہ شہزادے کے شانے پر بندھی ہوئی تانت کھول دے پھر وہ سلطان سلیمان خان سے بولا۔ ''شاہِ معظم! اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ زخم کے گرد ہلکی سی سرخی تو ہے لیکن سیاہی مائل سبزی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ لیپ نے سارا زہر کھینچ لیا ہے۔''

''زہر؟'' خرم سلطان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''میں سمجھ گیا تھا رئیس!'' سلطان سلیمان نے کہا۔ ''پٹی کا رنگ سیاہی مائل سبز ہو رہا تھا جس سے مجھے اس کا شبہ ہوا۔ تم نے بھی اس رنگت کو اپنے لیے اطمینان بخش کہا تھا۔ میرے شبہے کو تقویت اس سے ملی کہ شہزادے کے شانے پر تانت بڑی مضبوطی سے باندھی گئی تھی تاکہ زہریلا خون جسم میں نہ پھیل سکے۔''

''آپ کی ذہانت سے انکار ممکن ہی نہیں شاہِ معظم!'' رئیس الاطبا نے کہا۔ ''بے شک آپ کا خیال درست تھا۔ غالباً آپ کو یہ علم بھی ہوگا کہ تانت ایک خاص انداز سے ایک خاص جگہ پر باندھنے سے ہی دورانِ خون رک سکتا ہے اور یہ طریقہ اطبا ہی جانتے ہیں۔ ہر شخص تانت اس طرح نہیں باندھ سکتا کہ دورانِ خون رک جائے۔''

''میرے بیٹے کو اس طرح ہلاک کرنے کی کوشش کون کرسکتا ہے؟'' خرم سلطان کی آواز میں لرزش تھی۔

''تحقیق کرنا پڑے گی۔'' سلطان سلیمان نے کہا۔

اسی دوران میں طبیب نے کسی محلول سے زخم صاف کرنے کے بعد اس پر زردی مائل لیپ کیا اور لیپ کرنے کے بعد پٹی باندھنے لگا۔ رئیس الاطبا غور سے وہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

''شہزادے بہت جلد بالکل ٹھیک ہوجائیں گے ملکہ!'' رئیس الاطبا نے خرم سلطان کی حالت غیر دیکھتے ہوئے اسی سے کہا۔ ''اب یہ خطرے سے بالکل باہر ہیں۔''

اب خرم سلطان کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نظر آئی۔

رئیس الاطبا نے سلطان سلیمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو مضبوط اعصاب کے مالک ہیں شاہِ معظم! میں نے باقی لوگوں سے باہر جانے کے لیے یوں کہا تھا کہ اگر پہلا لیپ کارگر ہوتا نظر نہ آتا تو مجھے عجلت کے ساتھ کوئی دوسرا قدم اٹھانا پڑتا۔ پٹی کھول کر وہ لیپ بھی ہٹانا ہوتا۔ زخم دیکھ کر شہزادہ والا تبار اور شہزادی صاحبہ پر نہ جانے کیا گزرتی۔''

''باہر وہ دونوں بہت بے چین ہوں گے۔''

''اب وہ اندر آجائیں تو کوئی حرج نہیں، تاہم وہ زیادہ نہ رکیں۔ انہیں آرام سے سوتے دیا جائے۔'' رئیس الاطبا کا اشارہ شہزادہ بایزید کی طرف تھا پھر اس نے طبیب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ تو اس وقت تک رکیں گے جب تک شہزادے جاگ نہ جائیں۔ اس وقت پٹی ایک بار پھر تبدیل کی جائے گی۔ اس کے بعد زخم مندمل ہوجانے تک مزید کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔''

سلطان سلیمان نے سر ہلایا اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے ساتھ غصے کے تاثرات بھی تھے۔ وہ کمرے سے نکلا تو اس کا سامنا ان سب لوگوں سے ہوگیا جو وہاں موجود تھے۔ ابراہیم پاشا، شہزادہ سلیم اور شہزادی مہرماہ سلطان اسے دیکھ کر احتراماً خم ہوئے۔

''اب تم دونوں اندر جاسکتے ہو۔'' سلطان نے شہزادہ سلیم اور مہرماہ سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ایک طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ ابراہیم!''

''جیسا حکم آقا!'' ابراہیم پاشا پھر خم ہوا۔

☆☆☆

قصرِ شاہی کے زیادہ تر افراد سلطان سلیمان کو آقا ہی کہتے تھے کیونکہ اکثریت کنیزوں اور غلاموں ہی کی تھی۔ ابراہیم پاشا وزیرِ سلطنت کے عہدے تک پہنچ گیا تھا اور سلطان کی ہمشیرہ سے اس کی شادی بھی ہوچکی تھی لیکن غلام ہونے کے باعث سلطان سلیمان کو آقا ہی کہنے پر مجبور تھا۔ سلطان سلیمان کے پیچھے جاتے ہوئے اس کے چہرے سے نہایت پریشانی ظاہر ہورہی تھی کیونکہ قصرِ شاہی میں گزشتہ رات سے اب تک دو نہایت غیر معمولی واقعات ہوچکے تھے۔

جہاں سے حرم سرا کی حدود شروع ہوتی تھیں، وہاں حبشی خواجہ سرا پہرے پر رہتے تھے۔ انہیں نہ صرف آختہ کیا گیا تھا بلکہ ان کی زبانیں بھی کاٹ دی گئی تھیں تاکہ اگر وہ حرم سرا میں کچھ دیکھ بھی لیں تو اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاسکیں۔

انہی میں سے ایک غلام نے کچھ دن قبل ایک کنیز سے بدتمیزی کی تھی جس کی پاداش میں اس کو پچاس دن کے لیے زندان میں ڈال دیا گیا تھا۔ گزشتہ رات وہ زندان سے اس طرح غائب ہوا تھا کہ وہاں پہرا دینے والے دو سپاہی مردہ پائے گئے تھے۔ تلوار سے ان دونوں کی گردنیں اڑادی گئی تھیں۔

فوری طور پر اس معاملے کی تحقیقات کے لیے بابِ سرِعسکری کے آغا کیہان کو طلب کیا گیا تھا۔ طلب کرنے والا ابراہیم پاشا تھا۔

بابِ سرِعسکری، ترک سپاہ کا صدر دفتر تھا مگر آغا کیہان، سپاہ میں شامل نہیں تھا۔ اسے اور اس کے ماتحتوں کو صرف دفتری ذمے داریاں سونپی گئی تھیں یا اگر کسی قسم کی تحقیقات کروانا ہوتی تھیں تو وہ معاملہ اس کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اسے غیر معمولی معاملات کی تحقیقات کا خاص تجربہ تھا۔ اسے جس ملک سے لایا گیا تھا وہاں اسے اس کی تربیت دی گئی تھی۔

آغا کیہان نے نصف رات کے قریب ابراہیم پاشا کو اپنی تحقیقات سے آگاہ کردیا تھا اور ابراہیم پاشا نے وہ سب باتیں سلطان سلیمان کے گوش گزار کردی تھیں۔ آغا کیہان کی تحقیق اور تجزیے کے مطابق حبشی خواجہ سرا کو آزاد کرانے والا کوئی ایسا شخص ہوسکتا تھا جو قصرِ شاہی کی ہی مقتدر ہستی ہو۔ اس خیال کا سبب یہ تھا کہ زنداں کے محافظوں کی لاشیں اس طرح پائی گئی تھیں کہ انہوں نے نہ تو اپنے خنجر نکالے تھے اور نہ تلواریں بے نیام کی تھیں۔ اگر وہ کسی اجنبی یا قصر کے کسی عام آدمی کو زنداں کے قریب آتے دیکھتے تو چوکنا ہوجاتے۔ تلواریں بے نیام نہ کرتے تو کم از کم خنجر ہی نکال لیتے اور کسی کو زنداں کے قریب نہ آنے دیتے لیکن ہوا اس کے برعکس تھا۔ لہٰذا اس شخص نے ان کے قریب پہنچ کر بڑی تیزی سے ان کی گردنیں اڑادی تھیں۔ پھر ان میں سے ایک کے پاس سے زنداں کے قفل کی چابی نکالی اور حبشی خواجہ سرا کو آزاد کرالے گیا تھا۔

یہ نتیجہ اخذ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ محل کی وہ مقتدر ہستی کون ہوسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہی ممکن تھا کہ اس کا تعلق شاہی خانوادے سے ہوگا یا وہ قصرِ شاہی کے ہی ایک حصے میں قائم چند محکمے کے وزرا یا ان کے خاص ماتحت ہوسکتے تھے۔

کیونکہ خصوصی طور پر اس معاملے کی تحقیقات کے لیے آغا کیہان کو اختیارات بھی مکمل دیے گئے تھے اس لیے اس نے محل میں قائم محکموں کے وزرا اور ان کے معتمد افراد سے بھی پوچھ گچھ کی تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی مشتبہ قرار نہیں دیا تھا۔ آغا کیہان کا خیال تھا کہ اگر وہ انہی میں سے کوئی ہے تو نہایت عیار ہے جس نے پوچھ گچھ کے دوران میں کوئی ایسی بات اپنی زبان پر نہیں آنے دی تھی کہ اس پر شبہ کیا جاسکے۔ آغا کیہان نے کہا تھا کہ وہ بابِ سرِعسکری میں کام کرنے والے اپنے کچھ معتمد اور ہوشیار افراد سے ان لوگوں کی نگرانی کروائے گا، تبھی حقیقت سامنے آنے کا امکان ہے۔

ایک سوال یہ بھی تھا کہ حبشی خواجہ سرا آزاد ہونے کے بعد محل سے بھی فرار ہوا ہوگا یا نہیں؟ لیکن اب یہ ثابت ہوچکا تھا کہ وہ حبشی خواجہ سرا محل ہی میں رکا تھا۔ اسی نے شہزادہ بایزید کو زہریلے خنجر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی...... پھر محل ہی میں موجود کسی شخص نے اسے تیر مار کر ہلاک کردیا تھا۔ اسے ہلاک کرنے والا یقیناً وہی شخص ہوگا جس نے اسے آزاد کرایا تھا اور آزاد اسی لیے کرایا تھا کہ اس سے شہزادہ بایزید کو ختم کرواسکے۔ اسی نے رات سے اب تک اس غلام کو چھپا کر رکھا تھا۔ غلام کو یہ بھی یقین دلایا ہوگا کہ یہ سنگین واردات کرنے کے باوجود اس کی گرفتاری نہیں ہوسکے گی جس کے بعد اسے محل سے فرار کرادیا جائے گا۔

''وہ غلام......'' سلطان سلیمان اپنے کمرائے خاص میں ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''یقیناً کسی اہم شخصیت کا آلۂ کار بنا ہے۔ کسی معمولی ہستی کی بات پر وہ ہرگز یقین نہیں کرتا کہ اسے اتنی سنگین ترین واردات کے بعد محل سے فرار کرادیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس سے اکرام و انعام کے وعدے بھی کیے گئے ہوں گے۔''

''آپ بالکل درست فرمارہے ہیں آقا!'' آغا کیہان بولا۔

اس وقت ابراہیم پاشا تو وہاں موجود تھا ہی مگر آغا کیہان کے علاوہ محل کے داروغہ آغائے اوّل طوبور کو بھی طلب کیا گیا تھا۔ محل کے تمام امور آغائے اوّل طوبور اور اس کے ماتحت آغاؤں پر عائد ہوتی تھی۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا کیونکہ اسے معتوب ہونے کا خدشہ یقیناً ہوگا۔ واقعہ بہت سنگین تھا۔ شہزادہ بایزید کو قتل کرنے کی کوشش کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

آغا کیہان نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ ''غلام کو محل سے فرار کرانے اور انعامات سے نوازنے کے وعدے کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسے ہر صورت میں ختم کیے جانے کی تیاری بھی مکمل ہوگی۔ وہ گرفتار ہوجاتا تو گونگا ہونے کے باوجود اس شخصیت کی نشاندہی کرسکتا تھا جس نے اسے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔''

''اور اسے ہلاک کرنے والا اس وقت بھی قصرِ شاہی میں آزاد ہے۔'' سلطان سلیمان نے تشویش کا اظہار کیا پھر بولا۔ ''آغا طوبور!''

''آقا!'' آغا طوبور نے سرخم کیا۔

''تمہیں اور تمہارے ساتھ کام کرنے والوں کو اب بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔''

''جی میرے آقا!'' آغا طوبور نے مزید سر جھکایا۔

اس نے اطمینان کی سانس یقیناً لی ہوگی لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ اس کے غیاب میں کیا بات ہوچکی تھی۔ آغا کیہان نے سلطان سلیمان سے کہا تھا کہ وہ جن لوگوں کی نگرانی کروانا چاہتا ہے، ان میں آغا طوبور کا نام بھی شامل ہے۔

''تمہیں مکمل اختیارات دیے جاچکے ہیں۔'' سلطان سلیمان نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اب تم دونوں جاسکتے ہو۔ تم ابھی رکو گے ابراہیم!''

ابراہیم پاشا مؤدبانہ انداز میں جھکا۔

آغا کیہان اور آغا طوبور کے جانے کے بعد سلطان سلیمان نے ابراہیم پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ اس غلام نے کسی کنیز سے بدتمیزی کی تھی اور تم ہی نے اسے زنداں میں ڈلوایا تھا۔''

''معمولی سی بات تھی آقا!'' ابراہیم پاشا نے کہا۔ ''اس قسم کے چھوٹے موٹے واقعات سے باخبر کرکے میں آپ کا دماغ بوجھل نہیں کرتا ہوں۔ امورِ سلطنت کا بہت بوجھ ہے آپ پر!''

''لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک آختہ خواجہ سرا کسی کنیز سے بدتمیزی کرے۔''

''جی۔'' ابراہیم پاشا نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''مجھے بھی اس پر تعجب ہوا تھا۔ میں نے زنداں میں غلام کو برہنہ کروایا تھا۔ وہ...... وہ میرا مطلب ہے اسے آختہ نہیں کیا گیا تھا۔''

''کیا!'' سلطان سلیمان چونکا۔

''جی آقا!'' ابراہیم پاشا کا سر جھکا رہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں آقا! مجھے یہ خیال ذرا دیر سے آیا۔ میں آپ کے حکم کے مطابق فرانس کے سفیروں کے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ میں آج شام ہی اس کے آختہ نہ ہونے کی تصدیق کرسکا۔''

''اس کا ذمے دار کون ہے؟'' سلطان سلیمان نے بگڑ کر پوچھا۔

''شاہی جراح سفیان۔'' ابراہیم پاشا نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے فوراً طلب کیا تھا لیکن وہ اس وقت اپنے گھر پر نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے کسی عزیز سے ملنے کندر چلا گیا ہے جہاں سے جلد ہی لوٹ آئے گا۔'' ابراہیم پاشا گھبرایا ہوا سا بولتا ہی چلا گیا۔ ''مجھے شبہ ہوا کہ شاید اسے غلام اور کنیز کے معاملے کا علم ہوگیا ہے اس لیے وہ ڈر کر فرار ہوگیا ہے۔ میں نے اسے گرفتار کرنے کے لیے سپاہی بھیج دیے ہیں۔ اگر وہ کندر میں نہ ملا تو بھی اس کی تلاش جاری رہے گی۔ ہمارے سپاہی اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''ہوں۔'' سلطان سلیمان ٹہلتا ہوا ایک طرف گیا پھر پلٹ کر بولا۔ ''کیا ان حالات میں تمہیں دوسرے غلاموں کے سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا؟''

''اگر میں آپ کی بات کو صحیح طور پر سمجھا ہوں تو میرا جواب یہ ہے کہ محل کے تمام خواجہ سراؤں کا معائنہ کروایا جاچکا ہے۔ وہ سب آختہ کیے جاچکے ہیں۔''

اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک دے کر ان سپاہیوں میں سے ایک اندر آیا جو سلطان سلیمان کے محافظ تھے۔

''آقا!'' وہ بولا۔ ''ملکہ خرم سلطان باریابی کی اجازت چاہتی ہیں۔''

''کہہ دو کہ میرے کمرائے خاص میں انتظار کیا جائے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

محافظ کے جانے کے بعد سلطان سلیمان، ابراہیم پاشا کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

☆☆☆

خرم سلطان، شہزادہ بایزید کے کمرے سے جا چکی تھی جب ملکہ گل بہار اور ولی عہد سلطنت شہزادہ مصطفیٰ کمرے میں پہنچے۔ انہیں سانحے کی اطلاع خاصی تاخیر سے اس لیے ملی تھی کہ شہزادہ مصطفیٰ ایک کتب خانے کا افتتاح کرنے گیا ہوا تھا اور افتتاح کرنے کے بعد خاصی دیر تک کتابوں کا جائزہ لیتا رہا تھا اور ملکہ گل بہار امرائے سلطنت کی بیگمات کی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ دونوں بہ یک وقت ہی محل لوٹے تھے اور انہیں اس سانحے کی اطلاع ملی تھی۔

اب وہ نہایت پریشان لہجے میں شہزادہ سلیم سے اس سانحے کی تفصیلات معلوم کرنے کے بعد اس پر تبصرے کر رہے تھے۔ مہر ماہ سلطان اس دوران میں خاموش بیٹھی رہی تھی۔ اس کا دماغ بہ دستور اس خط میں الجھا ہوا تھا جو شہزادہ بایزید کے ہاتھ لگا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کس نے لکھا تھا۔

بایزید کے ہوش میں آنے کے ذرا دیر بعد ہی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی کیونکہ ملکہ گل بہار، شہزادہ شہریار اور شہزادہ مصطفیٰ سے باتیں کرنے کے دوران میں بایزید نے اس سے بے اعتنائی برتی تھی جس کا اسے دکھ ہوا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ بایزید ہی کو چاہتی تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ بستر پر لیٹی تو اس کی کنیز خاص فروزاں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے لیے کھانا چنا جائے؟''

''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''نصف شب گزر چکی شہزادی حضور!''

''کیا تم کچھ کم سننے لگی ہو؟'' مہر ماہ سلطان نے بگڑ کر کہا۔ ''میں نے کہا نا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔''

فروزاں مؤدبانہ انداز میں جھکی اور چلی گئی۔

بھوک ہی نہیں، مہر ماہ کی آنکھوں سے نیند بھی اڑی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر اس کے دماغ میں یہ پریشان کن سوال اٹھ رہا تھا کہ اس کے والدین پر اس خط کا کیا ردعمل ہوگا۔

ہوگا کچھ، اس نے جھنجلا کر سوچا اور اس مسئلے سے دھیان ہٹانے کے لیے مہری خاتون کی شاعری پڑھنے لگی جو اسے بہت پسند تھی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ مہری خاتون کا اصل نام بھی مہر ماہ تھا۔ اس کی وفات مہر ماہ سلطان کی پیدائش سے بیس پچیس سال پہلے، سولھویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہوئی تھی۔ پندرھویں صدی میں اس کی شاعری نے بڑی دھوم مچائی تھی۔

متعدد رومانی قصے اس سے منسوب کیے جاتے تھے اور اس کی شاعری بھی عشقیہ تھی۔ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی تھی جس کا سبب شاید کوئی ناکام عشق ہو۔ اس نے اپنی شاعری میں اپنی نسوانیت کو دبانے کی کوشش نہیں کی تھی اور اپنے جذبات کا بلاجھجک اظہار کیا تھا۔ اس نے اپنے عہد کے صف اول کے شعرا میں جگہ بنائی تھی۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ وہ سلطان سلیمان کے دادا کی حکمرانی کے زمانے میں شہزادہ احمد کے ادبی حلقے میں شامل تھی جو اماسیہ کا والی تھا۔

مہر ماہ سلطان کا خیال تھا کہ اس کی شخصیت پر مہری خاتون کے کلام کا خاصا اثر پڑا تھا۔ وہ بے باک اور خودسر ہو گئی تھی۔ سلطان سلیمان کیونکہ اپنی اس بیٹی کو بہت چاہتا تھا اس لیے عموماً اس کی خودسری کو بھی نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔

مہر ماہ سلطان کو صرف شاعری ہی نہیں، فنون لطیفہ کے ہر شعبے سے کم یا زیادہ دلچسپی بہرحال تھی۔ سلطنت کے امور سے اس نے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا تھا۔ اس نے یہ یاد رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ اس کے باپ نے یورپ پر لشکر کشی کا آغاز کب کیا تھا، یا ہنگری، بوڈا، ویانا اور دیگر مغربی ممالک کب فتح کیے تھے۔

امور مملکت سے اس کی عدم دلچسپی کا سبب یہ احساس بھی ہو سکتا تھا کہ اسے زمام حکومت کبھی نہیں سنبھالنا تھا۔ وہ شہزادہ نہیں، ایک شہزادی تھی جسے کسی نہ کسی دن بیاہ کر کسی ایسے شخص کی رفیقۂ زندگی بننا تھا جس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون کسی شاہی خاندان کا نہیں ہوتا۔

یہ اس کے خاندان کا رواج یا قانون تھا کہ شہزادیوں کی شادی امرائے دربار یا امرائے دربار کے کسی بیٹے سے ہوتی تھی تاکہ ان کے خاندان میں کسی دوسرے شاہی خاندان کا خون شامل نہ ہو۔

مہر ماہ سلطان نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی شادی کب ہوگی اور کس سے ہوگی۔ اس کی خواہش صرف اتنی تھی کہ جس سے بھی اس کی شادی ہو، وہ فنون لطیفہ سے اگر بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت دلچسپی ضرور رکھتا ہو۔

اسی قسم کے احساسات کے باعث ایک مرتبہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ کسی سے اپنی تصویر بنوائے۔ اس کے علم میں تھا کہ کئی مصور قسطنطنیہ ہی میں تھے۔ مگر وہ یہودی یا عیسائی تھے۔

عثمانی ترکوں میں تصویر کشی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے عہد میں شاید ہی کسی مسلمان نے مصور بننا چاہا ہو۔

مہر ماہ سلطان نے چھان بین کروائی تو اسے معلوم ہوا کہ ان دنوں وہاں کارل نام کے ایک مصور کی بہت دھوم تھی۔ وہ اتنی حسین تصویریں بناتا تھا کہ لوگ اش اش کر اٹھتے تھے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد مہر ماہ سلطان کے لیے مشکل یہ تھی کہ اپنی تصویر بنوانے کے لیے کارل کو کہاں بلائے۔ محل میں بلوانا تو اسے کسی طور بھی ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ یہ کام اسے چھپ کر ہی کرنا پڑے گا لیکن یہ بھی ایک مسئلہ تھا کہ اس کام کے لیے چھپنے کی جگہ کہاں ہو۔

کوئی ویران جگہ! مہر ماہ سلطان کے دماغ میں خیال آیا تھا اور پھر اس نے ایک ایسی جگہ تلاش کر بھی لی تھی۔ وہ بحیرۂ فارس کے کنارے چناروں کے ایک درخت کا جھنڈ تھا جس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ وہاں تصویر بنوانا خاصا کٹھن تو تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ مہر ماہ سلطان کے لیے وہاں آنا جانا کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ وہ کشتی رانی اور گھڑسواری خوب جانتی تھی۔ امور سلطنت سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود اس نے بچپن میں جب شہزادہ مصطفیٰ کو فنون حرب سیکھتے دیکھا تھا تو اسے بھی وہ سب سیکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ باپ کی لاڈلی بیٹی ہونے کے باعث یہ ممکن بھی ہو گیا۔ اس نے گھڑسواری، شمشیرزنی اور تیراندازی سیکھی تھی۔ گھڑسواری میں وہ کم عمری ہی میں طاق ہو گئی تھی لیکن شمشیرزنی اور تیراندازی میں اسے ابھی زیادہ ملکہ حاصل نہیں ہوا تھا۔

ایک مرتبہ وہ فروزاں کے ساتھ بحیرۂ فارس کے ساحل پر اس ویرانے میں گئی تھی۔ دو محافظ بھی ان کے ساتھ رہے تھے لیکن مہر ماہ نے ان کی پروا نہیں کی تھی۔ اسے تو کسی خاص مقام کی تلاش تھی۔ محافظ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔

جگہ کا انتخاب کر لینے کے بعد اس نے فروزاں ہی کو کارل کے پاس بھیجا تھا۔ فروزاں نے کارل سے ملتے وقت اسے نہیں بتایا تھا کہ وہ دراصل کون تھی۔ صرف یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ امراء کے خاندان کی ایک لڑکی کی کنیز ہے اور اس کی مالکہ چونکہ مسلمان ہے اس لیے چھپ کر تصویر بنوانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے کارل کو ''فلاں جگہ'' آنا ہوگا۔ کارل ایک ویرانے میں جانے کے خیال سے پریشان تو ہوا تھا لیکن جب فروزاں نے اسے اشرفیوں کی ایک بھاری تھیلی دی تھی تو وہ اس کام کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

مہر ماہ سلطان کو گھڑسواری کا شوق جنون کی حد تک تھا اور چونکہ وہ کم عمری ہی میں اس کی مشاق بھی ہو گئی تھی اس لیے سلطان سلیمان اس پر اعتراض بھی نہیں کرتا تھا کہ وہ دن کا ایک پہر محل سے باہر گھڑسواری میں گزار دے۔ مصوری کے لیے جس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ جگہ فروزاں ہی نے کارل کو دکھائی تھی چنانچہ وہ اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ مقررہ دن اور مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔ مہر ماہ سلطان نے جب پہلی مرتبہ کارل کو دیکھا تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق کارل کو پختہ عمر کا شخص ہونا چاہیے تھا لیکن اس کی عمر چھبیس ستائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس عمر میں اس کا سارے قسطنطنیہ میں شہرت پا جانا حیرت انگیز تھا۔

مہر ماہ سلطان اس وقت اپنا نصف چہرہ نقاب میں چھپائے ہوئے تھی۔ اگرچہ نقاب حریری تھا اور اس کی آنکھوں کے نیچے کے نقوش بس جھلملا رہے تھے لیکن وہ اسے اس عالم میں دیکھ کر بھی مبہوت رہ گیا تھا۔ تصویر کشی کا انتظام کارل نے پہلے ہی مکمل کر لیا تھا چنانچہ جب مہر ماہ سلطان نے تصویر بنوانے کے لیے چہرے سے نقاب ہٹائی تو کارل بالکل ہی دم بخود رہ گیا۔

''کام شروع کرو مصور!'' مہر ماہ سلطان نے کہا تھا۔

اس وقت کارل چونکا اور جب وہ بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''آپ کی کنیز نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اپنی تصویر میں اپنے آپ کو خود سے زیادہ حسین دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''بے شک۔'' مہر ماہ سلطان نے کہا تھا۔ ''یہی خواہش ہے میری!''

''شاید یہ مجھ سے ممکن نہ ہو۔''

''کیوں؟''

اس سوال کا جواب دینا کارل کے لیے ممکن نہیں تھا۔

مہر ماہ سلطان مسکرا دی۔ اسے اندازہ تھا کہ کارل جواب دینے سے قاصر کیوں ہے۔ ''میری خواہش کی پروا نہ کرو۔'' مہر ماہ سلطان نے کہا۔ ''تصویر جیسی بھی ہو، تم اپنا کام شروع کرو۔''

اصرار کے باعث کارل کو اپنا کام شروع کرنا پڑا۔

اگر کارل پختہ عمر کا آدمی ہوتا تو بھی مہر ماہ سلطان اس ویران مقام پر اس سے تصویر بنواتے ہوئے خوف زدہ نہ ہوتی۔ خنجر اس کی کمر سے ہر وقت بندھا رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کے باوجود خطرہ ہوتا تو وہ اپنے محافظوں کو پکار سکتی تھی جو اس سے بہت زیادہ دور نہیں تھے۔ محافظ اسے بس دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ مقام چناروں کے جھنڈ کے پار قدرے نشیب میں تھا۔

''میں وہاں بیٹھ کر شاعری کرتی ہوں شاہ بابا۔'' مہر ماہ سلطان نے ایک مرتبہ اپنے باپ سے کہا تھا۔ ''سناٹے

میں شعر کہنا آسان ہوتا ہے۔''

دراصل سلطان سلیمان نے ایک مرتبہ اس کے محافظوں سے پوچھ لیا تھا کہ وہ آخر کہاں جایا کرتی ہے کہ دوسرے پہر سے زیادہ وقت گزر جاتا ہے۔ محافظوں کو جواب دینا پڑا تھا۔

سلطان سلیمان نے دو ایک مرتبہ اس کی شاعری دیکھی بھی تھی اور ٹوٹے پھوٹے اشعار پڑھ کے مسکرا کر رہ گیا تھا۔ وہ خود ایک اچھا شاعر تھا اور اس کا تخلص ''محبّی'' تھا۔

مہر ماہ سلطان کی تصویر پندرہ دن قبل مکمل ہو چکی تھی۔ کارل اسے مہر ماہ سے زیادہ خوب صورت تو نہیں بنا سکا تھا لیکن پس منظر میں چاندنی رات دکھا کر اس نے تصویر ابھار ضرور دی تھی۔

مہر ماہ نے وہ تصویر چھپا کر رکھ دی تھی۔ کارل سے اس نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کارل خود بھی ایک خوب صورت نوجوان تھا لیکن ایسا بہرحال نہ ہو سکا کہ مہر ماہ کے دل میں اس کے لیے کوئی مخصوص گنجائش پیدا ہو جاتی۔ عشق محبت جیسے جذبوں کے بارے میں اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں تو یہ بات بھی کبھی نہیں آسکی تھی کہ اس کا باپ سلطان سلیمان اس کی والدہ خرم سلطان کا ایسا کیوں گرویدہ ہو گیا تھا کہ اب اس کی نظر میں کوئی دوسری عورت جچتی ہی نہیں تھی۔

لیکن اب وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ایسا کوئی جذبہ اس کے لیے کسی کے دل میں پیدا ہو چکا تھا اور اسی نے وہ ... خط اسے لکھ مارا تھا۔ اس خط کی عبارت میں ایک بات عجیب تھی۔ نہ تو اس میں کسی کو مخاطب کیا گیا تھا اور نہ یہ بات ظاہر ہونے دی گئی تھی کہ خط لکھنے والا کون تھا۔ اس معاملے میں مہر ماہ کا خیال کارل کی طرف بالکل نہیں گیا تھا۔ اس طرف دھیان جانے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ کارل پر یہ بات ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے جس کی تصویر بنائی تھی، اس کا باپ سلطنتِ ترکیہ کا فرماں رواں تھا اور وہ اس سلطنت کی شہزادی تھی۔

خط کسی گھڑسوار نے محل کے صدر دروازے پر ایک محافظ کے حوالے کرتے ہوئے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ شہزادی مہر ماہ سلطان کے لیے ہے۔ محافظ نے وہ خط آغا طوبور کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اس کے ذریعے سے شہزادی تک پہنچ جائے۔ صدر دروازے کے محافظ یا آغا طوبور یہ ہمت کر ہی نہیں سکتے تھے کہ خط کھول کر دیکھ لیتے۔ خط آغا طوبور کے ذریعے شہزادی تک پہنچ جاتا لیکن شہزادہ بایزید نے محافظ کو وہ خط آغا طوبور کے حوالے کرتے ہوئے دیکھا تو اسے نہ جانے کیوں تجسس ہوا کہ اس نے وہ خط آغا طوبور سے لے لیا۔ آغا سے اس نے کہا تھا کہ وہ خود یہ خط اپنی بہن کو پہنچا دے گا۔

خط مہر ماہ سلطان تک پہنچا بھی لیکن اس سے پہلے وہ شہزادہ بایزید نے پڑھ لیا تھا اور اسے شدید غصہ آ گیا تھا۔

☆☆☆

سلطان سلیمان نے دوسرے دن دوپہر کو اپنے کمرائے خاص میں خرم سلطان کو ایک خط دیا۔

''کیا ہے سلیمان؟'' خرم سلطان نے پوچھا۔

''پڑھ لو!''

خرم سلطان اگرچہ روسی نژاد تھی لیکن قصرِ شاہی میں ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باعث وہ فارسی اور ترک زبان اچھی طرح سیکھ چکی تھی۔ اس نے خط اس کے خول سے نکالتے اور سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس وقت بھی پریشان نظر آ رہے ہیں، بایزید تو اس کا سبب نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی اس کے کمرے سے آ رہی ہوں۔ وہ اب ٹھیک ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ تھوڑی دیر قبل آپ بھی اسے دیکھنے گئے تھے۔''

''ہاں۔'' سلطان سلیمان نے کہا۔ ''یہ خط مجھے اسی نے دیا ہے۔''

خرم سلطان اس مختصر دورانیے میں خط کھول چکی تھی۔ تحریر کا پہلا جملہ پڑھتے ہی اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑ گئی۔ لکھا تھا۔ ''میرے دل کی حکمراں......! میرا دل آپ کے جلوۂ حشر ساماں کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ چشمِ مضطر، تشنۂ دید ہے۔ دن ویران، راتیں پریشان ہیں۔ وارداتِ قلب کی خونابہ فشانی، قلم کی نوک سے یوں بہہ نکلنا چاہتی ہے کہ قلزمِ درد، تاحد کنار پھیل جائے لیکن محبت متقاضی ہے کہ یوں آپ کو نہ تڑپاؤں۔ بس یہ چاہتا ہوں کہ چشمِ حسرت، آشنائے دید ہو جائے۔''

خط کے آخر میں کسی کا نام نہیں تھا، جیسے لکھنے والا جانتا ہو کہ اسے اپنا نام لکھنے کی ضرورت نہیں، پڑھنے والا جان لے گا کہ وہ کون ہے۔

''یہ...... بایزید کے پاس!'' خرم سلطان حیرت سے بولی۔ ''یہ تو کسی لڑکی کو لکھا گیا ہے۔''

''مگر وہ لڑکی کہتی ہے کہ وہ خط لکھنے والے کو نہیں جانتی۔''

''لڑکی کون ہے؟''

''مہر ماہ۔''

''کیا!'' خرم سلطان حیرت زدہ رہ گئی۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی استفسار کرتی، سلطان سلیمان نے خود ہی وہ تفصیل دہرا دی جس کا علم اسے بایزید سے ہوا تھا۔

خرم سلطان نے حیرت سے سب کچھ سنا۔ سلطان سلیمان کے خاموش ہونے پر وہ کچھ سوچتی ہوئی متفکر لہجے میں بولی۔ ''کیا آپ کو مہر ماہ کے بیان پر یقین نہیں؟ کیا آپ بھی وہی سمجھ رہے ہیں جو بایزید نے سمجھا ہے؟''

''یقین یا عدم یقین، تحقیقات کے بعد ہی ممکن ہے۔''

''آپ نے مہر ماہ سے تو ابھی بات نہیں کی ہوگی؟''

''درست اندازہ ہے تمہارا۔ بہتر ہوگا کہ اس معاملے میں تم ہی اس سے بات کرو۔''

''ابھی جا کے کرتی ہوں۔ میں یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ بایزید پر ہونے والے حملے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟''

''ابھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بس یہ اندازہ تم بھی لگا سکتی ہو کہ اس کی منصوبہ بندی، اس گونگے خواجہ سرا کو زنداں سے چھڑانے سے پہلے کی گئی ہوگی۔ اس کا آختہ نہ ہونا تعجب خیز ہے۔ جراح سفیان کے ہاتھ لگنے تک یہ معما بھی حل نہیں ہو سکتا اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگا تو شاید مردہ ہی ہاتھ لگے۔ جس نے بھی بایزید کو ختم کرنا چاہا تھا، وہ سفیان کو بھی زندہ تو نہیں رہنے دے گا۔''

''آپ کو کسی پر شبہ ہے؟''

''سوچ سوچ کر میرا دماغ پتھرانے لگا ہے۔ محل میں تو کوئی ایسا نہیں جو بایزید کی جان کا دشمن ہو سکے۔ محل سے باہر ہی کا کوئی شخص ہو سکتا ہے۔''

''باہر کا کوئی فرد کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ زنداں کے محافظ آسانی سے اس کے ہاتھوں قتل ہو جائیں اور وہ حبشی خواجہ سرا کو زنداں سے نکال لے جائے؟''

''اس سوال پر بھی دماغ پتھرانے لگتا ہے اور اس سوال پر بھی کہ اس خواجہ سرا کو تیر کا نشانہ بنانے والا محل ہی میں ہے، آخر وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''وہی مقتدر ہستی، بایزید کی زندگی ختم کرنا چاہ سکتی ہے۔''

''مگر کون...... کون؟'' سلطان سلیمان مضطرب ہوا۔

''آلِ عثمان کا قدیم قانون۔'' خرم سلطان نے نظر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

سلطان سلیمان نے چونک کر خرم سلطان کی طرف دیکھا۔ آلِ عثمان میں یہی دستور رہا تھا کہ بادشاہ اپنے بھائیوں کو قتل کروا دیا کرتا تھا تاکہ بغاوت کے خدشات ختم ہو جائیں۔

''نہیں خرم!'' سلطان سلیمان نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''برادر کشی کی یہ پرانی بربری رسم اب نہیں رہی اور اگر تم سمجھتی ہو کہ اس رسم کا خیال اب بھی کسی کے دماغ میں آ سکتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ تمہارا اشارہ مصطفیٰ ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔ میرا بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میں نے اسی کو اپنا ولی عہد نامزد کیا ہے۔ اگر تمہارا اشارہ اسی کی طرف ہے تو مجھے حیرت ہوگی۔ تم جانتی ہو کہ مصطفیٰ بہت ٹھنڈے مزاج کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتا ہے۔''

حقیقتاً خرم سلطان، مصطفیٰ ہی کی طرف اشارہ کرنا چاہتی تھی لیکن سلطان کے لہجے کی سختی کے باعث اس نے بات بنائی۔ ''میرا اشارہ بایزید کے سب بھائیوں کی طرف ہے سلیمان!...... کون، کب تک زندہ رہے گا، یہ فیصلہ صرف قدرت کا ہوتا ہے۔ خدانخواستہ اگر مصطفیٰ کو کچھ ہو گیا تو اس کے بعد آپ اپنا ولی عہد سلیم ہی کو بنائیں گے۔ مصطفیٰ کے بعد سلیم ہی آپ کا بڑا بیٹا ہے۔''

''یعنی بایزید کے معاملے میں سلیم کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے؟'' سلطان سلیمان نے تیزی سے کہا۔

''حقیقتاً تو میں کسی کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہنا چاہتی۔'' خرم سلطان جذباتی انداز میں سلطان کے سینے سے لگ گئی۔ ''یہ سب کچھ سوچتے ہوئے، آپ کی طرح میرا دماغ بھی پتھرانے لگا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔''

''اتنی پریشان نہ ہو تم!'' سلطان سلیمان نے محبت سے اس کا شانہ تھپکا۔ ''ایسی الجھنیں تم صرف میرے لیے چھوڑ دیا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ معلوم کر لوں گا کہ کس معاملے کی کیا حقیقت ہے۔ تم جا کر اس خط کے بارے میں مہر ماہ سے بات کرو۔ شاید بھائی کے سامنے اس کی زبان نہ کھل سکی ہو لیکن تم سے وہ حقیقت نہیں چھپائے گی۔''

خرم سلطان، سلطان سلیمان کے سینے سے الگ ہوئی تو آب دیدہ تھی لیکن جیسے ہی اس کے دو آنسو ڈھلکے، سلطان سلیمان نے انہیں اپنے دونوں ہاتھوں کی دو انگلیوں پر لے لیا۔

''یہ بہت قیمتی موتی ہیں خرم!'' سلطان سلیمان نے کہا۔ ''جذباتی نہ ہو۔ جا کے مہر ماہ سے بات کرو۔ تم جانتی ہو کہ میں محبت کا پجاری ہوں۔ وہ مہر ماہ کے شایانِ شان ہوا تو ان دونوں کی شادی کرنے میں مجھے ذرا بھی ہچکچاہٹ

نہیں ہوگی۔"

خرم سلطان متوحشانہ جھجکی، پھر الٹے قدموں چلتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ سلطان سلیمان کے چہرے سے پھر فکرمندی ظاہر ہونے لگی۔ وہ خرم سلطان کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا۔

☆☆☆

مہرماہ سلطان نے جو کچھ شہزادہ بایزید سے کہا تھا، وہی جواب اس نے خرم سلطان کو بھی دیا۔

"میں قسم کھاتی ہوں والدہ!" اس نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم، خط کس نے لکھا اور میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتی ہوں کہ مجھے کسی سے محبت نہیں۔"

"تو پھر اس گستاخی کرنے والے کو سخت سزا دی جائے گی۔" خرم سلطان نے کہا۔ "تمہارے شاہ بابا سے بچ نہیں سکے گا وہ! جلد ہی اس کا پتا لگا لیا جائے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ حرکت کیوں کی گئی ہے؟ کون اس سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟"

"مجھے گل بہار پر شبہ ہے۔"

"ان پر؟" مہرماہ چونکی۔ "کیوں والدہ؟ وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

"دکھاوا کرتی ہے وہ! منافق عورت ہے۔ تمہارے شاہ بابا اپنی اولادوں میں تمہیں زیادہ چاہتے ہیں جبکہ اس کی خواہش ہے کہ سب سے زیادہ اس کے بیٹے کو چاہا جائے۔ وہ تمہیں اپنے شاہ بابا کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرسکتی ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو بہت غلط ہے۔ انہیں تو اپنی اس خوشی پر قناعت کرنا چاہیے کہ ان کا بیٹا ترک سلطنت کا ولی عہد ہے۔"

"مجھے تو یہ شبہ بھی ہے کہ بایزید کو ختم کرنے کے لیے بھی اسی نے مصطفیٰ کو بہکایا ہوگا۔ محل میں مصطفیٰ ایسی ہی اہم شخصیت ہے کہ زنداں کے محافظ اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرسکتے۔ اسی لیے وہ انہیں قتل کرکے اس حبشی خواجہ سرا کو آزاد کرسکتا ہے، اسی سے بایزید پر حملہ کروا سکتا ہے اور وہی اس خواجہ سرا کی گردن میں تیر پیوست کرسکتا ہے۔ تیراندازی میں اسے بلا کی مہارت ہے۔"

"آپ نے مجھے بہت حیران کردیا والدہ! مصطفیٰ بھائی تو ہم سب بھائی بہن سے محبت کرتے ہیں۔"

"ہاں وہ دل کا اتنا برا نہیں ہے۔" خرم سلطان نے اپنے موقف میں قدرے نرمی لاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ماں کے دباؤ یا بہکاوے میں تو آسکتا ہے۔ گل بہار اس کے دل میں یہ اندیشے پیدا کرسکتی ہے کہ اس کے بھائی تخت حاصل کرنے کے لیے بغاوت کرسکتے ہیں۔ اس سلطنت میں یہ ہوتا ہی رہا ہے کہ سربراہ بننے والوں نے اپنے بھائیوں کو اسی خدشے کے تحت ہلاک کیا۔"

"شاہ بابا نے تو یہ رسم ختم کردی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں کسی سے کہتے سنا تھا۔ وہ نہیں چاہتے کہ اب ان کے خاندان میں یہ بربریت جاری رہے۔"

"اس کے باوجود مصطفیٰ کے دماغ میں یہ خیال بٹھایا جاسکتا ہے۔"

"پھر تو سلیم بھائی کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"اندیشہ تو ہے اس کا۔ اسے میں نے سمجھا دیا ہے کہ وہ کل تک خود کو اپنے کمرے تک محدود رکھے اور بایزید تو زخمی ہونے کے باعث ابھی دو ایک دن تو اپنے کمرے میں رہے گا ہی۔"

"کل تک کیا فرق پڑ جائے گا والدہ؟"

"مصطفیٰ کو کل میگنیشیا بھیجا جارہا ہے۔ تمہارے شاہ بابا نے اسے وہاں کا والی مقرر کیا ہے۔ دستور کے مطابق گل بہار کو بھی اس کے ساتھ جانا ہوگا۔"

مہرماہ مسکرائی۔ "پھر تو اب محل پر آپ ہی کی حکومت ہوگی۔"

"والدہ سلطان کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں۔"

مہرماہ فوراً بولی۔ "رات کو وہ نہیں آئیں بایزید بھائی کو دیکھنے؟"

"کسی نے تمہیں بتایا نہیں؟ کل صبح سے ان کی طبیعت ناساز ہے۔ طبیب نے انہیں دو دن تک مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ بایزید کی خبر ان تک بہرحال پہنچ گئی تھی۔ وہ پریشان ہوگئی تھیں۔ تمہیں ان کی مزاج پرسی کو جانا چاہیے تھا۔"

"اب آپ سے معلوم ہوا ہے تو جاؤں گی۔ مجھے یہ خیال بھی ابھی آیا ہے کہ خورو سلطان پھوپی بھی بایزید بھائی کو دیکھنے نہیں آئیں۔"

مہرماہ اور اس کے بھائی، ابراہیم پاشا کی بیوی کو ہی خورو سلطان پھوپی کہا کرتے تھے۔

خرم سلطان نے مہرماہ کو بتایا۔ "وہ کل دوپہر سے یہاں نہیں ہے۔ اپنی بڑی بہن سے ملنے گئی ہوئی ہے۔"

"خانم سلطان پھوپی تو یہاں سے ایسی گئیں کہ پھر نہیں آئیں۔"

"خانم سلطان" اور "خورو سلطان" سلیمان کے عطا

کردہ خطابات تھے جو اس نے اپنی بہنوں کو دیے تھے۔

"اپنے شوہر کے قتل ہونے کی وجہ سے وہ بہت دل برداشتہ ہوگئی تھی۔" خرم سلطان نے جواب دیا۔

مہرماہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میں اس وقت چھوٹی تھی لیکن وہ لرزہ خیز واقعہ مجھے یاد ہے۔ شاہ بابا نے نہ جانے کس دل سے ان کے قتل کا حکم صادر کیا ہوگا۔"

"ایک مرتبہ تو انہوں نے فرہاد پاشا کو معاف بھی کیا تھا لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز ہی نہیں آیا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ تم اپنی دادی کی مزاج پرسی کے لیے چلی جانا۔"

"جی!"

لیکن خرم سلطان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک مہرماہ کے تصور میں فرہاد پاشا اور خانم سلطان کے چہرے متحرک رہے۔ وہ ان کے بارے میں سوچتی رہی۔

فرہاد پاشا ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس کا وطن "ڈالمیشیا" کے کسی ساحلی علاقے کی بستی تھی۔ وہ سلاف نژاد سلطان سلیمان کے وزرا میں سے ایک تھا۔ اس نے شام کی بغاوت ناکام بنائی تھی اور باغیوں کے سربراہ کا سر کاٹ کر سلطان کو بھیج دیا تھا۔ بلغراد اور دیگر کئی جنگوں میں وہ بڑی بے جگری سے لڑا تھا۔ اس کی انہی خدمات سے خوش ہوکر سلطان نے اپنی بہن خانم سلطان سے اس کی شادی کردی تھی اور اسے ایک ریاست کا والی بنا کر دربار سے بھیج دیا گیا تھا۔

جنگوں میں اس کی بہادری کا سبب اس کی فطری وحشت تھی جو ریاست کا والی بن کر بڑی شدت سے عود کر آئی۔ اسے خون بہا کر بڑی لذت حاصل ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ذاتی دشمنوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے قتل کروانا شروع کردیا۔ والیِ ریاست ہونے کی وجہ سے وہ اس پر قادر تھا۔ اس کی بدقسمتی سے اس کے ان اقدامات کی خبر سلطان سلیمان تک پہنچ گئی۔ اس نے فرہاد پاشا کو فوراً پایۂ تخت واپس بلوایا۔ اس کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت موجود تھے۔

سلطان سلیمان، عثمانی سلطنت کا نہایت منصف فرماں روا تھا۔ وہ اپنی سلطنت کے طول و عرض میں ہر قیمت پر قانون کا نفوذ چاہتا تھا۔ خواہ اس کی زد پر اس کی کوئی قریب ترین ہستی ہی کیوں نہ آجائے۔ وہ اسی وقت فرہاد پاشا کو سخت ترین سزا کا مستحق قرار دے دیتا لیکن حرم سرا کی طاقت اس کے آڑے آگئی۔ والدہ سلطان اور ابراہیم پاشا کی بیوی خورو سلطان، فرہاد پاشا کی حمایت میں ڈٹ گئی تھیں لیکن سلطان سلیمان پر اس سے زیادہ اثر شاید اپنی بہن خانم سلطان کے آنسوؤں کا پڑا ہو۔ پہلی مرتبہ اور غالباً آخری مرتبہ اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ اس نے فرہاد پاشا کو تنبیہ کرکے پایۂ تخت سے رخصت کردیا۔ اس مرتبہ اسے دریائے ڈینیوب کے کنارے ایک سرحدی ضلع کا حاکم بنایا گیا تھا۔

فرہاد پاشا اس کے بعد بھی اپنی فطری وحشت کے سامنے بے بس ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی طاقت کا غلط استعمال پھر شروع کردیا۔ اس نے بس یہ کوشش کی تھی کہ اس مرتبہ اس کی بیوی خانم سلطان کو اس کے ان وحشیانہ اقدامات کا علم نہ ہونے پائے لیکن وہ شاید بھول گیا تھا کہ سلطان سلیمان سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ اسے ایک مرتبہ پھر پایۂ تخت طلب کیا گیا اور اس مرتبہ سلطان نے بڑی عجلت کی۔ اس سے پہلے کہ حرم سرا کی طاقت حرکت میں آتی یا اسے خانم سلطان کی اشک بار آنکھیں دیکھنا پڑتیں، اس کے حکم سے جلادوں نے کمان کی تانت سے فرہاد پاشا کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کردیا تھا۔

خانم سلطان روتی دھوتی، اپنے بچوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوگئی۔ والدہ سلطان اور خورو سلطان کے علاوہ خود سلطان سلیمان نے اسے سمجھانے کے لیے اپنے سینے سے لگانا چاہا تھا لیکن وہ نہیں مانی۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں آئی تھی اور اپنے یتیم بچوں کے ساتھ ڈینیوب کے ساحل پر بنے ہوئے اسی محل میں رہ رہی تھی جو فرہاد پاشا نے بنوایا تھا۔ اس کے اخراجات کے لیے اس جاگیر کی آمدنی کافی تھی جو اسے جہیز میں والدہ سلطان سے ملی تھی۔ جو کچھ اسے سلطان سلیمان کی طرف سے ملا تھا، وہ اس نے واپس کردیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن شہزادہ مصطفیٰ اور ملکہ گل بہار میگنیشیا چلے گئے۔

اس وقت تک نہ تو یہ بات معلوم ہوسکی تھی کہ مہرماہ کو خط بھیجنے والا کون تھا اور نہ بایزید کے قتل کی ناکام سازش بے نقاب ہوئی تھی۔ محل اور محل سرا کی زندگی کے معمولات میں بھی بہ ظاہر کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسی شام خرم سلطان نے خفیہ طور پر رستم پاشا سے ملاقات کا بندوبست کیا۔

رستم پاشا سلطنت کی کوئی بہت اہم شخصیت تو نہیں تھا لیکن اسے غیر اہم بھی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ دربار تک اس کی رسائی بھی تھی۔ اس کے بعض اہم کاموں سے خوش ہوکر سلطان سلیمان نے اسے پاشا کے خطاب سے نوازا تھا۔

امورِ سلطنت سے متعلق کچھ کام بھی اسے سونپ دیے گئے تھے لیکن وہ کچھ زیادہ اہم نہیں تھے۔ ''پاشا'' کا خطاب ملنے کے سلسلے میں وہ خرم سلطان کا احسان مند بھی تھا اور تبھی سے اس کا بندۂ بے دام بھی بن گیا تھا۔

''میں ابھی مطمئن نہیں ہوسکتی رستم پاشا!'' خرم سلطان نے خفیہ ملاقات میں اس سے کہا۔ ''میری حریف اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں سے جا چکی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ محل میں اس کے دو ایک خاص افراد ضرور ہوں گے اور ابراہیم پاشا تو ہے ہی اس کا طرف دار۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو۔ محل کی ایک کنیز رخسارہ پر تو مجھے زیادہ ہی شبہ ہے۔ وہ گل بہار کی بہت چہیتی رہی ہے اور اسی لیے مجھے اس پر شبہ ہے۔ گل بہار اپنی چہیتی کنیز کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئی۔ گل بہار ہی نہیں بلکہ مصطفیٰ بھی اس پر فریفتہ ہے۔ تمہیں ان حالات پر کڑی نظر رکھنا ہوگی۔''

''میں ایک کام تو آپ سے پوچھے بغیر کر چکا ہوں ملکہ!'' رستم پاشا نے کہا۔ ''میں نے شہزادہ مصطفیٰ کے عملے میں ایک ایسا آدمی بھی شامل کروا دیا ہے جس پر میں مکمل اعتماد کرسکتا ہوں۔ وہ مجھے وہاں کی ایک ایک بات سے باخبر کرتا رہے گا۔''

''خوب...... بہت خوب رستم پاشا!'' خرم سلطان نے خوش ہوکر کہا۔ ''میں بھی چاہتی تھی کہ گل بہار اور مصطفیٰ کی وہاں کی سرگرمیاں بھی میرے علم میں آتی رہیں۔''

''میں ابراہیم پاشا پر بھی کڑی نظر رکھوں گا ملکہ لیکن آپ نے جس کنیز کا ذکر کیا ہے، اس پر تو وہی نظر رکھ سکتا ہے جس کی محل میں آزادانہ آمدورفت ہو۔ میں تو محل میں اسی وقت جاتا ہوں جب سلطان کسی وجہ سے مجھے طلب فرماتے ہیں۔''

''میں ایک ایسی تدبیر پر عمل کرنے والی ہوں کہ تم ہر وقت محل میں رہ سکو اور مجھے تم سے خفیہ ملاقاتیں نہ کرنا پڑیں۔''

''میں محل میں کیسے رہ سکتا ہوں ملکہ؟''

''جیسے گریتی رہنے لگا ہے۔''

''وہ فرانسیسی جسے ابراہیم پاشا نے محل کا محتسب مقرر کیا ہے؟''

''ہاں۔''

''لیکن میں اس کی طرح کیسے رہ سکتا ہوں ملکہ؟''

''گریتی کو اس منصب سے ہٹا دیا جائے گا۔ اس کی جگہ میں تمہیں مقرر کروانا چاہتی ہوں۔''

رستم پاشا خوش ہوا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوگا ملکہ......! آپ سلطانِ عالی سے یہ تبدیلی کروا بھی سکتی ہیں۔''

''میں تمہیں اس سے بھی بڑے منصب پر دیکھنا چاہتی ہوں رستم پاشا!''

خرم سلطان نے کہا۔ ''بس کسی طرح ابراہیم پاشا کا کانٹا راہ سے نکل جائے۔''

رستم پاشا چونکا۔

''اب تم جاسکتے ہو۔'' خرم سلطان پھر بولی۔

رستم پاشا رخصتی کا حکم ہونے کے بعد کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں کچھ سہانے خواب ضرور اڈنے لگے۔

ذرا دیر بعد خرم سلطان اپنے کمرے میں تھی۔ اس پر اب گہری سنجیدگی طاری تھی۔ گزرے ہوئے وقت نے اسے بہت بدل دیا تھا۔ جب وہ پہلے پہل محل میں لائی گئی تھی تو اسے شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سنجیدگی کسے کہتے ہیں لیکن اب اس میں جو بدلاؤ آیا تھا، اس کا سبب صرف وقت ہی نہیں بلکہ حالات بھی تھے۔

سلطان سلیمان کی منظورِ نظر بننے کے بعد اس نے جلد ہی محسوس کرلیا تھا کہ ملکہ گل بہار ہمہ وقت اس کی شدید ترین مخالفت پر آمادہ رہتی تھی لیکن اس کی وہ کوششیں بارآور نہیں ہوسکی تھیں کہ سلطان سلیمان کو اس سے بدظن کرسکیں۔

پھر اس کا دوسرا احساس یہ تھا کہ وزیرِ سلطنت ابراہیم پاشا کی ہمدردیاں بھی گل بہار کو حاصل تھیں جس کا سبب خرم سلطان کی دانست میں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ گل بہار، سلطنت کے ولی عہد یعنی شہزادہ مصطفیٰ کی ماں تھی۔ وہ مستقبل کے فرماں روا کی ماں سے اپنے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار رکھنا چاہتا تھا۔

سلطان کو اس پر اعتماد بھی بہت ہے، خرم نے بہت پہلے اس بات سوچا تھا جب ضعیف وزیرِاعظم پیری پاشا کے بعد اس کی جگہ ابراہیم پاشا کو دی گئی تھی جبکہ دوسرے کئی اہم منصب دار اور وزرا سمجھ رہے تھے کہ پیری پاشا کے بعد یہ منصب انہی کو ملے گا۔ انہی لوگوں میں ایک شخص سکندر چلیبی بھی تھا جس کی ابراہیم پاشا سے نفرت خرم سلطان نے بھی تاڑ لی تھی اور سوچا تھا کہ مناسب وقت آنے پر سوچے گی کہ سکندر چلیبی کو ابراہیم پاشا کے خلاف کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سکندر چلیبی خزانۂ شاہی کا منتظم تھا۔

شاہی خاندان میں اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے خرم سلطان نے سلطان سلیمان کو اس پر بھی آمادہ کرلیا تھا کہ وہ اسے اپنی غلامی سے آزاد کرکے اسے اپنے نکاح میں لے لے اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی تھی۔

اس کے بعد تو گل بہار کھل کر خرم سلطان کے سامنے آگئی تھی۔

''تم اس طرح بھی میری اہمیت ختم نہیں کرسکتیں خرم!'' گل بہار نے اس سے کہا تھا۔ ''میں بہرحال سلطنت کے ولی عہد کی ماں ہوں۔''

خرم سلطان جواب میں مسکرائی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''نیرنگیٔ حالات کا مطلب جانتی ہو تم......؟ کوئی نہیں جانتا گل بہار کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں کیا سمیٹ کر لائے گا۔ رہی میری آج کی اہمیت ...... تو اس بارے میں تم خوب جانتی ہوگی۔ ترک سلطنت میں چھ پشتوں سے ایسا نہیں ہوا کہ کسی فرماں روائے وقت نے کسی کنیز سے شادی کی ہو اور تم بھی آج تک کنیز ہی ہو۔ سلطان نے تمہیں آزاد نہیں کیا ہے۔''

''ہاں۔'' گل بہار کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''اس کے باوجود...... میری خواہش ہے، تم اس وقت تک زندہ رہو جب میں والدہ سلطان بنوں گی۔''

''اگر تم نے ابھی سے یہ خواب دیکھنا شروع کردیا ہے تو پھر تم سلطان کو قتل کروانے کی سازش بھی کرسکتی ہو لیکن یہ دماغ میں اچھی طرح بٹھا لو کہ میں انہیں جی جان سے چاہتی ہوں۔ میری زندگی میں ان پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔''

خرم کا یہ جواب قطعی غلط نہیں تھا۔ وہ سلطان سے اتنی ہی شدید محبت کرنے لگی تھی کہ اپنے علاوہ کسی کو سلطان کی خلوت میں دیکھنا اس کے لیے ذرا بھی قابلِ برداشت نہیں رہا تھا۔ گل بہار کو تو وہ اپنے حسن کی بدولت سلطان کی خلوت سے دور کرنے میں کامیاب ہو ہی چکی تھی لیکن اگر کبھی سلطان کسی خوب صورت کنیز کو نظر بھر کر دیکھ لیتا تھا تو خرم بڑی ہوشیاری سے اس کنیز کو اپنی کنیزوں میں شامل کرلیتی تھی تاکہ سلطان اس کی موجودگی ہی میں اس کنیز سے مل سکے۔

سلطان بھی اس کے عشق میں ایسا گرفتار ہوا تھا کہ حرم سرا میں ہونے والی اس رقابت سے بے خبر ہی رہا۔ اسے جب امورِ سلطنت سے فرصت ملتی تھی تو وہ اپنا بیشتر وقت خرم سلطان ہی کے ساتھ گزارتا تھا اور اس سے امورِ سلطنت کے بارے میں بھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا جیسے وہ اس کی مشیرِ خاص بھی ہو۔

اسی لیے کنیزوں میں یہ کانا پھوسی ہوتی رہتی تھی کہ خرم نے سلطان پر جادو کردیا ہے۔

ایسی ہی ملاقاتوں میں خرم اشاروں کنایوں میں ایسی باتیں کیا کرتی تھی کہ گل بہار اور شہزادہ مصطفیٰ کو سلطان کی نظروں سے گراسکے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اپنے حصولِ مقصد میں اسے آسانی صرف اس طرح ہوسکتی تھی کہ پہلے ابراہیم پاشا کو اپنے راستے سے ہٹائے چنانچہ اس سلسلے میں بھی اس کا دماغ کام کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ یہ اس کے لیے ایک کٹھن مہم ثابت ہوگی۔ سلطان کو ابراہیم پاشا پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ اسی اعتماد کے باعث اس نے ابراہیم پاشا کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب سونپنے کے کچھ ہی عرصے بعد ترک سپاہ کا سالارِ اعلیٰ بھی مقرر کردیا تھا۔

☆☆☆

شہزادی مہر ماہ سلطان کو اندازہ ہوچکا تھا کہ اس کی ماں کے دماغ میں کیا ہلچل رہتی تھی لیکن وہ خود کو ان باتوں میں ملوث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا بیشتر وقت اپنے شوق پورے کرنے میں صرف ہوتا تھا جس میں شاعری کو اولیت حاصل تھی۔

وہ بستر پر لیٹی مہری خاتون کا کلام پڑھ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ایک بلند آواز سنائی دی۔

''سلطان سلیمان خان تشریف لارہے ہیں۔''

مہر ماہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اسے فوراً خیال آیا تھا کہ کوئی خاص بات نہ ہوگی۔ سلطان سلیمان اس سے ملنا چاہتا تھا تو اسے ہی اپنے کمرے میں بلا لیا کرتا تھا۔

''فروزاں!'' اس نے اپنی کنیزِ خاص کو پکارا۔ وہ اپنے باپ کی مدارات کے لیے اس سے پودینے کا شربت منگوانی جو سلطان سلیمان کو بہت پسند تھا۔

برابر کا کمرا فروزاں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں سے اس کو کوئی جواب ملا نہ وہ خود آئی۔

مہر ماہ اسے دوبارہ پکارتی تو غصے سے پکارتی لیکن اس سے پہلے ہی سلطان سلیمان دروازہ کھول کر اندر آیا۔

مہر ماہ مؤدبانہ انداز میں جھکی۔ ''خوش آمدید شاہ بابا!''

''سلامت رہو۔'' سلطان سلیمان نہایت سنجیدہ چہرے کے ساتھ اس کے قریب آیا۔ مہر ماہ کو باپ کے اس انداز میں الجھن ہوئی۔ عموماً سلطان سلیمان دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگاتا اور اس کی پیشانی چوما کرتا تھا لیکن اس وقت صورتِ حال برعکس تھی۔

''انشاءاللہ، خیریت ہی ہوگی شاہ بابا!'' وہ بولی۔

''یہ تم نے کیوں کہا نورِ چشم؟ کیا خدشہ ابھرا ہے تمہارے ذہن میں؟''

''آپ اس وقت کچھ بدلے ہوئے سے نظر آرہے ہیں۔''

''کچھ سبب ہے اس کا...... میں ایک شخص کو لایا

ہوں۔ تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔'' سلطان سلیمان نے کہا اور پھر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اسے اندر لاؤ۔'' اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

دروازہ کھول کر دو سپاہی ایک شخص کو اندر لائے جو بہت خائف نظر آرہا تھا۔ مہرماہ اسے دیکھ کر چونک گئی۔ وہ مصور کارل تھا جس سے مہرماہ نے اپنی تصویر بنوائی تھی۔

''تمہیں وہ خط اس نے لکھا تھا۔'' سلطان سلیمان نے کہا۔ ''مگر اس نے اعتراف اس طرح کیا ہے کہ اسے کہانیاں لکھنے کا شوق ہے مگر لکھ نہیں پاتا۔ کبھی ایک آدھ صفحہ لکھ دیتا ہے تو اس سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے پھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ کبھی چند سطریں لکھ کر ہی پھاڑ دیتا ہے۔ جو خط تمہارے لیے آیا تھا، اس کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ وہ سطریں بھی اس نے لکھی تھیں اور اس طرح کہانی آگے بڑھانا چاہتا تھا لیکن جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ رک گیا۔ یہ اسے یاد نہیں کہ وہ اس نے پھاڑ دیا تھا یا کہیں ڈال دیا تھا مگر کیونکہ وہ محل پہنچ چکا ہے اس لیے یہ کہتا ہے کہ وہ اس نے کہیں ڈال دیا ہوگا جو کسی کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے وہ تمہیں بھجوادیا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ اس کے کسی دشمن کی حرکت ہے لیکن مجھے اس کا بیان ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی زبان سے سچائی اگلوانے کے لیے اسے زنداں میں ڈلوانا پڑے گا۔''

اس دوران میں مہرماہ، کارل کا چہرہ تکتی رہی تھی۔ اس کا دل اس خیال کے باعث تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ سلطان سلیمان کو اس تصویر کے بارے میں تو معلوم نہیں ہوگیا جو اس نے کارل سے بنوائی تھی؟

''تم اسے دیکھ کر چونکی کیوں تھیں مہرماہ؟'' سلطان سلیمان نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

مہرماہ نے باپ کی طرف دیکھا، کوئی جواب نہیں دے سکی۔ وہ متذبذب تھی کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

''میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' سلطان سلیمان نے کہا پھر سپاہیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لے جاؤ اسے۔ زنداں میں ڈلوادو۔ داروغۂ زنداں سے کہنا کہ اس کے سلسلے میں وہ میرے دوسرے حکم کا انتظار کرے۔''

کارل نے ایک مرتبہ مہرماہ کی طرف اور ایک مرتبہ سلطان سلیمان کی طرف دیکھا پھر سر جھکالیا۔

''میرا بیان غلط نہیں ہے سلطانِ عالی!'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

سلطان سلیمان نے کچھ نہیں کہا۔ دونوں سپاہی اسے بازوؤں سے پکڑے، کمرے سے لے گئے۔ دروازہ بند ہوگیا۔

''میں اس خط کی حقیقت کے علاوہ سب کچھ جان چکا ہوں مہرماہ!'' سلطان سلیمان نے کہا۔

مہرماہ سوچ رہی تھی کہ اگر کارل کا بیان غلط تھا اور اس نے واقعی وہ خط اسے لکھنے کی گستاخی کی تھی تو یقیناً وہ اس سزا کا مستحق تھا جو اسے زنداں میں ملتی۔ اس خیال کے ساتھ مہرماہ تصویر کے معاملے کی وجہ سے پریشان بھی تھی۔

کارل کے جانے کے بعد سلطان سلیمان نے کہا۔ ''میں اس خط کی حقیقت کے علاوہ سب کچھ جان چکا ہوں مہرماہ...... لیکن میں وہ سب کچھ تمہاری زبانی بھی سننا چاہتا ہوں۔ اس سے تو تم انکار کر ہی نہیں سکتیں کہ اسے پہلے سے جانتی ہو، ورنہ اسے دیکھ کر چونکتی نہیں۔''

''جی شاہ بابا!'' مہرماہ نے نظریں جھکالیں۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ باپ سے جھوٹ نہیں بولے گی۔ ''لیکن میں حیران ہوں، میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں کون ہوں۔''

''مجھے ساری بات بتاؤ نورِ چشم!''

''شاہ بابا!'' مہرماہ کی آواز قدرے رندھ گئی۔ ''میں نے آپ کی اجازت کے بغیر اور آپ سے چھپ کر جو کچھ کیا اس پر شرمندہ ہوں اور معافی چاہتی ہوں لیکن میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ یہ شخص مجھے اس قسم کا خط لکھنے کی گستاخی کرے گا۔''

''میں نے ابھی کہا تھا، مجھے ساری بات بتاؤ۔''

''میری خواہش تھی کہ میں اپنی تصویر بنواؤں لیکن مجھے اس کا علم بھی ہے کہ اس قسم کی غیر شرعی باتوں کو آپ سخت ناپسند کرتے ہیں۔''

''کیا میں بار بار کہوں کہ مجھے شروع سے آخر تک سب کچھ بتاؤ۔'' سلطان سلیمان کا لہجہ کچھ درشت ہوگیا۔

مہرماہ نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں بولنے لگی۔ سلطان سلیمان خاموشی سے سنتا رہا۔ مہرماہ نے ایک بات کے علاوہ سب کچھ سچ سچ بیان کردیا۔ خاموش ہونے کے بعد بھی وہ نظریں جھکائے رہی۔ سلطان سلیمان کا ردِعمل وہ اس کے چہرے پر دیکھنے کے بجائے سننا چاہتی تھی۔ وہ نہیں دیکھ سکی کہ سلطان سلیمان کا چہرہ اس وقت بالکل سپاٹ تھا۔ اس کی صرف آنکھیں ظاہر کررہی تھیں کہ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

کچھ خاموشی کے بعد سلطان سلیمان نے کہا۔ ''مجھے تمہارے بیان میں جھوٹ کی ذرا بھی رمق محسوس نہیں ہوئی نورِ چشم! یقیناً تم اس مصور کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی ہو۔

اس نے نہایت گستاخانہ عمل کیا ہے۔ اسے اس کی سخت ترین سزا ملنا چاہیے۔''

سلطان سلیمان کی ان باتوں اور اس کے لہجے سے مہرماہ کو اب وہ بات کہنے کی ہمت ہوئی جو وہ چھپا گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''شاہ بابا! ایک بات بتائیے۔ اگر آپ کی یہ بیٹی کسی سے کوئی وعدہ کرے لیکن اسے ایفا نہ کرسکے...... تو؟''

''یہ بہت برا ہوگا۔ تاریخ میں یہ بات درج نہیں ہونا چاہیے کہ سلطان سلیمان خان کی بیٹی شہزادی مہرماہ سلطان اپنے وعدے سے منحرف ہوجاتی تھی۔''

''لیکن اگر آپ ہی اپنی بیٹی کے ایفائے عہد میں رکاوٹ بن جائیں؟''

''میں ہرگز رکاوٹ نہیں بنوں گا۔'' سلطان سلیمان نے مضبوط لہجے میں کہا پھر بولا۔ ''مگر ان باتوں کا مطلب کیا ہے نورِ چشم! تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔''

''اس کا سبب میں ابھی بیان کرتی ہوں شاہ بابا! یہ تو آپ کو یقین آگیا ہے نا کہ میں اس سے محبت نہیں کرتی؟''

''یقیناً۔'' سلطان سلیمان نے کہا۔ ''میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ تمہارے بیان میں جھوٹ کی رمق بھی نہیں۔''

''تو پھر میں آپ سے درخواست کروں گی کہ اسے کوئی سزا نہ دیں اور اسے آزاد کردیں۔''

سلطان سلیمان نے چونک کر مہرماہ کی طرف دیکھا۔

''جی شاہ بابا!'' مہرماہ نے کہا۔ ''اسی طرح میرا وعدہ ایفا ہوسکے گا۔ جب میری تصویر مکمل ہوگئی تھی اور میں نے دیکھی تھی تو وہ مجھے بے حد پسند آئی تھی۔ میں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اسے کوئی ایسا انعام دوں جس کا وہ تصور بھی نہ کرسکے لیکن اس وقت میرے ذہن میں نہیں آسکا تھا کہ ایسا کیا انعام ہوسکتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس سے بس یہ کہا تھا کہ میرے والد کا تعلق شاہی دربار سے ہے اس لیے کبھی موقع ملنے پر میں اسے شاہی دربار سے ہی کوئی ایسا انعام دلواؤں گی جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکے گا۔ چنانچہ اب میں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتی ہوں۔ اسے آزاد کردیا جائے شاہ بابا!...... یہی ایک بہت بڑا انعام ہوگا جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ آپ کے عتاب سے بچ جائے۔ ایک نئی زندگی مل جائے گی اسے!''

یہ سب کچھ سنتے ہوئے سلطان سلیمان حیرت زدہ نظر آرہا تھا۔

مہرماہ کچھ رک کر بولی۔ ''میرا یہ وعدہ، کیا ایفا نہیں ہوسکتا، شاہ بابا؟''

''میری بیٹی کا وعدہ ضرور پورا ہوگا۔'' سلطان سلیمان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بابا!'' مہرماہ، سلطان سلیمان سے لپٹ گئی۔ ''میرے اچھے شاہ بابا!''

''مجھے وہ تصویر دکھاؤ۔ تمہارا وعدہ تو ہر حال میں پورا ہوگا لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں، کیا واقعی وہ تصویر اتنی اچھی بنی ہے کہ تم نے مصور سے اتنا بڑا وعدہ کرلیا۔''

مہرماہ نے جلدی سے وہ تصویر نکال کر سلطان سلیمان کو دکھائی۔

''واہ!'' تصویر دیکھتے ہی سلطان سلیمان کے منہ سے نکلا۔ ''تصویر واقعی شاندار ہے لیکن میری بیٹی اتنی خوب صورت ہے کہ اس کی تصویر اس سے زیادہ خوب صورت نہیں بنائی جاسکتی۔ بس چاندنی رات کے پس منظر سے جس طرح تصویر کو ابھارا گیا ہے، اس سے مصور کے ذہنِ رسا کی نشان دہی ہوتی ہے۔'' مہرماہ سلطان کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اسے آزاد کردیا جائے گا۔'' سلطان سلیمان نے کہا۔

مہرماہ ایک بار پھر خوش ہوکر باپ کے سینے سے لگ گئی۔

☆☆☆

اسی رات کو خواب گاہ میں سلطان سلیمان اپنی محبوب بیوی خرم سلطان کو بتا رہا تھا۔ ''مجھے بار بار خیال آتا رہا تھا خرم کہ اس خط کے بارے میں ہماری بیٹی جھوٹ نہ بول رہی ہو۔ میں ہر صورت میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے دونوں محافظوں کو طلب کیا۔ وہ مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ کچھ دن پہلے تک مہرماہ گھڑسواری کے لیے جس مقام پر جایا کرتی تھی، وہ مجھے اس مقام تک لے چلیں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کہاں جاتی تھی۔ میں نے خود جا کر اس جگہ کا معائنہ کیا۔ وہاں مجھے بعض جگہ رنگوں کے دھبے نظر آئے۔ اس سے بھی میں کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے فروزاں کو طلب کیا۔ محافظوں ہی سے معلوم ہوا تھا کہ اس وقت فروزاں ہماری بیٹی کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ جب میں نے اس سے سوال کیا تو وہ خوف سے کانپنے لگی۔ چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اس کا!'' سلطان سلیمان مسکرایا۔

خرم بڑی توجہ سے سب کچھ سن رہی تھی۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

سلطان سلیمان نے بات جاری رکھی۔ ''میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ وہ بہرحال ہماری بیٹی کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھی لیکن میرے سامنے جھوٹ بولنا بھی اس کے لیے

ممکن نہیں تھا۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اس کے بعد ہی میں نے کارل کو گرفتار کرایا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ خط لکھنے والا وہی ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ پوچھ گچھ کی ضرورت بھی نہیں پڑی، اس نے خود ہی اعتراف کرلیا کہ وہ تحریر اسی کی ہے لیکن وہ اس بات سے انکار کرتا رہا کہ وہ خط اسی نے ہماری بیٹی کو بھیجا تھا۔'' سلطان سلیمان نے کارل کا موقف بھی بتایا۔ وہ سب واقعات بھی دہرا دیے جو مہر ماہ کے کمرے میں پیش آچکے تھے۔

خرم سلطان اس کے خاموش ہوتے ہی بولی۔ ''تو آپ نے اسے آزاد کردیا؟''

''ہاں، تم اتنی فکرمند کیوں نظر آنے لگیں؟''

''آپ کو کارل کے بیان پر یقین آگیا ہے؟''

''نہیں۔ اس کا یقین تو نہیں ہے لیکن یہ یقین ضرور ہے کہ مہر ماہ کے دل میں اس کے لیے کسی قسم کے جذبات نہیں ہیں۔ کارل کے دل میں ہیں تو ہوا کریں۔ ہماری بیٹی اتنی خوب صورت ہے کہ اس پر کوئی بھی فریفتہ ہو سکتا ہے یا کم از کم یہ خواہش کرسکتا ہے کہ وہ ایک شہزادی کا شوہر بنے لیکن میں نے کارل کے معاملے میں بہرحال یہ سوچا تھا کہ اس سے ہماری بیٹی نے جو وعدہ کیا ہے، وہ پورا ہونا چاہیے۔''

''وہ آئندہ کسی پریشانی کا سبب بنا تو؟''

''تو وہ اپنے ہی حق میں کانٹے بوئے گا۔ اگر اس نے دوبارہ کوئی حرکت کی تو میں مہر ماہ سے کہوں گا کہ وہی کارل کے قتل کا حکم صادر کرے اور مجھے یقین ہے کہ مہر ماہ کو یہ حکم صادر کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا۔''

ان دونوں میں کچھ دیر تک اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں، پھر خرم ہی نے بتدریج باتوں کا رخ موڑا اور گریتی کے بارے میں سوال کر بیٹھی جسے محل کا حاجب مقرر کیا گیا تھا۔

جواب میں سلطان سلیمان نے کہا۔ ''میں یہ حکم صادر کرچکا ہوں کہ گریتی کو اس منصب سے ہٹا کر اس کی جگہ رستم پاشا کو دے دی جائے۔ اب تک میرے اس حکم کی تعمیل کی جاچکی ہوگی۔''

''خوب!'' خرم مسکرائی۔

''تمہارا مشورہ صائب تھا خرم!'' سلطان سلیمان نے کہا۔ ''ہماری سلطنت میں تمام مذاہب کے لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم نہیں رکھا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ گریتی ہمارا وفادار ہی رہتا لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ کسی غیر مسلم کو اتنے اہم منصب پر فائز نہ رکھا جائے۔''

''بالکل اسی طرح سوچا آپ نے جس طرح میں نے سوچا تھا۔''

''تم غلط کب سوچتی ہو۔'' سلطان نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

خرم سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ باتیں کرتے ہوئے میں ایک اور بات بھی سوچتی رہی ہوں۔ غالباً وہ بھی غلط نہیں ہوگی۔''

''کیا سوچ رہی تھیں؟''

''ہماری بیٹی اتنی خوب صورت ہے کہ کارل کے بعد کوئی اور قضیہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔''

''کٹے ہوئے سروں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔''

''اس سے بہتر کیا یہ نہ ہوگا کہ......'' خرم سلطان نے ایک تجویز پیش کی۔

سلطان سلیمان مسکرایا۔ ''اس حد تک سوچ ڈالا تم نے؟''

''میں کارل کے معاملے کو غیر اہم نہیں سمجھ رہی ہوں۔''

''لیکن مہر ماہ کی عمر!''

''اتنی کم تو نہیں...... اور پھر ذہنی اعتبار سے وہ اپنی عمر سے زیادہ بالغ ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' سلطان سلیمان نے سر ہلایا۔

''اس بارے میں والدہ ماجدہ سے بھی مشورہ کرنا ہوگا۔''

''ہاں، وہ تو بے حد ضروری ہے۔''

''اور ہاں......! ایک اہم بات پوچھنا ہے آپ سے، وہ بھولی جارہی تھی۔ بایزید پر حملے کے سلسلے میں آغا کیہان کی تحقیق کچھ آگے بڑھی یا نہیں؟''

''اس معاملے میں وہ بہت بے بس نظر آیا ہے اب تک۔''

''اب اس معاملے کی تحقیق بھی رستم پاشا کو سونپ دیجیے۔''

''ہاں، آدمی تو وہ بہت ذہین ہے۔''

خرم سلطان نے بڑی محبت سے خود کو سلطان سلیمان کے سینے پر بکھیر دیا۔

☆☆☆

بایزید کی مکمل صحت یابی پر محل میں جشن برپا کیا گیا۔

اسی دن سلطان سلیمان نے حضرت ابو ایوب انصاری کی درگاہ پر حاضری دی۔ اس درگاہ سے سلطنت عثمانیہ کا خاص تعلق تھا۔ جب کوئی نیا سلطان بنتا تھا تو اس کی کمر پر شاہی تلوار اسی درگاہ پر باندھی جاتی تھی۔

اسی دن مہر ماہ بایزید کے کمرے میں گئی۔ بایزید

اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ اس خط کے معاملے میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔'' وہ بولا۔ ''والدہ مجھے بتا چکی ہیں۔''

''لیکن آپ نے وہ خط شاہ بابا تک پہنچا دیا تھا۔'' مہر ماہ نے خفگی کا اظہار کیا۔ ''حالانکہ اگر اس معاملے میں حقیقت بھی ہوتی تو آپ کو میرا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔''

''جانتا ہوں۔'' بایزید نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔ ''سلیم بھائی سے بھی زیادہ محبت کرتی ہو تم مجھ سے۔''

''والدہ بھی آپ کو ان سے زیادہ چاہنے لگی ہیں۔''

بایزید نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''لیکن سلیم بھائی اپنا وتیرہ نہیں بدل رہے ہیں۔''

یہ ایسا موضوع تھا جس پر دونوں بہن بھائی زیادہ بات نہیں کرسکتے تھے۔ شہزادہ سلیم نے محل کی کنیزوں میں بہت زیادہ دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ خرم سلطان کی تنبیہہ کے باوجود اس کے طور طریق میں فرق نہیں آرہا تھا۔

مہر ماہ بولی۔ ''اب تک معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ زہر بلے خنجر سے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کس نے کی تھی۔''

بایزید کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات ابھرے تھے۔ اگر اس وقت اس کے دل میں کوئی بات تھی بھی تو وہ اس کی زبان پر نہیں آئی۔

''آپ بہت زیادہ محتاط ہیں۔'' مہر ماہ پھر بولی۔

بایزید مسکرایا۔ ''آؤ اب باہر چلیں۔''

''میں آپ کو بلانے ہی تو آئی تھی۔ یہ جشن آپ ہی کی وجہ سے برپا کیا گیا ہے۔''

وہ دونوں باہر نکلے۔ سازوں کے شوخ سروں سے سارا محل گونج رہا تھا۔ شہزادہ بایزید کے قدم والدہ سلطان کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''پہلے انہی کو سلام کرنے جاؤں گا۔'' بایزید نے کہا۔

''یہ تو ضروری ہے۔'' مہر ماہ نے کہا۔

وہ دونوں والدہ سلطان کے کمرے میں پہنچے۔ اس وقت وہاں ابراہیم پاشا کی بیوی شہزادی خورد سلطان بھی موجود تھی۔

والدہ سلطان نے بایزید کو گلے لگایا اور مہر ماہ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

مہر ماہ بولی۔ ''جشن برپا ہوا ہے تو مجھے خانم سلطان پھوپی بہت یاد آرہی ہیں۔''

والدہ سلطان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں نے اسے پیغام بھیجا تھا مگر وہ نہیں آئی۔''

''میرا تو بہت دل چاہ رہا ہے ان سے ملنے کو۔'' مہر ماہ بولی۔ ''دو سال ہوگئے جب ان سے ملنے گئی تھی۔''

''اس سے پہلے بھی ایک بار گئی تھیں۔''

''جی۔'' مہر ماہ نے کہا۔ ''بہت محبت کرتی ہیں وہ مجھ سے۔''

''میں نہیں کرتی تم سے محبت؟'' خورد سلطان مسکرائی۔

''یہ تو میں نے نہیں کہا خورد سلطان پھوپی!'' مہر ماہ جلدی سے بولی۔ بایزید دھیرے سے ہنس پڑا۔ والدہ سلطان اور شہزادی خورد سلطان بھی مسکرائیں۔

مہر ماہ نے والدہ سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دن خانم سلطان پھوپی کے پاس رہ آؤں؟''

''ابھی نہیں۔'' والدہ سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آج ہی تمہاری والدہ مجھ سے تمہارے بارے میں ایک بات چھیڑ چکی ہیں۔ مجھے غور کرنا ہے اس پر۔ بعد میں بات کریں گے تمہاری اس خواہش کے بارے میں۔''

''میرے بارے میں کیا بات چھیڑی ہے انہوں نے؟'' مہر ماہ قدرے حیرت سے بولی۔

''خرم سے ہی پوچھ لینا۔'' شہزادی خورد سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سا پہلے آجاتیں تو وہ تمہیں یہیں ملتیں۔ ابھی اٹھ کر گئی ہیں کہیں۔''

''شاہ بابا کی طرف گئی ہوں گی؟''

''نہیں۔'' خورد سلطان نے کہا۔ ''برادر معظم تو حضرت ایوب انصاری کی درگاہ پر گئے ہوئے ہیں۔''

''تو پھر آپ ہی بتا دیں نا! کیا بات چھیڑی ہے انہوں نے؟''

والدہ سلطان بولیں۔ ''ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے نور چشم!''

اسی وقت شہزادہ سلیم کمرے میں آیا۔ وہ والدہ سلطان اور شہزادی خورد سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے مؤدب ہوا پھر سب کے قریب آگیا۔ مہر ماہ کھڑی ہوگئی۔

''میں اجازت چاہوں گی۔'' وہ والدہ سلطان کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''اپنی والدہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوگئی ہو۔'' والدہ سلطان مسکرائی۔

مہر ماہ نے کوئی جواب دینے کے بجائے مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔

حقیقتاً وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہوگئی تھی کہ اس

کے معاملے میں ایسی کیا بات چھڑی تھی کہ اسے راز بھی رکھا جا رہا تھا لیکن وہ خرم سلطان کو تلاش کرنے میں ناکام رہی۔

خرم سلطان اس وقت اس راہداری میں تھی جہاں سے صرف قید خانوں کی طرف جایا جاتا تھا۔ وہ محل میں رہنے والوں کے لیے عام گزرگاہ نہیں تھی۔

"ملکہ!" رستم پاشا اسے بتا رہا تھا۔ "کل شام ابراہیم پاشا نے فرانس کے سفیروں سے دوسری ملاقات کی تھی۔ ایک معاہدے کے تحت فرانس کو ترک سلطنت میں تجارت کی اجازت دے دی گئی ہے اور سفیروں نے ابراہیم پاشا کو بے انتہا تحائف پیش کیے ہیں۔ اتنے زیادہ تحائف تو صرف رشوت ہی کے طور پر دیے جاسکتے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم..... ابراہیم پاشا کا لالچ دھیرے دھیرے بڑھتا ہی جا رہا ہے اور یہ بات ہمارے ہی حق میں جائے گی۔"

رستم پاشا نے غور سے خرم سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی سوال کرنے کی ہمت تو نہیں کرسکا لیکن اس وقت خرم سلطان کی یہ بات ضرور اس کے دماغ میں گونجی ہوگی کہ...... میں تمہیں اس سے بھی بڑے منصب پر دیکھنا چاہتی ہوں رستم پاشا! بس کسی طرح ابراہیم پاشا کا کانٹا راہ سے نکل جائے۔

"بایزید کے معاملے میں کچھ ہوا؟" خرم سلطان بولی۔ اس کے علم میں تھا کہ اس کی خواہش کے مطابق سلطان سلیمان نے اس معاملے کی تحقیق کا معاملہ رستم پاشا کے سپرد کردیا تھا۔

"فی الحال، میرا مطلب ہے جب تک شبہے کی تصدیق نہ ہوجائے، وہ بات زبان پر لانا مناسب نہیں ہوگا ملکہ؟"

"شبہ...... کیا شبہ ہوا ہے تمہیں؟"

"مجھے یقین ہے کہ وہ خیال آغا کیہان کے دماغ میں بھی آیا ہوگا لیکن وہ بھی اس کے اظہار کی جرأت نہیں کرسکا ہوگا۔"

"تم یہ جرأت کرو رستم پاشا!" خرم سلطان نے سخت لہجے میں کہا۔

"ابھی کچھ مہلت دیجیے ملکہ!"

"نہیں۔" خرم سلطان کے لہجے کی سختی برقرار رہی۔ "اپنے شبہے کا اظہار تمہیں ابھی کرنا ہوگا۔"

رستم پاشا متذبذب نظر آرہا تھا لیکن آخرکار اس نے زبان کھولی۔ "ملکہ! شہزادہ بایزید کے محافظوں نے بتایا ہے کہ جس وقت حبشی کی گردن میں تیر لگا، اس وقت حبشی کا رخ کس طرف تھا اور اس کی گردن میں وہ تیر کس طرف سے لگا تھا اور تیر کی نوک کس طرف سے گردن کے باہر نکلی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تیر کس جگہ سے چلایا گیا تھا۔"

"کس جگہ سے چلایا گیا تھا؟"

"ایک دریچے سے جو اوپری منزل پر ہی ہے۔"

"اوپری منزل کا کون سا دریچہ؟" خرم سلطان نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ......وہ......" رستم پاشا کی آواز اس کے حلق میں اٹکنے لگی۔

"بتاؤ رستم پاشا!" خرم سلطان نے تیز لہجے میں کہا۔

"ملکہ!" رستم پاشا مردہ سی آواز میں بولا۔ "وہ دریچہ اس راہداری میں ہے جہاں شہزادہ سلیم کی خواب گاہ ہے۔"

فوری طور پر خرم سلطان گنگ سی ہوگئی۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ بھی پھیل گئی تھی۔

"تو......تو......" خرم سلطان رک رک کر بولی۔ "تمہیں یہ شبہ ہے کہ وہ تیر شہزادہ سلیم نے چلایا ہوگا؟"

"کوئی اور بھی وہ دریچہ استعمال کرسکتا ہے ملکہ!" رستم پاشا نے جلدی سے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص شہزادہ سلیم کی خواب گاہ کے دربانوں کی نظر میں نہ آئے۔"

"شاید شہزادہ سلیم اس وقت اپنی خواب گاہ میں نہ ہوں اور اسی وجہ سے دربان کہیں ادھر ادھر ہوگئے ہوں۔"

"لیکن تم نے یہ سب کچھ اتنی ہچکچاہٹ کے ساتھ بتایا ہے جیسے تمہیں شہزادہ سلیم ہی پر شبہ ہو۔"

رستم پاشا کچھ نہیں بولا۔

"معلوم کرو...... معلوم کرو رستم پاشا!" خرم سلطان نے پہلو بدل کر کہا۔ "معلوم کرو کہ اس وقت شہزادہ سلیم اپنے کمرے میں تھا یا نہیں۔"

"جی۔" رستم پاشا کی آواز میں مردنی قائم رہی۔

خرم سلطان چونکی۔ زنداں کی طرف سے کسی کے قدموں کی آہٹ قریب آتی سنائی دی تھی۔

"بس جاؤ!" خرم سلطان نے کہا اور تیزی سے قدم بڑھا کر قریب کی دوسری راہداری میں مڑ گئی...... فی الحال وہ احتیاط کے طور پر رستم پاشا سے اس طرح نہیں ملنا چاہتی تھی کہ کوئی بھی انہیں دیکھے۔

☆☆☆

کئی دن گزر گئے۔ مہر ماہ سلطان یہ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی کہ اس کے بارے میں کیا بات چھیڑی

گئی تھی۔ اس نے خرم سلطان سے پوچھنا چاہا لیکن خرم سلطان بھی ٹال گئی تھی۔ مہر ماہ کو اپنے اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ شہزادہ بایزید کو اچانک "دارالفنونِ حرب" کیوں بھیج دیا گیا تھا جبکہ اسے وہاں اگلے سال جانا تھا۔

پایۂ تخت سے دو دن کی مسافت پر وہ مقام تھا جسے "دارالفنونِ حرب" کا نام دیا گیا تھا۔ ترک سپاہ میں بھرتی کیے جانے والے افراد کو فنونِ حرب سیکھنے کے لیے وہیں بھیجا جاتا تھا۔ وہاں تربیت دینے والے وہ ماہرین تھے جو نمایاں کارنامے انجام دینے کے بعد عمر زیادہ ہوجانے کے باعث جنگوں میں شریک نہیں کیے جاتے تھے۔ یہ ادارہ خود سلطان سلیمان نے قائم کیا تھا اور یہ بات بھی طے کی تھی کہ شہزادگان کو بھی فنونِ حرب سیکھنے کے لیے وہیں بھیجا جایا کرے گا۔

عام سپاہ کے لیے وہاں چھوٹے چھوٹے مکانات تعمیر کیے گئے تھے اور ایک چھوٹا سا محل اس لیے تھا کہ جب کسی شہزادے کو وہاں بھیجا جائے تو وہ اس محل میں رہے۔

مہر ماہ کو یہ بات بھی عجیب لگی تھی کہ شاہی محل کے حاجب کو اچانک تبدیل کردیا گیا تھا۔ گریتی کی جگہ رستم پاشا کو دے دی گئی تھی۔ یہ مہر ماہ کے علم میں پہلے ہی سے تھا کہ گریتی کو مامور کرنے والا ابراہیم پاشا تھا اور چونکہ خرم سلطان اور ابراہیم پاشا کے تعلقات کشیدہ تھے اس لیے مہر ماہ کا خیال تھا کہ یہ تبدیلی خرم سلطان کی وجہ سے ہوئی ہوگی لیکن خرم سلطان نے اس بارے میں کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

مہر ماہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ گھٹن کا شکار ہوتی چلی گئی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ محل کا ہر فرد اپنے معاملات کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور سب ایک دوسرے کے خلاف کوئی نہ کوئی سازش کرتے رہتے تھے۔ محل کی راہداریوں میں سرگوشیاں ہوتی رہتی تھیں۔

شہزادہ مصطفیٰ اور ملکہ گل بہار جب تک میگنیشیا نہیں گئے تھے، ملکہ گل بہار اور ملکہ خرم سلطان میں کھلے عام بھی جھڑپیں ہوجاتی تھیں۔

اس قسم کے سبھی معاملات مہر ماہ کو پسند نہیں تھے۔ شاید اسی لیے وہ یہ خواب اکثر دیکھا کرتی تھی کہ وہ ایک خوب صورت پرندہ بن کر اس محل سے اڑی اور دور ہوتی چلی گئی۔ دو مرتبہ وہ خاصے خاصے دن کے لیے اپنی بڑی پھوپی خانم سلطان کے پاس بھی رہ آئی تھی اور اب پھر اس کا دل چاہتا تھا کہ خانم سلطان کے پاس چلی جائے۔ مگر اسے رکنا اس لیے پڑا تھا کہ اس کے بارے میں کوئی بات چھیڑ دی گئی تھی جس کے بارے میں اسے ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا۔

وہی پراسراریت! مہر ماہ نے کھسیا کر کئی مرتبہ سوچا تھا۔

پھر جب وہ بات اس کے سامنے آئی تو وہ اور زیادہ کھسیائی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ بات اس سے چھپانا ضروری نہیں تھا کہ سلطان سلیمان نے اس کی شادی رستم پاشا سے طے کردی تھی لیکن جلد ہی اسے سن گن مل گئی کہ فیصلہ بہت آخر میں ہوا تھا۔ تاخیر کا سبب اختلافات تھے۔ کوئی اس کی شادی رستم پاشا سے کرانا چاہتا تھا اور کوئی اس کا مخالف تھا۔ مہر ماہ کے علم میں یہ نہیں آسکا کہ مخالف کون تھا اور تجویز کنندہ کون...... لیکن وہ قیاس کرسکتی تھی کہ رستم پاشا کا مخالف ابراہیم پاشا ہی ہوسکتا تھا کیونکہ رستم پاشا نے اس کے مامور کردہ حاجب، گریتی کی جگہ لے کر اسے زک پہنچائی تھی۔ مہر ماہ سے شادی کے بعد رستم پاشا کی اہمیت بھی بڑھ جاتی۔

شادی کی موافقت میں خرم سلطان ہوسکتی تھی کیونکہ اس طرح رستم پاشا اس کا بندۂ بے دام بن جاتا۔

اگرچہ خرم سلطان، سلطان سلیمان کے اعصاب پر چھا چکی تھی لیکن ابراہیم پاشا بھی سلطان سے بہت قربت رکھتا تھا۔

عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے والا ابراہیم اوائلِ جوانی ہی میں اسیر کرلیا گیا تھا۔ سلطان سلیمان کے باپ سلطان سلیم اول کے دور میں ہی اسے "شہزادہ سلیمان" کے خدم و حشم میں نمایاں جگہ اس لیے مل گئی تھی کہ وہ نہایت باصلاحیت اور ذہین تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد سلطان سلیمان نے اسے شاہی کمرے کا داروغہ مقرر کیا تھا۔ تین سال بعد ہی اسے وزیرِاعظم کا منصب بھی مل گیا۔ سلطان سلیمان کی چھوٹی بہن شہزادی خورو سلطان سے اس کی شادی بھی ہوگئی۔ اس کے بعد جب اس نے امیرِ لشکر بن کر فتوحات حاصل کیں اور نمایاں کارنامے سرانجام دیے تو سلطان سلیمان اس کا بہت گرویدہ ہوگیا۔

مہر ماہ کو خوب اندازہ تھا کہ اس کی والدہ اور ابراہیم پاشا ایک دوسرے کے نہایت طاقتور حریف تھے اس لیے رستم پاشا کے معاملے میں اپنی بات منوانے کے لیے خرم سلطان کو خاصی دشواری ضرور ہوئی ہوگی۔ مہر ماہ سے اس معاملے میں بہت رسمی رائے لی گئی تھی۔ مہر ماہ نے کسی بھی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ اگرچہ شاہی محل کے مذہبی ماحول نے اس پر بہت زیادہ اثرات نہیں چھوڑے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ان اثرات سے مکمل طور پر بچی رہی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ جوڑے تو آسمانوں پر ہی بن

جاتے ہیں جن سے فرار ممکن نہیں۔ خرم سلطان نے بہت زوروشور سے شادی کی تیاریاں شروع کروائیں۔

مہر ماہ اس وقت بچّی ہی تھی جب ابراہیم پاشا اور شہزادی خوردوسلطان کی شادی ہوئی تھی۔ مہر ماہ نے سنا تھا کہ عوام الناس بھی اسے ایک یادگار شادی کہتے تھے اور اب خرم سلطان کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی اس سے بھی زیادہ شاندار ہو۔

مہر ماہ کو ابراہیم پاشا اور شہزادی خوردسلطان کی شادی یاد ہی نہیں تھی اس لیے وہ ان ہنگاموں اور اپنی شادی کے ہنگاموں کا کوئی موازنہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔

جشن کا آغاز شادی سے تین دن پہلے ہی ہو گیا تھا۔ جنگ وجدل کے کمالات دکھانے کے لیے شہریوں نے کاٹھ کے قلعے بنائے تھے۔ ان پر حملے کے مناظر پیش کیے جارہے تھے۔ نٹ برادری ان رسوں پر چلنے کا مظاہرہ پیش کررہی تھی جو نہایت بلندی پر باندھے گئے تھے۔ موسیقی ہر طرف گونج رہی تھی اور ینی چری (نئی سپاہ) اپنے نقارے بجارہی تھی۔

ینی چری کی تشکیل کا آغاز چودھویں صدی میں سلطنتِ عثمانیہ کے تیسرے فرماں روا سلطان مراد اول نے کیا تھا۔ حکومت اپنے مفتوحہ علاقوں کے نصرانیوں سے ان کے بچے، بہ طور خراج حاصل کرتی تھی۔ ان بچوں کو مشرف بہ اسلام کیا جاتا اور مخصوص مدرسوں میں تعلیم دلائی جاتی۔ بعد میں انہیں فنونِ حرب سکھا کر سپاہی بنالیا جاتا۔ ان کا لباس خالص ترک فوج سے مختلف ہوتا تھا۔ ٹوپی بھی سفید نمدے کی ہوتی تھی جس کے پیچھے کپڑے کا ایک ٹکڑا سا لٹکا نظر آتا تھا۔ ان سپاہیوں کے سالار کو ینی چری آغا کہا جاتا تھا۔

مہر ماہ جانتی تھی کہ یہ سپاہ نہایت منظم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت تندخو بھی تھی۔ سلطان سلیمان کو بھی خیال رکھنا پڑتا تھا کہ اس سپاہ میں کسی وجہ سے خفگی کی لہر نہ دوڑے۔ خفگی کی وہ لہر کبھی کبھی بغاوت تک چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھی مہر ماہ سوچا کرتی تھی کہ سلطان سلیمان کے بیٹوں کے بارے میں اس سپاہ اور ان کے آغا کے خیالات کیا ہوں گے۔ یہ امکان مفقود نہیں تھا کہ ولی عہدی کے سلسلے میں کسی وقت اس سپاہ کا دل پلٹ جاتا اور وہ شہزادہ مصطفیٰ کے خلاف ہوجاتی۔ ان خیالات کے ساتھ مہر ماہ کو اپنی والدہ اور ملکہ گل بہار کی چپقلش بھی یاد آجاتی جس کی وجہ سے خرم سلطان کے دماغ میں یہ خیال کلبلانے لگا تھا کہ وہ گل بہار کا یہ خواب چکنا چور کردے کہ وہ کبھی ''والدہ سلطان'' بن جائے گی۔

اگر اس کا خواب پورا ہوجاتا تو وہ محل میں خرم سلطان کے لیے سانس لینا بھی دوبھر کرسکتی تھی۔

☆☆☆

خرم سلطان کے برپا کروائے ہوئے جشن کی تیسری رات مہر ماہ سلطان کی شادی کی پہلی رات تھی۔

اس رات مہر ماہ سلطان اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔ اس نے ہمیشہ ایک نرم خو اور نفاست پسند رفیقِ زندگی کا خواب دیکھا تھا جو عورت کو ایک نرم و نازک پھول سمجھے لیکن رستم آغا اس معاملے میں نہایت وحشی ثابت ہوا تھا۔ لڑکیاں اپنی شادی کی پہلی رات کو اپنی زندگی کی سب سے خوشگوار رات کی طرح یاد رکھنا چاہتی ہیں لیکن مہر ماہ کے لیے وہ ایک اذیت ناک رات تھی۔ مہر ماہ نے محسوس کیا کہ اس رات نے اس کے اور رستم پاشا کے درمیان ایک ایسی ذہنی خلیج حائل کردی تھی جو شاید کبھی پاٹی نہ جاسکے۔ اسے افسوس بھی ہوا کہ اس کی ماں نے صرف اپنے مفادات کی خاطر اس کی زندگی ایک ایسے خارزار میں دھکیل دی تھی جہاں وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک لہولہان ہی رہتی۔ اس کے خیال میں یہ تو ناممکن ہی تھا کہ اس کی ماں اس کے اور رستم پاشا کے مزاجوں کے تفاوت سے واقف نہ ہوتی۔

اب مہر ماہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر وقت رستم پاشا سے دور رہ کر گزارے لیکن مشکل صورت حال یہ تھی کہ اسے شاہی محل ہی میں رہنا تھا اور محل کے حاجب کی حیثیت سے رستم پاشا کا سارا وقت بھی محل ہی میں گزرتا۔

چند دن بعد اس نے خرم سلطان سے کہا۔ ''کیا سلطنتِ عثمانیہ کی شہزادی کو جہیز میں ایک محل بھی نہیں مل سکتا تھا والدہ؟''

خرم سلطان چونکی۔ ''تم الگ رہنا چاہتی ہو؟''

مہر ماہ نے نظریں جھکالیں۔ ''شادی کے بعد کیا یہ لڑکی کا حق نہیں ہوتا؟''

''بے شک ہوتا ہے مگر لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنے والدین کے ساتھ رہیں۔ رستم پاشا کی تو مجبوری بھی ہے کہ وہ یہیں رہے۔''

مہر ماہ بولی۔ ''قریب ہی ایک محل ہے جس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی لیکن ہو تو سکتی ہے۔''

مہر ماہ کا اشارہ اس محل کی طرف تھا جو سلطان سلیمان کے والد سلطان سلیم خاں نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں بنوانا شروع کیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی تعمیر ادھوری رہ گئی تھی۔ سلطان سلیمان نے اسے مکمل کروانے کی

طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

''مہرماہ!'' خرم سلطان نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم رستم پاشا سے شادی کر کے خوش نہیں ہو؟''

مہرماہ کے لیے جواب دینا مشکل تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

خرم سلطان بولی۔ ''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ مستقبل میں تم ایک بہت بڑے آدمی کی بیوی کہلاؤ گی۔ رستم پاشا بہت ذہین اور باصلاحیت ہے۔''

''والدہ!'' مہرماہ نے کہا۔ ''میرے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ میں سلطنتِ عثمانیہ کی شہزادی ہوں۔''

''لیکن......'' خرم سلطان کچھ کہتے کہتے رکی پھر بولی۔ ''اچھا خیر......! تمہاری خواہش ہے تو اس محل کی تعمیر مکمل کر کے وہ تمہیں دے دیا جائے گا۔ زیادہ کام نہیں ہے۔ چند ماہ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔''

''آپ سے ایک اجازت اور لینا ہے۔''

''کہو میری جان!''

''میں بہت دن سے کہہ رہی ہوں، مجھے خانم سلطان پھوپی بہت یاد آ رہی ہیں۔ میں کچھ دن کے لیے ان کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''

''ابھی تمہاری شادی کو چند ہی دن ہوئے ہیں مہرماہ! رستم پاشا کیا سوچے گا۔ اس کے علاوہ تمہیں والدہ سلطان سے بھی اجازت لینا ہوگی اور اپنے شاہ بابا سے بھی۔''

''مجھے یقین ہے کہ آپ سے اجازت ملنے کے بعد کوئی مرحلہ بھی میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔''

''اچھا!'' خرم سلطان نے طویل سانس لی۔ ''تم اتنی خواہش مند ہو تو جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔''

''شکریہ والدہ!'' مہرماہ، خرم سلطان کے سینے سے لگ گئی۔

پھر اسی دن اس نے سلطان سلیمان اور والدہ سلطان سے بھی اجازت لے لی۔ اجازت دیتے وقت وہ دونوں ہی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ انہیں بھی یہی خیال آیا ہوگا کہ مہرماہ اپنی شادی سے خوش نہیں تھی۔

یہ ممکن نہیں تھا کہ رستم پاشا کو اس معاملے کی بابت علم نہ ہوتا۔ اس کے تاثرات سے قطعاً ظاہر نہیں ہوا کہ وہ رنجیدہ ہوا ہوگا۔ وہ قطعی طور پر غیر جمالیاتی شخص تھا۔ اس کے لیے یہ بات تو اہم ہو سکتی تھی کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کی شہزادی کا شوہر بنا تھا لیکن یہ اس کے لیے قطعی غیر اہم تھا کہ اس کی بیوی کوئی بہت خوب صورت لڑکی تھی۔

☆☆☆

سفر طویل تھا۔ اگر مہرماہ سلطان آرام دہ بگھی میں سفر کرتی تو خاصا وقت لگ جاتا اس لیے اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر سفر کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات ایک عثمانی شہزادی کی شان کے خلاف تھی لیکن سلطان سلیمان نے اپنی لاڈلی بیٹی کی خواہش مسترد نہیں کی، بس اس کے سفر کے مکمل انتظامات کا حکم بہرحال صادر کیا۔

مہرماہ جب اس سفر پر روانہ ہوئی تو ینی چری کی ایک ''اورتا'' (پلٹن) اس کے ساتھ تھی جس کا سربراہ ینی چری آغا کا سگ بان باشی (ماتحت) تھا۔ اس سپاہ کے علاوہ کنیزیں بھی تھیں جن میں مہرماہ کی کنیزِ خاص فروزاں بھی تھی۔ مہرماہ نے ایسی کنیزوں کا انتخاب کیا تھا جنہیں گھڑ سواری آتی تھی، اس لیے ان کنیزوں کی تعداد چار سے زیادہ ہو نہیں سکی تھی۔

فروزاں نے مصور کارل کے بارے میں سلطان سلیمان کو جو کچھ بتایا تھا، اس کی وجہ سے ابتدا میں وہ مہرماہ سے خائف رہی تھی لیکن مہرماہ نے اسے تھپک دیا تھا۔

''میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔'' مہرماہ نے اس سے کہا تھا۔ ''شاہ بابا کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ خود میرے لیے ممکن نہیں کہ ان کے سامنے غلط بیانی کروں۔''

اس طرح فروزاں کا خوف دور ہو سکا تھا۔

سفر کے دوران میں فروزاں کا گھوڑا، مہرماہ کے گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ تین کنیزوں کے گھوڑے اس کے پیچھے تھے، پھر ینی چری تھے لیکن سگ بان باشی ایک دستے کے ساتھ مہرماہ سے خاصا آگے تھا۔ مہرماہ کی حفاظت کے پیشِ نظر ایک دستے کا آگے ہونا ضروری تھا۔ سگ بان باشی کے ساتھ بیرق دار، یعنی علم بردار بھی تھا جس کی کمر کے ساتھ سفید پرچم بڑی مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ اس پرچم کے اوپر گھوڑے کی دم لگی ہوئی تھی۔

سفر دوپہر کے قریب شروع ہوا۔ اندھیرا پھیلنے سے قبل انہیں کسی جگہ قیام کرنا تھا۔

سگ بان باشی نے قیام کے لیے ایک خوب صورت جگہ کا انتخاب کیا جہاں سرو اور چنار کے درختوں کی بہتات تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اونچے نیچے سرسبز ٹیلے بھی تھے۔

خیمے گاڑ دیے گئے۔ ینی چریوں کے خیمے گول تھے جن میں سے بعض پر مخصوص امتیازی نشان کڑھے ہوئے تھے۔ مہرماہ کا خیمہ نہایت وسیع و عریض ہونے کے ساتھ

ساتھ نہایت آرام دہ بھی تھا۔

الاؤ روشن کر لیے گئے۔ آشچی باشی (میرِ مطبخ) نے کھانا تیار کروانا شروع کیا۔

تین کنیزوں کا ایک خیمہ مہرماہ کے خیمے کے قریب ہی لگایا گیا تھا لیکن فروزاں کو مہرماہ نے اپنے ہی خیمے میں رکھا تھا۔

رات گزری۔ صبح ناشتے کے بعد سفر پھر شروع ہوا۔ دوپہر ہوئی تو قیام کے لیے پھر رکنا پڑا۔ اسی دن رات کو جہاں خیمے لگائے گئے، وہاں کچھ فاصلے پر ایک چشمہ بھی بہہ رہا تھا۔

''شہزادی!'' فروزاں نے مہرماہ سے کہا۔ ''میں چشمے تک گھوم آؤں؟ مجھے چشمے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''جاؤ لیکن جلدی آ جانا۔''

فروزاں کے جانے کے بعد مہرماہ لیٹ کر مہری خاتون کا کلام پڑھنے لگی۔ اسے مہری خاتون کے اشعار میں ایک عجیب اور اجنبی سی مہک محسوس ہوتی تھی لیکن محبت سے معمور عشقیہ اشعار پڑھتے ہوئے اس کی سمجھ میں یہ کبھی نہیں آ سکا تھا کہ انسان میں اس قسم کے جذبات کب، کیوں اور کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں اس نے اکثر سوچا تھا لیکن کبھی کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ کسی میں اس قسم کے جذبات کا مشاہدہ اس نے یقیناً کیا تھا لیکن وہ اس کے لیے واحد مثال تھی۔ اس کی ماں خرم سلطان کو سلطان سلیمان سے ایسی ہی محبت، ایسا ہی عشق تھا جو مہری خاتون کے کلام میں نظر آتا تھا۔ دو سال پہلے سلطان سلیمان کی شدید بیماری پر خرم سلطان کا رو رو کر اور دعائیں مانگ مانگ کر ہی سارا وقت گزرتا تھا۔ ایسی بری حالت تو والدہ سلطان کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ رنجیدگی کا تاثر ملکہ گل بہار کے چہرے پر بھی نظر آیا تھا لیکن وہ کچھ مصنوعی سا تھا اور اب دو سال بعد مہرماہ سوچنے لگی تھی کہ خرم سلطان کا خیال غالباً غلط نہیں تھا۔ ملکہ گل بہار جلد از جلد والدہ سلطان بننا چاہتی تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ سلطان سلیمان کا انتقال ہو جاتا اور شہزادہ مصطفیٰ تخت نشین ہوتا۔

مہرماہ نے پہلے پہل سوچا تھا کہ اس قسم کا جذبہ شاید زیادہ عرصے کی قربت کے باعث پیدا ہوتا ہو لیکن پھر اس نے خود ہی اپنا یہ خیال رد کر دیا تھا کیونکہ ملکہ گل بہار تو خرم سلطان سے بہت پہلے سلطان سلیمان کی قربت حاصل کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ مہری خاتون کے اشعار بھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ عشق کی بنیاد قربت نہیں ہوتی بلکہ یہ جذبہ اس طرح مہمیز ہوتا ہے کہ اس جذبے کا شکار ہونے والے کو بھی اندازہ نہیں ہو پاتا کہ ایسا کیوں ہو گیا۔

قدموں کی آہٹ سن کر مہرماہ نے خیمے کے در کی طرف دیکھا۔ اندر آتی ہوئی فروزاں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ پھر مہری خاتون کے اشعار کی طرف متوجہ ہو جاتی لیکن فروزاں کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات کی وجہ سے وہ مہری خاتون کے اشعار کی طرف متوجہ نہیں ہو سکی۔

کچھ ایسا تاثر تھا فروزاں کے چہرے پر جو مہرماہ کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ فروزاں کی سانس اتنی تیزی سے چل رہی تھی جیسے وہ کہیں دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔

''کیا بات ہے فروزاں؟'' مہرماہ پوچھ بیٹھی۔

''وہ......وہ......'' فروزاں ہانپ رہی تھی۔

مہرماہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''وہ......'' فروزاں پھر بولی۔ ''وہ...... مصور......کارل......''

''کارل۔'' مہرماہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ ''وہ تمہیں اس وقت کیسے یاد آ گیا؟''

''وہ......وہ......ابھی......چشمے پر......ملا تھا مجھے!''

مہرماہ جو بستر پر اٹھ بیٹھی تھی، یکلخت کھڑی ہو گئی۔

''چشمے پر ملا تھا وہ؟''

''جی......'' فروزاں نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اندھیرا تھا...... میں تو...... ڈر گئی تھی...... ایک درخت کی آڑ سے نکل کر...... اچانک سامنے آیا تھا...... میرے منہ سے چیخ نکل جاتی تو...... ینی چری دوڑ پڑتے اس طرف...... لیکن...... لیکن...... وہ فوراً ہی بول پڑا...... ڈرو نہیں فروزاں...... میں کارل ہوں...... میں نے تمہاری شہزادی کی تصویر بنائی تھی......''

''اوہ!'' مہرماہ کے منہ سے نکلا۔

''اس نے مجھے...... یہ دیا......'' فروزاں نے اپنا ہاتھ مہرماہ کی طرف بڑھایا۔ ''اور کہا...... یہ اپنی شہزادی کو دے دینا...... خط ہے میرا۔ بس...میرے منہ سے تو ایک لفظ نہیں نکل سکا اور...... وہ تیزی سے مڑ کر...... اندھیرے میں غائب ہو گیا۔''

مہرماہ نے فروزاں کے ہاتھ سے خط لے لیا اور پڑھنے لگی۔

''میرے دل کی دنیا کی شہزادی!...... بڑے کرب سے لکھ رہا ہوں یہ جملہ کہ آپ کو شادی مبارک ہو۔ دعا گو ہوں کہ آپ سدا خوش رہیں۔ میں تو اب تڑپ تڑپ کر ہی جی سکوں گا...... اگر جی سکا۔ مجھے کوئی رنج نہیں ہوگا، اگر کبھی

پکڑا جاؤں اور اپنی اس گستاخی کی وجہ سے میری گردن مار دی جائے..... مجھے اندازہ نہیں کہ آپ کہاں جارہی ہیں۔ ابھی جب پہلی ہی رات کو آپ نے پڑاؤ ڈالا ہے تو میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ آپ کے اس سفر کے دوران میں کسی طرح میرا یہ خط آپ تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ سے دور چلا جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ پھر کسی کی نظر میں آؤں اور گرفتار کیا جاؤں۔ مجھے یہ خوف ہرگز نہیں ہے کہ میری گردن ماری جاسکتی ہے، میں بس یہ چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کے بارے میں باتیں نہ بننے لگیں، لوگ غلط نہ سمجھ لیں، آپ کی رسوائی نہ ہو۔ اسی لیے میں نے اپنے پہلے خط کی عبارت ایسی رکھی تھی جس سے نہ تو یہ ظاہر ہو کہ خط کس نے لکھا ہے اور نہ یہ ظاہر ہو کہ یہ خط آپ کو لکھا گیا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ خط کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے اور آپ کی رسوائی کا سبب بنے۔ بس اتنی خواہش تھی میری کہ میرے تڑپتے دل کی آواز آپ تک پہنچ جائے اور آپ زندگی بھر سوچتی ہی رہیں کہ خط بھیجنے والا دیوانہ کون تھا۔ میں اس طرح آپ کے خیالوں میں تو رہوں، آپ کی زندگی میں آنا تو ممکن ہی نہیں۔ کہاں سلطنت عثمانیہ کی شہزادی اور کہاں میں ایک معمولی انسان! پھر یہ کہ اب تو آپ کسی اور کی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں..... خدا جانے میری یہ خواہش پوری ہوسکے گی یا نہیں کہ میں آپ کے خیالوں میں ''زندہ'' رہ سکوں لیکن ایک موہوم سی امید پر وہ خط بھی لکھا تھا اور یہ خط بھی لکھ رہا ہوں۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ یہ خط آپ تک رازداری کے ساتھ نہیں پہنچ سکتا تو پھر میں اسے اپنے پاس ہی رکھوں گا اور ہمیشہ کے لیے آپ سے دور چلا جاؤں گا۔ کبھی کبھی یہ خط خود ہی پڑھ کر اپنے تڑپتے دل کو بہلانے کی کوشش کیا کروں گا لیکن شدید خواہش یہی ہے کہ یہ خط آپ تک پہنچ جائے اور آپ کو یاد رہے کہ ایک نامعلوم دیوانہ آپ کے عشق میں گرفتار ہوا تھا..... اب اور کیا لکھوں، بس الوداع کہوں گا..... دل زدہ دیوانہ، کارل.....''

یہ خط خاصی دیر تک مہرماہ کے ہاتھ میں رہا۔ وہ اس نے کئی مرتبہ پڑھا تھا اور اس کے جسم میں ایک انجانی سی سنسناہٹ پھیلا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے مہری خاتون کے اشعار بھی یاد آتے رہے تھے۔ دماغ میں یہ خیال بھی چکرا تا رہا تھا کہ غالباً یہی وہ جذبہ ہے جس کا اظہار وہ مہری خاتون کے اشعار میں پڑھتی رہی تھی۔

فردزاں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''اس نے کیا لکھا ہے شہزادی صاحبہ؟''

مہرماہ نے اسے گھور کر دیکھا پھر سخت لہجے میں بولی۔ ''میرے اور تمہارے علاوہ اس خط کا علم کسی کو نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ سمجھ گئیں؟''

''جی..... جی شہزادی!'' فروزاں نے نظریں جھکا لیں۔ اسے مزید کوئی استفسار کرنے کی ہمت نہیں ہوسکی تھی۔

رات کو مہرماہ دیر تک جاگتی رہی، کارل اور اس کے خط کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی ابھرا کہ وہ کیوں اس معاملے کو ہمیشہ راز میں رکھنا چاہتی ہے؟

اگر وہ اس بارے میں سلطان سلیمان کو بتا دیتی تو سلطنت کا چپا چپا چھان ڈالا جاتا اور کارل کو گرفتار کر کے اس کی گردن اڑا دی جاتی۔

تو پھر اس معاملے کو راز میں رکھنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ کارل کو زندگی سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر کیوں؟

دماغ میں آنے والے اس سوال نے مہرماہ کو چونکا سا دیا۔ کیا وہ کارل کے جذبے سے متاثر ہوگئی تھی؟ اور کیا نہیں چاہتی تھی کہ عشق کا وہ پروانہ جل کر راکھ ہو جائے؟

مہرماہ کے دل نے کہا۔ ''ہاں۔''

''نہیں۔'' مہرماہ نے سختی سے زیرِلب کہا۔ ''مجھے اب اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہیے۔''

لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ سفر کے دوران میں اسے کارل کا خیال بار بار آتا رہا۔ اس نے وہ خط بھی اچھی طرح محفوظ کر لیا تھا۔ پڑاؤ کے دوران میں وہ کسی وقت مہری خاتون کا کلام پڑھتی تو اسے ان اشعار میں کارل کا چہرہ نظر آنے لگتا۔

☆☆☆

آخر سفر تمام ہوا۔

خانم سلطان نے اپنے محل میں بڑی پُرجوش محبت کے ساتھ مہرماہ سلطان کا استقبال کیا اور اسے گلے لگا کر بولی۔ ''میری عزیز از جان مہرماہ!..... بہت خوش ہوئی ہوں میں تمہیں دیکھ کر..... تم نے اس کا برا نہیں مانا کہ میں تمہاری شادی میں شرکت کے لیے نہیں آئی۔''

''مجھے آپ کے جذبات کا اندازہ ہے خانم پھوپی!'' مہرماہ نے کہا۔ ''اس محل میں قدم رکھنا، یقیناً آپ کے لیے بہت مشکل ہے جہاں آپ کی بیوگی کا حکم صادر ہوا تھا۔''

''ہاں۔'' خانم سلطان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''فرہاد پاشا جیسے بھی تھے، میرے بچوں کے باپ تھے اور شاید وہ اتنے برے بھی نہیں تھے جتنا مشہور کیا گیا اور برادرِ معظم ان

کا سر قلم کروانے کا حکم صادر کر بیٹھے۔''

مہرماہ نے افسردگی سے کہا۔ ''آپ کے دل میں اب بھی نفرت ہوگی شاہ بابا کے لیے؟''

''کتنی محبت مجھے تم سے ہے، اندازہ ہے تمہیں؟''

''میری بات اور ہے۔''

''تم انہی کی بیٹی ہو مہرماہ!'' خانم سلطان کی آواز تھوڑی سی بھرائی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ ''خرم کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''والدہ بالکل ٹھیک ہیں، آپ کو یاد بھی کرتی ہیں۔''

خانم سلطان نے قصرِ شاہی کے سبھی افراد کی خیریت پوچھی پھر اچانک کہا۔ ''آج تو مجھے تمہارے آنے کی خوشی ہوئی ہے اور گزشتہ روز کی صبح بھی میرے لیے ایک خوشی لا چکی ہے۔ عماد آگیا ہے۔''

مہرماہ چونکی۔ ''کہاں رہے وہ اتنے عرصے؟ بتایا تو ہوگا۔''

''یہ سب باتیں..... اور بہت سی باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔ تمہارے لیے حمام تیار ہو گیا ہوگا۔ پہلے غسل کر کے ذرا دیر آرام کر لو۔ اتنی دیر میں کھانے کا وقت ہو جائے گا۔ کھانے پر باتیں کریں گے۔'' خانم سلطان نے ایک بار پھر مہرماہ کی پیشانی چومی۔

فردزاں اور خانم سلطان کی دو کنیزوں کے ساتھ مہرماہ نے حمام کا رخ کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ عماد کے آجانے سے خانم سلطان کتنی خوش ہوگی۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی۔ وہ اس کے شوہر فرہاد پاشا کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس وقت اس کی عمر بہت کم تھی جب سلطان سلیمان کے حکم سے فرہاد پاشا کو قتل کیا گیا تھا۔ خانم سلطان نے اس کی پرورش بھی اس طرح کی تھی جیسے اپنے بچوں کی کی تھی۔ عماد جب سولہ سترہ سال کا ہو گیا تھا تو اچانک کہیں گم ہو گیا تھا یا خود کہیں چلا گیا تھا۔ خانم سلطان نے اسے تلاش کروانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن وہ نہیں ملا تھا۔

مہرماہ حمام سے فارغ ہونے کے بعد خانم سلطان کے کمرے میں پہنچی۔

''آرام نہیں کیا میں نے۔'' وہ بولی۔ ''کوئی خاص تکان نہیں ہے سفر کی۔ اب رات کو ہی آرام کروں گی۔ میرے بہن بھائی کہاں ہیں؟''

خانم سلطان کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹا مہرماہ سے بڑا تھا اور بیٹی مہرماہ کی تقریباً ہم عمر تھی۔ ان کے بارے میں خانم سلطان نے بتایا کہ وہ دونوں اپنے دادا سے ملنے قریب ہی کی ایک ریاست گئے ہوئے تھے۔

''آٹھ دس دن میں آجائیں گے۔'' خانم سلطان نے مزید کہا۔ ''اتنے دن تو رکو گی نا تم؟''

''میں تو کچھ زیادہ ہی دن رکنے کے ارادے سے آئی ہوں خانم پھوپی!''

''ایک بات تو بتاؤ مہرماہ!'' خانم سلطان خاصی سنجیدہ ہو گئی۔ ''تم جب سے آئی ہو، میں اس بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ تم اپنی شادی سے خوش نہیں ہو کیا؟''

''یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟''

''تمہاری شادی کو ابھی کچھ ہی دن ہوئے ہیں اور تم یہاں آگئی ہو۔''

''تو کیا کرتی؟ رستم پاشا کی مصروفیت حد سے زیادہ ہے۔ بہت کم وقت گزرتا ہے ان کے ساتھ..... پھر یہ کہ آپ کی یاد تو مجھے بہت دن سے آرہی تھی۔ اگر میری شادی کا معاملہ نہ ہوتا تو میں بہت دن پہلے آپ کے پاس آچکی ہوتی۔'' مہرماہ نے خانم سلطان کو بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ اپنی شادی سے سخت ناخوش تھی۔ اس نے فوراً ہی موضوع بھی بدلا۔ ''عماد سے تو ملوایئے! وہ کہاں ہے؟''

''چلو ملا دیتی ہوں۔ کہیں سو نہ گیا ہو۔ کل صبح سے آج صبح تک تو جاگتا ہی رہا تھا۔'' خانم سلطان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب آیا تھا تو شدید تپ میں گرفتار تھا۔ غشی سی طاری تھی اس پر..... خدا کا شکر ہے کہ وہ کہیں گھوڑے سے گر کر زخمی نہیں ہوا۔''

مہرماہ کو عماد کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے خانم سلطان نے مزید بتایا۔

عماد کی حالت دیکھ کر خانم سلطان نے فوراً طبیب کو بلوایا تھا جو ریاست کے موجودہ صوبیدار کا خاص طبیب تھا۔ خانم سلطان ایک سابق اور مقتول صوبیدار... کی بیوہ تھی لیکن صوبیدار اس کی اہمیت اس لیے سمجھتا تھا کہ وہ سلطان سلیمان کی بہن تھی۔

''آج صبح سے اس کی حالت بہتر ہوئی ہے۔'' خانم سلطان بتاتی رہی۔ ''طبیب کل سے اب تک اس کے پاس رہا تھا۔ آج صبح یہ ہدایت دے کر گیا ہے کہ عماد کو دو چار دن مکمل آرام کرنا چاہیے۔''

مہرماہ اس کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی بستر پر ایک نوجوان لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔

''ابھی تک سوئے نہیں تم یا ذرا دیر سو کر جاگ گئے ہو؟'' خانم سلطان مہرماہ کا ہاتھ پکڑے اس کے بستر کی

طرف بڑھی۔

عماد، مہر ماہ کو تک رہا تھا اور مہر ماہ پلکیں جھپکانا تک بھول گئی تھی۔ اس کے سامنے عماد تھا یا کارل؟ مہر ماہ کے دماغ میں اس سوال کی گونج پھیل رہی تھی۔

''چلو خیر!'' خانم سلطان بولی۔ ''اچھا ہے کہ تم جاگ رہے ہو اور تمہاری طبیعت بھی خاصی بہتر معلوم ہو رہی ہے۔ میری عزیز از جان بھتیجی تمہیں دیکھنے آئی ہے۔ مجھ سے اس کا نام تو تم نے کئی بار سنا ہے۔ یہ شہزادی مہر ماہ سلطان ہے۔''

''خوش آمدید شہزادی صاحبہ!'' عماد نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہو۔'' مہر ماہ بولی۔ ''خانم پھوپی مجھے بتا چکی ہیں کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

خانم سلطان نے بھی عماد کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ہاں ہاں، لیٹے رہو۔'' لہجے میں محبت بھری ہوئی تھی۔ ''میری پیاری بھتیجی برا نہیں مانے گی کہ تم اس کے احترام میں کھڑے نہیں ہوئے۔''

''بس اب چلیے خانم پھوپی!'' مہر ماہ جلدی سے بولی۔ ''مریض کو آرام کرنے دیا جائے تو بہتر ہے۔''

خانم سلطان نے ہنس کر کہا۔ ''تم ہی نے کہا تھا کہ تمہیں عماد سے ملواؤں۔''

حقیقت تو یہی تھی لیکن عماد کو دیکھ کر مہر ماہ کے حواس پراگندہ سے ہو گئے تھے۔ وہ جلد از جلد اس کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی۔

خانم سلطان اسے اپنے کمرے میں واپس لے آئی۔ مہر ماہ نے اس دوران میں اپنے حواس پر کافی حد تک قابو پا لیا تھا۔ ''اس کمرے میں تصویریں بہت سی لگی ہوئی تھیں۔'' وہ بولی۔

''ہاں۔ اسی کی بنائی ہوئی ہیں۔ اسے بہت کم عمری سے شوق تھا مصوری کا...... جب وہ غائب ہوا تھا، اسی زمانے کی ہیں وہ تصویریں۔ اس عمر میں بھی وہ اتنی اچھی تصویریں بنانے لگا تھا۔ تم شاید بھول گئیں، میں نے تمہیں بتایا تھا اس کے شوق کے بارے میں۔''

''کئی سال پہلے آئی تھی میں آپ کے پاس پہلی مرتبہ۔''

''شاید تبھی بتایا تھا میں نے تمہیں۔ تم اس وقت چھوٹی تھیں۔ بھول گئی ہو گی۔ اس وقت عماد کو غائب ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ اس کے غائب ہونے کے بعد میں نے اس کا کمرا بند کروا دیا تھا کہ بچے وہاں جا کر اس کی کوئی چیز خراب نہ کر دیں۔ میرا دل کہتا تھا مہر ماہ کہ وہ کبھی نہ کبھی ملے گا ضرور، کبھی آئے گا ضرور...... بچے اپنے دادا سے مل کر آئیں گے تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے اسے گھر میں پا کر۔''

خانم سلطان کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ عماد کو بہت چاہتی تھی۔ آخر بچپن سے پرورش کی تھی اس کی......

مہر ماہ نے اپنے حواس پر کافی قابو پا لیا تھا لیکن دماغ میں ہلکی سی جھنجھناہٹ اب بھی ہو رہی تھی۔ اس پر جو ردعمل ہوا تھا، وہ اسے بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

خانم سلطان نے کھانا وہیں منگوا لیا تھا۔

کھانے کے دوران میں وہ کچھ تشویش سے بولی۔ ''تمہاری شادی سے کچھ دن پہلے باب ہمایوں میں بڑا سنگین واقعہ پیش آیا تھا۔''

''باب ہمایوں'' سلطان سلیمان کے محل کو کہا جاتا تھا۔

مہر ماہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ تو سب لوگوں کی خیریت پوچھ رہی تھیں، آپ کو اس سنگین واقعے کا علم کیسے ہو گیا؟''

''مجھے بس خاص خاص اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔'' خانم سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''محل سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جانے کے بعد بھی مجھے یہ خواہش ہمیشہ رہی ہے کہ وہاں کے حالات سے باخبر رہوں۔ وہاں کوئی ہے جو مجھے اطلاعات بھجواتا رہتا ہے۔ ابھی جب تم حمام گئی تھیں، اسی وقت قاصد ایک خط لے کر آیا تھا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ جس روز تم وہاں سے روانہ ہوئی ہو، اسی روز شام کو شاہی جراح سفیان کو کسی جگہ مردہ پایا گیا تھا۔''

یہ بات مہر ماہ کے علم میں تھی کہ شہزادہ بایزید پر خنجر پھینکنے والے حبشی خواجہ سرا کو آختہ نہیں کیا گیا تھا جس کی ذمے داری جراح سفیان ہی پر عائد کی جا سکتی تھی اور سفیان اپنے گھر سے غائب بھی ہو گیا تھا۔

خانم سلطان بولی۔ ''اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ بایزید کو قتل کرنے کی باقاعدہ سازش کی گئی تھی۔ وہ حبشی ایک ماہر خنجر زن تھا۔ سفیان کو خاصی رشوت دی گئی ہو گی کہ اس حبشی کو آختہ نہ کرے۔''

مہر ماہ خاموشی سے خانم سلطان کی طرف دیکھتی رہی۔

''خرم کو تو گل بہار پر شبہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ شبہ غالباً زیادہ مضبوط نہیں۔ مصطفیٰ اور گل بہار کے جانے کے بعد بھی خرم، بایزید کو خطرے میں محسوس کر رہی ہو گی۔ اس نے اچانک ہی بایزید کو دارالفنون حرب بھیج دیا ہے، محل سے دور کر دیا ہے۔ اسے ضرور یہ شبہ بھی ہو گا کہ بایزید کا دشمن شاید اب بھی محل میں موجود ہے۔''

''وہ کون ہو سکتا ہے خانم پھوپی؟''

خانم سلطان کے چہرے پر فکرمندی کا تاثر گہرا ہو گیا۔ وہ کچھ رک کر بولی۔ ''میرے ذہن میں ایک خیال ہے تو سہی لیکن میں اسے اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی۔ تم کھانا کھاؤ مہر ماہ...... تمہارا ہاتھ رک رہا ہے۔''

''کیا آپ کو یہ اطلاع بھی مل چکی ہے کہ سلیم بھائی کے مزاج میں آنے والی ایک تبدیلی کے باعث والدہ کی زیادہ محبت کا مرکز بایزید بھائی بن گئے ہیں؟''

''میں نے کہا نا مہر ماہ، کھانا کھاؤ۔ اس انداز میں سوچنے سے یا بات کرنے سے دل لرزنے لگتا ہے۔''

''کوئی اور اطلاع بھی آئی ہے؟'' مہر ماہ نے کھانے پر توجہ دیتے ہوئے موضوعِ گفتگو بدلا۔

''وہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' خانم سلطان نے کہا۔ ''برادرِ معظم ابراہیم پاشا کو کسی مہم پر بھیج رہے ہیں۔''

اس وقت موضوعِ گفتگو تبدیل کرنے کے بعد بھی مہر ماہ کا ذہن عماد میں الجھا رہا۔

☆☆☆

تین دن گزر گئے۔ خانم سلطان اور مہر ماہ میں زیادہ تر خاندان کے موجودہ حالات یا سلطنتِ عثمانیہ کے ماضی کی باتیں ہوتی رہیں۔

اسی شام جب اندھیرا زمین پر نہیں اترا تھا، مہر ماہ پائیں باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے ذہنی طور پر عماد کے بارے میں مختلف النوع خیالات کی گرفت میں تھی۔ اچانک اس کا سامنا عماد سے ہو گیا۔

عماد چونکا پھر جلدی سے مؤدبانہ انداز میں جھکا۔ ''معاف کیجیے گا شہزادی! مجھے علم نہیں تھا کہ آپ یہاں چہل قدمی کر رہی ہیں۔''

وہ الٹے قدموں واپس لوٹ جانا چاہتا تھا کہ مہر ماہ بول پڑی۔ ''ٹھہرو عماد!''

عماد ٹھٹک کر رکا۔ اس کی نظریں جھکی رہیں۔

''تم پانچ سال گھر سے کیوں غائب رہے؟'' مہر ماہ بولی۔ ''مقصد کیا صرف یہی تھا کہ مصور کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں شہرت حاصل کرو؟''

''نہ جانے میں کیا چاہتا تھا۔'' عماد نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے اب کچھ یاد نہیں۔'' اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''میں بھی یاد نہیں؟'' مہر ماہ نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

عماد نے چونکے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا لیکن پھر دوبارہ نظریں جھکانے میں بھی دیر نہیں لگائی۔

''شہزادی!'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''انسان کبھی کبھی پاگل ہو جاتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی ہوا۔ میں کسی بچے کی طرح چاند کی طرف ہمک پڑا۔ اپنی اس گستاخی کا اعتراف ہے مجھے۔ سزاوار ہوں میں۔ یہی چری سپاہ محل کے قریب ہی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ آپ حکم دیجیے کہ وہ میرا سر اڑا دیں۔''

''ادھر آؤ۔'' مہر ماہ ایک فوارے کی طرف بڑھی۔

عماد نے تذبذب کے ساتھ اس کے پیچھے قدم بڑھائے۔

مہر ماہ فوارے کے گرد بنی ہوئی ایک تیر کے برابر اونچی دیوار پر بیٹھ گئی جو سنگِ رخام سے بنی ہوئی تھی۔

''بیٹھو!'' مہر ماہ نے کہا۔

''میں آپ کے قریب بیٹھنے کی گستاخی کیسے کر سکتا ہوں شہزادی!''

''بیٹھو!'' مہر ماہ نے جھنجلا کر کہا۔ ''حکم دے رہی ہوں میں۔''

عماد تذبذب کے ساتھ بیٹھ گیا۔

مہر ماہ بولی۔ ''میرے قریب بیٹھنے کی گستاخی تم نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن مجھے عشقیہ خط لکھ سکتے ہو۔''

''میں اس گستاخی کی سزا کے لیے تیار ہوں۔''

''میں کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ اپنی والدہ سے یہ پوچھنے کی جرأت تو میں نہیں کر سکی لیکن تم سے پوچھ سکتی ہوں۔ ایک شاعرہ مہری خاتون کے کلام نے بھی مجھے بہت الجھایا ہے۔''

''مجھے بھی وہ بہت پسند ہیں۔''

''اوہ! مہری خاتون کو پڑھا ہے تم نے؟''

''جی۔''

اس وقت مہر ماہ کو یکایک خیال آیا کہ وہ ایک ایسے ہی رفیقِ زندگی کی خواہش مند تھی جسے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ہو۔

مہر ماہ سوچتی ہوئی بولی۔ ''اس کے اشعار پسند کرنے کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ وہ جس قسم کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، وہ جذبات آخر کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ ویسے وہ جذبات میرے مشاہدے میں آ چکے ہیں۔ میری والدہ کو بھی میرے شاہ بابا سے عشق ہے۔ دوسرا مشاہدہ مجھے تمہاری وجہ سے ہوا۔''

عماد نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری، کچھ بولا نہیں۔

''یہ عشق۔'' مہر ماہ پھر بولی۔ ''کیا ہوتا ہے یہ؟''

عماد خاموش رہا۔

مہر ماہ پھر جھنجلا گئی۔ ''مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میرے

سوال کے جواب میں کوئی خاموش رہے۔"

"وہ...... میں......" عماد سٹپٹا گیا۔ "میں کیا عرض کروں شہزادی؟"

مہرماہ ہنس پڑی۔ "یہ بتاؤ کہ عشق ہوتا کیا ہے؟"

"عشق......" عماد متذبذب لہجے میں بولا۔ "چاہت جب عقل کے دائرے کو توڑ کر آگے نکل جاتی ہے تو اسے عشق کہتے ہیں۔"

"چاہت تو میرے تجربے کے مطابق دھیرے دھیرے بڑھتی ہے۔ قربت کی وجہ سے بڑھتی ہے۔ میں تمہارے سامنے طویل عرصے تک تو نہیں رہی۔ وہ بس کچھ دنوں کی بات تھی۔"

"یہ جذبہ قربت اور وقت سے ماورا ہوتا ہے شہزادی!" عماد نے کہا۔ "یہ ایک نظر میں بھی ہوجاتا ہے۔"

مہرماہ نے طویل سانس لی۔ "مہری خاتون کے اشعار میں بھی یہی بات ہے جو... میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اس کا سبب تو دنیا میں کوئی بھی نہیں سمجھ سکا ہوگا شہزادی اور شاید کبھی نہ سمجھ سکے۔"

"تمہارے دل میں یہ کب پیدا ہوا تھا؟"

"جب میں نے آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔"

"پہلے ہی دن؟" مہرماہ تعجب سے بولی۔

"جی۔"

مہرماہ کے چہرے پر الجھن کا تاثر برقرار رہا۔ وہ سوچتی ہوئی بولی۔ "تمہارا پہلا خط مجھے محل میں ملا تھا۔ تم نے کیسے جان لیا کہ میں شہزادی ہوں۔"

"جب آپ نے مجھ سے دربار کے توسط سے کوئی بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔" عماد نے جواب دیا۔ "لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی میں جان لیتا۔ تصویر مکمل کرنے کے بعد مجھے خیال تھا کہ اب میں آپ کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ اسی لیے میں نے بہت احتیاط سے آپ کا تعاقب کیا تھا۔ جب آپ محل میں گئی تھیں تو میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کا تعلق محل ہی سے ہوگا اور یہ میرے علم میں تھا کہ آپ سے زیادہ کم عمر اس محل میں کوئی نہیں ہے۔"

"یہ تمہیں خانم پھوپی سے پہلے ہی معلوم ہوچکا ہوگا۔"

"جی۔"

"دوسرے خط میں تم نے لکھا تھا، تمہیں اندازہ نہیں کہ میں وہ سفر کرکے کہاں جارہی ہوں؟"

"جی۔" عماد نے کہا۔ "مجھے علم نہیں تھا کہ آپ پہلے بھی یہاں آچکی ہیں۔ پھر یہ کہ میں آپ کی حقیقت جاننے کے بعد کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ پھر اس خط کے بعد تو صدمے سے میری حالت ہی غیر ہوگئی تھی۔"

"صدمہ کیوں؟"

"میں نے آپ کو خط میں لکھا تھا کہ اب آپ سے دور چلا جاؤں گا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب آپ کو کبھی دیکھ بھی نہیں سکوں گا۔ یہ میرے لیے صدمہ ہی تھا۔ اسی صدمے کی وجہ سے میں جب یہاں پہنچا ہوں تو تپ میں مبتلا تھا۔ میں ابھی عرض کرچکا ہوں کہ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہوچکی تھی۔ میں ہیجان کا شکار ہوگیا تھا۔ اگر مجھے شبہ بھی ہوجاتا کہ آپ یہاں پہنچیں گی تو میں ابھی ہرگز گھر نہ آتا، یا شاید کبھی نہ آتا۔ کہیں بہت دور چلا جاتا۔"

مہرماہ غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کچھ رک کر اس نے ایک اور سوال کیا۔ "تم نے عیسائیوں جیسا نام کیوں اختیار کیا تھا؟"

"میں نہیں چاہتا تھا، کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو کہ میں کون ہوں۔ کچھ لوگوں کو تو یقیناً معلوم ہوگا کہ فرہاد پاشا کے ایک بھائی کا نام عماد ہے۔"

"مگر اس کا مقصد؟"

"گھر سے جانے کے بعد تو میں نے دن رات ایک کردیے تھے۔ میں ایک بہترین مصور کی حیثیت سے اتنی شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ میرا نام سلطانِ معظم کے کانوں تک پہنچ جائے۔"

"اس سے کیا ہوتا؟"

عماد نے خانم سلطان کا نام لیا پھر کہا۔ "انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ سلطانِ معظم کو اچھی تصاویر بہت پسند ہیں۔"

"میں نے تو محل میں کبھی کوئی تصویر نہیں دیکھی۔" مہرماہ حیرت سے بولی۔

عماد نے پھر خانم سلطان کے حوالے سے جواب دیا۔ "سلطانِ معظم کے خیال کے مطابق تصویر ایسی ہونا چاہیے کہ اسے دیکھ کر دل چاہے کہ بس دیکھتے رہو اسے...... انہیں کوئی ایسی تصویر نہیں ملی ہوگی۔ میں چاہتا تھا کہ میری شہرت اتنی ہوجائے کہ سلطانِ معظم مجھے طلب کرلیں۔ میں اس طرح دربار تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"اس کا مقصد؟"

اب پھر عماد خاموش رہا۔ اس کے چہرے سے ہچکچاہٹ صاف ظاہر ہورہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ اس کی خاموشی پر مہرماہ پھر بگڑ جاتی، وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "میں

کم عمر تھا جب سلطانِ معظم نے میرے بھائی کو قتل کروایا۔ میں جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا، مجھے اس کی تفصیل معلوم ہوتی رہی۔" اس نے خانم سلطان کے حوالے سے بتایا۔ "انہیں شبہ تھا کہ سلطانِ معظم کو ابراہیم پاشا نے ہی اتنا ورغلایا ہوگا کہ وہ اس کی باتوں پر اعتبار کر بیٹھے اور انہوں نے میرے بھائی کو قتل کروادیا۔"

"خانم پھوپی نے مجھ سے کبھی اس شبہے کا اظہار نہیں کیا۔ خیر! تم اپنی بات جاری رکھو...... دربار تک رسائی پانے کے بعد کیا تم ابراہیم پاشا کو قتل کرنا چاہتے تھے؟"

"میں تحقیق کرنا چاہتا تھا۔" عماد نے جواب دیا۔ "اگر یہ بات ثابت ہوجاتی، یا کم از کم مجھے اس کا یقین ہوجاتا تو میں......" عماد کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور چہرہ سرخ ہوگیا۔ "تو میں ابراہیم پاشا کو قتل کردیتا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ میرے اس اقدام کی وجہ سے میری گردن بھی مار دی جاتی۔"

مہرماہ نے ایک طویل سانس لی۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں۔" عماد نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اگر آپ ہی یہ چاہیں کہ مجھے اپنی گستاخی کی سزا ملے تو اور بات ہے ورنہ میں اب بابِ ہمایوں کی طرف رخ بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں؟"

"اگر میں نے وہاں رسائی حاصل کر بھی لی تو خوف زدہ رہوں گا۔"

"خوف زدہ...... کیوں؟"

"میرے جذبات۔" عماد نے جواب دیا۔ "یہ انسان کو پاگل کردیتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میرا پاگل پن آپ کی رسوائی کا سبب بنے۔"

"لیکن اب تو میری شادی بھی ہوچکی ہے۔ تم جانتے ہو۔"

"زندگی کے ایسے موڑ پر عشق کا جذبہ ختم نہیں ہوجاتا۔ کم از کم میں یہی محسوس کررہا ہوں کہ میرے دل میں وہ شعلہ پہلے سے زیادہ تیز ہوچکا ہے۔" عماد کی آواز بھرا گئی۔ "میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکوں گا آپ کو۔"

"اور اگر میں تمہیں سزا دے بیٹھوں؟ تمہیں قتل کروادوں؟"

"احسان ہوگا یہ آپ کا مجھ پر...... میں سسک سسک کر زندگی گزارنے سے بچ جاؤں گا۔ ہاں، ایک خواہش ضرور ہوگی میری۔"

"وہ کیا؟" مہرماہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میری گردن آپ کے سامنے اڑائی جائے اور آپ دیکھ سکیں کہ میرے خون کے قطروں کی چمک میں میری آنکھیں صرف آپ کی طرف نگراں ہیں۔" عماد کی آواز رندھ سی گئی۔

"نہیں۔" مہرماہ بولی۔ "تمہیں زندہ رہنا ہوگا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ عشق میں آدمی کس طرح سسک سسک کر زندہ رہتا ہے۔" یہ الفاظ سفاکی کے غماز تھے لیکن مہرماہ کے لہجے میں سفاکی نہیں تھی۔ صرف تجسس ہی تھا کہ یہ عشق آخر کیا بلا ہوتا ہے۔

اتنی دیر تک عماد کی نظریں جھکی ہی رہی تھیں۔ اب پہلی مرتبہ اس نے نظر اٹھا کر مہرماہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حسرت دہک رہی تھی۔

"اب مجھے جانا چاہیے۔" مہرماہ کھڑی ہوگئی۔ "اندھیرا پھیلنے والا ہے۔"

وہ اس طرف چل پڑی جہاں اس کی کنیز فروزاں موجود تھی۔ عماد کو اس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ مہرماہ کے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔ "وہ...... شہزادی حضور...... وہ......"

"وہ کارل نہیں ہے۔" مہرماہ نے اس کی بات کاٹی۔ "فرہاد پاشا کا چھوٹا بھائی ہے۔" پھر اس کے لہجے میں سختی آگئی۔ "لیکن اس حیرت انگیز مشابہت کا ذکر تم کسی سے نہیں کروگی۔"

"جی۔" فروزاں نے کہا۔ اس کا چہرہ کچھ عجیب سے تاثرات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ یقیناً اس کے دل نے تسلیم نہیں کیا ہوگا کہ وہ کارل نہیں تھا۔

مہرماہ گم صم سی تھی جب محل میں داخل ہوئی۔

انہی دنوں میں خانم سلطان کا بیٹا اور بیٹی واپس آچکے تھے۔ مہرماہ سے مل کر تو انہیں خوشی ہوئی ہی تھی لیکن عماد سے مل کر تو وہ خوشی کے مارے رونے ہی لگے تھے۔

کچھ ہی دن بعد خانم سلطان کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس شادی کے پندرہ دن بعد مہرماہ نے خانم سلطان سے واپس جانے کی اجازت چاہی۔ ان پندرہ دنوں میں عماد سے اس کا سامنا بہت کم ہوا تھا اور جب بھی ہوا تھا، مہرماہ نے اس سے کسی بھی قسم کی گفتگو سے گریز کیا تھا۔

محل سے رخصت ہوتے وقت مہرماہ نے خانم سلطان سے کہا۔ "میں اب آپ کے پاس آتی ہی رہا کروں گی خانم پھوپی!"

اسے رخصت کرتے وقت خانم سلطان کے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ عماد بھی موجود تھا۔ مہرماہ کی بات سن کر اس کی

آنکھوں میں یہ سوال تڑپنے لگا۔
''کیا آپ یہ دیکھنے کے لیے آتی رہیں گی شہزادی کہ سسک سسک کر کس طرح جیا جاتا ہے؟''

☆☆☆

مہرماہ جس روز پایۂ تخت واپس پہنچی، اسی دن بابِ ہمایوں میں ہلچل مچ گئی۔ والدہ سلطان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ فوراً شاہی اطبا کے ساتھ رئیس الاطبا کو بھی طلب کرلیا گیا تھا۔
دو دن بعد معلوم ہوا کہ والدہ سلطان کو، کوئی اور بیماری بھی لاحق ہوگئی تھی۔ طبیب شب و روز محل میں موجود رہے لیکن والدہ سلطان کی گرتی ہوئی صحت نہیں سنبھال سکے۔
سلطان سلیمان نے فرہاد پاشا کے قتل کے بعد روٹھ جانے والی بہن خانم سلطان کو پہلی مرتبہ خط لکھا۔
''عزیز ہمشیرہ!...... والدہ ماجدہ شدید علیل ہوگئی ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ کب، کیا ہوجائے۔ تم مجھ سے ناراض ہو لیکن کیا والدہ ماجدہ کو دیکھنے بھی نہیں آؤ گی؟''
اس خط نے خانم سلطان کو تڑپا دیا۔ وہ آبھی گئی لیکن اتنا طویل سفر جلدی طے نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے باوجود والدہ کی سانس اس وقت چل رہی تھی۔ شاید اس کی روح کو اتنے دن تک تامل اسی لیے رہا کہ جسدِ خاکی کا ساتھ چھوڑنے سے پہلے ایک مرتبہ اپنی بڑی بیٹی کو دیکھ لے۔
بیٹی نے اپنا سر، ماں کے سینے پر رکھا اور ماں کی روح اپنی منزل کی طرف چلی گئی۔
محل سے سات گھوڑوں کی دموں والا شاہی پرچم اتار کر سیاہ پرچم لگا دیا گیا۔
محل سرا کا سارا انتظام درہم برہم ہوگیا کیونکہ وہاں کا نظام چلانے والی ہی دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔
چہلم کے بعد معاملات دھیرے دھیرے ٹھیک ہونا شروع ہوئے۔ شہزادہ مصطفیٰ ملکہ گل بہار کے ساتھ میگنیشیا واپس چلا گیا۔
''اب تم ہی محل سرا کا انتظام سنبھالو خرم!'' سلطان سلیمان نے خرم سلطان سے کہا۔
اور مہرماہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اب تمام معاملات پر اس کی ماں کی گرفت اور مضبوط ہوجائے گی۔
خانم سلطان کو سلطان سلیمان نے ایک بار پھر روکنا چاہا تھا لیکن وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ واپس چلی گئی۔ عماد اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔
چند ماہ بعد مہرماہ اپنے محل میں منتقل ہوگئی جس کی تعمیر خاص طور پر اسی کے لیے مکمل کی گئی تھی۔

رستم پاشا کو اس محل میں آنے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا لیکن جتنا وقت بھی ملتا تھا، وہ مہرماہ کے لیے ناخوشگوار ہی ہوتا تھا۔
والد اور والدہ کو صبح کا سلام کرنے کے لیے مہرماہ کو بابِ ہمایوں جانا ہی پڑتا تھا لیکن اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہاں کم سے کم وقت گزارے۔ اس کم وقت کا بھی زیادہ حصہ وہ اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ جہانگیر کے ساتھ گزارتی تھی جس کا علاج تو مستقل ہو رہا تھا لیکن رئیس الاطبا نے اب اشاروں کنایوں میں یہ بات کہنا شروع کردی تھی کہ شہزادہ جہانگیر جیسے جیسے بڑا ہوتا جائے گا، اس کی کمر ٹیڑھی ہوتی رہے گی۔ اس کی کمر کی ہڈیاں جو پیدائشی طور پر ابھری ابھری تھیں، ان کا بس اتنا ہی علاج ہو پا رہا تھا کہ انہیں تیزی سے ابھرا ابھرا ہونے سے روکا جا رہا تھا۔ خرم اپنے اس بیٹے کے لیے اکثر اداس ہوجاتی تھی۔
مزید چھ ماہ گزارنے کے بعد مہرماہ پھر خانم سلطان کے محل پہنچ گئی۔ خانم سلطان نے اس بار بھی اسے بڑی محبت سے رکھا۔ دو تین دن گزر گئے۔ مہرماہ کو عماد نظر نہیں آیا۔ چوتھے دن وہ خانم سلطان سے پوچھ ہی بیٹھی۔
''عماد کیا پھر کہیں چلا گیا؟ جب سے آئی ہوں، دکھائی نہیں دیا وہ۔''
خانم سلطان نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ افسردہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔ ''جانے کیا ہوگیا ہے اب اسے؟ تقریباً سارا وقت اپنے کمرے ہی میں گزار دیتا ہے۔ کسی وقت باہر آتا ہے تو بس اپنے بھتیجے اور بھتیجی کے ساتھ رہتا ہے۔ میرے پاس بھی بہت کم وقت بیٹھتا ہے۔ اس نے یہ پابندی بھی لگا دی ہے کہ اس کے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ جب اس کا دل چاہے گا، خود ہی باہر آجایا کرے گا۔''
''عجیب بات ہے۔ یہ پابندی کیوں کہ اس کے کمرے میں کوئی نہ آئے؟''
''سمجھ میں نہیں آتا۔'' خانم سلطان کی افسردگی قائم رہی۔
مہرماہ، خانم سلطان کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔
اگلے دن عماد سے اس کا سامنا اچانک ہوا جب وہ اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ عماد ٹھٹک کر رکا اور پھر اس کے منہ سے جیسے بے اختیار نکلا۔
''میں آپ ہی کے پاس آرہا تھا۔''
''مجھے تو یہاں آئے کئی دن گزر چکے ہیں۔'' مہرماہ نے سنجیدگی سے کہا۔
''معلوم ہوگیا تھا مجھے...... میں آپ کی دادی مرحومہ

کی تعزیت کرنا چاہتا تھا آپ سے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں گا۔ اس وقت بس آگیا۔ اب سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کہوں۔ تعزیت کے موقع پر میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لفظ کہیں کھو گئے ہیں جو مجھے کہنا چاہئیں۔''
''تو کچھ مت کہو۔ یہ رسمی سی بات ہوتی ہے۔ جو کچھ خدا کو منظور تھا، وہ ہوگیا۔''
''آپ کہیں جارہی ہیں؟''
''خانم پھوپی کے پاس جارہی ہوں اور کہاں جاؤں گی۔''
''مجھے اجازت دیجیے۔'' عماد مؤدبانہ انداز میں جھکا اور پھر مہرماہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔
مہرماہ سوچتی ہی رہ گئی کہ یہ عماد کا کون سا روپ ہے؟ یہ عشق کی کون سی منزل ہے؟
وہ متجسس بھی ہوگئی تھی کہ عماد نے دوسروں کے لیے اپنے کمرے میں داخلہ بند کردیا تھا آخر کیوں؟
اس سوال کا جواب خانم سلطان کے پاس بھی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ عماد سے عمر میں بھی خاصی بڑی تھی اور رشتے میں بھی...... اسی نے عماد کی پرورش کی تھی۔ وہ سلطنتِ عثمانیہ کے فرماں روا کی بہن تھی۔ اس صوبے کا موجودہ والی بھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور تھا لیکن خانم سلطان نے یہ حکم صادر نہیں کیا تھا کہ عماد اپنے کمرے میں دوسروں کا داخلہ بند نہیں کرسکتا۔
''میں اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتی۔'' چند دن بعد خانم سلطان نے افسردگی سے کہا تھا۔ ''اس کے دل میں جو محبت اپنے بھائی کے لیے تھی یا ہے، اتنی ہی محبت اس کے دل میں میرے لیے بھی ہے۔ آخر پرورش کی ہے میں نے اس کی۔ میں بھی اسے اتنی ہی شدت سے چاہتی ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہوگا کہ میرے کسی سخت رویے کے باعث وہ ایک بار پھر گھر چھوڑ کر چلا جائے۔ ابھی تک اس نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ چند سال تک کہاں غائب رہا۔''
اس کے بعد مہرماہ نے وہاں پندرہ دن اور گزارے۔ اس عرصے میں عماد سے اس کا اتفاقی سامنا صرف ایک بار ہوا۔
''جانے کیا ہوگیا ہے اسے!'' خانم سلطان نے فکرمندی سے کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ تمہارا سامنا نہ کرنا چاہتا ہو۔ پہلے وہ کھانے وغیرہ کے لیے تو میرے پاس آبیٹھتا تھا۔ تمہارے آنے کے بعد وہ کھانا بھی اپنے کمرے میں کھانے لگا ہے۔ کنیز کھانا لے جاتی ہے لیکن اسے بھی وہ کمرے میں نہیں آنے دیتا۔ دروازے ہی سے کھانے کی سینی اس سے لے لیتا ہے۔''
مہرماہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے زبردستی کی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ آپ کے گھر کا معاملہ ہے خانم پھوپی......! میں اپنے طور پر یہی سمجھتی ہوں کہ مجھے آپ کے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔''
ان کی یہ گفتگو اس وقت ہوئی تھی جب مہرماہ خانم سلطان کے محل سے رخصت ہو رہی تھی...... اس مرتبہ وہ خانم سلطان کے بیٹے کی شادی میں بھی شرکت کرچکی تھی۔
سفر کے دوران میں بھی یہ سوال اس کے دماغ میں کئی مرتبہ ابھرا کہ عماد کے اس روپ کو، کیا مردم بیزاری سمجھا جائے؟
جب مہرماہ اپنے شہر، سلطنتِ عثمانیہ کے پایۂ تخت پہنچی تو شہر میں داخل ہوتے ہی احساس ہوا جیسے وہاں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوچکا تھا۔ لوگوں کے چہروں سے مسکراہٹ غائب تھی اور وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے جیسے انہیں ڈر ہو کہ وہ اگر زور سے بولے تو نہ جانے کیا ہوجائے۔
عام حالات میں مہرماہ سیدھی اپنے محل کا رخ کرتی اور حمام سے فارغ ہونے کے بعد ہی بابِ ہمایوں جاتی لیکن شہر کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ سیدھی بابِ ہمایوں پہنچی۔
جب وہ محل میں داخل ہوئی تو اس نے کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی حالت بھی ایسی دیکھی جیسے وہ سہمے ہوئے ہوں۔
ایک جگہ کنیزوں کی سربراہ رقیہ بیگم اور آغا طوبور سرگوشیوں میں باتیں کرتے نظر آئے۔ وہ مہرماہ کو دیکھتے ہی چونکے اور مؤدبانہ انداز میں جھکے۔ مہرماہ ان سے ہی صورتِ حال کے بارے میں کوئی استفسار کرتی لیکن اسی وقت رستم پاشا سے سامنا ہوگیا۔
''خوش آمدید شہزادی!'' رستم پاشا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔
''کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے رستم پاشا؟'' مہرماہ نے پوچھا۔
''میرے ساتھ آیئے!'' رستم پاشا نے ایک طرف قدم بڑھائے۔
''بات کیا ہے؟'' مہرماہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔
''ابراہیم پاشا ایک مہم سے کل شام لوٹے تھے۔ ان سے بات چیت کے بعد جب آقا اپنی خواب گاہ میں جانے لگے تو انہوں نے ابراہیم پاشا کو حکم دیا کہ آج وہ اپنے محل

جانے کے بجائے دیوانِ خاص ہی میں ٹھہریں۔ شہزادی خورد سلطان کو پیغام بھیج دیا گیا تھا کہ کسی مصروفیت کی وجہ سے ابراہیم پاشا کو بابِ ہمایوں میں روک لیا گیا ہے لہٰذا وہ ان کا انتظار نہ کریں۔ ابراہیم پاشا نے رات دیوانِ خاص ہی میں گزاری جہاں ان کے لیے بستر لگا دیا گیا تھا۔"

مہرماہ کچھ کہتی لیکن اس وقت وہ دونوں دیوانِ خاص میں داخل ہو رہے تھے اور وہاں کا منظر دیکھ کر مہرماہ کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ اسے دیواروں پر خون کے دھبے نظر آئے تھے۔ ابراہیم پاشا وہاں موجود نہ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" مہرماہ کے منہ سے نکلا۔

"خون کے دھبے ہیں شہزادی!"

"کس کے خون کے؟" مہرماہ نے تیزی سے پوچھا۔

"ابراہیم پاشا کے؟"

"کیا ہوا اسے؟ کسی نے حملہ کیا اس پر؟ زخمی کر دیا اسے؟"

"جی نہیں۔" رستم پاشا کا لہجہ پُرسکون تھا۔ "زخمی ہونے کی بات نہیں۔ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔"

مہرماہ چونکی۔ "کس نے قتل کیا؟"

"جلاد نے۔" رستم پاشا نے جواب دیا۔ "حکم آقا کا تھا۔"

پھر مہرماہ کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔ اس کا سارا جسم سنسنانے لگا تھا۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑی رہی پھر مڑ کر تیز تیز چلتی ہوئی خرم سلطان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی سانس پھولی ہوئی سی تھی۔

"آؤ مہرماہ!" ٹہلتی ہوئی خرم سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے اطلاع بھی نہیں بھجوائی اپنے آنے کی؟"

"یہ کیا ہوا ہے والدہ؟"

"مجھے ابھی ایک کنیز نے بتایا ہے کہ تم رستم پاشا کے ساتھ دیوانِ خاص کی طرف گئی تھیں۔ وہاں تمہیں معلوم نہیں ہوا، کیا ہوا ہے؟"

"والدہ!" مہرماہ پلکیں جھپکائے بغیر بولی۔ "آپ ابراہیم پاشا کے خلاف تھیں۔"

"مجھے اس سے انکار نہیں۔" خرم سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں ابراہیم کو صرف اپنے لیے ہی نہیں، سلطنتِ عثمانیہ بلکہ خانوادۂ عثمانیہ کے لیے خطرہ سمجھتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ اسے اس منصب سے ہٹا دیا جائے۔ سلیمان اس جیسے شخص کے قتل کا حکم میری وجہ سے صادر نہیں کر سکتے۔"

"شاہ بابا نے یہ حکم کیوں صادر کیا؟"

"کب تک چشم پوشی سے کام لیتے۔ وہ اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس نے جو فتوحات حاصل کیں، اس کا سبب ینی چریوں کی بہادری اور خود سلیمان کی منصوبہ بندی تھی لیکن وہ خود کو سکندر سے بھی بڑا فاتح سمجھنے لگا تھا اور مغرور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سلیمان کے علم میں یہ بات بھی آ چکی تھی کہ فرانسیسیوں سے کیے گئے معاہدے پر ابراہیم نے سلطان کے لقب کے ساتھ دستخط کیے تھے۔ سلیمان نے اسے بھی نظر انداز کیا تھا لیکن اس مرتبہ ابراہیم نے جو حرکت کی، اسے سلیمان برداشت نہ کر سکے۔ اس مرتبہ کی مہم میں انہوں نے سکندر چلیبی کو ابراہیم کا ماتحت بنا کر بھیجا تھا۔ ان دونوں میں نہ جانے کیا ذاتی دشمنی تھی کہ ابراہیم پاشا نے اس پر خزانے میں چوری کا الزام لگا کر پھانسی دے دی۔ اگر سکندر چلیبی نے واقعی ایسا کیا تھا تو بھی یہ معاملہ ثبوت کے ساتھ سلیمان کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ سلیمان ہی اس کا فیصلہ کرتے لیکن ابراہیم پاشا کی خودسری تو آسمان کو چھونے لگی تھی۔ کل اس کی واپسی ہوئی لیکن اس سے پہلے خیرالدین باربروسہ نے آ کر سلیمان کو آگاہ کر دیا تھا کہ ابراہیم پاشا کا الزام جھوٹا تھا۔ اس مہم میں باربروسہ بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا۔"

سب کچھ تفصیل سے جان لینے کے باوجود مہرماہ سوال کر بیٹھی۔ "کیا ابراہیم پاشا کو بتا دیا گیا تھا کہ اس کا جرم کیا ہے؟"

"مجھے اس کا علم نہیں۔ کسی وقت پوچھوں گی سلیمان سے۔ ابھی تو افسردگی کے عالم میں ہیں۔ ان کے اس اقدام سے بہرحال ان کی ایک بہن بیوہ ہو گئی ہے۔"

"دوسری بہن!" مہرماہ بول پڑی۔

"ٹھیک کہا تم نے۔"

"ابراہیم پاشا کی لاش؟" مہرماہ نے ایک اور سوال کیا۔

"تدفین کے لیے بھجوا دی گئی ہے۔"

"خورد سلطان پھوپی؟"

"ظاہر ہے کہ وہ شدید صدمے میں ہوگی۔ میں تعزیت کے لیے اس کے محل گئی تھی لیکن اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ ابراہیم کو میں نے قتل کرایا ہے۔"

"کیا میں ان سے ملنے جاؤں؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ تم سے بھی نہیں ملے گی۔"

خرم سلطان کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ مہرماہ خورد سلطان کے محل گئی لیکن خورد سلطان اس سے ملنے

کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوئی۔ مہرماہ نے افسردگی کے عالم میں اپنے محل کا رخ کیا۔ اس کے دماغ میں ہیجان برپا تھا۔ رستم پاشا سے ابراہیم پاشا کے قتل کی بات سن کر اس کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس کی والدہ ہی نے اس کے شاہ بابا کو ورغلا کر ابراہیم پاشا کے قتل کا حکم صادر کروایا ہوگا لیکن خیرالدین باربروسہ کا حوالہ ملنے کے بعد اسے اپنے ذہن سے یہ خیال جھٹکنا پڑا۔

خیرالدین باربروسہ سلطان سلیمان کے والد سلطان سلیم ہی کے عہد سے سلطنتِ عثمانیہ کا وفادار تھا۔ اسے مختلف خطابات سے نوازا گیا اور ترک بحری بیڑے کا امیر البحر بنا دیا تھا۔

قسطنطنیہ کے امراء میں یہ بات مشہور تھی کہ پچاس سالہ باربروسہ کسی قیمت پر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس کے "سچ کی تلخی" سلطان سلیمان کو بھی برداشت کرنا پڑتی تھی کیونکہ سلطنتِ عثمانیہ سے اس کی وفاداری کا دامن قطعی بے داغ تھا۔

اس سے قطع نظر کہ ابراہیم پاشا کیسا آدمی تھا، مہرماہ پر اس کے قتل کے گہرے اثرات ہوئے تھے۔ بہت دن تک وہ اپنے محل سے باہر نکلی ہی نہیں۔ اسے بس اطلاعات ملتی رہیں کہ باہر کیا ہو رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ سلطان سلیمان نے وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر بوڑھے ایاز پاشا کو فائز کر دیا تھا۔ مہرماہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی تھی کہ اس معاملے میں اس کی والدہ کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ وہ تو اس منصب پر رستم پاشا کو دیکھنا چاہتی تھی۔

خورد سلطان کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ نیم پاگل سی ہو گئی تھی۔ در و دیوار سے لپٹ کر باتیں کیا کرتی تھی۔

کچھ دن بعد خانم سلطان، خورد سلطان سے تعزیت کے لیے آئی۔ دس بارہ دن اس کے محل میں رہی۔ دو دن اس نے مہرماہ کے محل میں آ کر بھی گزارے لیکن سلطان سلیمان سے ملنے نہیں گئی۔

تین سال بعد مہرماہ کی طبیعت کچھ خراب ہوئی تو طبیبہ نے اسے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ مہرماہ کسی قیمت پر رستم پاشا کی اولاد کی ماں نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے اسقاط کرا دیا اور نہایت درشت لہجے میں طبیبہ سے کہا۔ "اگر والدہ یا رستم پاشا کو اس کا علم ہوا تو یاد رکھنا، تمہارا سر تمہارے شانے پر نہیں رہے گا۔"

اسی سال یہ بھی ہوا کہ بوڑھا ایاز پاشا طاعون کا شکار ہو کر وفات پا گیا۔ اس مرتبہ اس کی جگہ رستم پاشا کو مل گئی۔ اس موقع پر خرم سلطان یقیناً بہت خوش ہوئی ہوگی لیکن مہرماہ کے لیے یہ خوشی کی بات ہرگز نہیں تھی کہ اب اس کا شوہر سلطنتِ عثمانیہ کا وزیرِاعظم تھا۔

دو سال بعد مہرماہ پھر ماں بننے والی تھی جب اس نے پھر اسقاط کرا دیا۔

ان پانچ سالوں میں مہرماہ تین مرتبہ خانم سلطان سے ملنے گئی تھی۔ دو مرتبہ ایک ایک ماہ وہاں رہی تھی۔ تیسری مرتبہ چند دن رہ کر ہی واپس آ گئی تھی۔ اس مرتبہ اسے یہ جان کر وحشت سی ہونے لگی تھی کہ عماد نے اپنے کمرے کے برابر کا ایک اور کمرا بھی اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اس کمرے کے داخلی دروازے پر اینٹیں چنوا دی تھیں تاکہ کوئی ادھر سے اندر داخل نہ ہو سکے۔ اس مرتبہ اس کی صحت بھی کچھ گری گری سی نظر آئی تھی۔

ایک سال اور گزرا تھا کہ طبیبہ نے ایک موقع پر مہرماہ سے کہا۔

"میں بڑی معذرت کے ساتھ عرض کروں گی شہزادی صاحبہ کہ اس مرتبہ آپ اسقاط نہیں کروا سکتیں۔"

"کیا مطلب؟" مہرماہ چونکی۔

طبیبہ نے نظریں جھکا کر کہا۔ "آپ پھر ماں بننے والی ہیں۔ اس مرتبہ اسقاط کروانے سے آپ کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

مہرماہ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔

سولہویں صدی اپنا نصف سفر طے کر چکی تھی جب میگنیشیا سے خبر آئی کہ ملکہ گل بہار کا انتقال ہو گیا تھا۔ مہرماہ پر اس کا کوئی جذباتی ردِعمل نہیں ہوا۔ خرم سلطان نے بھی "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھنے پر اکتفا کیا تھا۔ مہرماہ کو اس پر ضرور تعجب ہوا کہ سلطان سلیمان پر اس خبر کا کوئی مثبت یا منفی ردِعمل نہیں ہوا تھا۔ اس کا سبب مہرماہ کو کچھ عرصے بعد اس دن معلوم ہوا جب ترک سپاہ کسی مہم پر جانے کے لیے اپنی تیاری کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ خود سلطان سلیمان اس لشکر کی قیادت کرتا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی بہت اہم مہم درپیش تھی۔

مہرماہ کو اوائل عمری سے سلطنت کے کسی بھی قسم کے امور سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے تجسس نہیں ہوا کہ اس مہم کے بارے میں جاننے کے لیے بابِ ہمایوں کا رخ

کرتی لیکن اسے اطلاع ملی کہ اس کی والدہ خرم سلطان نے اسے فوراً طلب کیا تھا۔

یہ پیغام ملنے کے بعد مہرماہ نے باب ہمایوں پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ جب وہ راہداری طے کرتی ہوئی خرم سلطان کی خواب گاہ کے قریب پہنچی تو اس نے خواب گاہ سے شاہی طبیبہ کو نکلتے دیکھا۔ طبیبہ اسے دیکھ کر مؤدبانہ انداز میں جھکی۔

"خیریت؟" مہرماہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"خیریت ہے شہزادی!" طبیبہ کے لہجے میں اطمینان تھا۔ "اور خیریت ہی رہے گی...... انشاءاللہ!"

طبیبہ کے لہجے سے مہرماہ کی بے تابی ختم ہوئی اور اس نے کمرے میں قدم رکھا۔ خرم سلطان بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

"والدہ!" مہرماہ مؤدبانہ جھکی۔

"خوش آمدید نورِ چشم!...... آؤ...... میرے قریب آؤ......"

"آپ کی طبیعت......" مہرماہ نے اس کے قریب جاتے ہوئے پوچھنا چاہا۔

"صبح سے طبیعت کچھ خراب ہے۔ طبیبہ کا کہنا تو یہی ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں لیکن...... جانے کیوں...... مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری علالت میں اضافہ ہوگا۔"

"خدا نہ کرے والدہ!" مہرماہ نے جلدی سے کہا۔ "ایسی بات زبان پر لانا اچھا نہیں ہوتا۔"

"بیٹھو! مجھے تم سے کچھ اہم باتیں کرنا ہیں لیکن اس سے پہلے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

مہرماہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"نورِ چشم!" خرم سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہاری شادی کو خاصا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ تمہاری ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں ہو سکی۔"

مہرماہ دکھ سے مسکرائی۔ "آج پوچھ رہی ہیں آپ...... اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد؟"

"خیال تو آتا رہتا تھا لیکن میں پوچھتی نہیں تھی۔" خرم سلطان نے کچھ افسردہ سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "غلطی ہوئی تھی مجھ سے۔ میں نے رستم پاشا کے اور تمہارے مزاجوں کے فرق کو نہیں سمجھا تھا اور تمہاری شادی کر دی تھی۔ اتنے عرصے میں یہ بات چھیڑی اس لیے نہیں کہ اب مداوا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ بہرحال، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے طلاق کے بارے میں نہیں سوچا۔"

"کیسے سوچتی والدہ!" مہرماہ کی آواز کچھ بھرا گئی۔ "میرے علم کے مطابق، خانوادۂ عثمانیہ کی کسی شہزادی کو طلاق نہیں ہوئی، کسی نے طلاق نہیں لی۔ میں اپنے خاندان پر یہ داغ کیسے لگاتی۔ جس طرح بن پڑا، وقت گزار رہی ہوں۔"

"مرحبا نورِ چشم!" خرم سلطان نے کہا۔ "مجھے کبھی کبھی خیال آیا تھا کہ شاید یہ قدم اٹھا کر تم مجھے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے آج میں تم سے کہنا چاہتی ہوں کہ اب بھی اس بارے میں نہ سوچنا۔ میں نہ رہوں تو بھی۔"

مہرماہ نے جلدی سے خرم سلطان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ابھی کہہ چکی ہوں کہ ایسی بات زبان پر لانا اچھا نہیں ہوتا۔"

خرم سلطان نے اس کا ہاتھ چوم لیا اور مسکرائی۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ "میں نے خاص طور سے دو اہم باتیں بتانے کے لیے بلایا تھا تمہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہاری شادی سے بھی پہلے کا ایک معما حل ہو گیا۔"

"کون سا معما والدہ؟"

"بایزید پر جان لیوا حملے کا معما۔"

"معلوم ہو گیا کچھ؟" مہرماہ نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں۔" خرم سلطان نے کہا۔ "یہ تو شاید بتا چکی ہوں تمہیں کہ حبشی خواجہ سرا پر جس دریچے سے تیر چلایا گیا تھا، وہ دریچہ سلیم کی خواب گاہ کی راہداری کا ہے۔"

"یہ اگر آپ نے مجھے بتایا تھا تو اب مجھے یاد نہیں۔ تو کیا سلیم بھائی......"

"نہیں۔" خرم سلطان نے بات کاٹتے ہوئے کہا پھر بولی۔ "میں نے اس معاملے کی تحقیق رستم پاشا کو سونپ دی تھی۔ اس نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ جس وقت اس حبشی پر تیر چلایا گیا تھا، سلیم اپنی خواب گاہ میں تھا نہ راہداری میں۔ اسے مصطفیٰ نے کوئی خاص بات کرنے کے لیے باغ میں بلایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کی خواب گاہ کے دونوں دربان بھی ذرا دیر کے لیے ادھر ادھر ہو گئے تھے اس لیے وہ بھی نہیں دیکھ سکے کہ راہداری کے دریچے سے کس نے تیر چلایا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اس معاملے میں سلیم بھائی کا ہاتھ تھا نہ مصطفیٰ بھائی کا!" مہرماہ بول پڑی۔

خرم سلطان کچھ رک کر بولی۔ "کچھ دن بعد رستم پاشا کو شبہ ہوا کہ اس معاملے میں رقیہ بیگی کچھ جانتی تھی اور چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے بھی رقیہ بیگی سے پوچھ گچھ کی۔ اسے ڈرایا دھمکایا بھی لیکن اس نے زبان نہیں کھولی۔ کچھ عرصے بعد رستم پاشا کو اسی قسم کا شبہ آغا طوبور پر

بھی ہوا لیکن پوچھ گچھ کرنے پر اس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

مہرماہ سلطان توجہ سے سنتی رہی۔ خرم سلطان بولتی رہی۔

"جب آغاؤں اور کنیزوں کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو انہیں محل سے رخصت کر دیا جاتا ہے۔ والدہ سلطان کے انتقال کے چند سال بعد انہیں الگ کیا جانا چاہیے تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ والدہ کے بعد حرم سرا پر مجھے مکمل اختیار حاصل ہو گیا تھا اس لیے میرے ہی فیصلے کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ان دونوں کو اس سے الگ نہیں کیا تھا کہ کبھی نہ کبھی شاید انہی دونوں کی وجہ سے حقیقت سامنے آئے اور آخر...... ابھی کوئی ہفتہ بھر پہلے حقیقت سامنے آ گئی۔"

"کیسے؟" مہرماہ نے بے تابی سے پوچھا۔ "کس نے مارا تھا تیر؟"

"مصطفیٰ نے۔"

"کیا!" مہرماہ شدت سے چونکی۔ "مصطفیٰ بھائی نے؟"

"ہاں۔"

"ابھی تو آپ نے بتایا کہ مصطفیٰ بھائی نے سلیم بھائی کو باغ میں بلایا تھا؟" مہرماہ نے تعجب کا اظہار کیا۔ "وہ دونوں تو وہاں ہوں گے اس وقت۔"

"سلیم باغ میں کچھ دیر انتظار کر کے محل میں واپس آ گیا تھا۔ مصطفیٰ باغ میں نہیں ملا تھا۔ جب وہ محل میں داخل ہوا تو اسے بایزید کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی اطلاع ملی۔ اس سے میں نے ہی بات کی تھی۔ روا روی کے سے انداز میں میں نے مصطفیٰ سے بھی سوال کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک کتب خانے کا افتتاح کرنے گیا ہوا تھا۔ بعد میں رستم پاشا نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مصطفیٰ، بایزید کے واقعے سے پہلے کتب خانے سے واپس آ گیا تھا۔"

"سلیم بھائی کو اطلاع کس نے دی تھی کہ مصطفیٰ بھائی......"

خرم سلطان نے اس کی بات کاٹی۔ "گلِ بہار کی کوئی کنیز تھی۔ بعد میں سلیم کو یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کون تھی۔ یہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ بایزید پر تیر چلانے والا مصطفیٰ تھا۔ اس پر بس شبہ ہی کیا جا سکتا تھا لیکن اب ایک ہفتے پہلے ثبوت بھی مل گیا۔"

"ہاں۔" مہرماہ بولی۔ "وہی بتانے جا رہی تھیں آپ!"

خرم نے سر ہلایا پھر کہا۔ "اس شام میں نے سلیمان سے کہا تھا کہ وہ جلدی خواب گاہ میں آ جائیں اور کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں۔ دراصل ان دنوں ان کی مصروفیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں دیر تک امورِ سلطنت سے متعلق کام کرتے رہتے تھے۔ مجھے خیال تھا کہ وہ کام میں میری بات بھول جائیں گے اس لیے میں خود انہیں لینے چلی گئی تھی۔ جب میں انہیں لے کر اپنی خواب گاہ کی طرف آ رہی تھی تو ایک جگہ ہمیں ایک کمرے سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ مصطفیٰ کا نام آنے کی وجہ سے ہم دونوں ہی ٹھٹک کر رک گئے۔ کمرے میں رقیہ بیگی اور آغا طوبور تھے۔ ان کی گفتگو تیز تیز سرگوشیوں میں ہو رہی تھی۔ رقیہ بیگی اس خوف کا اظہار کر رہی تھی کہ انہیں اس عمر تک محل سے الگ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں مشتبہ ہو چکے ہیں اور انہوں نے یہ چھپا کر غلطی کی ہے کہ انہوں نے شہزادہ مصطفیٰ کو حبشی خواجہ سرا پر تیر چلاتے دیکھ لیا تھا۔ رقیہ بیگی اسے غلطی قرار دے رہی تھی اور آغا طوبور کہہ رہا تھا کہ اگر وہ حقیقت کا اظہار کر دیتے تو نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اس لیے شہزادہ مصطفیٰ پر تہمت لگانے کے الزام میں ان پر سلطان کا عتاب نازل ہوتا۔"

مہرماہ نے اپنا سر تھام لیا۔ "پھر؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"یہ سب کچھ سن کر سلیمان کو غصہ آنا ہی چاہیے تھا۔ آغا طوبور اور رقیہ بیگی کو کمرے میں طلب کر لیا گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان دونوں کے جھگڑے کی ساری باتیں سن لی گئی ہیں تو ان کے چہرے فق پڑ گئے۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے سلطان کے قدموں پر گر پڑے۔ ان دونوں نے بڑے طویل عرصے تک یہ راز چھپائے رکھا تھا جو ایک سنگین جرم تھا۔ اس پر ان دونوں کی گردن بھی اڑائی جا سکتی تھی۔ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ ان دونوں کا موقف بالکل درست تھا۔ اگر وہ اس وقت اس راز سے پردہ اٹھاتے تو ان پر یقین نہیں کیا جاتا، الٹا وہ خود ہی معتوب ہوتے۔ میری بات سلطان کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ دونوں سزا سے بچ گئے۔ دراصل ان دنوں وہ پہلے ہی سے بہت ناراض تھے مصطفیٰ پر۔"

"کیوں والدہ؟"

"پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ ایک کنیز کی کسی غلطی پر تمہارے شاہ بابا نے حکم صادر کر دیا تھا کہ اسے محل سے نکال دیا جائے چنانچہ اسے نکال دیا گیا۔ وہ مصطفیٰ کی ریاست چلی گئی تھی اور محل میں جا کر مصطفیٰ کے سامنے گڑگڑائی تھی کہ غلطی کسی اور کی تھی جو اس پر ڈال دی گئی۔ مصطفیٰ نے نہ صرف یہ بات مان لی بلکہ اس کنیز سے تعلق بھی قائم کر لیا۔ اس کنیز سے اب اس کا چار سال کا بیٹا ہے۔ اس نے یہ سب کچھ راز میں رکھا تھا۔ محل کے بہت خاص لوگ اس راز سے واقف تھے۔ مصطفیٰ یہ بات خاص طور پر

تمہارے شاہ بابا سے چھپانا چاہتا تھا مگر دس دن قبل یہ بات کسی طرح سلیمان کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ معاملہ گل بہار نے بھی چھپا دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا راز کیسے فاش کرتی؟ سلطان کو اس پر بھی شدید غصہ آیا تھا۔ پھر رقیہ بیگی اور آغا طوبور کا واقعہ جلتی پر تیل بن گیا۔ رہی سہی کسر اس سے اگلے ہی دن پوری ہوگئی جب سلیمان کو معلوم ہوا کہ مصطفیٰ بغاوت پر تل گیا ہے اور باپ کو معزول کر کے تخت پر قابض ہونا چاہتا ہے۔''

''نہیں والدہ!'' مہر ماہ کا جسم ہی نہیں، دماغ بھی سنسنا گیا۔ ''مصطفیٰ بھائی اس حد تک جاسکتے ہیں۔''

''اقتدار کا نشہ ایسا ہی ہوتا ہے نورِ چشم!'' خرم سلطان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''پھر جب اس نشے کو مہمیز کر دیا جائے تو پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ میرا خیال ہے، مصطفیٰ کو اسی کنیز نے ورغلایا ہوگا جو اب اس کے چار سالہ بیٹے کی ماں ہے۔ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا ہے کہ ایرانیوں نے پہاڑوں سے نکل کر ارضِ روم پر قبضہ کرلیا ہے۔ سلیمان نے رستم پاشا کی سرکردگی میں ایک لشکر ایرانیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا۔''

ان دنوں شہزادہ مصطفیٰ ریاست اماسیہ کا والی تھا۔ خرم سلطان نے بتایا کہ جب ترک لشکر اماسیہ سے گزر رہا تھا تو نہ صرف اس کی رفتار سست پڑ گئی بلکہ سپاہیوں نے یہ مطالبہ بھی شروع کر دیا کہ بادشاہ اگر اتنا بوڑھا ہوگیا ہے کہ لشکر کی قیادت نہیں کرسکتا تو اس لشکر کی سپہ سالاری شہزادہ مصطفیٰ کو سونپی جانا چاہیے تھی۔ وہ رستم پاشا کی قیادت قبول نہیں کریں گے کیونکہ وہ عثمانی نسل سے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات تک سننے میں آئی کہ وہ رستم پاشا کو قتل کر کے سلطان سلیمان کو معزول کر دیں گے تاکہ انہیں ایک ضعیف بادشاہ سے نجات مل جائے اور سلطنتِ عثمانیہ کے تخت پر شہزادہ مصطفیٰ بیٹھ سکے۔

مہر ماہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ''یقین نہیں آرہا والدہ!''

''اسی لیے سلطان نے خود وہاں جاکر معاملے کی تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہیں یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ مصطفیٰ ہی نے اس معاملے میں سپاہ کو اکسایا ہے۔ آخر اماسیہ ہی کی حدود میں ایسا کیوں ہوا۔''

''والدہ!'' مہر ماہ کی آواز لرزیدہ ہی رہی۔ ''بغاوت کی سزا تو موت ہے، خواہ وہ باغی، بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔''

''خدا سلطنتِ عثمانیہ پر رحم فرمائے۔'' خرم سلطان نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ معاملہ یوں زیادہ خراب ہوتا نظر آرہا ہے کہ سلیمان پہلے ہی سے غصے میں تھے۔ کنیز اور اس کا بیٹا..... پھر بایزید کا معاملہ..... اور اب یہ..... دیکھو کیا ہوتا ہے۔ سلطان کل روانہ ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف سے یہ خبریں بھی مل رہی ہیں کہ سلیم اور بایزید باقاعدہ ایک دوسرے کے خلاف ہوگئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مصطفیٰ کو بغاوت کی سزا دے دی گئی تو تمہارے دونوں ہی بھائی ولی عہد بننے کے لیے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں گے۔ یہی سب کچھ سوچ سوچ کر میری طبیعت خراب ہوئی ہے۔ تم ہمیشہ بایزید ہی کی حمایت کرنا نورِ چشم!''

''آپ جانتی ہیں والدہ کہ مجھے زیادہ محبت بایزید بھائی ہی سے ہے اور ویسے بھی اگر سلیم بھائی ولی عہد بنے تو یہ سلطنتِ عثمانیہ کے حق میں بہت برا ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ بیس پچیس شادیاں تو وہ کر چکے ہیں۔''

''ٹھیک سنا ہے تم نے!'' خرم سلطان نے ٹھنڈی سانس لی۔

ان دنوں بایزید قونیہ کا اور سلیم مغنیسیہ کا والی تھا۔

مہر ماہ نے کچھ رک کر پوچھا۔ ''جہانگیر کا کیا حال ہے؟''

''اس کا کیا حال ہوتا۔'' خرم سلطان زیادہ غمگین نظر آنے لگی۔ ''تمہیں معلوم ہی ہے وہ تو ہر وقت اپنے کمرے ہی میں پڑا رہتا ہے۔''

کبڑا ہونے کی وجہ سے شہزادہ جہانگیر کو خواجہ سراؤں اور کنیزوں کے سامنے آتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی تھی اس لیے عرصہ دراز سے اس نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کرلیا تھا۔

خرم سلطان سے اجازت لے کر مہر ماہ شہزادہ جہانگیر کے کمرے میں پہنچی۔ کچھ وقت اس نے اپنے بھائی کے ساتھ گزارا، پھر اپنے محل آگئی۔ وہ ذہنی طور پر خاصی منتشر ہوگئی تھی۔

☆☆☆

آنے والے وقت اور واقعات نے مہر ماہ کو پے در پے ذہنی جھٹکے لگائے۔ شہزادہ مصطفیٰ کو ''ارگلی'' کے مقام پر سلطان سلیمان کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ وہاں سے سلطان سلیمان واپس لوٹا تو خاصا افسردہ تھا۔ پھر اس کی افسردگی میں مزید اضافہ ہوا جب اس نے خرم سلطان کو خاصا علیل پایا۔ دوسری طرف سے یہ اطلاعات بھی آرہی تھیں کہ شہزادہ مصطفیٰ کے بعد شہزادہ سلیم اور شہزادہ بایزید کے تعلقات میں کشیدگی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔

سلطان سلیمان نے کسی مصلحت سے یہ حکم صادر کیا کہ بایزید قونیہ سے اماسیہ، اور سلیم مغنیسیہ کوتاہیہ چلا جائے۔ شہزادہ سلیم نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن شہزادہ بایزید نے قونیہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ یہ گویا سلطان سلیمان سے بغاوت کا اعلان تھا۔ مہرماہ نے بایزید کو خط لکھ کر سمجھانے کی کوشش کی، اسے شاہ بابا کے حکم کی تعمیل کرنا چاہیے لیکن اس خط کا جواب تک نہیں آیا۔

سلطان سلیمان کو اس حکم عدولی پر شدید غصہ آیا۔ مصطفیٰ کے بعد وہ بایزید کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو جاتا لیکن خرم سلطان کی بڑھتی ہوئی علالت کے باعث وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکا۔ وہ اس حالت میں اپنی محبوب بیوی سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا۔

خود مہرماہ اپنی والدہ کی بیماری کے باعث اپنا محل چھوڑ کر مستقل طور پر باب ہمایوں آ گئی تھی اور اگرچہ علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں تھی لیکن مہرماہ اپنی ماں کے بستر کے قریب رہتی یا جہانگیر کے کمرے کی طرف دوڑ لگاتی۔ ہر وقت کمرے میں پڑے رہنے کی وجہ سے وہ پیٹ کی کئی بیماریوں کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ بہت جلد چٹ پٹ ہو گیا۔ اس کے انتقال کا صدمہ خرم سلطان کی بیماری پر مزید اثر انداز ہوا۔

مہرماہ نے ماں کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا لیکن خدمت گزاری سے موت کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ طویل علالت کے بعد خرم سلطان بھی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

سلطان سلیمان اور مہرماہ پر قیامت گزر گئی۔

ممکن نہیں تھا کہ خرم سلطان کی موت کی خبر شہزادہ سلیم اور شہزادہ بایزید تک نہ پہنچی ہو مگر اس موقع پر ان دونوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سلطان سلیمان سے خائف ہوں گے۔

خانم سلطان تو قسم کھا چکی تھی کہ باب ہمایوں میں کبھی قدم نہیں رکھے گی۔ اگرچہ والدہ سلطان کی وفات پر اس کی یہ قسم ٹوٹ چکی تھی لیکن اس موقع پر اس نے مہرماہ کے نام ایک تعزیتی خط لکھنے پر اکتفا کیا تھا۔

خورد سلطان پر ابراہیم پاشا کے قتل کے بعد جو وحشت طاری ہوئی تھی، وہ اب مکمل دیوانگی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اسے اپنے بچوں تک کا ہوش نہیں رہا تھا تو خرم سلطان کی موت کی اطلاع کا اس پر کیا اثر ہوتا اور اگر اثر ہوتا بھی تو شاید وہ نہ آتی۔ اس نے ابراہیم پاشا کے قتل کا سبب ہی خرم سلطان کو سمجھا تھا۔

سلطان سلیمان کو بھی اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بہت دن تک گم صم رہا۔ ان دنوں میں سلطنت کے معاملات رستم پاشا اور اس کا نائب صوقولی پاشا دیکھتے رہے۔

مہرماہ کو اب باب ہمایوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے محل چلی آئی۔ رستم پاشا سے اس کے تعلقات بدستور ناخوشگوار رہے۔

ان تین برسوں میں مہرماہ کو خانم سلطان کے پاس جانے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ وہاں چلی جائے تو ایک ایسی خبر آئی کہ اس کا دماغ شل ہو کر رہ گیا۔

قونیہ میں بایزید نے اپنی سپاہ میں اضافہ شروع کر دیا تھا۔ گویا اب دونوں بھائیوں میں جنگ چھڑنے والی تھی۔

مہرماہ نے سنا کہ اب سلطان سلیمان قونیہ روانہ ہو رہا ہے۔ اس روانگی کا مقصد دونوں بھائیوں کی چپقلش ختم کروانا بھی ہو سکتا تھا لیکن بایزید کی حکم عدولی کے باعث مہرماہ کے دل و دماغ میں خدشات کلبلانے لگے تھے۔

کچھ عرصے بعد خبر آئی کہ سلطان کے وہاں پہنچنے سے ذرا ہی پہلے، دونوں بھائیوں میں جنگ ہو گئی تھی۔ اس جنگ میں بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ اماسیہ کی طرف بھاگا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔

اب سلیم کو باپ کی حمایت حاصل ہو گئی اور بایزید کے باغی ہو جانے کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

ایران کے شاہ طہماسپ صفوی نے بہت خوشی سے بایزید کو پناہ دی تھی۔ اس طرح وہ اپنے کچھ مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سلطان سلیمان کو پیغام بھیجا کہ ارضِ روم اور دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ بایزید کو عطا کر دیا جائے۔

اس طرح شاہ طہماسپ ان صوبوں کو ایران کے زیرِ اثر لانا چاہتا تھا۔

سلطان سلیمان کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ اتنا بڑا لشکر لے کر وہاں نہیں پہنچا تھا کہ ایران کے مقابل باقاعدہ صف آرا ہو سکتا اس لیے اس نے خط کتابت ہی جاری رکھی اور پھر دونوں فریق ایک معاہدہ کرنے پر تیار ہو گئے۔

مہرماہ کو یہ علم نہیں ہو سکا کہ وہ معاہدہ کیا تھا لیکن اسے یہ معلوم ہو گیا کہ طہماسپ نے بایزید کو اس کے چاروں بیٹوں اور اس کے حرم کے ساتھ سلطان سلیمان کے حوالے کر دیا تھا۔

اس حوالگی کی خبر سے مہرماہ پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کے دل میں جو خدشہ پیدا ہوا تھا، وہ درست ثابت ہوا۔

بایزید کو اس کے بیٹوں سمیت قتل کر دیا گیا تھا۔

سلطان سلیمان اپنے زندہ رہ جانے والے ایک بیٹے شہزادہ سلیم سے بھی کچھ زیادہ خوش نہیں تھا اور اسی لیے واپس پایۂ تخت آتے ہوئے اس کا خیال تھا کہ اپنی عزیز بیٹی مہرماہ کے ساتھ ہی باقی زندگی گزار دے گا لیکن مہرماہ کو اپنے بھائی بایزید سے اتنی محبت تھی کہ اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باپ سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا اور باپ کی واپسی سے پہلے ہی خانم سلطان کے گھر پہنچ گئی۔

☆☆☆

یہ پہلا موقع تھا جب مہرماہ رات ہونے پر وہاں پہنچی تھی۔ حسبِ معمول خانم سلطان نے اسے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لگایا اور اس کی پیشانی چومی لیکن خود اس میں جو فرق آ گیا تھا، وہ مہرماہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ خانم سلطان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی لیکن پھیکی پھیکی سی۔

"آپ کچھ اداس ہیں خانم پھوپی!"

خانم سلطان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کھانے کا وقت ہو چکا ہے لیکن آج کچھ دیر سے کھالوں گی۔ پہلے تم حمام......"

"نہیں خانم پھوپی! اب کل صبح ہی حمام ٹھیک رہے گا۔ ابھی تو کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے سونے کا ارادہ ہے۔"

"کھانا تو کھاؤ گی نا؟"

"ہاں کھانا تو کھاؤں گی۔ کھاتے ہوئے باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ آپ ایک بات ٹال گئیں میری..... اداس کیوں ہیں آپ؟"

"آؤ!" خانم سلطان اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے کی طرف بڑھی۔ "میری اداسی کا سبب عماد ہے۔"

"کیا.....کیا ہوا اسے؟" مہرماہ ہکلا سی گئی۔

"اس مرتبہ بہت عرصے بعد آئی ہو تم۔ کئی سال ہو گئے لیکن میں کوئی گلہ نہیں کر رہی ہوں۔ تم وہاں ایسے ہی حالات میں تھیں کہ یہاں آنا تمہارے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں خرم کی وفات پر بھی وہاں نہیں آ سکی۔"

"آپ پھر میری بات ٹال گئیں۔ عماد کے بارے میں کچھ کہا تھا آپ نے!" مہرماہ بے تابی سے بولی۔

"ہاں۔" خانم سلطان نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اس کی صحت تو پہلے ہی خراب رہنے لگی تھی، ان سالوں میں تو وہ بالکل ڈھیر ہو گیا ہے۔ تم اسے مشکل سے پہچان سکو گی۔"

مہرماہ نے ایک طویل سانس لی۔ خانم سلطان کی پہلی بات سے وہ فوری طور پر کچھ اور ہی سمجھی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ مہرماہ نے اس کے بیٹے اور بیٹی کے بارے میں پوچھا۔

خانم نے جواب دیا۔ "وہ سال میں ایک آدھ بار آتی ہے۔ تم جانتی ہی ہو، اس کی شادی جس ریاست میں ہوئی ہے، وہ بہت دور ہے۔ صاحبزادے اپنی بیگم کے ساتھ صوبیدار صاحب کے گھر گئے ہیں۔ وہاں کوئی تقریب ہے۔ میں اس لیے نہیں گئی کہ عماد بالکل اکیلا رہ جاتا۔ ویسے وہ اکیلا تو رہتا ہے۔ اپنے کمرے سے کم نکلتا ہے، پھر بھی میں نہیں چاہتی تھی کہ محل میں وہ اکیلا رہ جائے۔ کنیزیں وغیرہ تو ہیں مگر......"

"اب بھی اس کی وہی حالت ہے؟" مہرماہ بول پڑی۔

"پہلے سے زیادہ خراب حالت ہے، ابھی بتا تو چکی ہوں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ اس نے اپنے کمرے سے متصل ایک کمرا لے لیا تھا۔ بعد میں ایک کمرا اور لے لیا ہے۔ جانے کیا کرتا رہتا ہے وہ ان کمروں میں۔"

"آج میں دیکھتی ہوں جا کر۔"

"میرے دل کی بات آ گئی ہے تمہاری زبان پر۔" خانم سلطان نے کہا۔ "پہلے دو ایک مرتبہ یہ خیال آیا تھا مجھے لیکن نہ جانے کیا سوچ کر میں نے تم سے کہا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں اپنے کمرے میں آنے سے نہیں روک سکے گا۔ اتنی ہمت نہیں کر سکے گا۔"

"میں ابھی جاتی ہوں۔" مہرماہ اٹھی۔

"پہلے کھانا تو کھالو۔"

دو کنیزیں کھانے کی سینیاں لیے اندر آ رہی تھیں۔ خانم سلطان نے اس کمرے میں آتے ہوئے کسی کنیز کو اشارہ کر دیا تھا۔

"نہیں خانم پھوپی!" مہرماہ نے کہا۔ "اب میں بے چین ہو گئی ہوں۔ پہلے دیکھ آؤں جا کر۔"

"اچھا تو میں بھی بعد میں کھالوں گی جب تم آ جاؤ گی۔"

مہرماہ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ عماد کا کمرا کہاں تھا۔ کمرے کے سامنے رک کر اس نے ذرا توقف کیا جیسے کچھ سوچنے لگی ہو پھر آہستہ سے دستک دی۔

کسی قسم کا جواب نہیں ملا۔ کچھ توقف سے مہرماہ نے زیادہ زور سے دستک دی۔ اس کا فوری جواب ملا۔

"کون ہے؟" آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

مہرماہ نے اپنا نام بتانے کے بجائے پھر دستک دی۔ اس مرتبہ اندر سے غصے میں بڑبڑانے کی آواز اور دروازے

کی طرف آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا گیا لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ اندر کا کچھ منظر دیکھا جاسکتا۔

خانم سلطان پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ تم اسے مشکل سے پہچان سکوگی اور اس نے بالکل درست کہا تھا۔ چلتے پھرتے نظر پڑنے کی صورت میں وہ اسے واقعی پہچان نہیں پاتی۔ عماد کے ابھرے ہوئے گال اتنے پچک گئے تھے کہ آنکھوں کے نیچے ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ جلد کی سفید رنگت میں گھلی ہوئی سرخی غائب ہوچکی تھی۔ بال نہایت بڑے اور الجھے ہوئے تھے۔ وہ مہرماہ کو دیکھ کر چونکا اور پھر تیزی سے باہر نکل آیا۔

''شہزادی!'' وہ مؤدبانہ جھکا۔ اس کی یہ کوشش دانستہ تھی کہ دروازے اور مہرماہ کے بیچ میں حائل رہے۔

''صحت بہت اچھی ہوگئی ہے تمہاری۔'' مہرماہ کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''آپ کب تشریف لائیں؟''

''ابھی آئی ہوں۔ سوچا، آج پہلے تم سے مل لوں، کئی سال بعد آئی ہوں نا!''

''چلیں، دیوان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں۔ میں تمہارے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کروں گی۔''

''اس پر اصرار مت کیجیے۔ میں التجا کرتا ہوں۔''

''مجھے تمہارے کمرے میں بیٹھنا ہے۔'' مہرماہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

عماد کے چہرے پر تذبذب کا تاثر گہرا ہوگیا۔

''تو...... تو......'' وہ رک رک کر بولا۔ ''ایک وعدہ کیجیے۔''

''کس بات کا وعدہ؟''

''کمرے میں آپ جو کچھ بھی دیکھیں، اس کے باعث مجھ سے ناراض نہیں ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' مہرماہ آگے بڑھی۔

عماد جلدی سے پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اس کا جسم مہرماہ سے ٹکرا جاتا۔

مہرماہ نے کمرے میں قدم رکھا اور پھر اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس کے قدم جہاں تھے، وہیں جم گئے۔

کمرے میں عماد کے بستر کے علاوہ جو کچھ نظر آرہا تھا، وہ صرف مصوری کا سامان تھا اور مہرماہ کی تصویریں تھیں۔ ہر زاویے سے بنائی ہوئی تصویریں۔ ایک نہایت بڑی تصویر نے ساری چھت ڈھک دی تھی۔

مہری خاتون نے اپنے اشعار میں کہا تھا کہ محبت جب شدت اختیار کرتی ہے تو اس جذبے کو عشق کہتے ہیں اور جب عشق بھی کچھ حدود پھلانگ جاتا ہے تو وہ کیفیت جنون کی ہوتی ہے۔

مہرماہ پلکیں جھپکائے بغیر تصویروں پر نظر دوڑاتی رہی۔ عماد نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ مہرماہ کے قدم متصل کمرے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ وہاں بھی اس نے اپنی تصویروں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا اور وہی حالت تیسرے کمرے کی تھی۔ مہرماہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہاں اکیلی ہی تھی۔ عماد اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ مہرماہ گم صم انداز میں چلتی پہلے کمرے میں پہنچی۔ عماد وہیں تھا۔ مہرماہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بستر کی طرف بڑھی۔ بیٹھنے کے بعد وہ بولی۔

''قریب آؤ...... بیٹھو!''

عماد آگے آیا اور بستر کی دوسری جانب بیٹھ گیا۔

''تم کہتے تھے، مجھے رسوا نہیں کرنا چاہتے۔'' مہرماہ بولی۔ ''اگر کوئی یہ تصویریں دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔''

''میرے جیتے جی، کوئی نہیں دیکھ سکتا یہ تصویریں۔''

''مرنے کے بعد مجھے رسوا کرنا چاہتے ہو؟''

عماد چپ رہ گیا۔

مہرماہ کچھ رک کر بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے آٹھ نو سال بڑے ہو۔ بیالیس، تینتالیس سال کے ہوگے اب لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ساٹھ سال سے زیادہ کے ہوگئے ہو۔ گزشتہ برسوں میں تم نے اپنے کھانے پینے کا، غذا کا بہت خیال رکھا ہے۔''

عماد خاموش رہا۔ مہرماہ پھر بولی۔

''عشق میں اس طرح سسک سسک کر جیتے ہیں؟ جیسا کہ تم نے کہا تھا ایک بار...... لیکن اس طرح تو...... مرجاتے ہیں سسک سسک کر۔''

عماد اب بھی چپ رہا۔

''میری طرف کیوں نہیں دیکھتے تم؟'' مہرماہ ہی بولتی رہی۔ ''کبھی دیکھتے ہو تو اچٹتی سی نظر سے۔''

''کیا کروں، مجبور ہوں۔''

''مجبور؟ کیوں؟''

''گستاخی معاف شہزادی!...... میری آنکھیں شاید چندھیانے لگتی ہیں، آپ کے چہرے پر بکھری ہوئی تیز چاندنی سے۔''

''چاندنی!'' مہرماہ ہنسی۔ ''دو عشرے سے زیادہ گزر چکے ہیں جب تم نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا۔ اگر اس وقت میرے چہرے پر چاندنی تھی بھی تو اب وہ دھواں بن کر اڑ چکی ہے۔''

''کبھی میری آنکھوں سے دیکھیے گا آئینہ!'' اس مرتبہ عماد کی آواز بھرا گئی۔

اس مرتبہ مہرماہ کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے عماد کی طرف دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیوں اب اس کے ہونٹوں میں لرزش آگئی تھی اور کچھ بولنے کی کوشش میں اسے دشواری پیش آرہی تھی۔ خاصے سکوت کے بعد وہ بول سکی اور اس مرتبہ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''ایک وعدہ کرسکوگے مجھ سے؟''

''کہیے!''

''پہلے وعدہ کرو اور یہ وعدہ بھی کرو کہ اسے ایفا بھی کروگے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''تو پھر آج سے...... ابھی سے...... تمہیں اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ تمہیں اس وقت تک زندہ رہنا ہے جب تک میں مر نہ جاؤں۔''

''خدانہ کرے شہزادی!'' عماد نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا لیکن پھر نظریں جھکالیں۔ اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ ''خدا کرے کہ میری زندگی بھی آپ کو مل جائے۔''

''ابھی تم وعدہ کرچکے ہو کہ اسے ایفا بھی کروگے۔''

''لیکن مشیت......''

مہرماہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''مشیت کے آگے تو سبھی مجبور ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم خود کو اس طرح موت کی طرف نہ دھکیلو جس طرح دھکیل رہے ہو۔ اس طرح سسک سسک کر نہ مرو۔''

''اچھا!'' عماد نے آہستہ سے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا۔''

''وعدہ کرنے کے بعد کوشش نہیں، عمل کیا جاتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں تم سے کچھ چاہ رہی ہوں۔''

عماد نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ پھر اس کے دو آنسو بھی ٹپک گئے۔ غالباً اسے اپنے جذباتی جوار بھاٹے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا کیونکہ آنسو ٹپکنے پر وہ چونک پڑا۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔

''مجھے نہیں معلوم کہ میں اب کب آؤں گی۔'' مہرماہ بولی۔ ''لیکن جب بھی آؤں...... یہی دیکھوں کہ تمہاری صحت بہتر ہوتی جارہی ہے۔''

پھر وہ یکایک کھڑی ہوئی اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ اس نے دیکھا کہ خانم سلطان بے چینی سے اسی راہداری میں ٹہل رہی تھی۔

''کیا ہوا مہر!'' وہ تیزی سے قریب آئی لیکن مہرماہ کے قدم تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔

''مجھے قوی امید ہے کہ عماد اب خود کو سنبھال لے گا۔ آپ مجھے خط بھیجتی رہیے گا۔ حالات سے آگاہ رکھیے گا۔ میں اب جارہی ہوں۔''

''کہاں جارہی ہو؟'' خانم سلطان نے تیزی سے پوچھا۔

''واپس جارہی ہوں۔ ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔''

اس وقت خانم سلطان یہ نہ دیکھ سکی کہ مہرماہ کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ خانم سلطان کے اصرار کے باوجود نہیں رکی اور نہ اس نے خانم سلطان کے کسی استفسار کا کوئی واضح جواب دیا۔

مہرماہ کی فوراً واپسی کے اس فیصلے سے اس کی کنیزیں بھی حیران رہ گئیں۔ ینی چریوں کی پلٹن کو آرام کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سفر پھر شروع ہوگیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مہرماہ رات کے وقت سفر کررہی تھی۔ وہ گھوڑے کو ایڑ پر ایڑ لگاتی رہی۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ مہرماہ کا انداز ایسا تھا جیسے اس پر یکایک جنون طاری ہوگیا ہو۔

ینی چریوں کو بھی اپنی رفتار تیزی سے بڑھانا پڑی لیکن مہرماہ کی کنیزیں اپنے گھوڑے اتنی تیزی سے نہیں دوڑا سکتی تھیں۔

اس سفر کے خاتمے پر جب مہرماہ اپنے محل میں داخل ہورہی تھی، رستم پاشا باہر نکل رہا تھا۔

''اتنی جلدی واپس آگئیں شہزادی!'' اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

''ہاں۔'' مہرماہ نے جواب دیتے ہوئے اس کے جسم پر موجود زرہ بکتر کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ''کسی مہم پر جارہے ہو؟''

''ہاں، لشکر آج ہی روانہ ہونے والا ہے۔''

مہرماہ نے اس سے کوئی اور بات نہیں کی اور محل میں داخل ہوگئی۔ رستم پاشا اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر چلا گیا۔ اس نے بھی مہرماہ کی بے رخی کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ فطرتاً جاہ پرست اور خود غرض شخص تھا۔ اس کے لیے یہی کافی تھا کہ عثمانی شہزادی کا شوہر ہونے کی وجہ سے وہ مراعات حاصل کرتا رہا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ مہرماہ نے خانم سلطان کے پاس سے واپس آنے کے بعد اپنے محل سے نکلنا چھوڑ دیا تھا لیکن مختلف ذرائع سے اس کو باہر کی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ فروزاں سے ملنے والی ایک اطلاع نے اسے چونکا دیا۔ اطلاع یہ تھی کہ رقیہ بیگی اور آغا طوبور جنہیں خرم سلطان کی

اب بڑی عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ ان دونوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی۔

مہر ماہ کو علم تھا کہ جن خدام کو محل سے الگ کیا جاتا تھا، انہیں اتنی رقم دے دی جاتی تھی کہ وہ سکون سے اپنی باقی زندگی گزار لیں لیکن اتنا کچھ ہرگز نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی گزار سکیں۔

اس اطلاع پر کچھ خیالات مہر ماہ کے دماغ میں کلبلانے لگے تھے جنہیں اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے دماغ سے نکال دیا۔

چند ماہ بعد اسے خانم سلطان کا خط ملا جس میں دیر سے خط لکھنے کی کچھ وجوہ بیان کی گئی تھیں جن سے مہر ماہ کو دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لیے خط کے صرف یہ جملے اہم تھے۔

”تم نہ جانے کیا جادو کر کے گئی ہو کہ عماد میں بدلاؤ آتا ہی چلا گیا ہے۔ اس کی صحت اب بہت بہتر ہو گئی ہے۔“

انہی دنوں میں مہر ماہ کی صحت گرنے لگی تھی۔

☆☆☆

1665ء میں آسٹریلیا سے سلطنت عثمانیہ کی جنگ دوسری مرتبہ شروع ہوئی تھی۔ اس جنگ میں ینی چریوں کی کچھ ناکامیاں سامنے آنے پر ستر سالہ ضعیف سلطان سلیمان خود قسطنطنیہ سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کی منصوبہ بندیوں کی وجہ سے پھر کامیابیاں حاصل ہونا شروع ہو گئیں۔ 2 اگست کو اس نے ”سگتوار“ کا محاصرہ کیا۔ 8 ستمبر کو وہ شہر تسخیر کر لیا گیا۔ یہ سلطان سلیمان کی آخری فتح تھی۔ وہ اس فتح کا جشن بھی نہیں منا سکا۔ وہ 5 اور 6 ستمبر کی درمیانی رات کو اپنے خیمے ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔

فتح کے بعد جب ینی چریوں کو اس کی موت کا علم ہوا تو انہوں نے تلواروں سے اپنے خیموں کی طنابیں کاٹ دیں۔ اپنے سروں سے عمامے، خود، اتار کر پھینک دیے اور نالہ و شیون کرنے لگے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ہر فرماں رواں کی موت پر وہ اسی طرح سوگ منایا کرتے تھے۔

شہزادہ سلیم اس وقت بلغراد میں تھا۔ اسے اطلاع ملی تو وہ اپنی سب سے چہیتی بیوی نور بانو اور چہیتے چار سالہ بیٹے شہزادہ مراد کے ساتھ تیزی سے واپس لوٹا۔

اس تربت میں دفن کیا گیا جو اس نے پہلے ہی سے خود بنوائی تھی۔

سوگ کے دن گزر جانے کے بعد شاہی جلوس شہر کی فصیل کے باہر سرو کے درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچا جہاں حضرت ابو ایوب انصاری کی درگاہ تھی۔ وہاں ایک سفید ریش بزرگ پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی خم دار تلوار تھی۔ اس تلوار کی نیام پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس درویش کو جو رسم ادا کرنا تھی، اس کا آغاز اس کے اجداد سے ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو تلوار تھی، وہ خانوادۂ عثمانیہ کی موروثی تلوار تھی۔

درگاہ سے کچھ دور ایک بلند سی جگہ پر دو گھڑسوار کھڑے تھے۔

”دیکھ رہے ہو؟“ ایک گھڑسوار نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ دوسرے نے جواب دیا۔ ”اس درویش کے ساتھ شہزادہ سلیم ہیں۔ میں نے انہیں پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب یہ شاید سولہ سترہ سال کے تھے۔ اب یہ چالیس بیالیس سال کے ہوں گے۔“

”یہ کیا ہونے جا رہا ہے؟“

”غالباً تاج پوشی کی رسم ہے۔“

”میری خواہش ہے کہ تم اس منظر کی تصویر بناؤ۔ اس تصویر میں کچھ علامات بھی ہوں جن سے ظاہر ہو کہ یہ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کا آغاز ہو رہا ہے۔“

”کیوں؟ کیا مطلب؟“

”یہ میری پیش گوئی ہے۔ یہ کسی جگہ کندہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ میری زندگی تو ظاہر ہے کہ اس وقت تک نہ رہے گی لیکن مستقبل کا مؤرخ جان لے گا کہ میری پیش گوئی کیا تھی۔“

اس وقت وہ درویش سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک بلند چبوترے پر لے جا چکا تھا جہاں سے عوام سب کچھ دیکھ سکتے تھے۔ درویش نے شاہی تلوار سلیم کی کمر سے باندھی۔ کوئی منصب دار ایک طشت میں تاج لیے کھڑا تھا۔ وہ تاج سلیم کے سر پر رکھا گیا اور ہر طرف مبارک سلامت کی آوازیں گونجنے لگیں۔

دونوں گھڑسوار اب دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ایک قبرستان کے قریب سے گزرے۔ ایک گھڑسوار نے اس قبرستان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جہاں تین سال پہلے رستم پاشا کی تدفین ہوئی تھی۔

کہانی کے تاریخی ماخذ

کتاب	مصنف
تاریخ اسلام	اکبر شاہ خان نجیب آبادی
تمدن عرب	ڈاکٹر گستاؤلی بان
تاریخ ایران	مقبول بیگ بدخشانی
تاریخ الخلفاء	جلال الدین سیوطی
[illegible]	اسٹینلے لین پول
تاریخ فرشتہ	محمد قاسم فرشتہ

قیدخانہ

کاشف زبیر

نظروں کا فریب بھی کیا کیا کرشمے دکھاتا ہے... جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا... انہیں بھی یہی عارضہ لاحق تھا۔ اس دلدل میں دھنستے دھنستے وہ ایک ایسے قید خانے تک پہنچ گئے جسے وہ اپنے لیے سب سے مضبوط پناہ گاہ سمجھتے تھے لیکن... رفتہ رفتہ بڑھنے والے حبس نے بتایا کہ وہ ایک قفس میں قید ہیں اور وقت نے بھی ثابت کر دیا کہ آزاد فضائوں میں اڑنے والے پنچھی تادیر قفس میں نہیں رہ سکتے۔

کھلے آسمانوں کی جستجو میں بھٹکنے والے طائروں کی داستان

سٹ بیری نے بلندی سے نیچے دور تک پہلے اس شہر کو دیکھا۔ شہر میں بلند عمارتیں تھیں اور اس کی گلیوں و سڑکوں پر چہل پہل تھی۔ خوراک اور سامان تیار کرنے والی فیکٹریوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شہر کے چاروں طرف ایک بلند اور ناقابلِ عبور فصیل تھی۔ جو اس فصیل میں تھے وہ باہر نہیں آ سکتے تھے اور جو باہر تھے وہ صرف مخصوص شرائط کے تحت ہی اندر جا سکتے تھے۔ سٹ بیری جانتا تھا کہ یہ شہر جو اب اس سیارے پر واحد آباد جگہ تھی جہاں انسان سکون سے

رہ سکتا تھا، درحقیقت ایک بہت بڑا قید خانہ تھا۔ اس میں لاکھوں انسان رہتے تھے مگر قیدیوں کی طرح۔ انہیں کھانے کو ملتا تھا، پہننے کو لباس میسر تھا۔ وہ رہائش رکھتے تھے اور محدود تفریحات بھی میسر تھیں مگر اس کے بدلے انہیں سٹی کونسل کے قوانین اور وقتے وقتے سے نازل ہونے والے احکامات کی مکمل پاسداری کرنا ہوتی تھی۔ نافرمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نافرمانی کی ایک ہی سزا تھی۔ معتوب کو شہر سے نکال دیا جاتا۔ جہاں اسے کھانا اور پانی کچھ نہیں ملتا تھا کیونکہ صرف اس شہر کے آس پاس ہی نہیں بلکہ اس پورے سیارے پر صحرا قبضہ کر چکا تھا۔ ماضی کی سرسبز و شادابی قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ ہر طرف اڑتی ریت تھی یا سنگلاخ ٹیلے اور پہاڑ تھے۔ سمندر اور دریا خشک ہو چکے تھے۔ ہر قسم کی نباتات اور جاندار ختم ہو گئے تھے۔ انسانوں کی آبادی بھی سکڑ کر بس اسی شہر تک محدود ہو گئی تھی۔ نسلِ انسانی کی بقا کے لیے سخت قوانین نافذ کیے گئے اور ان کے نفاذ کے لیے زیادہ سختی سے کام لیا گیا تھا۔ شروع میں یہ کام نیک نیتی سے کیا گیا تھا مگر بعد میں سٹی کونسل کے نام پر ایک ایلیٹ کلاس وجود میں آ گئی جو عیش و آرام سے زندگی بسر کرتی تھی اور عام لوگوں کو بس گزارے لائق ملتا تھا۔ رہائش کے لیے کثیر المنزلہ عمارتیں بنائی گئی تھیں۔ سرمئی رنگ کی یہ ایک جیسی عمارتیں مضبوط اور باسہولت تھیں مگر ان میں شہریوں کو بس گزارے لائق جگہ ملتی تھی۔ اسی طرح فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ اسکائی اسکریپرز میں فارمز بنائے گئے جن میں خوراک اگتی تھی۔ یہاں کلوننگ کی مدد سے ایسے جانور اور پرندے پالے جاتے تھے جن کا گوشت خوراک کے کام آتا تھا۔ شہر کے نیچے پانی کا بہت بڑا ذخیرہ تھا لیکن اس سے صرف ضرورت کا پانی لیا جاتا تھا اور استعمال ہونے والے پانی کو نوّے فیصد تک صاف کر کے دوبارہ استعمال کیا جاتا تھا۔

قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ ساتھ متعدی بیماریوں کے شکار افراد کو بھی شہر سے نکال دیا جاتا تھا تاکہ دوسرے اس بیماری سے محفوظ رہیں۔ جن لوگوں کو شہر سے نکالا جاتا انہیں شہر سے کئی سو کلومیٹرز دور کسی ویرانے میں چھوڑ دیا جاتا جہاں سے وہ کسی صورت واپس شہر تک نہیں آسکتے تھے اور وہیں بھوکے پیاسے مر جاتے۔ اگر کوئی شہر کی طرف واپس آ بھی جاتا تو اس کے لیے دروازہ نہیں کھلتا تھا اور وہ فصیل سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاتا تھا۔ سٹ بیری کا باپ آرٹ بیری ایک انجینئر تھا۔ پھر اسے کوئی جلدی بیماری ہوئی اور اسے اس کے اہلِ خانہ سمیت شہر سے دور ایک ویرانے میں پھینک دیا گیا۔ سٹ بیری کے علاوہ ان کے تین بچے اور تھے۔ ویرانے میں پھینکے جانے کے بعد وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں انہیں پانی اور خوراک مل سکے۔ وہ صحراؤں اور پہاڑوں میں بھٹکتے رہے اور اسی سفر کے دوران ایک ایک کر کے سٹ بیری کے تینوں بہن بھائی اور ماں بھوک پیاس اور سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لا کر موت کی آغوش میں جا سوئے۔

سٹ بیری اور آرٹ بیری بھی قریب المرگ تھے جب وہ ایک پہاڑ کے نیچے غار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس غار میں پانی کا چشمہ تھا اور اس چشمے کے ساتھ ایسی کائی اگی ہوئی تھی جسے کھایا جا سکتا تھا۔ گویا اس پانی اور کائی نے ان کی جان بچائی تھی۔ آرٹ بیری اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ انجینئرنگ سے ہٹ کر دوسرے شعبوں کے بارے میں بھی اس کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اس نے ایک دن دس سالہ سٹ بیری سے کہا۔ ”اس دنیا میں اور بھی شہر تھے لیکن پھر وہ ویران ہو گئے۔ مگر ان کی عمارتیں اور سامان اب بھی موجود ہے۔“

سٹ بیری حیران ہوا۔ ”ایسے شہر کہاں ہیں؟“

آرٹ بیری کے پاس اس کا اپنا بنایا ہوا نقشہ تھا۔ یہ نقشہ اس نے سٹی کونسل کی لائبریری میں موجود نقشوں سے نقل کیا تھا۔ عام لوگوں کو اس لائبریری میں جانے کی اجازت نہیں تھی مگر آرٹ بیری کو انجینئر ہونے کی وجہ سے یہ سہولت تھی کہ وہ لائبریری سے استفادہ کر سکتا تھا۔ ورنہ لائبریریاں صرف ایلیٹ کلاس کے لیے تھیں۔ اس نے موقع پا کر وہاں سے اس نقشے سمیت بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جب اسے شہر سے نکالا گیا تو اب یہ معلومات اس کے کام آ سکتی تھیں۔ آرٹ بیری نے نقشے کی مدد سے سٹ بیری کو بتایا۔ ”یہاں سے شمال کی طرف دو سو کلومیٹرز کے فاصلے پر ایک مُردہ شہر ہے۔ اگر ہم اس کی طرف سفر کریں تو ایک ہفتے میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

”پاپا! مردہ شہر میں جانے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟“

”وہاں سے ہمیں سامان ملے گا، اس سامان سے ہم بہت کچھ بنا سکیں گے۔“ آرٹ بیری نے کہا۔ پھر ان دونوں باپ بیٹے نے راستے کے لیے پانی اور خشک کائی کی خوراک کا ذخیرہ کیا اور مُردہ شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں اندازے سے زیادہ وقت لگا مگر وہ بالآخر وہاں پہنچنے میں کامیاب رہے۔ شہر صدیوں پہلے مُردہ ہو گیا تھا۔

اس کی عمارتیں بھی کھنڈر ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود انہیں وہاں استعمال کے قابل بہت سی چیزیں مل گئی تھیں۔ آرٹ نے انہیں استعمال کے قابل بنا لیا۔ انہیں شمسی توانائی سے چلنے والی ائر بائیک ملیں، ہتھیار اور رابطے کے آلات ملے۔ سب سے بڑھ کر انہیں پانی بھی مل گیا تھا مگر کھانے کے لائق کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ آرٹ اپنا فن اور معلومات سٹ کو منتقل کر رہا تھا۔ ائر بائیک کی مدد سے وہ دس دن کا سفر صرف چند گھنٹے میں طے کر کے واپس غار تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں سے کائی کا تازہ ذخیرہ لے کر وہ مُردہ شہر کی طرف گئے۔ یہاں بہت سا سامان تھا جسے وہ غار تک منتقل کر سکتے تھے۔ اس کام میں انہیں سالوں لگے مگر انہوں نے بالآخر غار کے پاس اپنے لیے رہائش اور دوسری سہولتیں حاصل کر لیں۔ مردہ شہر سے انہیں محفوظ کیے ہوئے آلو کے بیج ملے تھے۔ سٹ بیری نے انہیں تجربے کے طور پر زمین میں بویا۔ غار سے پانی لا کر وہ ان کی سینچائی کرتا رہا اور پھر ایک دن زمین سے آلو کے پودوں نے سر اٹھایا۔ وہ دن سٹ بیری کے لیے بہت یادگار تھا۔

ایک طرف وہ زندہ رہنے کا سامان کر رہے تھے تو دوسری طرف آرٹ بیری کی جلدی بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے پاس ..... علاج کے لیے کچھ نہیں تھا اور پانچ سال بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے سٹ بیری سے کہا۔ ”سٹ! میرے بعد تم اکیلے رہ جاؤ گے مگر گھبرانا مت۔ خود کو مضبوط کرنا۔ ابھی تم صرف پندرہ سال کے ہو۔ جب تم پختہ عمر تک پہنچ جاؤ تب شہر کی طرف جانا اور وہاں سے ان لوگوں کو یہاں لانا جو آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تم ایک نیا شہر آباد کر سکو گے۔ یہاں تم لوگ سچ مچ آزاد ہو گے۔“

”میں ایسا ہی کروں گا پاپا۔“ سٹ بیری نے باپ سے وعدہ کیا۔ اس نے باپ کو مرنے کے بعد مکان کے پاس ہی دفن کیا۔ اب وہ اکیلا تھا مگر ذمے داریوں کے لحاظ سے اسے فرق نہیں پڑا۔ وہ گزشتہ دو سال سے کام کر رہا تھا۔ آرٹ بیری صرف اسے ہدایات دیتا تھا۔ اس نے سٹ بیری کو سکھا دیا تھا کہ چیزوں کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور مشینری کی مرمت کس طرح کی جاتی ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد بھی سٹ بیری نے مُردہ شہر آمد و رفت جاری رکھی۔ اس نے کئی طرح کے ہتھیار بھی حاصل کر لیے اگرچہ اسے کسی سے خطرہ نہیں تھا... سوائے سٹی کونسل کی طرف سے۔ اگر سٹی کونسل کو پتا چل جاتا کہ شہر سے باہر کوئی زندہ شخص ہے اور اس نے زندہ رہنے کے لوازمات بھی تلاش کر لیے ہیں تو وہ یقیناً اسے مارنے کے لیے اپنے خاص دستے بھیجتے۔ اس لیے سٹ بیری نے اپنی رہائش کو کیموفلاج کیا ہوا تھا تاکہ وہ فضا سے نظر نہ آئے مگر آلوؤں کے پودے نظر آ جاتے۔ اس لیے سٹ بیری باپ کے مرنے کے بعد کم سے کم آلو کاشت کرتا تھا اور اس کے بیج بہت احتیاط سے محفوظ رکھتا تھا۔

کئی سال بعد جب وہ ایک جوان اور مضبوط شخص بن گیا تو اس نے شہر کی طرف جانے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے لیے ایک پلان کی ضرورت تھی۔ سٹ بیری نے خاصے غور و خوض کے بعد ایک پلان سوچ لیا۔ اس نے سب سے پہلے شہر کے پاس ایک محفوظ جگہ تلاش کی اور وہاں سامان منتقل کرتا رہا۔ وہ مردہ شہر سے کئی اور ائر بائیک پرزوں کی صورت میں لے آیا تھا اور انہیں یہاں جوڑ کر اس نے مزید ائر بائیک تیار کر لی تھیں۔ جب اس نے شہر کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تو ائر بائیک بھی شہر کے پاس اپنے محفوظ ٹھکانے پر لے گیا۔ خوراک، پانی اور ہتھیاروں کا مناسب ذخیرہ بھی اس نے وہاں چھپا دیا تھا۔ ان سب چیزوں کو اس نے اچھی طرح کیموفلاج کیا تھا کیونکہ شہر کے آس پاس سٹی کونسل کے خاص دستے گشت کرتے تھے اور وہ فضائی نگرانی بھی کرتے تھے۔ صبح کا وقت تھا، سٹ بیری بلندی سے نیچے پھیلے شہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ شہر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس نے دس سال یہاں گزارے تھے۔ اب وہ بائیس سال کا ہو رہا تھا اور اس دوران میں شہر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تبدیلی آ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ گزشتہ ڈھائی سو سال سے شہر کی آبادی کا تناسب ایک ہی چلا آ رہا تھا۔ ہر سال جتنے نوجوان انسان کارکن کی حیثیت اختیار کرتے تھے اتنے ہی عمر رسیدہ افراد کو شہر سے نکال کر ویرانوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ غیر کارکن افراد میں صرف پندرہ سال سے کم عمر افراد تھے جو پڑھتے تھے اور مختلف ہنر سیکھتے تھے۔ عمر رسیدہ افراد میں کسی کو بیکار نہیں رکھا جاتا تھا۔

☆☆☆

گارڈ نے سٹ بیری کو دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا کوٹھری میں جا گرا۔ ایک گھنٹا پہلے وہ تباہ حال فصیل کے دروازے تک پہنچا تھا۔ وہاں گارڈز نے اسے گرفتار کر لیا اور ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اسے سٹی کونسل کی جج کمیٹی کے سامنے پیش کیا جاتا جو اس کی قسمت کا فیصلہ کرتی۔ سٹ بیری نے اپنا نام آئن روڈز بتایا تھا۔ اس

نے گارڈز کو بتایا کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ ایک غار میں رہتا تھا جہاں پانی اور کائی سے ان کا گزارہ ہوتا تھا مگر پھر پانی کا چشمہ سوکھ گیا اور اس کے اہلِ خانہ بھوک پیاس سے ہلاک ہو گئے۔ وہ اسی غار میں پیدا ہوا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کہاں سے آئے تھے۔ وہ کئی نسلوں سے اسی غار میں رہ رہے تھے۔ پھر وہ جان بچانے کے لیے صحرا میں چل پڑا اور بھٹکتا ہوا اتفاقیہ اس شہر کے سامنے آنکلا۔

سٹ بیری کو معلوم تھا کہ گارڈز کے مقابلے میں جج کمیٹی اس سے زیادہ تفصیلی پوچھ گچھ کرے گی۔ اس نے خود کو اَن پڑھ اور کم ذہن کا آدمی ظاہر کیا تھا جس کے پاس بولنے کے لیے الفاظ بھی کم تھے اور وہ بس چند ایک چیزوں کا نام ہی جانتا تھا۔ اس نے اپنے پاس سے ہر ایسی چیز چھوڑ دی تھی جس سے اس شہر سے اس کا تعلق ثابت ہو سکے۔ اس نے مردہ شہر سے ملنے والے لباسوں میں سے ایک لباس پہنا ہوا تھا۔ گارڈز کے جانے کے بعد اس نے کوٹھری کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ یہ اس عمارت کی شاید 100 ویں منزل تھی۔ بہت نیچے شہر کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ پورے شہر کو ایک فیوژن ری ایکٹر بجلی فراہم کرتا تھا۔ اس ری ایکٹر میں پانی بطور ایندھن استعمال ہوتا تھا اور محض چند سو لیٹرز پانی سارا... سال بجلی پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اسی بجلی سے یہاں کا نظامِ زندگی چلتا تھا۔ ایلیٹ کلاس کے لیے شہر میں الگ جگہ تھی۔ وہاں کوئی عام آدمی نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی رہائشی عمارتیں بڑی اور خوب صورت تھیں۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے اور اب لوگ گھروں سے نکلنے لگے تھے۔ یہاں رہنے والے بارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ وہ صبح چھ سے شام چھ بجے تک مسلسل مصروف رہتے تھے۔ اس کے بعد وہ آٹھ بجے تک اپنی رہائش گاہ تک محدود رہتے تھے اور پھر انہیں آٹھ سے گیارہ بجے تک باہر نکلنے اور مخصوص تفریحات میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ گیارہ بجے تک تمام افراد کو لازمی اپنی رہائش گاہوں تک پہنچ جانا ہوتا تھا ورنہ ان کے دروازے خود کار انداز میں بند ہو جاتے اور گیارہ بجے کے بعد جو باہر پایا جاتا اسے سٹی گارڈز گرفتار کر لیتے۔ ایک بار ایک ہفتے قید کی سزا ہوتی تھی۔ دوسری بار باہر پائے جانے والے کو ایک مہینے کی سزا ہوتی تھی اور تیسری بار... قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو شہر بدر کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے لوگ بہت محتاط رہتے تھے۔ خوراک، لباس اور گھریلو سامان سب کو ملتا تھا اور تفریح کے لیے مخصوص ٹوکن دیے جاتے تھے۔ جن کے ٹوکن ختم ہو جاتے، ان کو آٹھ بجے کے بعد بھی باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

یہاں سیل فون نہیں تھے۔ وائرلیس رابطے کی سہولت صرف حکومت اور اس سے متعلقہ افراد کو دی گئی تھی۔ باقی سب کے پاس لائن والے فون تھے مگر کوئی کسی سے براہِ راست رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ رابطہ صرف آپریٹر کرا سکتا تھا۔ بچوں کو ماں باپ سے اس وقت لے لیا جاتا تھا جب وہ تین سال کے ہوتے تھے پھر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کونسل کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کے رجحانات دیکھ کر ان کے شعبوں کا تعین کیا جاتا اور پھر انہیں ان مخصوص شعبوں کی تربیت دی جاتی تھی۔

پندرہ سال کی عمر میں انہیں فیکٹریوں یا ان کے شعبوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان والوں سے مل سکتے تھے ورنہ پہلے انہیں محدود اجازت ہوتی تھی۔ سال میں ایک دو بار ہی وہ گھر والوں سے مل سکتے تھے۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد وہ ماں باپ اور بہن بھائیوں سے مل سکتے تھے مگر رہائش سب کی الگ الگ ہوتی تھی۔ شادی پسند کی کی جاتی تھی مگر میڈیکل ٹیسٹ لازمی تھا۔ شادی کی اجازت کا انحصار ان کے کلیئر ہونے پر ہوتا تھا۔ جب کارکن بوڑھے ہو جاتے اور ان سے مزید کام نہیں ہوتا تو انہیں اس وقت تک کے لیے ان کے بچوں کے سپرد کر دیا جاتا جب تک سٹی کونسل انہیں اضافی قرار دے کر شہر بدر نہیں کر دیتی تھی۔ اپنے بوڑھے ماں باپ یا بزرگوں کے لیے کارکنوں کو راشن اور پانی کے معاملے میں قربانی دینی پڑتی تھی اور انہیں ہفتے میں چھٹی کے دن بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

عام لوگ زیادہ سے زیادہ سپروائزر ہو سکتے تھے، اس سے اوپر تمام عہدیدار ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بچے مختلف ماحول میں پرورش اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انہیں ان کے ماں باپ اور خاندان کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ وہ پابندیوں سے مستثنیٰ تھے۔ ان کے بوڑھے شہر سے باہر نہیں جاتے تھے۔ مگر بچے پیدا کرنے کے حوالے سے ان پر بھی پابندیاں تھیں۔ کوئی جوڑا دو سے زیادہ بچے پیدا نہیں کر سکتا تھا اور تین آخری حد تھی۔ اس کی اجازت بھی مخصوص حالات میں ملتی تھی جب ایلیٹ کلاس کے کسی جوڑے کے ہاں دو بچے نہیں ہوتے یا سرے سے بچے ہی پیدا نہیں ہوتے تو ان کی جگہ کسی دوسرے

جوڑے کو مزید بچے پیدا کرنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس کا مقصد ایلیٹ کلاس کی تعداد کو برقرار رکھنا تھا۔ وہ محدود تعداد کی وجہ سے تو ایلیٹ کلاس تھے۔ صدیوں سے یہ نظام کامیابی سے چلا آ رہا تھا۔ عام انسان بھی اس کے عادی ہو چکے تھے، وہ اس کے خلاف کچھ سوچتے ہی نہیں تھے۔

سٹ بیری روشن دان سے باہر دیکھتے ہوئے یہ سب سوچ رہا تھا۔ اسے آرٹ بیری نے یہ سب بتایا تھا۔ یہاں آئے ہوئے اسے چند گھنٹے ہوئے تھے مگر اس کا دم ابھی سے گھٹنے لگا تھا۔ وہ آزادی کا مزہ چکھ چکا تھا شاید اسی لیے اسے گھٹن ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے غلطی تو نہیں کی ہے؟ اگر کونسل نے اسے شہر بدر کرنے کا فیصلہ کیا تو اسے کسی بھی ویرانے میں پھینکا جا سکتا تھا جہاں وہ بھوک پیاس سے ہلاک ہو جاتا۔ وہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا تھا جب اسے قبول کر لیا جاتا اور شہر میں رہنے کی اجازت دے دی جاتی۔ اس نے اپنی زندگی کا رسک لیا تھا مگر یہ ضروری تھا۔ وہ ساری عمر اکیلا اس ویرانے میں نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے انسانوں کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ اسے رشتوں کی ضرورت تھی۔ کوئی لڑکی اس کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں بنتی۔ ان کی نسل آگے بڑھتی اور وہ اس سیارے پر ایک اور آبادی بناتے جہاں انسان آزاد ہوتا۔ وہاں پر بھی قوانین ہوتے مگر سب کے لیے ایک جیسے ہوتے۔ یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی کہ وہ ایک بڑا مقصد لے کر یہاں آیا تھا۔

اگلے دن اسے جج کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ پوری تیاری سے آیا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کس سوال کا کیا جواب دینا ہے۔ اس نے پورے اعتماد سے جوابات دیے مگر جج کمیٹی کے سخت شکلوں والے اراکین کو لگا کہ وہ بہت سہما ہوا اور کنفیوز ہے۔ یہ اس کی اداکاری تھی اور اسی وجہ سے فیصلہ اس کے حق میں ہوا۔ کمیٹی نے اسے شہر میں رہنے کا حق دے دیا مگر ساتھ ہی ایک مہینے کی آزمائشی مدت کی شرط لگا دی۔ اگر اس دوران میں وہ خود کو ایک کارآمد شہری ثابت نہیں کر پاتا تو اسے شہر بدر کر دیا جاتا۔ اسے جیل کے بجائے خدمات کے شعبے میں بھیج دیا گیا جہاں آرکیل نامی شخص کو اس کا باس مقرر کیا گیا اور اس نے تین دن تک آسانی سے کیے جانے والے محنت کے مختلف کاموں میں اس کا امتحان لیا اور بالآخر اسے ایک موزوں سینیٹری ورکر قرار دیا جو سڑکوں اور گلیوں کی صفائی اور کچرا اٹھانے کا کام کر سکتا تھا۔ چوتھے دن اسے سینیٹری فورس میں بھیج دیا گیا۔

سٹ بیری یہی چاہتا تھا۔ اس کام میں وہ آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا۔ اگر اسے کسی فیکٹری میں بھیج دیا جاتا تو اس کی آزادی بس وہیں تک محدود ہو جاتی۔ مگر وہ صفائی کرنے والے کے طور پر شہر کے بڑے حصے میں گھوم پھر سکتا تھا اور لوگوں سے رابطہ بھی کر سکتا۔ اسے ایک رہائشی عمارت میں کمرا مل گیا۔ یہاں ہفتے کا راشن ایک ساتھ دیا جاتا، اسے بھی ہفتے کا راشن مل گیا۔ اس کے شعبے کے لوگ دو شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ ایک شفٹ دن کی ہوتی تھی اور ایک رات کی۔ ہر بار انہیں چھ گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا اور اس دوران میں وہ اپنا علاقہ مکمل صاف کرنے کے ذمے دار تھے۔ رات آٹھ بجے دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی تفریح کی آزادی ملتی تھی۔ کام کے چوتھے دن جب وہ تفریح کے لیے نکل رہا تھا تو اس نے سڑک پر مختصر سا ہنگامہ دیکھا۔ سٹی گارڈز ایک بوڑھے کو کھینچ کر لیے جا رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکی رو رہی تھی اور چلا رہی تھی۔

”پلیز! میرے گرینڈ پا کو مت لے جاؤ۔“

بوڑھا رو رہا تھا مگر اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ جانتا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جب اسے گاڑی میں دھکیلا گیا تو اس نے چلا کر کہا۔ ”اپنا خیال رکھنا میری بچی۔“

لڑکی اب دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ گاڑی اس کے دادا کو لے کر چلی گئی۔ لوگ لڑکی کے آس پاس سے گزر کر جا رہے تھے مگر کسی نے اسے تسلی کے دو لفظ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی کوئی اس کے پاس رکا۔ سٹ بیری بھی اسے دور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لڑکی کے پاس جائے اسے تسلی دے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کا آزمائشی عرصہ تھا اور اگر اس دوران میں وہ کوئی ایسا کام کر جاتا جو سٹی کونسل کی نظر میں جرم ہوتا تو اسے شہر بدری کا پروانہ مل جاتا۔ اس لیے وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ لڑکی کچھ دیر کھڑی رہی پھر وہیں سڑک پر فٹ پاتھ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اگر پہلے اس کا کہیں جانے کا ارادہ تھا تو اب اس نے ملتوی کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سوائے دادا کے اس کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ اس صورت میں دوسرے رشتے دار بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ سٹ بیری سڑک کے دوسری طرف تھا اور وہاں سے لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لڑکی اٹھی اور سست قدموں سے ایک طرف چل پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کچھ واضح نہ ہو کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس طرف جانا ہے۔ سٹ بیری کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے ساتھ ساتھ سڑک کے دوسری طرف چلنے لگا لیکن ساتھ ہی وہ بہت محتاط بھی تھا۔ اگر کوئی

گارڈ نظر آتا تو وہ چلنے کے دوران لڑکی کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ بالآخر لڑکی ایک تاریک گلی کی طرف مڑی تو سٹ بیری نے سڑک عبور کی اور اس گلی میں آ گیا۔ گلی سنسان اور تاریک تھی۔ لڑکی کے قدموں کی چاپ اس کی راہنمائی کر رہی تھی۔ مگر ایک جگہ پہنچ کر لڑکی کے قدموں کی آہٹ گم ہو گئی۔ سٹ بیری تیزی سے آگے بڑھا مگر لڑکی کہیں نہیں تھی۔ اس جگہ سے گلی دو طرف اور نکل رہی تھی اور دونوں راہیں تاریک تھیں۔ سٹ بیری فیصلہ نہیں کر پایا کہ لڑکی کس طرف گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ناکام واپس آ گیا۔

اس سے اگلے دن اسے موقع نہیں ملا کیونکہ شہر کے ایک حصے میں صفائی کے لیے اچانک ہی انہیں طلب کر لیا گیا تھا۔ یہ حصہ تفریح کے لیے باہر نکلنے والوں کے لیے بند تھا اور جب سٹ بیری اپنے ساتھی کارکنوں کے ہمراہ وہاں پہنچا تو وہاں شدید قسم کی ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کے آثار نظر آئے۔ گلی اور دیواروں پر جابجا خون اور فائر کور کے دھبے تھے۔ سٹ بیری جانتا تھا، یہ قدیم پستول نما ہتھیار ایسے شعلے پھینکتا تھا جو جسم کے آر پار ہو جاتے تھے۔ اس کے ذہن میں آیا کہ یہاں کچھ ہوا تھا۔ کوئی بڑی ہنگامہ آرائی، لیکن باقی شہر والے اس سے بے خبر تھے۔ انہوں نے سپروائزر کی ہدایت کے مطابق اپنا کام نمٹایا اور علاقہ صاف کر کے پہلے جیسا کر دیا۔ اس علاقے کے لوگوں کو بھی تفریح کے لیے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ سٹ بیری کے ساتھ کام کرنے والے ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ سٹ بیری نے چند ایک سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ کنی کترا گئے۔ یہاں ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ لوگ صرف اپنے رشتے داروں اور دوست احباب سے میل ملاقات رکھتے تھے کارکنوں کے آپس میں تعلقات کا کوئی تصور نہیں تھا۔ کام کے وقت وہ صرف کام کرتے تھے یا فارغ ہوتے تو کہیں چپ کر کے بیٹھ جاتے۔

اس سے اگلے دن سٹ بیری چھٹی کے بعد گھر آیا۔ معمولات اور ڈنر سے نمٹ کر آٹھ بجے دروازہ کھلا تو وہ اسی عمارت کے سامنے آ گیا جس سے لڑکی نکلی تھی اور اس کے بوڑھے دادا کو گارڈز لے گئے تھے۔ وہ ہر ممکن تیزی سے آیا تھا اور اسے امید تھی کہ لڑکی ابھی نہیں نکلی ہو گی اور ایسا ہی ہوا۔ لڑکی اندر سے برآمد ہوئی اور ایک طرف چل پڑی۔ آج بھی اس کا رخ اسی گلی کی طرف تھا۔ سٹ بیری سڑک کے دوسری جانب چل رہا تھا۔ سڑک پر بجلی سے چلنے والی خود کار وینز گزر رہی تھیں۔ یہ ڈرائیور کے بغیر چلتی تھیں اور شہر کے تمام حصوں میں مسلسل چلتی رہتی تھیں۔ کوئی بھی شخص مخصوص اسٹاپ سے ان میں سوار ہو سکتا تھا۔ یہ مخصوص اسٹاپس پر رکتی تھیں۔ اچانک لڑکی دوسری طرف کے اسٹاپ پر رکنے والی وین میں سوار ہو گئی۔ جب تک سٹ بیری سڑک عبور کر کے اس طرف آتا، وین کا دروازہ بند ہو گیا اور وہ آگے روانہ ہو گئی۔ سٹ بیری نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ایک منٹ بعد دوسری وین آئی تو وہ اس میں سوار ہو گیا۔ لڑکی والی وین بہت آگے جا چکی تھی۔ سٹ بیری ہر اسٹاپ پر دیکھتا رہا۔

بالآخر لڑکی اسے اسٹاپ سے ذرا آگے ایک گلی میں جاتی نظر آئی۔ سٹ بیری وین سے اترا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ شہر کی مرکزی شاہراہوں کو چھوڑ کر ذیلی گلیاں ویران اور تاریک تھیں۔ اکثر گلیاں اسکائی اسکریپرز کے نیچے سے گزر رہی تھیں کیونکہ کھلی جگہوں پر صرف سڑکیں تھیں۔ عمارتیں اتنی بڑی تھیں کہ ان کے دوسری طرف جانے کے لیے بہت گھومنا پڑتا اس لیے ان کے نیچے سے پیدل چلنے والوں کے لیے سرنگ نما گلیاں بنائی گئی تھیں۔ مگر نہ جانے کیوں ان گلیوں میں روشنی کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ لڑکی ایسی ہی ایک گلی میں مڑ گئی۔ سٹ بیری کے پاس ٹارچ تھی لیکن اس نے روشن نہیں کی۔ اس بار بھی وہ لڑکی کے قدموں کی آہٹ پر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے رفتار تیزی رکھی کہ لڑکی کے پاس رک سکے اور وہ اچانک اسے دھوکا نہ دے جائے۔ مگر اس بار بھی لڑکی کے قدموں کی آہٹ اچانک معدوم ہو گئی۔ سٹ بیری نے ٹارچ روشن کی اور آس پاس کی گلیوں میں دیکھنے لگا۔ اسے ایک گلی میں سایہ سا مڑتا دکھائی دیا تو وہ اس کے پیچھے لپکا۔ مگر اچانک ہی اس کے پاؤں کسی چیز سے الجھے اور وہ گر پڑا۔ وہ چیز اس کے گرد لپٹ گئی اور اسے مکمل طور پر بے بس کر دیا۔ سٹ بیری نے جتنے ہاتھ پاؤں مارے، وہ چیز اس کے گرد اتنی ہی لپٹتی چلی گئی۔ پھر اسے کھینچا جانے لگا۔ سٹ بیری نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ اس کی ٹارچ گر گئی تھی۔ پھر اس کے منہ پر تیز روشنی آئی اور کسی نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”آئن...... آئن روڈز۔“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ خود کو خوفزدہ ظاہر کر رہا تھا۔

”تم روبی کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟“

”کون روبی؟“ اس نے پوچھا۔ اس کی نظر کسی قدر کام کرنے لگی تھی اور اب وہ دیکھ سکتا تھا کہ یہ گلی نہیں بلکہ

ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ وہ اس کے فرش پر ایک جال میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ روشنی اس سے ہٹ کر لڑکی پر مرکوز ہو گئی۔

”یہ روبی ہے۔“

سٹ بیری کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے نرمی سے کہا۔ ”مجھے کھول دو، مجھ سے تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ دوسرا آدمی بولا۔ وہ ایک کونے میں کھڑا تھا۔ ”تم کونسل کے جاسوس ہو۔ اس سے پہلے تم کو کبھی نہیں دیکھا۔“

”یہ غلط ہے اور مجھے اس لیے پہلے کبھی نہیں دیکھا کہ میں ابھی آیا ہوں چند دن پہلے۔“

”کہاں سے؟“

”شہر کے باہر سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”بکواس۔“ دوسرے آدمی نے پھر کہا۔ ”باہر کوئی زندہ فرد نہیں رہ سکتا۔“

”رہ سکتا ہے۔“ سٹ بیری نے اعتماد سے کہا۔ ”باہر بہت سے لوگ موجود ہیں اور وہ زندہ بھی ہیں۔ انہوں نے پانی اور خوراک کے ذرائع تلاش کر لیے ہیں۔ میں اس شہر سے باہر پیدا ہوا اور اتنا بڑا ہوا۔“

”تم شہر کیوں آئے؟“

”کیونکہ ہمارا پانی کا ذریعہ خشک ہو گیا تھا۔“ سٹ بیری نے اعتماد سے جھوٹ بولنا جاری رکھا۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ سچ حکومت کے مخالف تھے یا پھر اسے آزمایا جا رہا تھا۔ ”میرا خاندان بھوک پیاس سے ہلاک ہو گیا۔ میں بھٹکتا ہوا یہاں آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس سیارے پر اب کوئی اتنا بڑا شہر موجود ہے۔“

”یہ واحد شہر ہے۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔ ”لیکن تم بکواس کرتے ہو۔ یہاں سے باہر کوئی زندہ انسان موجود نہیں ہے۔“

”میں نے تمہیں سچ بتا دیا ہے، اب تمہاری مرضی مانو یا نہ مانو۔“ سٹ بیری نے کہا اور پھر خود کو کھولنے کی درخواست کی۔

”اسے آزاد کر دو۔“ روبی نے کہا۔

”لیکن یہ......“ دوسرے آدمی نے کہنا چاہا۔

”اسے کھول دو۔“ اس بار روبی کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ ایک منٹ بعد سٹ بیری کھڑا ہوا اپنا جسم سہلا رہا تھا۔ کھینچے جانے سے اسے جابجا چوٹوں اور خراشوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”تمہارا شکریہ۔“ اس نے روبی سے کہا اور پھر پوچھا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ روبی نے کہا اور اسے اندر ایک کمرے میں لے آئی۔ یہ تمام کمرے پتھر اور اینٹوں سے بنے تھے اور ان میں دروازے نہیں تھے۔ شہر میں اس قسم کے کسی ٹھکانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، یہ یقیناً خفیہ تھا۔ یہاں روشنی تھی۔ روبی نے اس کا ہاتھ دیکھا جو اچھا خاصا زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک ڈبا اٹھایا اور اس سے محلول کی شیشی اور روئی نکال کر اس کا زخم صاف کرنے لگی۔ سٹ بیری نے آہستہ سے پوچھا۔

”تم لوگ کون ہو؟“

”تم میرے پیچھے کیوں تھے؟“ روبی نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔

”وہ تمہارے دادا کو لے گئے۔“

روبی کے تاثرات بدلے۔ اس کے چہرے پر بیک وقت غصہ اور غم نظر آیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”شاید ان کو کسی ویرانے میں پھینک دیا گیا ہو۔“

”مجھے افسوس ہے۔ کیا ان کے سوا تمہارا اور کوئی رشتے دار نہیں ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے ماں باپ کو اس وقت شہر بدر کر دیا گیا تھا جب میں صرف چار سال کی تھی۔ وجہ کسی کو نہیں معلوم۔ پھر جب میں کارکن بنی تو دادا جان ریٹائر ہو گئے۔ وہ میرے پاس رہنے لگے کیونکہ ان کو دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ پرسوں وہ انہیں بھی لے گئے۔“

”اب وہ انہیں کسی ویرانے میں پھینک دیں گے یا پھینک چکے ہوں گے جہاں وہ بھوک پیاس سے ہلاک ہو جائیں گے۔ کیا ہمارا بھی مقدر ہے؟“ سٹ بیری نے تلخی سے کہا۔

روبی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے تم نے جھوٹ بولا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے، میں کونسل کا جاسوس ہوں؟“

”نہیں، تمہاری اس بات پر تو یقین ہے لیکن اس پر یقین نہیں آ رہا کہ تم پہلی بار یہاں آئے ہو۔ مجھے لگ رہا ہے تم اس شہر اور یہاں بسنے والوں کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہو جتنا کہ ہم جانتے ہیں۔“

سٹ بیری سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”میں سچ بولوں گا لیکن اس سے پہلے تم سے ایک سوال کرنا چاہوں گا۔“

”کیسا سوال؟“

”یہی کہ کیا تم اور تمہارے ساتھی اس جبر کی زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“

''بالکل۔'' روبی نے سر ہلایا۔ ''ہم کب سے جدوجہد کررہے ہیں لیکن اب تک کامیاب نہیں ہوئے۔''

''کیا تم لوگ شہر پر قبضہ کرنا چاہتے ہو یا یہاں سے نکل جانا چاہتے ہو؟''

''ہم یہاں آزاد رہنا چاہتے ہیں۔'' روبی نے اپنا مقصد بیان کیا۔

ست بیری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔ میرا ایک سوال اور ہے کیا کل تمہارے لوگوں کا سٹی گارڈز سے تصادم ہوا تھا؟''

روبی چونکی۔ اس کے تاثرات بدل گئے اور اس نے اچانک ہاتھ سامنے کیا تو اس میں فائر کور تھا۔ اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''واپس آنے کے بعد مجھے سینیٹری میں لگایا گیا ہے اور میں بھی اس دستے میں شامل تھا جس نے تصادم کے مقام کی صفائی کی تھی۔''

''ہمارے چار ساتھی مارے گئے اور دو پکڑے گئے۔'' روبی نے فائر کور نیچے کرلیا۔ ''تم نے کہا واپس آنے کے بعد..... اس کا مطلب؟''

ست بیری نے اسے اپنی اصل کہانی سنائی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ شہر سے باہر بھی پانی کا ذخیرہ ہے اور زمین بدستور زرخیز ہے۔ ست بیری نے کہا۔ ''یہ سچ ہے۔ میں نے آلو اگائے اور مجھے یقین ہے کہ پانی ہو تو باقی سبزیاں اور پودے بھی اُگ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہاں بتایا جاتا ہے کہ زمین بنجر ہوگئی ہے اور شہر سے باہر کہیں پانی نہیں ہے۔''

''یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں ہمیں غلام بنا کر رکھنے کے لیے۔'' روبی نے تلخی سے کہا۔ ''لیکن جلد ہم اس جبر کے نظام کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیں گے۔''

''روبی! یہ ممکن نہیں ہے۔ تم چند لوگ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ اسی طرح تلاش کرکے تمہیں ختم کردیں گے۔''

''تب ہم کیا کریں؟''

''یہاں سے نکل چلو۔ میں جانتا ہوں آس پاس مردہ شہر ہیں۔ وہاں سے ہمیں سامان مل سکتا ہے۔ خود میں نے اور میرے پاپا نے وہاں سے سامان لے کر بہت ساری چیزیں بنائی ہیں۔ میرے پاس ائربائیک بھی ہے جو یہاں سے کچھ دور ایک جگہ چھپائی ہے۔''

''ہم باہر زندہ نہیں رہ سکتے۔'' روبی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پانی کا ذخیرہ جس کی تم بات کررہے ہو وہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ کبھی بھی ختم ہوسکتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہے بس ہمیں حالات بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''میرا نہیں خیال... کہ تم لوگ یہاں کے حالات بدل سکتے ہو۔''

اچانک دوسرا آدمی جو اصل میں ایک نوجوان لڑکا تھا تیزی سے اندر آیا اور اس نے ست بیری کو دھکیل کر دیوار سے لگادیا۔ ''میں نے کہا تھا نا یہ کونسل کا جاسوس ہے۔''

''میں جاسوس نہیں ہوں۔'' ست بیری نے مزاحمت کیے بغیر کہا۔ ''میں آزاد تھا اور صرف اس لیے یہاں آیا ہوں کہ جو لوگ اس قید خانے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں' ان کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔''

''تم نے کیا سمجھا ہے، یہاں سے باہر جانا آسان ہے؟'' دوسرا آدمی زہریلے لہجے میں بولا۔

''بالکل آسان ہے۔'' ست بیری نے یقین سے کہا۔ ''میں نے تمام حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا ہے۔ فصیل کی برائے نام ہی نگرانی ہوتی ہے کیونکہ کونسل کو یقین ہے کوئی یہاں سے باہر جاکر مرنا نہیں چاہے گا۔ ہم ذرا سی کوشش سے نکل سکتے ہیں۔''

''اور اس کے بعد بھوکے پیاسے صحرا میں مرجائیں ہے'' پہلا لڑکا بھی اندر آگیا۔ اس کا رویّہ بھی جارحانہ تھا۔

''کیسے مرجاؤ گے، جب میں زندہ رہا ہوں۔''

''یہ بکواس کررہا ہے۔'' دوسرا پھر بولا تھا کہ ست بیری نے اس کے منہ پر کہنی سے وار کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا اور اس کے بعد دونوں بپھر کر ست بیری کی طرف آئے تھے کہ روبی درمیان میں آگئی۔

''رک جاؤ۔'' روبی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ جو کہہ رہا ہے، میں اس کی تصدیق کرسکتی ہوں۔''

''تب تک یہ کونسل کو ہمارے بارے میں بتادے گا۔''

''تب تک یہ یہیں رہے گا۔'' روبی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''سچ جھوٹ سامنے آنے کے بعد اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' ست بیری نے اطمینان سے کہا۔ ''لیکن اس کے بعد میں واپس نہیں جاسکوں گا کیونکہ میں کیا وضاحت پیش کروں گا کہ میں ایک دن کہاں رہا اور میری وضاحت کون مانے گا۔ میں ویسے ہی آزمائشی مدت میں ہوں، وہ مجھے شہر بدر کردیں گے۔''

''اب تم اسی جگہ رہو گے۔'' روبی نے کہا اور گھڑی

دیکھی۔ ''جانے کا وقت ہوگیا ہے۔''

روبی کے ساتھی لڑکوں کے نام کورین اور شرنائل تھے۔ کورین اب تک اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ست بیری کی ضرب سے اس کے منہ سے خون چھلک آیا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ ''جلد تم ہمیشہ کے لیے غائب ہوجاؤ گے۔''

''دیکھتے ہیں۔'' ست بیری نے سکون سے کہا۔ وہ تینوں چلے گئے اور وہ اس جگہ اکیلا رہ گیا۔ یہاں بہت کچھ تھا جو شاید ان لوگوں نے ہنگامی حالات کے لیے جمع کیا تھا مگر کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ یہاں خوراک اور پانی بھی نہیں تھا۔ باہر جانے والا دروازہ دھات کا بنا ہوا تھا اور اسے کھولنے کا طریقہ ست بیری کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ صحرا کے مقابلے میں شہر میں رات اتنی سرد نہیں ہوتی تھی اور وہ اس بند جگہ سکون سے سوتا رہا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو روبی آگئی اور وہ عجلت میں تھی۔ وہ اس کے لیے خوراک اور پانی لائی تھی۔ اس نے ست بیری کو بتایا۔ ''یہ میں نے خود بنایا ہے۔ اب مجھے کام پر جانا ہے۔''

''تم کہاں کام کرتی ہو؟''

''لیب میں جہاں پودوں، سبزیوں کے بیجوں کی پروسیسنگ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم پرندوں کی کلوننگ کرتے ہیں۔'' روبی نے جواب دیا۔ ست بیری چونک گیا۔ اس نے کہا۔

''تم بہت اہم جگہ کام کرتی ہو۔ کیا تم وہاں سے سبزیوں اور پھلوں کے بیج لاسکتی ہو؟''

''لا تو سکتی ہوں۔'' روبی نے اپنا بیگ بند کرتے ہوئے کہا جس میں وہ ست بیری کے لیے ناشتا لائی تھی۔ ''مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''میری بات سنو......''

''شام کو۔'' روبی نے کہا اور باہر نکل گئی۔ ست بیری گہری سانس لے کر رہ گیا پھر وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔ یقیناً روبی نے اپنے راشن سے قربانی دی تھی کیونکہ یہاں سب کو ہفتے بھر کا ناپا تلا راشن ملتا تھا۔ اگر کسی کا راشن ضائع ہوجاتا تو اسے بڑی مشکل سے اضافی راشن ملتا تھا اس لیے سب اپنے راشن کے معاملے میں محتاط رہا کرتے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روبی کس طرح سے تصدیق کرے گی۔ تصدیق کے تمام ذرائع سٹی کونسل اور اس کے خاص آدمیوں کے قبضے میں تھے۔ عام افراد کی کسی قسم کے ریکارڈ تک رسائی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کام کے لیے مخصوص آلات استعمال کرنا جانتے تھے۔ ست بیری کا سارا دن سوچتے

عزت

بیوی۔ ''میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔''

شوہر۔ ''کتنی عزت؟''

بیوی۔ ''اتنی کہ اگر آپ بیڈ پہ بیٹھے ہوں تو میں صوفے پہ بیٹھوں گی۔''

شوہر۔ ''اگر میں صوفے پہ بیٹھ گیا تو؟''

بیوی۔ ''تو میں موڑھے پہ بیٹھوں گی۔''

شوہر۔ ''اگر میں موڑھے پہ بیٹھ گیا تو؟''

بیوی۔ ''تو میں پیڑھی پہ بیٹھوں گی۔''

شوہر۔ ''اگر میں پیڑھی پہ بیٹھ گیا تو؟''

بیوی۔ ''تو میں زمین پہ بیٹھوں گی۔''

شوہر۔ ''اگر میں زمین پہ بیٹھ گیا تو؟''

بیوی۔ ''میں گڑھا کھود کے اس میں بیٹھوں گی۔''

شوہر۔ ''اگر میں گڑھے میں بیٹھ گیا تو؟''

بیوی غصے سے۔ ''تو میں گڑھے کو مٹی سے بھر دوں گی، کمبخت تیرے کو عزت راس نہیں آتی۔''

مرسلہ: رضوان تولی کریزوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہوئے گزرا کہ وہ کس طرح ان لوگوں کو راضی کرے۔ وہ جو خواب دیکھ رہے تھے، اس کی تعبیر ممکن نہیں تھی۔

شام کو آٹھ بجے کے بعد کورین اور شرنائل دو اور افراد کے ساتھ آئے۔ وہ اس میں دلچسپی لے رہے تھے مگر ان کا رویّہ معاندانہ ہی تھا۔ انہوں نے ست بیری سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے رکھائی سے کہا۔ ''اب کسی قسم کی گفتگو اسی وقت ہوگی جب میری حیثیت کا تعین ہوجائے گا۔''

''جلد تمہاری اصلیت سامنے آجائے گی۔'' کورین نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اسی لمحے روبی اندر آئی۔ وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے پہلے ست بیری کے لیے ڈز نکال کر میز پر رکھا مگر ست بیری نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس سے زیادہ دوسرے بےتاب تھے۔ شرنائل نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

روبی نے سر ہلایا۔ ''کلیئر ہے...... یہ سچ مچ باہر سے

آیا ہے۔یہی نہیں ،یہ شک کی حد تک نگرانی میں ہے۔''
کورین نے مایوسی سے کہا۔''اس کا مطلب ہے ،ہم نے بلاوجہ اسے روکا۔اب یہ ہم پر بوجھ بن جائے گا۔''
''میں بالکل بوجھ نہیں بنوں گا۔''سٹ بیری نے کہا۔''تم فکرمت کرو،میں نے کہا نا میں شہر سے باہر جاسکتا ہوں۔''
کورین نے نفی میں سر ہلایا۔''یہ آسان نہیں ہے۔''
''مشکل سے سہی لیکن میں باہر جاسکتا ہوں۔''سٹ بیری کھڑا ہو گیا۔''افسوس کہ تم لوگوں کی وجہ سے میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔تم لوگ نہ سہی اس شہر میں بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جو اس قید سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہوں گے۔مگر اب میں انہیں تلاش نہیں کرسکتا۔''
''اپنی خوشی سے کوئی موت قبول نہیں کرے گا۔''اشرتانگل نے نفی میں سر ہلایا۔
''سنو،ہمیں اس کی مدد کرنا ہوگی۔''روبی نے کہا تو سب نے اسے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کر دی ہو۔
''ہم اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔''کورین نے کہا۔
''ہمیں کرنا ہوگی ورنہ اس نے خود باہر جانے کی کوشش کی اور پکڑا گیا تو ہمارے بارے میں بتا دے گا۔''روبی نے زور دے کر کہا تو وہ چونک گئے۔یہ خیال کسی کو نہیں آیا کہ وہ ان کا ٹھکانا دیکھ چکا تھا اور ان کے ناموں سے بھی واقف تھا۔اگر وہ پکڑا جاتا تو سٹی گارڈز کے جلاّد اس سے سب اگلوا لیتے۔مختصر بحث کے بعد وہ مان گئے کہ سٹ بیری کو شہر سے باہر پہنچانے میں اس کی مدد کریں گے۔تب تک وہ ان کے ساتھ رہے گا۔انہوں نے اس کی خوراک کا ذمہ بھی لے لیا تھا۔دو دن بعد ایک رات اسے وہاں سے نکالا گیا۔کورین اور روبی کے ساتھ ایک آدمی اور تھا اور اس نے سٹی گارڈ کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ یہ وردی انہوں نے کسی طرح سے حاصل کر لی تھی۔وہ چھپتے چھپاتے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے شہر کی فصیل کے پاس آئے۔اندر سے اوپر جانے کے کئی راستے تھے مگر ان پر مستقل گارڈز گشت کرتے تھے۔بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح اوپر بھی پہنچ گئے اور ایک کسی قدر تاریک جگہ انہوں نے رسی کی مدد سے سٹ بیری کو فصیل سے نیچے اتار دیا۔فصیل پر کچھ فاصلے کے بعد سرچ لائٹس لگی تھیں جو خودکار انداز میں گردش کرتی تھیں۔سٹ بیری نے ان کی گردش کے دورانیے کا اندازہ لگایا اور پھر پتھروں اور ریت کے چھوٹے ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا دور اس طرف جانے لگا جہاں اس نے اپنی ائر بائیک اور دوسرا سامان چھپایا تھا۔جب وہ چھوٹی پہاڑی سر کرکے دوسری طرف پہنچا تو صبح طلوع ہو چکی تھی۔اس نے پلٹ کر شہر کی طرف دیکھا اور تھکے قدموں سے اس جگہ پہنچا جہاں اس نے سب چھپایا تھا۔مگر جب وہ وہاں پہنچا تو ریت میں گڑھا تھا اور اس میں چھپایا ہوا سامان غائب تھا۔خطرے کے احساس کے ساتھ وہ پلٹا مگر اسے دیر ہو گئی تھی۔اس کے عقب میں ایک سٹی گارڈ موجود تھا اور اس نے اپنی فائر گور کی نال گھما کر اس کے سر پر ماری۔سٹ بیری چکرا کر نیچے گرا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو وہ ایک نیم تاریک کمرے میں ایک فولادی کرسی سے بندھا بیٹھا تھا۔وہاں چند افراد موجود تھے۔سٹ بیری ان کی صورتیں واضح نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ سٹی کونسل سے تعلق رکھتے ہوں گے۔اسے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک شخص نے گونجتی آواز میں پوچھا۔''آئن روڈز......تم نے شہر سے فرار کی کوشش کیوں کی؟''
''مجھے یہاں گھٹن ہو رہی تھی۔''اس نے جھوٹ بولا۔اسے اطمینان ہوا تھا کہ اس کی اصل شناخت سامنے نہیں آئی تھی۔
''یہ جھوٹ ہے۔تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہارا سامان بھی قبضے میں لے لیا ہے۔تم نے ساری کہانی غلط سنائی تھی۔تم نے یہ سارا سامان کہاں سے لیا؟''
''میں نے اس حد تک غلط کہا تھا کہ میں بھٹکتا ہوا یہاں آیا۔میں جان بوجھ کر یہاں آیا تھا کیونکہ میں اکیلا تھا اور انسانوں کے درمیان رہنا چاہتا تھا۔''
''تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔اگر ایسا تھا تو تم یہاں سے فرار کیوں ہوئے؟''
''میں نے بتایا نا کہ میں گھٹن محسوس کر رہا تھا۔میں اب تک آزاد رہتا آیا ہوں اور مجھے ایسے ماحول کی عادت نہیں ہے۔اس لیے میں نے یہاں سے فرار کا فیصلہ کیا۔''
''فرار میں کن لوگوں نے تمہاری مدد کی؟ تم غائب ہونے کے بعد چار دن کہاں رہے؟''
''کسی نے میری مدد نہیں کی۔میں گلیوں میں چھپتا رہا تھا۔''
''اس دوران میں تمہیں کس نے خوراک اور پانی دیا؟''
''میں اپنے اپارٹمنٹ سے دونوں چیزوں کا ذخیرہ لے کر نکلا تھا۔''
''تم پھر جھوٹ بول رہے ہو،تمہارے اپارٹمنٹ میں راشن کا ذخیرہ موجود تھا۔''

انہوں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا اور اس کے بعد اسے اذیت سے گزرنا پڑا۔ سٹی گارڈز کے جلاد اسے جسمانی اذیتیں دے کر سچ پوچھ رہے تھے مگر سٹ بیری نے اپنی زبان بند رکھی۔ وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا کہ اس کی کسی نے مدد نہیں کی اور وہ خود یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ ایک رات اذیتوں کے دور سے گزر کر وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں کرسی پر جھول رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ سمجھا کہ جلاد آرام کر کے پھر آگئے ہیں۔ مگر آنے والا ایک ہی تھا اور اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔ ''سٹ بیری۔''

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ''روبی! تم...... ان کے ساتھ؟''

روبی نے اپنا نازک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ ''شش...... آہستہ بولو...... میں بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ دو دن تو تمہارا سراغ لگانے میں لگے ہیں۔''

''روبی! تمہاری صفوں میں کوئی غدار ہے۔ اسی نے میرے بارے میں بتایا ہے کیونکہ جب میں اس جگہ پہنچا جہاں میرا سامان تھا تو سامان غائب تھا اور یہ لوگ میرے منتظر تھے۔''

''ہمارے درمیان کوئی غدار نہیں ہے۔'' روبی نے یقین سے کہا۔ ''میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ ایک دن اور گزار لو پھر ہم تمہیں آزاد کرا لیں گے۔''

''اگر تم مجھے آزاد کرا لوگی تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ غدار سب کو پکڑوا دے گا۔''

''میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ اتفاق ہے۔'' روبی نے کہا۔ ''اب میں جارہی ہوں، جلد تم آزاد ہو گے۔''

روبی جس طرح آئی تھی، اسی طرح خاموشی سے چلی گئی۔ سٹ بیری جانتا تھا کہ اس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ خطرہ کیوں مول لیا۔ خوش قسمتی سے اگلا دن اس کے لیے بہتر گزرا۔ اس کے زخموں کا علاج ہوا اور اسے کھانا اور پانی بھی دیا گیا مگر ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس کے لیے کم سے کم بھی سزائے موت کا فیصلہ ہوتا اور یہاں سزائے موت دینے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ معتوب کو شہر بدر کر دیا جاتا۔ وہ کسی ویرانے میں پیاس اور بھوک سے سسک سسک کر جان دیتا تھا۔ رات آئی اور وہ جاگنے کی کوشش میں اونگھ رہا تھا کہ باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی کراہا ہو پھر زمین پر گرا ہو۔ وہ چونک گیا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور روبی اندر آئی۔ اس نے تیزی سے اسے کرسی کی گرفت سے آزاد کیا۔ ''جلدی چلو، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ کسی وقت بھی خطرے کا الارم بج جائے گا۔''

کمزوری اور زخموں سے چور ہونے کے باوجود سٹ بیری تیزی سے حرکت میں آیا۔ باہر راہداری میں نگران پڑا تھا، پتا نہیں بے ہوش تھا یا مر گیا تھا۔ آگے بھی انہیں اسی طرح سٹی گارڈز بے حس و حرکت پڑے دکھائی دیے۔ بالآخر وہ اس عمارت سے باہر نکل آئے۔ روبی کے ساتھ چھ افراد اور تھے۔ وہ تاریک گلیوں اور سرنگوں سے ہوتے ہوئے دور شہر کے عام علاقے میں ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچے۔ سٹ بیری کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ صاف ستھری حالت میں ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے زخم بہتر تھے اور اب ان میں درد نہیں تھا۔ روبی اس کے پاس موجود تھی۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی۔ ''اب کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' سٹ بیری نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا۔''

''تمہاری خاطر نہیں، اپنی خاطر۔'' روبی نے کہا۔ ''تم ہمارے بارے میں جانتے تھے۔''

''میں نے تمہارے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن کیا تم نے واقعی یہ خطرہ اس لیے مول لیا تھا؟''

روبی نے رخ پھیر لیا۔ ''اب میں چلوں گی۔ وقت ہو گیا ہے۔ کل صبح ملاقات ہوگی۔ تمہارے لیے کھانا اور پانی رکھا ہوا ہے۔''

سٹ بیری اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ قید اور تشدد کے دوران اس نے جتنا سوچا اسے اتنا ہی یقین ہوا کہ وہ کسی کی مخبری پر پکڑا گیا ہے۔ ورنہ سٹی گارڈز کو بھلا کیسے پتا چلا کہ اس نے اپنا سامان کہاں چھپایا تھا۔ اس ساری رات وہ آرام کرتا رہا۔ خوراک اور پانی سے اس کی حالت مزید بہتر ہو گئی۔ صبح روبی آئی تو کسی قدر پُرجوش تھی۔ اس نے سٹ بیری سے کہا۔ ''بس کچھ دن کی بات ہے، بالآخر ہمیں جبر کے اس نظام سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔''

وہ تشویش زدہ ہو گیا۔ ''تم لوگ کسی کارروائی کی تیاری کر رہے ہو؟''

روبی نے سر ہلایا۔ ''ہاں، ہم ری ایکٹر پر قبضہ کرنے جارہے ہیں۔ بجلی بند ہوتے ہی سارے سسٹم ناکارہ ہو جائیں گے اور تب ہم شہریوں کو آزاد کرا کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر کے سٹی کونسل والوں کو حراست میں لے لیں گے۔''

''روبی! مجھے یقین نہیں ہے، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ لوگ بہت ہوشیار اور بیدار ہیں۔ انہوں نے تمہاری صفوں میں پہلے ہی غدار شامل کیے ہوئے ہیں۔''

''ہمارا ایک ایک آدمی چنا ہوا اور اعتماد والا ہے۔'' روبی نے پھر یقین کرنے سے انکار کیا۔ ''دوسرے اگر مخبری ہوئی ہوتی تو صرف تم نہیں پکڑے جاتے بلکہ ہم تین بھی پکڑے جاتے۔ مگر ہمیں نہیں پکڑا گیا اس لیے تم فکر مت کرو۔''

سٹ بیری کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کیا مجھے باہر آنے جانے کی اجازت ہے؟''

''تم پر پابندی نہیں ہے لیکن تمہارا باہر جانا بالکل مناسب نہیں ہوگا۔ سٹی کونسل کی جانب سے تمہاری تصویر ہر جگہ دکھائی جارہی ہے۔ شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جو اب تمہیں پہچان نہ سکے۔''

روبی کو کام پر جانا تھا اس لیے وہ چلی گئی۔ سٹ بیری ایک بار پھر اکیلا تھا اور اس بار اس نے روبی کے جانے کے بعد زیادہ اکیلا پن محسوس کیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ لڑکی اس کے دل میں خاص مقام حاصل کر چکی ہے۔ وہ اپنے آدمیوں میں برتر پوزیشن رکھتی تھی کیونکہ اس کی کہی بات حروف آخر ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کے لیے سب خود کر رہی تھی۔ سٹ بیری کا پہلی بار کسی لڑکی سے واسطہ پڑا تھا مگر انسانی جذبات اور فطرت سے وہ ناآشنا نہیں تھا۔ مگر وہ جس جگہ اور جن حالات میں تھا، روبی کے لیے اپنے جذبات کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دو دن مزید اسی جگہ رہا۔ اس کے زخم بھر گئے تھے اور کمزوری بھی دور ہو گئی تھی۔ تیسرے دن خلافِ توقع روبی اور بہت سے دوسرے لوگ دن میں آگئے۔ سٹ بیری کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے روبی سے پوچھا۔ ''کوئی خاص بات ہے؟''

روبی نے سر ہلایا۔ ''ہاں...... آج رات جب لوگوں کو تفریح کے لیے نکلنے کی اجازت ملے گی تب ہم بھی باہر جائیں گے اور ری ایکٹر پر قبضہ کریں گے۔''

''تم لوگوں نے تمام حفاظتی انتظامات دیکھ لیے ہیں؟''

''بالکل، ہمارا پلان مکمل ہے۔'' روبی نے اسے یقین دلایا۔ اس بار انہوں نے کہیں سے ہتھیاروں کے ذخیرے بھی برآمد کیے تھے۔ ان میں عام فائر گنز کے ساتھ ایسی تباہ کن گنیں بھی تھیں جو دو فٹ موٹی کنکریٹ کی دیوار توڑ سکتی تھیں۔ اسلحے اور افرادی قوت کے لحاظ سے ان کی تیاری مکمل تھی مگر وہ اس صورت میں کامیاب ہو سکتے تھے جب سٹی کونسل کو ان کے بارے میں علم نہ ہو۔ سٹ بیری کا اندیشہ برقرار تھا کہ ان میں سٹی کونسل کے مخبر ہیں اور اس صورت میں ان کا منصوبہ ناکام ہو سکتا تھا۔ آٹھ بجتے ہی وہ سب مسلح حالت میں باہر نکل آئے۔ روبی نے بتایا کہ ایسی ہی دو ٹولیاں اور مختلف جگہوں سے نکل کر ری ایکٹر کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ وہ سب گلیوں اور سرنگوں سے ہوتے ہوئے ری ایکٹر کے سامنے پہنچے۔

شہر اور ری ایکٹر میں فاصلہ رکھا گیا تھا تاکہ کسی حادثے کی صورت میں لوگ اس سے متاثر نہ ہوں۔ درمیان میں ایک بڑا سا میدان تھا جو روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ میدان میں داخل ہوئے۔ ری ایکٹر تک سب صاف نظر آرہا تھا۔ سٹ بیری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ری ایکٹر سے پہلے اتنا بڑا سا میدان کیوں خالی رکھا گیا تھا اور یہاں کوئی گارڈنگ نہیں تھا۔ یہ اس وقت ان کی سمجھ میں آیا جب وہ سب میدان میں داخل ہوئے اور اچانک ان کے پیروں تلے سے زمین نکلنے لگی۔ میدان میں جگہ جگہ زمین سرک رہی تھی اور اس میں نمودار ہونے والے خلا انسانوں کو نگل رہے تھے۔ گرنے والوں کی بھیانک چیخیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت بلندی سے نیچے گر رہے ہوں۔

دیکھتے ہی دیکھتے میدان سو سے زیادہ آدمیوں کو نگل چکا تھا اور ان میں سے بہ مشکل ایک درجن باقی بچے تھے۔ بچنے والوں میں سٹ بیری کے ساتھ روبی اور شرنائل بھی تھے۔ کورین غائب ہو گیا تھا۔ وہ بھی گرنے والوں میں شامل تھا۔ روبی کو سٹ بیری نے بچا لیا۔ وہ ایک خلا میں تقریباً گر گئی تھی اگر سٹ بیری بروقت اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا اور اسے اوپر نہ کھینچ لیتا۔ جیسے ہی خلا ختم ہوئے اور زمین ہموار ہوئی، چاروں طرف سے سٹی گارڈز نے انہیں گھیر لیا۔ وہ انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دے رہے تھے اور ان کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس کا فائدہ تھا کہ یہ سب مخبری کا نتیجہ تھا۔ وہ لوگ پہلے سے ان کے منتظر تھے اور انہوں نے ان کا انجام بھی طے کر لیا تھا۔ یقیناً سٹ بیری کے فرار کے وقت انہوں نے باقی سب کو اس لیے نہیں پکڑا تھا کہ وہ ایک ساتھ ہی اس پورے گروہ کا خاتمہ چاہتے تھے جو بغاوت پر آمادہ تھا۔

ان سے ہتھیار لے لیے گئے اور ان کے ہاتھ پاؤں فولادی ہتھکڑیوں میں جکڑ کر انہیں مخصوص گاڑیوں میں ڈال

کر کسی نامعلوم مقام پر لے جایا گیا۔ پھر انہیں الگ الگ کوٹھریوں میں رکھا گیا۔ سٹ بیری نے موقع پا کر روبی سے کہا تھا کہ وہ سربراہ ہونے کا اقرار نہ کرے۔ کسی مرنے والے ساتھی کو سربراہ بتا دے مگر اس نے انکار کیا۔ ”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ان کا جاسوس انہیں پہلے ہی میرے بارے میں بتا چکا ہوگا۔“

سٹ بیری نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ تو ہے۔“

دو دن قید میں رکھنے کے بعد انہیں کونسل کی مرکزی کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان سب پر جرم بغاوت ثابت ہو چکا تھا۔ فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی اور انہیں موقع دیا گیا کہ وہ اپنے دفاع میں دلائل دیں۔ سب سے پہلے روبی نے بات کی لیکن اس نے اپنے جرم سے انکار نہیں کیا البتہ اس نے تفصیل سے وجوہات بیان کیں کہ جن کی وجہ سے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے علم بغاوت بلند کیا اور اس ناانصاف نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آخر میں کہا۔ ”مجھے اپنے کیے سے انکار نہیں ہے۔ مجھے صرف افسوس ہے کہ میں ناکام رہی۔“

سب باری باری بات کرتے رہے۔ ان میں سے بعض جذباتی ہو گئے تھے اور انہوں نے سخت زبان استعمال کی مگر ان کی باتوں کو بھی خاموشی سے سنا گیا۔ کونسل کمیٹی کے اراکین سنگلاخ چہروں کے ساتھ منتظر تھے کہ وہ اپنی بات مکمل کریں تو ان کی سزا سنائی جائے۔ اپنی باری پر سٹ بیری نے کہا۔ ”اب میں سچ بولوں گا۔“ پھر اس نے اپنی مکمل کہانی سنائی کہ کس طرح اس کے جلاوطن ماں باپ نے اپنی جانیں بچانے کی کوشش کی مگر صرف وہی بچا۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ آزادی پسند لوگوں کو یہاں سے لے جانے آیا تھا تاکہ وہ اپنی الگ بستی آباد کر سکیں۔ ان کے بیانات مکمل ہونے کے بعد کونسل کمیٹی نے انہیں سزا سنا دی اور سزا یہی تھی کہ انہیں شہر سے دور کسی ویرانے میں پھینک دیا جائے۔ جس وقت یہ کارروائی جاری تھی اور سٹ بیری نے اپنے بارے میں بتایا تو عوامی گیلری میں بیٹھا ہوا ایک شخص چونک اٹھا اور پھر وہ سارا وقت بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ کہنے کو یہ عوامی گیلری تھی مگر یہاں ایلیٹ کلاس کے لوگ ہی آ سکتے تھے۔ اس شخص کا تعلق بھی ایلیٹ کلاس سے تھا۔ کونسل کے فیصلے کے مطابق انہیں ایک ہفتے بعد شہر بدر کیا جاتا۔ تب تک وہ قید خانے میں رہتے۔ یہ فیصلہ سن کر روبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”معزز کونسل کمیٹی! ہم اب تک ایک قید خانے میں ہی رہتے آئے ہیں۔“

انہیں ان کی کوٹھریوں میں واپس بھیج دیا گیا۔ دوسری رات خلافِ توقع سٹ بیری کی کوٹھری کا دروازہ کھلا تو وہ چونک گیا کیونکہ اسے کھانا بھی دروازے کے نیچے ایک درز سے دیا جاتا تھا۔ یہ کوٹھری اسی دن کھلتی جب سزا پر عمل درآمد کا وقت آتا۔ آنے والے نے خود کو اسی طرح چادر میں چھپایا ہوا تھا جیسے کبھی روبی اس سے ملنے آئی تھی مگر یہ شخص کسی گارڈ کے ساتھ آیا تھا اور اسی نے دروازہ کھولا تھا۔ اس شخص کے اندر آتے ہی اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ سٹ بیری بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ ”کون ہو تم؟“

جواب میں آنے والے نے چادر ہٹا دی اور سٹ بیری حیران رہ گیا۔ وہ آرکیل تھا۔ اس کا باس جس نے اسے سینیٹری کے شعبے میں بھیجا تھا۔ اس نے آتے ہی بلا تمہید کہا۔ ”کونسل کمیٹی کے سامنے تم نے اپنے بارے میں جو بتایا تھا وہ سچ ہے؟“

”اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔“ سٹ بیری نے سنجیدگی سے کہا۔ ”موت کے سامنے آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ ہاں میں جھوٹ بول کر یہاں آیا ضرور تھا۔“

”میرے خدا! تم سچ مچ آرٹ بیری کے بیٹے ہو؟“

”ہاں، اپنے باپ کے بارے میں کوئی بے غیرت شخص ہی جھوٹ بول سکتا ہے۔“

”میں آرکیل بیری ہوں، آرٹ بیری کا بھائی۔“ اس نے کہا۔ ”دنیا میں میرا وہی ایک خون کا رشتہ ہے۔“

سٹ بیری نے شک سے اسے دیکھا۔ ”لیکن پاپا نے کبھی تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔ میں دس سال کی عمر تک شہر میں رہا لیکن تم ہم سے نہیں ملے؟“

”ہاں کیونکہ میں اپر کلاس میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد لوئر کلاس سے میرا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے آخری بار آرٹ کو اس وقت دیکھا جب وہ ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ تم میرے بھتیجے ہو۔“ اس نے بازو پھیلا دیے۔

”بھتیجا۔“ سٹ بیری نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم نے ابھی تو کہا تھا کہ تمہارا ہم سے رشتہ ختم ہو گیا ہے۔“

آرکیل کے ہاتھ گر گئے۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ ”تم نے ٹھیک کہا میں جذباتی ہو کر یہاں چلا آیا۔“

وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر اس نے چادر اوڑھی اور مڑ کر دروازہ بجایا۔ گارڈ نے دروازہ کھولا اور آرکیل باہر چلا گیا۔ سٹ بیری جواب تک تن کر کھڑا تھا، اس کے جاتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس دنیا میں خون کا واحد رشتہ اس کے

سامنے آیا تھا مگر وہ اس کے سینے سے نہ لگ سکا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔ مگر اس نے جو کیا اس پر وہ مطمئن تھا۔ اگر آرکیل اپر کلاس میں شامل کر لیا گیا تھا تو اس کی اپنی زندگی ہوگی، اس کے اپنے بیوی بچے ہوں گے۔ ایک سزائے موت کے قیدی سے تعلق ظاہر ہونے پر اس کی پوزیشن خراب ہو سکتی تھی۔ سٹ بیری کے رویے کے بعد اس کا امکان کم تھا کہ وہ اس سے پھر ملنے آتا۔ ایک ہفتے بعد سٹ بیری سمیت پندرہ افراد جن میں نو مرد اور چھ عورتیں یا لڑکیاں تھیں، یہ سب ہی جوان العمر افراد تھے، انہیں قید خانے سے نکال کر شہر کے ائرپورٹ تک لایا گیا۔ وہاں انہیں ایک بڑے طیارے میں بٹھایا گیا۔ یقیناً انہیں کسی ویرانے میں اتارنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ اتفاق سے روبی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے سٹ بیری کا ہاتھ دبایا۔ ”مجھے افسوس ہے تم ہماری خاطر آئے اور اب تم بھی سزا پاؤ گے۔“

”مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔“

”مجھے غدار کا پتا چل گیا ہے۔“ روبی بولی۔ ”وہ کورین ہے۔ وہ مجھ سے ملنے قید خانے میں آیا تھا۔“

”کورین۔“ سٹ بیری نے گہری سانس لی۔ ”تم نے اس سے کیا کہا؟“

”میں نے اسے مبارکباد دی کہ وہ تاعمر اسی قید خانے میں رہے گا۔ میں یہاں سے آزاد ہو کر جا رہی ہوں۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ سٹ بیری مسکرایا۔ ”ہم آزاد ہونے جا رہے ہیں۔“

اسی لمحے طیارہ بلند ہونے لگا۔ یہ ہیلی کاپٹر کی طرح پرواز کرتا تھا۔ یہ کافی بڑا تھا اور طویل فاصلے تک جا سکتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا انہیں دور چھوڑنے کا پروگرام تھا۔ طیارہ بلند ہو کر پہلے جنوب کی طرف گیا مگر شہر سے دور نکلنے کے بعد اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا اور شمال کی طرف پرواز کرنے لگا۔ سٹ بیری حیران ہوا۔ وہ کھڑکی سے نیچے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ روبی غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھنا چاہا لیکن سٹ بیری نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جیسے جیسے طیارہ آگے بڑھ رہا تھا، سٹ بیری پُرجوش اور کسی قدر حیران نظر آ رہا تھا پھر طیارہ نیچے آنے لگا۔ وہ یقیناً شہر سے سیکڑوں میل دور نکل آیا تھا۔ اس کے پائے ریت پر ٹکے اور اس کا عقبی حصہ کھلنے لگا۔ گارڈز ان کے ہاتھوں پیروں کی بیڑیاں کھول رہے تھے اور پھر انہیں باہر نکلنے کا حکم دیا گیا۔ وہ باہر آئے تو طیارے کا دروازہ بند ہونے لگا۔ وہ منتظر تھے کہ کب طیارہ پرواز کر جاتا ہے اور وہ اس ویرانے میں رہ جائیں گے مگر بجائے اس کے کہ اس کے انجنوں کی آواز آتی، کسی نے میگا فون پر کہا۔

”تم لوگوں کو سٹی کونسل کے حکم پر اس ویرانے میں پھینکا گیا ہے مگر تم لوگ ہمت مت ہارو۔ زندگی کے ذرائع تلاش کرنے کی کوشش کرو شاید تم کامیاب رہو۔“

روبی نے حیرت سے کہا۔ ”اس بات کی کیا ضرورت تھی؟“

اسی لمحے طیارے کے انجن گرجے اور وہ پرواز کر گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد سٹ بیری نے کہا۔ ”اس بات کی ضرورت تھی، تب ہی تو کہی گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شرنائل بولا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ سٹ بیری نے روبی کا ہاتھ تھاما اور ایک طرف چل پڑا۔ شرنائل اس کے پیچھے لپکا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”ایک جگہ..... میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے رکے بغیر کہا۔ شرنائل پیچھے آیا تو باقی سب بھی اس کے پیچھے آئے۔ کئی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ بہ مشکل ایک پتھریلی پہاڑی پر چڑھے۔ اب پیچھے آنے والے اسے برا بھلا کہہ رہے تھے مگر جب وہ ٹیلے کے اوپر پہنچے تو ان کی زبان بند ہو گئی۔ سامنے وادی میں آلو کے سبز پودوں سے سجا ہوا کھیت اور وہ مکان نظر آ رہا تھا جو آرٹ بیری نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ سٹ بیری نے روبی کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہمارا مستقبل کا گھر۔“

”ہاں، یہ ہمارا گھر ہوگا۔“ روبی مسکرائی اور اس نے اپنے لباس سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی جس میں مختلف سبزیوں اور پھلوں کے بیج تھے۔ وہاں پانی موجود تھا اور وہ اب ایک نئی بستی بسا سکتے تھے۔

”تم نے کہا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”ہاں لیکن جب میں نے چپکے سے یہ بیج لیب سے لیے تب بھی میرا یہی خیال تھا۔“

سٹ بیری نے اس سے پھر نہیں پوچھا کہ اس نے بیج کیوں لیے تھے۔ ٹیلے سے دوسری طرف اترتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں آرکیل بیری کا شکریہ ادا کیا۔ ”تھینک یو انکل۔“

طیارے سے میگا فون پر آنے والی آواز آرکیل کی ہی تھی۔ وہی انہیں اس جگہ چھوڑنے آیا تھا جہاں وہ زندہ رہ سکتے تھے۔ ایک نئی اور آزاد زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔

قسط نمبر: 4

ستاروں پر کمند

طاہر جاوید مغل

اصول اور انقلاب... ہمیشہ دو مختلف طبقات کے درمیان عمل اور ردّعمل کی ایسی گھلی جنگ کا نام جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ازل سے جاری ہے۔ چاہتوں کو درو بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں... کیونکہ روزن کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے انہیں دہانہ بنا دیتے ہیں... وہ بھی عجیب دہرے نظام اور مزاج کا شکار تھا جیسے کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کے جھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی وہ بھی سر اٹھا کر جینے کی خواہش میں اپنی جڑیں زمین میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے بچپن کی دیوار سے ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا لیکن... اس کی امیدوں کے دیے تیز ہواؤں کے سرکش جھونکے بھی نہ بجھا سکے... دوسری جانب اس کی چاہت تھی جو سودوزیاں کی حد کھینچے بیٹھی فاصلوں کو سمٹنے ہی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ جو ایک پل کی رفاقت میں قید تھا... ان گنت اندیشوں کے باوجود اسے انہونیوں کی امید تھی اگرچہ برسوں سے اس کے آنگن میں دشت کی ویرانی تھی لیکن دل کی گلیوں میں وہی چل تھل موسم کی کسک لیے وہ ایسی مسافت کے لیے رخت سفر باندھ بیٹھا تھا جس میں اس کے پاس حوصلوں اور عزم مصمم کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو خوش گمانیوں میں آکر ستاروں پر کمند ڈال چکا تھا... جس کے پیر تو زمین میں دھنسے تھے مگر... آنکھیں آسمانوں کی بلندیوں میں گم تھیں ایسے میں لگنے والی ہر ٹھوکر اسے ایک نئے رمز... اور ہر دکھ اسے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستارے فلک سے زمین کی طرف نہیں آتے مگر... کمند تو زمین سے فلک کی جانب جاسکتی ہے۔ لہٰذا دور بہت دور اس کے مقدر کا ستارہ بھی اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

رقیبوں کی زہریلی چالوں...... پیار کی مدھر تالوں اور بدلتی رُتوں کا

رومان انگیز طویل سلسلہ

عادل نے اپنا سر نیچے جھکا کر دونوں بازوؤں میں چھپا لیا تھا تاکہ کم سے کم چوٹ لگے لیکن چوٹیں تو جسم کے ہر حصے پر لگ رہی تھیں۔ سر سے رسنے والا خون اس کے سامنے کچی زمین پر ٹپک رہا تھا۔ جو پستول وہ قمیص کے نیچے لگا کر لایا تھا، وہ گر چکا تھا اور کارندوں نے اٹھا لیا تھا پھر اس نے شہزادی کے بڑے بھائی قاسم کی گرج دار آواز سنی۔ ”کیا ہوا ہے؟ یہ کیسے آیا یہاں؟“

نڈھال عادل کو مشتعل کارندوں نے دبوچ کر کھڑا کر دیا۔ وہ چیونٹیوں کی طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ مشتاق ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”قاسم بھائی! یہ پچھلے دروازے سے پتا نہیں کس طرح اندر آ گیا ہے۔ یہاں بیبیاں پینگ جھول رہی تھیں۔“

عقب سے انور کڑک کر بولا۔ ”میں بتاتا ہوں جی یہ کس طرح آیا ہے۔ اس نے زبردستی کی ہے میرے ساتھ۔ پستول سیدھا کیا ہے میری طرف۔ یہ دیکھیں جی۔ یہاں پستول کا دستہ مارا ہے اس نے......“ انور نے اپنے گریبان میں سے اپنی چھاتی دکھائی۔

عادل ہکا بکا تھا۔ اس نے اپنے منہ میں جمع ہو جانے والا خون ایک طرف تھوکا اور انور کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ جھوٹ بولتا ہے، میں یہاں تایا جی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کہا تھا تایا جی یہاں احاطے میں ہیں۔“

”میں نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی جی۔“ فربہ اندام انور ڈھٹائی سے بولا۔ ”اس نے مجھ سے زبردستی پچھلا دروازہ کھلوایا اور دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی کو بتایا تو میری اور میرے بچوں کی خیر نہیں۔“

عادل کے سینے میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ انور اس کے منہ پر سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ ”کمینے، کتے! میں جان سے مار دوں گا تجھے......“ عادل نے کہا اور مچل کر خود کو کارندوں سے چھڑانا چاہا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کے لچک دار جسم میں غیر معمولی توانائی تھی۔ قریب تھا کہ وہ خود کو کارندوں سے چھڑا لیتا اور انور پر جا پڑتا کہ کارندوں نے زور مار کر اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ گرتے گرتے بھی اس نے انور کے منہ پر ایسا زوردار تھپڑ مارا کہ وہ اچھل کر آموں کے ایک ڈھیر پر جا گرا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ کارندے ایک بار پھر عادل پر پل پڑے۔ شہزادی کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید دوسری لڑکیاں اسے کھینچ کر کہیں اندر لے گئی تھیں۔ قاسم خود بھی عادل کو مارنے والوں میں شامل ہو گیا۔ عادل کو اس کے ہاتھوں میں سیاہ ریوالور نظر آیا۔ اس نے ریوالور سے عادل کی گردن پر ایک زوردار ضرب لگائی تو عادل کو لگا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے دھندی چھانے لگی ہے۔ قاسم کی زہریلی پھنکار اس کے کانوں میں پڑی۔ ”مار دو کتے کو...... جان سے مار دو۔“

یہی وقت تھا جب ایک اور گرجتی ہوئی آواز عادل کی سماعت سے ٹکرائی...... ”رک جاؤ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟ رک جاؤ۔“ یہ تایا فراست کی آواز تھی۔

عادل زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کی نئی قمیص تار تار ہو چکی تھی۔ پانچ چھ کارندوں نے اسے دبوچ رکھا تھا۔ تایا فراست نے آگے بڑھ کر عادل کو دیکھا اور پھر بولے۔ ”چھوڑ دو اسے...... پیچھے ہٹ جاؤ۔“

قاسم نے کہا۔ ”ابا جی، یہ خبیث اپنے ہوش میں نہیں ہے، خون چڑھا ہوا ہے اس کے سر کو۔“ پھر وہ مشتاق سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اس کے ہاتھ پاؤں باندھو رسّی سے۔“

تایا فراست نے ذرا توقف سے کہا۔ ”نہیں، اس کی لوڑ نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کتنی گرمی ہے اس کے دماغ میں۔ چھوڑ دو اسے...... پیچھے ہٹ جاؤ۔“

قاسم اور مشتاق نے ایک بار پھر اعتراض کیا۔ بہرحال فراست صاحب کے حکم پر پیچھے ہٹ گئے۔ ریوالور ابھی تک قاسم کے ہاتھ میں تھا۔ باقی کارندوں نے بھی عادل کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔ خون مسلسل اس کے سر اور منہ سے رس رہا تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”دیکھ لو تایا جی! میں آپ سے ملنے آیا تھا اور میرا یہ حال کیا ہے ان لوگوں نے۔ پیچھے سے وار کیا ہے انہوں نے...... مرد ہوتے تو سامنے سے آتے۔ اب بھی مرد ہیں تو سامنے سے آئیں......“

”اوئے۔ تیری مردانگی کی ایسی تیسی......“ قاسم پھر مشتعل ہو کر عادل کی طرف بڑھا لیکن تایا فراست نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

انہوں نے ساری صورت حال کو بھانپ لیا تھا۔ وہ انور کا پھٹا ہوا گریبان اور زخمی سینہ بھی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بیٹے قاسم کو باہر جانے کا کہا پھر عادل، انور اور مشتاق کو اپنے ساتھ لیا اور احاطے کے ایک کمرے میں آ گئے۔ دروازہ بند کر کے انہوں نے اصل صورت حال جاننے کی کوشش کی۔ انور جھوٹ بول رہا تھا اور بڑی ڈھٹائی سے بول رہا تھا۔ مشتاق بھی حتی الامکان اس کی مدد کرنے میں مصروف تھا۔ عادل نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن ساری

باتیں اس کے خلاف جا رہی تھیں۔ آٹھ دس منٹ بعد تایا فراست نے انور اور مشتاق کو بھی باہر بھیج دیا۔ عادل ایک پرانے کپڑے سے بار بار سر اور ہونٹوں سے بہنے والا خون پونچھ رہا تھا۔ اس نے اپنی تار تار قمیص نوچ کر پھینک دی تھی۔ اب اس کے جسم پر صرف بنیان اور پتلون تھی۔

تایا فراست کی پیشانی پر بے شمار بل نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی عادے! تم نے اپنی عزت کا پاس کیا نہ میری عزت کا۔“

”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں تایا جی۔ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں...... ڈراما کر رہے ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو......“

”دیکھ، چور نالے چتر والا کام نہ کر۔ شرمندہ ہونے کے بجائے تم الٹا دوسروں کو الزام دے رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔“

”تایا جی! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہوتی تو میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگ لیتا لیکن جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو شرمندہ کس بات پر ہو جاؤں؟“

”نہیں، تمہیں شرمندہ ہونے کی نہیں...... پنڈ میں سینہ تان کر چلنے کی ضرورت ہے۔ بہت کچھ کر کے آئے ہو تم شہر سے بھی۔“ تایا فراست نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہاں کباڑ اور ردّیاں بیچ رہے ہو اور پنڈ میں مشہور کر رہے ہو کہ لاکھوں کی کمائیاں ہیں اور وہ ماں تمہاری مبارکبادیں وصول کرتی پھرتی ہے لوگوں سے...... بتاؤ مجھ کو ان چھ سات مہینوں میں کون سا پہاڑ توڑا ہے تم نے؟ کون سی توپ چلائی ہے اور جو آگے جا کر ہونا ہے، وہ بھی سب اندازہ ہے ہم کو۔“

”تایا جی! میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ مجھے پتا ہے اور میرے اللہ کو۔ اور مجھے اللہ سے پوری امید ہے کہ وہ میری محنت کا صلہ مجھے ضرور دے گا۔ میں اپنی حق حلال کی کمائی لا کر آپ کے سامنے رکھوں گا...... لیکن...... لیکن شاید آپ کو یقین نہیں۔ اسی لیے آپ کے گھر میں وہ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کم از کم آپ کے ہوتے تو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے زبان دی ہوئی ہے......“

”کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں؟ کیا گل کر رہے ہو تم؟“ تایا فراست تنک کر بولے۔

”تایا جی! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کے گھر میں...... رشتے کی بات ہو رہی ہے۔“

”کس کے رشتے کی؟“

”شہزادی کے رشتے کی، چودھری مختار کے بیٹے کی طرف۔ پورے پنڈ میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ اندر خانے آپ لوگوں نے...... ہاں کر دی ہے۔“ عادل نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

تایا فراست کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ پہلے تو لگا کہ وہ بہت تند و تیز بولیں گے لیکن پھر انہوں نے خود کو کچھ سنبھالا اور عادل کی طرف انگلی اٹھا کر بولے۔ ”دیکھ عادے! زبان سنبھال کر بات کر...... اور میں تیرے منہ سے بار بار اپنی دھی کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔ کوئی حق نہیں ہے تجھے اس طرح گل کرنے کا۔“

عادل نے ڈرے بغیر کہا۔ ”تایا جی! یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔ کیا آپ نے واقعی رشتے کے سلسلے میں چودھریوں کو ”ہاں“ کہہ دی ہے؟“

تایا فراست نے اپنی پگڑی کا اونچا شملہ درست کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں اب تک ایسی کوئی گل نہیں ہوئی تھی پر اب ہو گی...... اب ہو گی۔ جو زبان ہوئی تھی اس سے تو خود پھرا ہے۔ تو نے کہا تھا میں شہزادی سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔ پر آج تو چوری چھپے یہاں گھسا ہے۔ بے حیائی دکھائی ہے تو نے۔ اب میں بھی کسی وعدے کا پابند نہیں ہوں اور ان چھ مہینوں میں دیکھ بھی لیا ہے میں نے کہ آگے چل کر تو نے کون سا دلّی فتح کرنا ہے۔“

غم و غصے اور بے بسی کی شدت سے عادل کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نے تایا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تایا! میں اپنی ماں کے سر کی قسم کھاتا ہوں، میں یہاں صرف آپ سے ملنے آیا تھا۔ ان لوگوں نے کسی کے کہنے پر ناٹک کیا ہے، مجھے پھنسایا ہے...... اور اگر آپ کو اب بھی یقین نہیں تو پھر......“ وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر تیزی سے دیوار کی طرف بڑھا۔ یہاں ایک تھری ناٹ تھری رائفل جھول رہی تھی۔ اس نے تیزی سے یہ ڈبل بیرل رائفل اتاری۔ تایا فراست اضطراری طور پر ایک قدم پیچھے ہٹے...... لیکن عادل نے رائفل کو الٹا کر اس کا دستہ تایا کی طرف بڑھایا اور نال اپنے سینے پر رکھ لی۔ ”اب بھی یقین نہیں تو پھر مجھے گولی مار دیں۔ میں اپنا خون آپ کو معاف کرتا ہوں۔ خدا کے واسطے، گولی مار دیں مجھے۔“ اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

تایا فراست کے چہرے پر غصے کی سرخی کچھ کم تو ہوئی لیکن ماتھے کی تیوریاں برقرار رہیں۔ اگلے پانچ دس منٹ میں تایا اور بھتیجے کے درمیان تند و تیز گفتگو ہوئی۔ تایا فراست

کا کہنا تھا کہ وہ خیالی پلاؤ پکانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ایک بے کار امید کے سہارے وہ اپنی بیٹی کو دیر تک گھر میں نہیں بٹھا سکتے۔ انہیں ابھی سے اندازہ ہوگیا ہے کہ اس انتظار کا نتیجہ کیا نکلنا ہے۔

عادل کی منت سماجت کے جواب میں تایا نے بس اتنا کہا کہ وہ اس سال کے آخر تک دیکھیں گے۔ اگر انہیں کوئی امید نظر آئی تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ کہیں نہ کہیں شہزادی کی بات طے کردیں گے۔ ان کا لہجہ بالکل حتمی تھا اور وہ مزید کوئی بات سننا نہیں چاہتے تھے۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب جلد از جلد اپنے دیے ہوئے قول سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے عادل کو ہدایت کی کہ موجودہ حالات میں اس کا یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ وہ آج رات ہی ماں کو لے کر یہاں سے چلا جائے۔

☆☆☆

تایا کی زمین سے عادل خود ہی زخمی ہوکر نہیں آیا تھا، اس کا دل بھی زخمی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سینے کے اندر خون ٹپک رہا ہے۔ ڈھائی سال کی بتایا مہلت اب گھٹ کر چھ سات ماہ رہ گئی تھی۔ گاؤں میں اس کی جو بے عزتی ہوئی اور جو زخم اسے لگے وہ علیحدہ تھے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ چودھری مختار کا کیا دھرا ہے۔ چودھریوں نے اس کے لیے یہاں سازشوں کا جال بچھایا ہوا تھا۔ شاید تایا فراست نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ فی الحال یہاں سے چلا جائے، کہیں کوئی ایسی گڑبڑ نہ ہوجائے کہ وہ خود بھی اسے سنبھال نہ سکیں۔

گاؤں میں اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جارہا تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ باغ میں موجود کارندوں نے عادل کو ننگا کرکے مارا ہے اور اس نے معافیاں مانگ کر اپنی جان چھڑائی ہے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ شہزادی کو اغوا کرنے کی نیت سے نئے احاطے میں داخل ہوا اور شہزادی کے شور مچانے پر پکڑا گیا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ گھر میں ماموں طفیل اور ممانی بھی بالکل گم صم تھے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ جھیل میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے وہ ماں بیٹا جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیں۔

کرنے کو تو عادل بہت کچھ کرسکتا تھا۔ اگر وہ ایک بار چودھری مختار کی حویلی میں گھس جاتا تو پھر وہاں دو چار لاشیں تو ضرور گر جاتیں لیکن ابھی اسے تحمل سے کام لینا تھا۔ سرمد صاحب کے یہ الفاظ بھی بار بار اس کے کانوں میں گونجتے تھے۔ ”غم و غصے کو برداشت کرنا بھی ان تکلیفوں کے زمرے میں آتا ہے جن کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اسی فرد یا افراد کو اپنے غم و غصے کا نشانہ بنائیں جن کی وجہ سے ہم مشتعل ہوئے ہیں۔ ہم اپنے غم و غصے کا رخ کسی اور طرف موڑ کر بھی اپنا بدلہ چکا سکتے ہیں۔ جیسے کلاس میں مانیٹر کے ہاتھوں بے عزت ہونے والا لڑکا، مانیٹر سے لڑنے کے بجائے زیادہ محنت سے پڑھائی کرکے اور امتحان میں مانیٹر کو نیچا دکھا کر اپنا بدلہ چکا سکتا ہے۔“

سرمد صاحب کی ایسی ہی باتیں سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھیں اور اس کی اندرونی کیفیت کو بدل ڈالتی تھیں۔

رات کو عادل خاموشی سے پھلاہی درختوں میں پہنچا تھا جہاں ایک جھنڈ کے درمیان خالی جگہ پر گاؤں کے لڑکوں نے اکھاڑا سا بنا رکھا تھا۔ یہاں نوری نت کا وہ پھٹا پرانا پتلا بھی تھا جس پر لڑکے گھونسا بازی کیا کرتے تھے۔ عادل کے سینے میں جیسے آگ سی بھڑک رہی تھی۔ یہ آگ کسی اور طرف کا رخ کرتی تو یقیناً بہت کچھ بھسم ہوجاتا...... اس نے اس آگ کا رخ نوری نت کے پتلے کی طرف کردیا۔ وہ دیر تک اس پر مکا بازی کرتا رہا۔ دھائیں دھائیں کی آوازوں سے رات کی خاموش تاریکی میں ارتعاش پیدا ہوتا رہا۔ اس کے بازو شل ہوگئے۔ ٹانگیں بے جان محسوس ہونے لگیں لیکن وہ لگا رہا۔ سانس اب سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ پسینا دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ یہی پسینا اس کے اندر کی آگ پر گر کر اسے ماند بھی کر رہا تھا۔ وہ رکا نہیں بلکہ تھک کر گر گیا۔ آج صبح جو چوٹیں اس کے جسم پر لگی تھیں، ان سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

قدموں کی مدھم آواز نے اسے چونکایا۔ یہ شاہد تھا، اس کے بچپن کے ساتھیوں میں سے ایک۔ عادل اٹھ بیٹھا۔ شاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور گلے سے لگایا۔ شاہد آبدیدہ تھا۔ آج صبح پال پور میں باغ کے اندر عادل کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس نے عادل کے سارے یار دوستوں کو سخت غمزدہ کردیا تھا۔ شاہد نے عادل کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”عادے! ہم سب جانتے ہیں یہاں جو کچھ ہورہا ہے۔ وہ لمبو ناصر اپنے باپ چودھری مختار کے ساتھ مل کر شہزادی کو تجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ وہ تجھے اتنا بے عزت کر دینا چاہتے ہیں کہ تو دوبارہ پنڈ کا رخ ہی نہ کرے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔“

”کیا کرو گے تم؟“ عادل نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”تم کہو تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ میں نے کوڈو اور سلمان سے بھی بات کی ہے۔ ہم اس کمینے ناصر کی ٹانگیں توڑ

کر کھیتوں میں پھینک دیں گے...... یا ویسے ہی غائب کر دیتے ہیں اس لمڈھینگ کو۔“

عادل نے گہری سانس لی۔ ”نہیں شاہد! یہ تو بڑا کمزور سا جواب ہوگا۔ میں ناصر کو جواب ضرور دوں گا پر کسی اور ڈھنگ سے۔ یہ وقتی ہار ہے، آخری جیت ہماری ہی ہوگی۔“

”لیکن تو کیا کرے گا عادے! تو ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ بڑی اونچی ہواؤں میں ہیں۔ ان کے منڈوں کے پاس بڑا پیسا آگیا ہے۔ بندے اب کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں ان کو۔“

”سب ٹھیک ہوجائے گا یار۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔“ عادل نے آبدیدہ شاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس رات، دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے عادل اپنی ماں کو لے کر خاموشی سے لالی گاؤں سے نکل آیا تھا۔ جب دیہاتی تانگا ماں بیٹے کو لے کر پکی سڑک کی طرف روانہ ہورہا تھا، عادل کو دور پال پور میں تایا کی حویلی کے اونچے برج نظر آئے تھے۔ ان برجوں کے نیچے کسی کمرے میں اس کی شہزادی سو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں شہزادی کی وہ درد بھری آواز گونجنے لگی جو کل لڑائی کے دوران میں سنائی دی تھی۔ ”چھوڑ دو اسے...... نہ مارو...... مرجائے گا...... چھوڑ دو۔“

کیسی بے بسی، تڑپ تھی اس آواز میں۔ وہ جانتی تھی، وہ اس کے لیے زخم کھا رہا ہے۔ اسی کے لیے دربدر ہورہا ہے۔ عادل نے حویلی کے برجوں کے پیچھے آسمان پر وہ ہلکی ہلکی روشنی دیکھی جو سورج طلوع ہونے سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ”شہزادی...... رات کتنی بھی لمبی ہے...... لیکن تیرے آنسوؤں کی قسم...... صبح ضرور آئے گی۔“

☆☆☆

ماں کو گوجرانوالہ میں چھوڑ کر عادل اپنے دوست صادق کے پاس لاہور پہنچ گیا۔ اپنی چوٹوں کے بارے میں عادل نے صادق کو بس اتنا بتایا کہ راستے میں کچھ لڑکوں سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ وہ دونوں رات بھر اپنے کام کے بارے میں بات کرتے رہے۔ صادق کا خیال تھا کہ کباڑ کے کام کو پرانی مشینری کی خرید و فروخت کے کام میں بدل دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی رقم کی ضرورت تھی۔ کم از کم آٹھ دس لاکھ کا سرمایہ تو شروع میں ہونا ہی چاہیے تھا۔

اگلے روز عادل کا دل چاہا کہ سرمد صاحب کو فون کرکے ان کی خیر خیریت دریافت کرے لیکن پھر نہ جانے کیوں ایک جھجک سی آڑے آگئی۔ اس کے ذہن میں آیا کہ کہیں سرمد صاحب یہ نہ سمجھیں کہ بار بار حال پوچھنے کے بہانے وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ سرمد صاحب اسے کیا کام سونپنے والے ہیں اور اس سے کیا مالی فائدہ حاصل ہونے والا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہمایوں کو فون کرلیا اور ان سے سرمد صاحب کا حال چال پوچھ لیا۔ وہ ابھی تک مکمل بیڈ ریسٹ پر تھے۔ اکثر رات کو ٹانگ میں درد محسوس کرنے لگتے تھے۔ تاہم حسب عادت پین کلر وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ کرسٹل بھی یہیں لاہور میں موجود تھی اور تن دہی سے سرمد صاحب کی تیمارداری کر رہی تھی۔

عادل کو صادق کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ صنعتی نمائش میں کھجور کے تنوں پر چڑھنے والا کھیل آج کل پھر پیش کیا جارہا ہے لیکن لاہور میں نہیں کسی اور شہر میں۔ اس کھیل کے لیے رانا سیٹھ نے پھر چودھری مختار کے کارندے حبشی سے رابطہ کر رکھا تھا۔ اس بارے میں تفصیلی معلومات رانا سیٹھ کے کیمرا مین ابرار کے پاس تھیں۔ عادل کو معلوم ہوا کہ ابرار انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا ہے۔ شام کے وقت عادل، ابرار سے ملنے ہی انٹر کانٹی نینٹل گیا تھا لیکن وہاں ابرار سے ملاقات نہیں ہوسکی...... ہاں کسی اور سے ہوگئی اور یہ بڑی سنسنی خیز ملاقات تھی۔ ہوٹل کے مین ڈائننگ ہال سے گزرتے ہوئے عادل کی نگاہ اچانک ایک گوشے کی میز کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں کی مدھم روشنیوں میں اسے خوبرو کرسٹل بیٹھی نظر آگئی۔ اس کے ساتھ جو غیر ملکی نوجوان بیٹھا تھا، وہ یقیناً وہی ”لیوپڈ“ نامی فرینڈ تھا جس نے ایبٹ آباد کے ہوٹل میں کرسٹل سے بدتمیزی کی تھی۔ کرسٹل نے عادل کی طرف دیکھا۔ ذرا سا چونکی لیکن پھر انجان بن گئی۔ عادل سمجھ گیا کہ وہ جان پہچان ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ یقیناً لیوپڈ نے بھی عادل کو دیکھا تھا لیکن وہ چونکہ عادل کو جانتا نہیں تھا لہٰذا اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر عادل بھی ایک قریبی میز پر جا بیٹھا۔ یہاں سستا ترین آرڈر تو کولڈ ڈرنک کا ہی ہوسکتا تھا۔ عادل نے یہی آرڈر دیا اور خوامخواہ اپنے موبائل فون سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

اس ہال کی بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں۔ ہلکا میوزک پلے ہورہا تھا۔ عادل کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ کرسٹل اور لیوپڈ نارمل موڈ میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سامنے آئس کریم اور جوسز وغیرہ رکھے تھے۔ بہرحال کچھ دیر بعد عادل کو یوں لگا جیسے ان کی گفتگو میں تلخی آتی جارہی ہے۔

کا کہنا تھا کہ وہ خیالی پلاؤ پکانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ایک بے کار امید کے سہارے وہ اپنی بیٹی کو دیر تک گھر میں نہیں بٹھا سکتے۔ انہیں ابھی سے اندازہ ہوگیا ہے کہ اس انتظار کا نتیجہ کیا نکلنا ہے۔

عادل کی منت سماجت کے جواب میں تایا نے بس اتنا کہا کہ وہ اس سال کے آخر تک دیکھیں گے۔ اگر انہیں کوئی امید نظر آئی تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ کہیں نہ کہیں شہزادی کی بات طے کر دیں گے۔ ان کا لہجہ بالکل حتمی تھا اور وہ مزید کوئی بات سننا نہیں چاہتے تھے۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب جلد از جلد اپنے دیے ہوئے قول سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے عادل کو ہدایت کی کہ موجودہ حالات میں اس کا یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ وہ آج رات ہی ماں کو لے کر یہاں سے چلا جائے۔

☆☆☆

تایا کی زمین سے عادل خود ہی زخمی ہو کر نہیں آیا تھا، اس کا دل بھی زخمی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سینے کے اندر خون ٹپک رہا ہے۔ ڈھائی سال کی بقایا مہلت اب گھٹ کر چھ سات ماہ رہ گئی تھی۔ گاؤں میں اس کی جو بے عزتی ہوئی اور جو زخم اسے لگے وہ علیحدہ تھے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ چودھری مختار کا کیا دھرا ہے۔ چودھریوں نے اس کے لیے یہاں سازشوں کا جال بچھایا ہوا تھا۔ شاید تایا فراست نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ فی الحال یہاں سے چلا جائے، کہیں کوئی ایسی گڑبڑ نہ ہو جائے کہ وہ خود بھی اسے سنبھال نہ سکیں۔

گاؤں میں اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ باغ میں موجود کارندوں نے عادل کو ننگا کر کے مارا ہے اور اس نے معافیاں مانگ کر اپنی جان چھڑائی ہے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ شہزادی کو اغوا کرنے کی نیت سے نئے احاطے میں داخل ہوا اور شہزادی کے شور مچانے پر پکڑا گیا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ گھر میں ماموں فضیل اور ممانی بھی بالکل گم صم تھے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ جھیل میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے وہ ماں بیٹا جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیں۔

کرنے کو تو عادل بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اگر وہ ایک بار چودھری مختار کی حویلی میں گھس جاتا تو پھر وہاں دو چار لاشیں تو ضرور گر جاتیں لیکن ابھی اسے تحمل سے کام لینا تھا۔ سرمد صاحب کے یہ الفاظ بھی بار بار اس کے کانوں میں گونجتے تھے۔ ''غم و غصے کو برداشت کرنا بھی ان تکلیفوں کے زمرے میں آتا ہے جن کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اسی فرد یا افراد کو اپنے غم و غصے کا نشانہ بنائیں جن کی وجہ سے ہم مشتعل ہوئے ہیں۔ ہم اپنے غم و غصے کا رخ کسی اور طرف موڑ کر بھی اپنا بدلہ چکا سکتے ہیں۔ جیسے کلاس میں ماسٹر کے ہاتھوں بے عزت ہونے والا لڑکا، ماسٹر سے لڑنے کے بجائے زیادہ محنت سے پڑھائی کر کے اور امتحان میں ماسٹر کو نیچا دکھا کر اپنا بدلہ چکا سکتا ہے۔''

سرمد صاحب کی ایسی ہی باتیں سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھیں اور اس کی اندرونی کیفیت کو بدل ڈالتی تھیں۔

رات کو عادل خاموشی سے پھر انہی درختوں میں پہنچا تھا جہاں ایک جھنڈ کے درمیان خالی جگہ پر گاؤں کے لڑکوں نے اکھاڑا سا بنا رکھا تھا۔ یہاں نوری نت کا وہ بیٹا پرانا پتلا بھی تھا جس پر لڑکے گھونسا بازی کیا کرتے تھے۔ عادل کے سینے میں جیسے آگ سی بھڑک رہی تھی۔ یہ آگ کسی اور طرف کا رخ کرتی تو یقیناً بہت کچھ بھسم ہو جاتا...... اس نے اس آگ کا رخ نوری نت کے پتلے کی طرف کر دیا۔ وہ دیر تک اس پر مکا بازی کرتا رہا۔ دھائیں دھائیں کی آوازوں سے رات کی خاموش تاریکی میں ارتعاش پیدا ہوتا رہا۔ اس کے بازو شل ہو گئے۔ ٹانگیں بے جان محسوس ہونے لگیں لیکن وہ لگا رہا۔ سانس اب سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ پسینا دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ یہی پسینا اس کے اندر کی آگ پر گر کر اسے ماند بھی کر رہا تھا۔ وہ رکا نہیں بلکہ تھک کر گر گیا۔ آج صبح جو چوٹیں اس کے جسم پر لگی تھیں، ان سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

قدموں کی مدھم آواز نے اسے چونکایا۔ یہ شاہد تھا، اس کے بچپن کے ساتھیوں میں سے ایک۔ عادل اٹھ بیٹھا۔ شاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور گلے سے لگایا۔ شاہد آبدیدہ تھا۔ آج صبح پال پور میں باغ کے اندر عادل کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس نے عادل کے سارے یار دوستوں کو سخت غمزدہ کر دیا تھا۔ شاہد نے عادل کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''عادے! ہم سب جانتے ہیں یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ لمبو ناصر اپنے باپ چودھری مختار کے ساتھ مل کر شہزادی کو تجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ وہ تجھے اتنا بے عزت کر دینا چاہتے ہیں کہ تو دوبارہ پنڈ کا رخ ہی نہ کرے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔''

''کیا کرو گے تم؟'' عادل نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''تم کہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے گوڈو اور سلمان سے بھی بات کی ہے۔ ہم اس کمینے ناصر کی ٹانگیں توڑ کر کھیتوں میں پھینک دیں گے...... یا ویسے ہی غائب کر دیتے ہیں اس لمڈھینگ کو۔''

عادل نے گہری سانس لی۔ ''نہیں شاہد! یہ تو بڑا کمزور سا جواب ہوگا۔ میں ناصر کو جواب ضرور دوں گا پر کسی اور ڈھنگ سے۔ یہ وقتی ہار ہے، آخری جیت ہماری ہی ہوگی۔''

''لیکن تو کیا کرے گا عادے! تو ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ بڑی اونچی ہواؤں میں ہیں۔ ان کے منڈوں کے پاس بڑا پیسا آگیا ہے۔ بندے اب کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں ان کو۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا یار۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔'' عادل نے آبدیدہ شاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اسی رات، دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے عادل اپنی ماں کو لے کر خاموشی سے لالی گاؤں سے نکل آیا تھا۔ جب دیہاتی تانگا ماں بیٹے کو لے کر پکی سڑک کی طرف روانہ ہو رہا تھا، عادل کو دور پال پور میں تایا کی حویلی کے اونچے برج نظر آئے تھے۔ ان برجوں کے نیچے کسی کمرے میں اس کی شہزادی سو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں شہزادی کی دردو بھری آواز گونجنے لگی جو کل لڑائی کے دوران میں سنائی دی تھی۔ ''چھوڑ دو اسے...... نہ مارو...... مر جائے گا...... چھوڑ دو۔''

کیسی بے بسی، تڑپ تھی اس آواز میں۔ وہ جانتی تھی، وہ اسی کے لیے زخم کھا رہا ہے۔ اسی کے لیے دربدر ہو رہا ہے۔ عادل نے حویلی کے برجوں کے پیچھے آسمان پر وہ ہلکی ہلکی روشنی دیکھی جو سورج طلوع ہونے سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''شہزادی...... رات کتنی بھی لمبی ہے...... لیکن تیرے آنسوؤں کی قسم...... صبح ضرور آئے گی۔''

☆☆☆

ماں کو گوجرانوالہ میں چھوڑ کر عادل اپنے دوست صادق کے پاس لاہور پہنچ گیا۔ اپنی چوٹوں کے بارے میں عادل نے صادق کو بس اتنا بتایا کہ راستے میں کچھ لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں رات بھر اپنے کام کے بارے میں بات کرتے رہے۔ صادق کا خیال تھا کہ کباڑ کے کام کو پرانی مشینری کی خرید و فروخت کے کام میں بدل دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی رقم کی ضرورت تھی۔ کم از کم آٹھ دس لاکھ کا سرمایہ تو شروع میں ہونا ہی چاہیے تھا۔

اگلے روز عادل کا دل چاہا کہ سرمد صاحب کو فون کر کے ان کی خیر خیریت دریافت کرے لیکن پھر نہ جانے کیوں ایک جھجک سی آڑے آگئی۔ اس کے ذہن میں آیا کہ کہیں سرمد صاحب یہ نہ سمجھیں کہ بار بار حال پوچھنے کے بہانے وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ سرمد صاحب اسے کیا کام سونپنے والے ہیں اور اس سے کیا مالی فائدہ حاصل ہونے والا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہمایوں کو فون کر لیا اور ان سے سرمد صاحب کا حال چال پوچھ لیا۔ وہ ابھی تک مکمل بیڈ ریسٹ پر تھے۔ اکثر رات کو ٹانگ میں درد محسوس کرنے لگتے تھے۔ تاہم حسب عادت پین کلر وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ کرسٹل بھی یہیں لاہور میں موجود تھی اور تن دہی سے سرمد صاحب کی تیمارداری کر رہی تھی۔

عادل کو صادق کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ صنعتی نمائش میں کھجور کے تنوں پر چڑھنے والا کھیل آج کل پھر پیش کیا جا رہا ہے لیکن لاہور میں نہیں کسی اور شہر میں۔ اس کھیل کے لیے رانا سیٹھ نے پھر چودھری مختار کے کارندے حبشی سے رابطہ کر رکھا تھا۔ اس بارے میں تفصیلی معلومات رانا سیٹھ کے کیمرا مین ابرار کے پاس تھیں۔ عادل کو معلوم ہوا کہ ابرار انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا ہے۔ شام کے وقت عادل، ابرار سے ملنے ہی انٹر کانٹی نینٹل گیا تھا لیکن وہاں ابرار سے ملاقات نہیں ہو سکی...... ہاں کسی اور سے ہو گئی اور یہ بڑی سنسنی خیز ملاقات تھی۔ ہوٹل کے مین ڈائننگ ہال سے گزرتے ہوئے عادل کی نگاہ اچانک ایک گوشے کی میز کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں کی مدھم روشنیوں میں اسے خوبرو کرسٹل بیٹھی نظر آگئی۔ اس کے ساتھ جو غیر ملکی نوجوان بیٹھا تھا، وہ یقیناً وہی ''لیوپڈ'' نامی فرینڈ تھا جس نے ایبٹ آباد کے ہوٹل میں کرسٹل سے بدتمیزی کی تھی۔ کرسٹل نے عادل کی طرف دیکھا۔ ذرا سا چونکی لیکن پھر انجان بن گئی۔ عادل سمجھ گیا کہ وہ جان پہچان ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ یقیناً لیوپڈ نے بھی عادل کو دیکھا تھا لیکن وہ چونکہ عادل کو جانتا نہیں تھا لہٰذا اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر عادل بھی ایک قریبی میز پر جا بیٹھا۔ یہاں سستا ترین آرڈر تو کولڈ ڈرنک کا ہی ہو سکتا تھا۔ عادل نے یہی آرڈر دیا اور خوامخواہ اپنے موبائل فون سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

اس ہال کی بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں۔ ہلکا میوزک پلے ہو رہا تھا۔ عادل کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ کرسٹل اور لیوپڈ نارمل موڈ میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سامنے آئس کریم اور جوسز وغیرہ رکھے تھے۔ بہرحال کچھ دیر بعد عادل کو یوں لگا جیسے ان کی گفتگو میں تلخی آتی جا رہی ہے۔

کرسٹل کا رنگ بدل گیا تھا اور لیوپڈ بھی ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر رہا تھا۔ لگتا ہے ایسا ہے وہ اپنے سر کو جھلاہٹ آمیز انداز میں ہلاتا بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں کرسٹل کا لہجہ کچھ دبا دبا تھا۔ پھر اچانک تلخی بڑھ گئی۔ لیوپڈ کے بولنے کی آواز عادل کے کانوں تک پہنچنے لگی لیکن الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد لیوپڈ بڑے غصیلے انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی کرسی کو ہلکی سی ٹھوکر ماری اور پاؤں پٹختا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ کرسٹل نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکا نہیں۔

کرسٹل کچھ دیر گم صم بیٹھی رہی۔ اس نے سفید پینٹ کے اوپر نفیس سی ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ سنہری مائل بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ وہ ابھی تک عادل سے لاتعلق بنی ہوئی تھی۔ آخر اس نے میز پر رکھا ہوا اپنا موبائل فون اٹھایا اور کسی سے رابطہ کرنے لگی۔ اس نے تین چار بار کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ لیوپڈ سے ہی رابطہ کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گہری سانس لی اور ہارے ہوئے سے انداز میں اٹھ کر لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ یقیناً وہ لیوپڈ کے پیچھے ہی گئی تھی۔ عادل نے لیوپڈ کو لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور پر جاتے دیکھا تھا۔ کرسٹل بھی سیکنڈ فلور پر ہی جا رہی تھی۔ عادل تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا اور کرسٹل کے پہنچتے پہنچتے وہ بھی سیکنڈ فلور پر پہنچ گیا۔ کرسٹل اس کی آمد سے بے خبر رہی۔ بہرحال عادل نے اسے کوریڈور میں داخل ہوتے اور پھر ایک کمرے کے دروازے پر ناک کرتے دیکھ لیا۔ وہ واپس آ کر پھر ہال میں بیٹھ گیا اور کولڈ کافی کا آرڈر دے دیا۔ پتا نہیں کیوں اسے الجھن سی ہو رہی تھی۔ کرسٹل جس طرح جز بز ہو کر لیوپڈ کے پیچھے اس کے کمرے میں گئی تھی، وہ چونکا دینے والی بات تھی۔ پتا نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کیا تعلق تھا جو اس جیسی آزاد اور بے باک لڑکی بے بس نظر آنے لگی تھی۔

اچانک عادل کے فون کی بیل ہوئی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ یہ کرسٹل کا نمبر تھا...... وہ اسے کال کیوں کر رہی تھی؟ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال ریسیو کی۔ ''ہیلو...... ہیلو!'' اس نے دو بار کہا۔

دوسری طرف سے کرسٹل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں اس کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ غالباً لیوپڈ سے ہی مخاطب تھی...... وہ انگلش میں کہہ رہی تھی...... ''پلیز لیوپڈ! یہ ٹھیک نہیں، تم نے زیادہ ڈرنک کی ہے۔ تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔''

لیوپڈ کی آواز ذرا فاصلے سے سنائی دی۔ اس نے دو تین فقرے بولے۔ ان فقروں سے عادل کی سمجھ میں یہی آیا کہ ایک تو وہ نشے میں ہے، دوسرے کرسٹل کو اپنے قریب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عادل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ یہ تو ویسی ہی سچویشن تھی جو ایبٹ آباد کے ہوٹل میں سامنے آئی تھی۔

عادل کو اب یہ اندازہ بھی ہوا کہ کرسٹل نے عادل کو اندر کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے ہی موبائل فون پر چپکے سے یہ کال کر دی ہے۔ اب موبائل فون شاید اس کے پاس ہی ٹیبل یا تکیے وغیرہ پر رکھا تھا اور آوازیں عادل کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ دونوں میں تند و تیز گفتگو جاری تھی۔ ان کی زیادہ تر انگریزی عادل کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آوازیں بھی بالکل صاف نہیں تھیں۔ تاہم اتنا اندازہ تو عادل کو ہو گیا کہ لیوپڈ کسی شرط کی بات کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس سال بھی اسی نے جیتنا ہے۔ اسے اپنا حریف آس پاس کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کی باتوں میں دو تین بار ''نوبل راک'' کا ذکر بھی آیا۔ پتا نہیں کہ یہ نوبل راک کیا بلا تھی۔

ایک بار کرسٹل کی کراہ سنائی دی۔ شاید لیوپڈ نے نشے کی حالت میں اسے سخت ہاتھ لگائے تھے...... یا پھر ویسے ہی تھپڑ وغیرہ مارا تھا۔ اس کا ایک فقرہ عادل کو صاف سنائی دیا۔ ''کیا میری برتھ ڈے کو تم اتنی زیادہ کنجوسی سے مناؤ گی۔ مجھے بہت مایوس کر رہی ہو تم۔''

چند لمحے بعد کرسٹل کی اشک بار آواز سنائی دی۔ ''لیوپڈ! تم حد سے بڑھ رہے ہو......'' اس نے کچھ اور بھی کہا جو مدھم آواز کے سبب عادل کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اب عادل کے لیے حرکت میں آنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بذریعہ لفٹ سیکنڈ فلور پر پہنچ گیا۔ لیوپڈ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ڈور بیل بجائی۔ چوتھی پانچویں بیل پر دروازہ تھوڑا سا کھلا اور لیوپڈ کا لال بھبوکا چہرہ نظر آیا۔ اس نے عادل کو سرتاپا گھورا۔ ''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟'' اس نے بڑے کرخت لہجے میں کہا۔

یہی وقت تھا جب عادل کو عقب میں کرسٹل کی جھلک نظر آئی۔ اس کے سنہری بال منتشر تھے۔ شرٹ کے بالائی بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ لیوپڈ نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ عادل کی نظر سے اوجھل ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ لیوپڈ بھناتے ہوئے انداز میں دروازہ بند کر دیتا...... عادل اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک صوفے پر گرا۔ عادل نے پھرتی سے

ساتھ دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

لیوپڈ ایک دم آگ بگولا ہو گیا تھا۔ وہ پچیس چھبیس سال کا نہایت ورزشی جسم والا چست نوجوان تھا۔ غصے میں اس کے رخسار کا زخم کچھ اور نمایاں نظر آنے لگا تھا اور اس کے ''لک'' کو خطرناک ٹچ دے رہا تھا۔ وہ صوفے پر گرتے ہی مقناطیس کی طرح اس کی طرف آیا۔ اس نے ایک طوفانی گھونسا عادل کے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ عادل پہلے سے تیار تھا، جھکائی دے کر خود کو صاف بچا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جوابی گھونسا رسید کیا جو عین لیوپڈ کی انگلش ناک پر پڑا۔ وہ تیورا کر کرسٹل کے قدموں میں گرا۔ کرسٹل چلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ دروازہ لاک ہو چکا تھا اور چابی عادل کی جیب میں تھی ورنہ وہ شاید کمرے سے بھاگ ہی جاتی۔ عادل نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل میں کسی طرح کا شور شرابا ہو......

چوٹ کھانے کے باوجود لیوپڈ کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر عادل سے لپٹ گیا۔ اس کا جسم کھلاڑیوں جیسا تھا۔ نشے نے اس کے جسم میں اضافی توانائی بھر دی تھی۔ اس نے گالیاں بکتے ہوئے پورا زور لگایا اور عادل سمیت میز پر گرا۔ وہسکی کی بوتل قالین پر لڑھک گئی۔ گلاس چکنا چور ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا فریش کریم کیک، عادل کے نیچے مسلا گیا۔ عادل نے لیوپڈ کی ٹانگوں کے درمیان اپنی پنڈلی کی جچی تلی ضرب لگائی پھر سر کی ٹکر سے لیوپڈ کو دور گرا دیا۔ اس کے بعد اس نے شرابی لیوپڈ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ نوری نت جیسا اصلی بندہ اس کے سامنے تھا۔ عادل نے اس کے چہرے کا نقشہ خراب کر دیا۔ عادل کو ایک ٹیبل لیمپ رسید کرنے کی کوشش میں لیوپڈ اس بری طرح غیر متوازن ہوا کہ کھڑکی سے ٹکرایا اور الٹ کر نیچے جا گرا۔ ایک لمحے کے لیے تو عادل کو یہی لگا کہ شاید وہ دوسری منزل سے گر کر اپنی کھوپڑی تڑوا بیٹھے گا لیکن پھر اس کی تقدیر اس کا ساتھ دے گئی۔ گرتے گرتے بھی اس نے کھڑکی کی چوکھٹ تھام لی اور کسی بازی گر کی طرح ہوا میں جھول گیا۔ اس بات کا پتا تو عادل کو کافی بعد میں چلا کہ وہ واقعی ایک زبردست کوہ پیما ہے...... خالی ہاتھ چٹانوں پر چڑھنے والا۔

عادل نے فوراً اسے کھینچ کر دوبارہ کمرے میں کر لیا۔ تاریکی کی وجہ سے کوئی نیچے سے یہ منظر نہیں دیکھ سکا تھا۔ عادل نے کھڑکی بند کر دی۔ لیوپڈ اب قالین پر لیٹا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا تھوبڑا خون سے رنگین تھا۔ عادل نے اسے دوبارہ اٹھنے اور کوشش کرنے کی دعوت دی لیکن وہ وہیں پڑا کینہ پرور نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

عادل نے اس کی طرف انگلی اٹھائی اور سنگین لہجے میں کہا۔ ''بس چپ چاپ یہاں پڑے رہو، اگر پیچھے آئے تو تماشا لگ جائے گا۔ کرسٹل نے دو لفظ بھی کہہ دیے تو سیدھے لاک اپ میں پہنچو گے۔''

لگتا تھا کہ بات شرابی لیوپڈ کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ کرسٹل ابھی تک تھرتھر کانپ رہی تھی۔ ایک کندھے پر سے اس کی شرٹ پھٹ بھی چکی تھی۔ بہرحال یہ چاک اتنا نمایاں نہیں تھا۔ عادل نے کرسٹل کو ساتھ لیا اور وہسکی کی بوتل کو نفرت انگیز ٹھوکر مارتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد کرسٹل اور عادل ایم ایم عالم روڈ کے ایک فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ عادل کے سر اور ہاتھ کی دو دن پرانی چوٹیں دیکھ کر کرسٹل حیران ہوئی تھی۔ عادل نے ان چوٹوں کے بارے میں کرسٹل کو بھی وہی بتایا جو صادق کو بتایا تھا۔ یعنی راہ چلتے کسی سے جھگڑا۔ موسم برسات اپنا آخری زور مار رہا تھا۔ اچانک ہی کالی گھٹائیں چھائی تھیں اور آسمان سے گرج چمک کے ساتھ تابڑ توڑ پانی برسنے لگا تھا...... وہ دونوں یہاں ٹیکسی پر پہنچے تھے۔ کرسٹل نے عادل سے درخواست کی تھی کہ وہ وہاں ہوٹل میں پیش آنے والے سنگین واقعے کے بارے میں سرمد صاحب کو کچھ نہ بتائے۔ عادل نے وعدہ کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے پوچھا۔ ''کرسٹل! میری سمجھ میں نہیں آتا جب تم اپنے اس ہم وطن کی خصلت جانتی بھی ہو پھر کیوں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئیں؟''

وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولی۔ ''اس کا برتھ ڈے ہوتا...... یہ ہام کو مجبور کرتا کہ ہام روم کے اندر جا کر اس کا برتھ ڈے سلیبریٹ کرے......''

''لیکن...... تم کیوں مجبور ہوتی ہو؟ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ تم نے شاید آج تک مجھے اپنا نہیں سمجھا۔ ورنہ اس طرح اندھیرے میں تو نہ رکھتیں۔''

''نا ئیں عادل! ایسا کبھی مت سوچنا۔''

''تو پھر مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔''

''ہام...... کیا بتائے توم کو؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''دیکھو، تمہاری کچھ باتیں میں نے موبائل پر سنی بھی ہیں۔ وہ کسی شرط کی بات کر رہا تھا...... اور شاید یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ یہ شرط دوبارہ جیتے گا۔ کیا کوئی شرط ہارنے کے بعد تم اس کی مزاحمت نہیں کر پا رہی ہو؟''

''نا ئیں عادل! ہام نے کوئی شرط نا ئیں لگایا اور نہ

ہارا ہے۔ یہ کوئی اور چاکر (چکر) ہے۔ یہ شرط بہت پہلے سے لگ رہا ہے۔ سِنس مِنی مِنی ایرز۔"

باہر بادل زور سے گرجے اور بارش کی بوچھاڑیں کچھ اور تیز ہو گئیں۔ ریسٹورنٹ کے ہال میں اکثر میزیں خالی تھیں اور اندر کا ماحول پُرسکون تھا۔

"تمہارا مطلب ہے کرسٹل، یہ کوئی ایسی شرط ہے جو پرانے وقتوں سے لگائی جارہی ہے اور لیوپڈ کے یہ شرط جیتنے کی وجہ سے تم پر اثر پڑا ہے؟"

"ہاں۔ یوکین سے۔ ہام پر اثر پڑا۔"

عادل کے ذہن میں ایک اور خیال چمکا۔ اس نے کہا۔ "مجھے یاد آیا...... تمہاری اور لیوپڈ کی باتوں میں کسی نوبل راک کا ذکر بھی آیا ہے۔ واٹ از دِس نوبل راک؟"

کرسٹل کے سفید چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ عادل کو لگا کہ وہ بات ٹالنے کے لیے کوئی بات بنائے گی۔ وہ جلدی سے بولا۔ "کہیں یہ کوئی ایسی چٹان تو نہیں جس پر چڑھنے کا مقابلہ ہوتا ہو؟"

کرسٹل ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ عادل اس کے گرد گھیرا تنگ کرتا جارہا ہے اور اب شاید اسے عادل کو کچھ نہ کچھ بتانا ہی پڑے گا۔ اس نے پہلے عادل سے وعدہ لیا کہ وہ اس بارے میں سرمد یا ہمایوں کو ابھی کچھ نہیں بتائے گا۔ ہاں اگر وہ خود کچھ بتائیں تو اور بات ہے۔ عادل نے وعدہ کرلیا۔

گرجتے برستے موسم میں اس ریسٹورنٹ کی مدھم روشنی میں بیٹھ کر کرسٹل نے اس سلسلے میں جو کچھ بتایا، وہ عادل کے لیے کافی حیران کن تھا۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

"سناترا برادری، انگلینڈ کے شاہی خاندان کی ہی ایک شاخ تھی۔ اس میں آگے بیسیوں فیملیز تھیں، گھرانے تھے۔ چند پشتوں کے بعد ان لوگوں کا شجرۂ نسب اٹھارھویں صدی کے جارج دوم سے جاملتا تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کو ہندوستان پر مکمل تسلط حاصل ہوگیا اور اگلے قریباً نوے سال تک انہوں نے اپنے اس تسلط کو خوب انجوائے کیا۔ لیکن اس سے پہلے بھی انگریز یہاں موجود تھے اور "انجوائے" کر رہے تھے۔ یہ اسی "سنہری دور" کی بات ہے۔ سناترا برادری کی کچھ فیملیز تفریح کے لیے کے ٹو کے دامنوں تک جاتی تھیں۔ وہاں برف پر مختلف کھیل ہوتے تھے اور موج میلا کیا جاتا تھا۔ وہیں پر ایک خوب صورت عمودی چٹان تھی۔ اس کی اونچائی اپنے اردگرد کی سطح سے کوئی 1800 فٹ تھی۔ یہاں پر انگریز نوجوان خالی ہاتھ چڑھنے کے مقابلے کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے مذکورہ فیملیز نے اس چٹان پر چڑھنے کے مقابلے کو مستقل تفریح کی شکل دے دی۔ بتدریج ان مقابلوں نے سناترا برادری میں سالانہ ایونٹ کی شکل اختیار کرلی۔ اس چٹان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں تک جانے کا راستہ اگست کے آخر میں ہونے والی دو تین تیز بارشوں کے بعد ہی کھلتا تھا لہٰذا یہ مقابلے نسبتاً خنک موسم یعنی اگست کے آخر یا ستمبر میں ہوتے تھے۔ سناترا برادری کے لوگ مقررہ وقت پر اس جگہ جمع ہوتے اور چٹان پر چڑھا جاتا۔ ایسے ہی مقابلوں میں ایک موقع پر "جو" نامی ایک نوجوان بلندی سے گر کر ہلاک ہوگیا۔ اس ہر دلعزیز نوجوان کے نام پر چٹان کو جو نوبل...... یا نوبل راک کہا جانے لگا۔

بہرحال یہ نام اور یہاں ہونے والے مقابلے صرف سناترا فیملیز تک ہی محدود رہے۔ چالیس پچاس سال بعد ان مقابلوں میں ایک اور چیز شامل ہوگئی۔ ہر سال 25 سال تک والی کیٹیگری میں جو نوجوان یہ مقابلہ جیتتا تھا، اس کو یہ حق حاصل ہوجاتا تھا کہ وہ سناترا کمیونٹی میں سے کسی بھی لڑکی کو اپنی شریک حیات کے طور پر چن سکتا ہے۔ شرط صرف اتنی ہوتی تھی کہ وہ لڑکی پہلے سے انگیج نہ ہو۔ انگیج ہونے کی صورت میں وہ اپنی مرضی سے اپنی انگیج منٹ ختم بھی کرسکتی تھی اور کئی بار ایسا ہوا بھی۔ ظاہر ہے کہ برادری کے چیمپئن نوجوان سے شادی کرنا ایک اعزاز کی طرح ہوتا تھا۔ پھر اس نوجوان کو ایک خطیر رقم انعام میں بھی حاصل ہوتی تھی۔ یہ رقم پرانے وقتوں میں تو نسبتاً تھوڑی تھی لیکن آہستہ آہستہ بڑھتی رہی اور پانچ لاکھ پاؤنڈز تک پہنچ گئی۔ 1947ء میں انگریز یہاں سے کوچ کرگئے۔ جو نوبل راک پر سناترا برادری کی سرگرمیاں دو چار سال کے لیے تو رک گئیں لیکن ان سرگرمیوں کو پچھلے دو ڈھائی سو سال میں چونکہ ایک مذہبی رنگ بھی مل چکا تھا، اس لیے تھوڑے سے وقفے کے بعد سناترا برادری کے لوگ ہر سال اگست یا ستمبر کے مہینے میں پھر یہاں آنے لگے...... یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور اب تک جاری تھا۔ کچھ بڑے بوڑھوں کا خیال تھا کہ جو نوبل راک کی شکل کچھ کچھ گرجے سے مشابہ ہے۔ اس لیے یہ لوگ اسے تکریم بھی دیتے تھے۔

پچھلے برس یہاں ہونے والے مقابلے میں سناترا برادری کی ایک بڑی فیملی ماؤنٹے کا نوجوان لیوپڈ ماؤنٹے جیتا تھا۔ اس نے دو پروفیشنل راک کلائمبرز کا بے حد جاندار

مقابلہ کیا اور انہیں نیچا دکھا کر سب کو حیران کر دیا۔ وہ خود بھی زبردست ایتھلیٹ تھا اور راک کلائمبنگ کے عالمی مقابلوں میں بھی حصہ لے چکا تھا۔ لیوپڈ لندن کے ایک بااثر سماجی شخص ڈیوک ایان کا لختِ جگر تھا۔ ماؤ نیٹے فیملی سناترا برادری کی سب سے خوش حال فیملی سمجھی جاتی تھی اور برادری میں ان لوگوں کا گہرا اثر رسوخ تھا۔ مقابلہ جیتنے کے بعد لیوپڈ نے غیر متوقع طور پر جوناتھن فیملی کی لڑکی کرسٹل کا ہاتھ مانگ لیا۔ کرسٹل کی چونکہ کہیں انگیج منٹ نہیں تھی لہٰذا وہ خاندانی روایت کے مطابق لیوپڈ سے شادی کی پابند تھی۔ تاہم اس وقت برادری کے سب بڑے حیران رہ گئے جب کرسٹل نے روایت شکنی کرتے ہوئے لیوپڈ کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ سے ایک گمبھیر مسئلہ کھڑا ہو گیا جو اب تک موجود تھا بلکہ مزید سنگین ہو چکا تھا۔

کرسٹل کی پوری روداد سننے کے بعد عادل کی دلچسپی اس معاملے میں مزید بڑھ گئی۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔ بادل بدستور موجود تھے۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش ہونے لگتی تھی۔

عادل نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”ساری بات سمجھ میں آ رہی ہے کرسٹل...... لیکن...... شادی سے انکار کی کوئی وجہ تو ہو گی تمہارے ذہن میں؟“

”وجہ بس یہی تھی عاڈل...... کہ وہ ہام کو اچھا نائیں لگتا۔ شیور لی، ہام اس کو خوش نائیں رکھ سکتا اور نہ وہ ہام کو۔“

”تمہارے انکار کو اس نے قبول نہیں کیا؟“

”نائیں عاڈل! اس نے اسے اپنا انسلٹ سمجھا۔ وہ ہام سے ہر صورت شادی کرنا مانگتا۔ آخر میں اس نے ہام کو بس تھوڑا سا رعایت دیا۔“

”کیسی رعایت؟“

”ایک سال کا ریلیکسیشن۔ وہ کہتا کہ ہام اس سال بھی کمپی ٹیشن جیت کر دکھائے گا اور پھر ہام کے پاس میرج سے انکار کرنے کا کوئی چانس نائیں ہوئیں گا۔“

”تم نے اس کی یہ شرط مانی؟“ عادل نے پوچھا۔

”بس ہام خاموش رہا تھا۔ وہ سمجھتا کہ ہام کچھ کچھ رضامند۔ آئی ایم سو مچ ڈسٹرب عاڈل۔ آئی ڈونٹ نو، واٹ ٹو ڈو۔“ وہ روہانسی ہو گئی اور تیزی سے انگلش بولتی چلی گئی۔

اب بات کچھ کچھ عادل کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تن بدن میں عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سرمد صاحب نے اس لیوپڈ کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اس کا گھمنڈ توڑنے کے لیے ہی اسے تیار کیا ہو؟ چند ماہ سے جاری ساری تگ و دو اسی لیوپڈ کے سامنے خم ٹھونکنے کے لیے ہو؟ ایک موقع پر کچھ اس طرح کا اشارہ سرمد صاحب نے دیا بھی تھا۔ پھر ایک دفعہ کرسٹل نے بھی کچھ اسی مفہوم کی بات کی تھی اور کہا تھا...... ”سر کا خیال ہے عاڈل کر تو م، ہام کے لیے کچھ کر سکتا۔“

عادل کو یہ سب کچھ ایک سنسنی خیز کہانی کی طرح لگ رہا تھا۔ سر سرمد نے کے ٹو کے سفر پر روانہ ہوتے وقت عادل کے دل میں ایک دیے کی امید جگائی تھی...... اور پھر بانگڑی چوٹی سر کرنے کے بعد انہوں نے کہا تھا۔ ”عادل...... سمجھو کہ دفینہ تمہیں مل گیا ہے۔“ اور اب کرسٹل ایک خطیر رقم کی بات کر رہی تھی۔ رائل فیملی کی ریت کے مطابق جیتنے والے کو کم و بیش نصف ملین پاؤنڈز یعنی پانچ کروڑ پاکستانی روپے کے لگ بھگ انعامی رقم ملنا تھی اور پھر اس کو ایک بڑا اعزاز یہ بھی حاصل ہونا تھا کہ وہ سناترا برادری کی کسی بھی دوشیزہ کو شریکِ حیات بنانے کے لیے منتخب کر سکتا تھا۔ بعد ازاں عادل کا یہ دوسرا اندازہ غلط ثابت ہوا کیونکہ سناترا برادری کی دوشیزہ سے شادی والی شق صرف برادری کے نوجوانوں کے لیے تھی۔

اب اس نوبل راک والے معاملے میں عادل کی دلچسپی ایک دم بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے کرسٹل سے اس بارے میں مزید کئی سوال کیے۔ اس نے اپنی معلومات کے مطابق تسلی بخش جوابات دیے۔

آخر میں عادل نے اس سے پوچھا۔ ”کرسٹل! تمہارا کیا خیال ہے، کہیں سرمد صاحب مجھے لیوپڈ کے مقابل تو نہیں لانا چاہ رہے؟“

وہ بولی۔ ”سا‌چی بات یہ ہے عاڈل، ہام کو اس بارے میں کنفرم انفارمیشن نائیں ہے لیکن ہام کا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ شاید ان کے ذہن میں یہ آپشن ہے۔ کسی عام بندے کے لیے لیوپڈ سے وِن کرنا ممکن نائیں۔ ہی از ایکسٹرا آرڈینری ان دِس فیلڈ عاڈل!“

پھر کرسٹل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ نوبل راک پر چڑھائی کی تاریخ سناترا برادری میں کوئی ڈھائی سو سال پرانی ہے۔ یعنی کہ محمد شاہ کے دورِ حکومت سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ آج تک کے اندراج کے مطابق صرف دو بندے ایسے ہیں جنہوں نے ریکارڈ ٹائم میں نوبل راک پر چڑھائی مکمل کی۔ ان میں ایک وہی ”جو“ نامی نوجوان تھا جو بعد میں گر کر ہلاک ہوا۔ دوسرا یہ لیوپڈ ہے۔ لیوپڈ کا ٹائم ”جو“ سے بھی تقریباً تین منٹ کم تھا۔ اس حوالے سے اسے غیر معمولی قرار دیا جا رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ آئندہ تین چار

سال تک وہی نوبل راک کا چیمپئن رہے گا۔

عادل نے کرسٹل سے پوچھا۔ ”اس سال یہ مقابلے کب ہونے ہیں؟“

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ”عاڈل! سمجھو وہ ٹائم آ گیا ہے۔ سناترا برادری کی آٹھ دس فیملیاں تو اسلام آباد پہنچ چکی ہیں۔ ابھی مزید آ رہی ہیں۔ لگتا ہے کہ ستمبر کے فرسٹ ویک میں یہ مقابلے ہوئیں گے۔“

حیران کن اتفاق تھا کہ جس وقت ریسٹورنٹ کے نیم روشن گوشے میں عادل اور کرسٹل کے درمیان یہ اہم گفتگو ہو رہی تھی، اس وقت عادل کے موبائل فون پر سرمد صاحب کی کال آ گئی۔ عادل نے کال ریسیو کی...... اور مودب لہجے میں سرمد صاحب کی خیر خیریت دریافت کی۔

تمہیدی گفتگو کے بعد وہ بولے۔ ”تم کہاں ہو عادل؟“

”میں لاہور میں ہی ہوں سر...... کل ہی آیا ہوں۔“

”تو ٹھیک ہے۔ کل صبح تم میرے پاس آ جاؤ...... تمہارے فراغت کے دن اب ختم ہو گئے ہیں۔ اب کام کرنا ہو گا۔“ انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”میں بالکل تیار ہوں جناب۔“

سرمد صاحب سے بات کرنے کے بعد عادل خود کو ایک دم توانا محسوس کرنے لگا۔ ترنگ اور جوش کی ایک لہر سی اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ کرسٹل کے ساتھ ابھی ابھی جو انکشاف انگیز گفتگو ہوئی تھی، اس کی روشنی میں یہ صاف پتا چل رہا تھا کہ سرمد صاحب کس رخ پر سوچ رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کرسٹل سے مزید بات کرنے کے بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ عادل نے کرسٹل کو دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ اب کہیں اکیلی باہر نہ نکلے اور لیوپڈ سے ہر طرح کا رابطہ منقطع رکھے۔ وہ لیوپڈ کے ردِعمل سے خوفزدہ تھی۔ عادل نے اسے تسلی دی کہ وہ اور ہمایوں اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی عادل سرمد صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔ حلوا پوری اور چنے کے لاہوری ناشتے کے بعد اس نے صادق کو ساتھ لیا اور نکل پڑا۔ صادق نے کباڑ اور مشینری کے کام کے لیے اب ایک پک اپ نما گاڑی بھی لے لی تھی۔ سیکنڈ ہینڈ تھی لیکن خاصی فٹ تھی۔ سفید رنگ کی اس پک اپ پر عادل سرمد صاحب کی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ دن کے نو بج چکے تھے، سڑکوں پر رش تھا۔ نسبت روڈ کے گنجان چوک سے گزرتے ہوئے عادل نے ہجوم پر نگاہ دوڑائی۔ ہر کوئی اپنے اپنے ”کام“ پر پہنچنے کی جلدی میں تھا۔ سیکڑوں افراد حرکت میں تھے۔ پیدل چلنے والوں کی اکثریت تھی۔ اچانک عادل کی نگاہ لوگوں کے درمیان ایک تمتمائے ہوئے سے چہرے پر پڑی اور اسے لگا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے سر کی طرف آ گیا ہے۔ ذرا دیر کے لیے وہ سکتہ زدہ سا رہ گیا تھا۔ اس کی نظر کمزور نہیں تھی اور نہ اس کی نظر نے دھوکا کھایا تھا۔ اس نے لوگوں کے درمیان جس شخص کی جھلک دیکھی، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہاں سے طویل فاصلوں پر کے ٹو کے برفستانوں میں عادل اسے دیکھ چکا تھا...... اسے یہاں نسبت روڈ کے چوک میں لوگوں کے درمیان ”مالاکانے زادہ“ نظر آیا تھا۔ منڈا ہوا شفاف سر، سوچی سوچی آنکھیں، تمتماتا چہرہ...... ہاں، یہ مالاکانے زادہ تھا...... اور مالاکانے زادہ، کئی دن پہلے بانگڑی کے بیس کیمپ میں بیمار رہنے کے بعد مر چکا تھا۔ اگر وہ مر چکا تھا تو پھر یہ کون تھا؟ اس کا ہم شکل؟ نہیں...... ایسا ہرگز نہیں تھا...... تو پھر؟ کیا عادل نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھا تھا؟

”گاڑی روکو۔“ وہ پکار کر بولا۔

صادق ابھی اتنا ماہر ڈرائیور نہیں بنا تھا۔ اس نے بوکھلاہٹ میں بریک دبائے۔ پیچھے آنے والا رکشا پک اپ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ صادق نے گاڑی کنارے پر روکی۔ عادل ہکا بکا سا نیچے اترا اور لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا اس طرف بڑھا جہاں اس نے مالاکانے زادہ کی جھلک دیکھی تھی۔ وہاں اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا، ایک دکان کے اونچے تھڑے پر چڑھ گیا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کہیں کوئی منڈا ہوا چمکیلا سر دکھائی نہیں دیا۔

کچھ دیر بعد وہ صادق کے پاس واپس پک اپ میں تھا۔ ”کون تھا یار؟“ صادق نے حیران لہجے میں پوچھا۔

”شاید مجھے دھوکا ہوا ہے...... میں نے ایک مرے ہوئے شخص کو دیکھا ہے۔“ عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”مرا ہوا شخص؟“ صادق نے مزید تفصیل پوچھی۔

عادل...... صادق کو اپنی تقریباً تمام اسٹوری سنا چکا تھا۔ اس میں مالاکانے زادہ، فولاد جان اور درابے خاں کا ذکر بھی تفصیل سے موجود تھا۔ عادل نے کہا۔ ”مجھے ابھی یوں لگا ہے جیسے مالاکانے زادہ یہاں نسبت چوک میں موجود تھا۔“

”شاید تم رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکے ہو۔“ صادق نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”ہاں...... لگ تو ایسے ہی رہا ہے...... لیکن......“ وہ

کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔
دونوں کچھ دیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ پھر عادل کے فون پر ہمایوں کی کال آ گئی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ عادل کتنی دیر میں پہنچ رہا ہے۔
''بس دس منٹ کی ڈرائیو ہے۔'' عادل نے کہا۔
تقریباً پندرہ منٹ بعد صادق اسے سرمد صاحب کی رہائش گاہ کے پاس ڈراپ کر رہا تھا۔
اس روز عادل اور سرمد صاحب کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو قریباً چار گھنٹے جاری رہی۔ اس کے درمیان ہی چٹائیوں پر بیٹھ کر ایک سادہ سا لنچ بھی کیا گیا...... سرمد صاحب کے اپنے کھیت میں اُگے ہوئے کدو کا سالن اور تندوری روٹی، کچھ ایسا مزہ تھا اس میں کہ فائیو اسٹار ہوٹل کا سواد بھول گیا۔ سرمد صاحب کی ساری بات چیت اس لیے حسب توقع تھی کہ کل شب کرسٹل نے اس حوالے سے کافی کچھ عادل کو بتا دیا تھا۔ سناترا برادری کی ڈھائی سو سال پرانی روایت ٹوئل راک۔ اس پر چڑھائی کے واقعات اور شرائط وغیرہ، یہ سب کچھ بڑا داستانی لگ رہا تھا۔
گفتگو کے آخر میں سرمد صاحب نے کہا۔ ''سناترا برادری سے باہر کا کوئی فرد ان خاندانی مقابلوں میں حصہ نہیں لیتا لیکن کرسٹل اور لیوپڑ والا تنازعہ بالکل مختلف تھا...... اصل میں گرما گرمی کے دوران میں کرسٹل نے ہی یہ بات لیوپڑ سے کہی تھی کہ وہ دعا کرتی ہے کہ اس کا گھمنڈ ٹوٹ جائے۔ کوئی اس کو نیچا دکھانے والا آ جائے۔ لیوپڑ نے کہا تھا...... ٹھیک ہے ڈارلنگ! میں تمہاری خاطر چند مہینے کسی ایسے سورما کا انتظار کر لیتا ہوں لیکن اگر یہ نہ ہوا تو پھر تمہیں میری نیک خواہش کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔ اس وقت میں نے لیوپڑ سے کہا تھا کہ امید ہے اگلے برس تک ہم تمہارا چیلنج قبول کرنے کے قابل ہو جائیں گے...... اور اس وقت ہمارے درمیان یہ بات بھی طے ہو گئی تھی کہ لیوپڑ کے چیلنج کو قبول کرنے والا، سناترا برادری سے باہر کا بندہ بھی ہو سکتا ہے۔''
عادل نے عجیب نظروں سے سر سرمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''سر! آپ کو کیسے معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی آپ کو مل جائے گا؟''
''میرے پاس ہمایوں موجود تھا۔ یہ پیدائشی کوہستانی ہے۔ چلاس اور اسکردو کے بلند پہاڑوں میں پرورش پائی ہے اس نے۔ تم نے دیکھا ہے یہ کس قدر سخت جان اور محنتی ہے۔ مجھے امید تھی کہ میں اسے لیوپڑ کے مقابل لانے کے قابل ہو جاؤں گا لیکن پھر اس دوران میں ہم دونوں کی نظر تم پر پڑ گئی۔ تمہاری خداداد صلاحیت نے ہم دونوں کو متاثر کیا۔ اور ہم دونوں نے صنعتی نمائش میں تمہیں دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ تم سے رابطہ کیا جائے۔ آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں ہمارا یہ فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا۔''
ہمایوں حسب عادت ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جیسے ہر وقت کسی سوچ میں غرق رہتی تھیں۔ عادل نے دیکھا تھا، شدید پریشانی یا خطرے کے وقت بھی اس کا چہرہ سپاٹ ہی نظر آتا تھا، تاہم اس کی پیشانی کسی اندرونی حدت کے سبب تمتمانے لگتی تھی۔
سر سرمد اور ہمایوں سے گفتگو کے دوران میں بھی عادل کے ذہن کے ایک گوشے میں صبح ''نسبت چوک'' میں دیکھا ہوا منظر نقش رہا۔ مالکانے زادہ کی پراسرار جھلک بار بار عادل کی آنکھوں کے سامنے آتی رہی۔ بہرحال اس حوالے سے اس نے سر سرمد اور ہمایوں سے کوئی بات نہیں کی۔ کرسٹل نے بھی ابھی تک کل رات والا واقعہ سر سرمد یا ہمایوں کے گوش گزار نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لیوپڑ کی شدید بدتمیزی اور ہاتھا پائی کے بارے میں جلد ہی ازخود سرمد صاحب کو بتا دے گی۔
سرمد صاحب کی باتوں سے عادل کے دل و دماغ میں ایک نیا جوش لہریں لینے لگا تھا...... نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اگر سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسے سرمد صاحب کہہ رہے ہیں تو...... اس بار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ دولت کا بھوکا نہیں تھا...... لیکن فی الوقت حالات نے دولت کو اس کی ضرورت بنا دیا تھا...... اٹل ضرورت۔ اسے کسی کی خاطر ایک مقررہ رقم حاصل کرنا تھی اور اپنی جان داؤ پر لگا کر بھی کرنا تھی۔ دو روز بعد اگست کی بائیس تاریخ تھی اور یہی ان لوگوں کی کے ٹو کی طرف روانگی کا دن تھا۔ سرمد صاحب نے کرسٹل اور ہمایوں کو بھی تیاری کی ہدایت جاری کر دی۔ یہ جان کر عادل کو حیرت ہوئی کہ زخمی ٹانگ کے باوجود سرمد صاحب خود بھی اس سفر پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کی ٹانگ پر گھٹنے سے اوپر تک پلاستر تھا اور وہ بیساکھیوں کے سہارے ہی چل سکتے تھے۔ سرمد صاحب کے اندازے کے مطابق آنے جانے میں قریباً بیس روز لگ جانے تھے۔ دس روز وہاں قیام تھا یعنی یہ کل قریباً ایک مہینے کا سفر تھا۔ عادل ایک بار پھر ماں کے پاس گوجرانوالہ پہنچا۔ ان کو اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا اور دعاؤں کا طالب ہوا۔ والدہ کے لیے بھی یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ وہ ایک ماہ کے لیے

لاہور اور گوجرانوالہ سے دور جا رہا ہے۔ اس طرح وہ اس جھگڑے کے اثرات سے دور نکل جائے گا جو وہاں پال پور گاؤں میں ہوا تھا۔ بلکہ ماں تو چاہ رہی تھی کہ وہ ایک ماہ کے بجائے دو چار ماہ کے لیے کہیں دائیں بائیں ہو جائے۔
عادل نے ماں کو تسلی تشفی دی اور خرچے کے لیے رقم وغیرہ دے کر لاہور واپس آ گیا۔ اس روز وہ رات کو دیر تک صادق سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ اس نے کباڑ خانے کے ساتھ والے دکان دار سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا۔ ''صادق بھائی دوپہر سے نظر نہیں آ رہا۔ گیٹ کو تالا لگا ہوا ہے۔''
عادل نے پوچھا۔ ''اس کی پک اپ اندر ہی ہے؟''
''نہیں، وہ بھی نہیں ہے۔ شاید ادھر ہی گیا ہو گا۔ لیکن وہ جب جاتا ہے بتا کر جاتا ہے۔ شاید کہیں جلدی میں چلا گیا ہے۔''
''ٹھیک ہے، وہ رات کو یا صبح جب بھی آئے اس سے کہنا کہ مجھے فون کر لے...... اس وقت تو اس کا فون بھی بند جا رہا ہے۔''
اگلے روز کئی کام کرنا تھے۔ عادل اور ہمایوں سفر کی تیاری میں مصروف رہے۔ کچھ فوڈ ''ٹن پیک'' کرایا گیا۔ ایک نیا ٹینٹ خریدا گیا۔ کوہ پیمائی کے سامان میں جو کمی تھی، وہ پوری کی گئی۔ ہمایوں والا لائسنس یافتہ پستول تو رابے خان اور فواد جان کے ساتھ ہی برف کی قبر میں دفن ہو گیا تھا۔ اسی لائسنس پر نیا ہتھیار ایشو کرانے کے لیے ہمایوں کئی دن سے کوشش کر رہا تھا۔ سرمد صاحب کے ایک کرم فرما کے تعاون سے پستول دستیاب ہو گیا۔
سہ پہر کے وقت عادل کو پھر صادق کا خیال آیا۔ صادق کا فون حسب سابق خاموش تھا۔ اس نے پڑوسی دکان دار کو فون کیا۔ اس نے بتایا۔ ''صادق بھائی رات کو بھی نہیں آیا۔ کباڑ لانے والے لڑکے بار بار اس کا پوچھ رہے ہیں۔''
عادل کو کچھ پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ اس طرح کا غیر ذمے دار تو نہیں تھا۔ اپنے گاؤں کے عبدالقدیر کا لینڈ لائن فون نمبر عادل کے پاس موجود تھا۔ عادل نے اسے فون کیا اور درخواست کی کہ وہ ذرا صادق کا پتا لگانے کی کوشش کرے۔ خود وہ ایک بار پھر ہمایوں اور کرسٹل وغیرہ کے ساتھ مل کر سفر کی تیاری میں مصروف رہا۔
رات کو بھی صادق کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ صبح سویرے جب ہمایوں، کرسٹل اور سر سرمد وغیرہ ایبٹ آباد روانگی کے لیے گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے، ایک اور پریشان کن اطلاع عادل کو موصول ہوئی۔ یہ اطلاع اس کے دوست عبدالقدیر نے ہی اس تک پہنچائی۔
عبدالقدیر کا فون آیا تو عادل سمجھا کہ شاید وہ صادق کے بارے میں کچھ بتائے گا لیکن قدیر نے صادق کے بجائے لالی گاؤں کی بات کی۔ اس نے کہا۔ ''یار عادے...... مجھے ایک پریشان کرنے والی اطلاع ملی ہے......''
''کیوں، کیا ہوا؟'' عادل چونکا۔
''کل رات دس گیارہ بجے کے قریب تیرے مامے طفیل کے گھر میں ایک ڈاکو گھسا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی ساتھی بھی ہو جو گھر سے باہر کھڑا ہو۔ تیرا ماما زخمی ہوا ہے اور تحصیل اسپتال میں ہے۔''
عادل سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے ممانی کی خیر خیریت پوچھی اور بچوں کی بھی۔
قدیر نے کہا۔ ''بچے تو ٹھیک ہیں پر تیری مامی کو بھی چوٹیں آئی ہیں۔ وہ سر پر چوٹ کی وجہ سے ڈیڑھ دو گھنٹے بے ہوش رہی ہے لیکن اب ٹھیک ہے۔ کوئی جنونی سا بندہ تھا۔ کسی وزنی چیز سے سب کے سر پر ضربیں لگائی ہیں۔ بڑے بچے کا سر بھی زخمی ہے۔ چودہ پندرہ ٹانکے لگے ہیں اسے۔ گھر میں نقد پیسے بھی تھے لیکن صرف سونے کی چیزیں لے کر گیا ہے۔''
عادل کے لیے یہ شدید دھچکا تھا۔ پتا نہیں کیوں ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح چمکا اور اسے اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ پچھلے دو روز کی شدید مصروفیت میں وہ نسبت روڈ والے اس تحیر خیز منظر کو بھولا ہوا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں مالکانے زادہ کے چہرے کی تمتمائی ہوئی جھلک...... اور مالکانے زادہ اس کی معلومات کے مطابق مر چکا تھا۔ عادل کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ صادق بھی پرسوں سے لاپتا تھا اور اب گاؤں میں ماموں طفیل کے گھر پر یہ پراسرار حملہ...... کہیں نسبت روڈ والے منظر...... اور ان دونوں واقعات میں کوئی تعلق تو نہیں تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ پائندہ عالم امرانہ ہوا ابھی زندہ ہو اور کسی بدلے وغیرہ کے چکر میں یہاں آن موجود ہوا ہو...... یہ عادل ہی تھا جس نے مالکانے زادہ کے سر پر پیچھے سے کلہاڑی کی الٹی ضرب لگائی تھی اور اسے بے بس کرنے میں رمزی وغیرہ کی مدد کی تھی۔
بہرحال عادل نے فوراً ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اپنا یہ خیال اسے ایک دور دراز قیاس آرائی ہی کی طرح لگا۔ اس نے قدیر سے پوچھا۔ ''مامی اب مکمل ہوش میں ہے؟'' قدیر نے اثبات میں جواب دیا۔ عادل نے

پوچھا۔ ''اس نے کچھ بتایا ہے اس بندے کے بارے میں؟''

''وہ کہتی ہے کہ وہ اس گاؤں یا علاقے کا تو نہیں لگتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ ایک کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا اور بڑے گھیر کی شلوار کے ساتھ قمیص پہن رکھی تھی۔ تمہاری مامی اس کی آواز نہیں سن سکی۔''

قدیر نے عادل کو بتایا کہ لاہور میں صادق کا ابھی کوئی پتا نہیں ہے۔ عادل نے قدیر سے درخواست کی کہ وہ صادق کے یار دوستوں سے مل کر اس کا کھوج لگانے کی کوشش کرے۔ ان کے سفر کا شیڈول بڑا سخت تھا ورنہ ایسے حالات میں عادل یہاں رک جاتا اور اس سارے معاملے کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال بھی آرہا تھا کہ کہیں ماموں طفیل کے گھر میں پیش آنے والے واقعے کے پیچھے تایا فراست کے بیٹوں قاسم اور عاصم وغیرہ کا ہاتھ نہ ہو۔ باغ والے واقعے کے بعد وہ بہت بھڑکے ہوئے تھے۔ انہیں یہ رنج بھی ہوسکتا تھا کہ ماموں طفیل نے ماں بیٹے (عادل اور اس کی ماں) کو بطور مہمان اپنے گھر میں ٹھہرایا ہوا تھا۔

بہرطور مقررہ وقت پر وہ لوگ براستہ سڑک ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ دو گاڑیوں میں تھے۔ دوسری اسٹیشن وین تھی۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ ہمایوں سوار تھے۔ اس وین میں زیادہ تر ان کا سازوسامان ہی تھا۔ عادل کچھ خاموش خاموش تھا۔ ''کیا بات ہے عادل! تم گم صم ہو؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ زبردستی مسکرا کر بولا۔

وہ جانتا تھا کہ سرمد صاحب کی نگاہیں بندے کے اندر دور تک دیکھ لیتی ہیں۔ ان کے سامنے جھوٹ بولنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

انہوں نے اپنی پلاسٹر شدہ ٹانگ کو ہولے سے اٹھا کر اس کی جگہ تبدیل کی اور بولے۔ ''عادل! تمہیں پتا ہے مجھے دنیا میں سب سے پیارے لوگ کون لگتے ہیں؟''

پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ ''وہ جو اپنا دکھ اور گہری پریشانی سینے میں چھپاتے ہیں اور مسکرانے والوں کے ساتھ مسکراتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے عادل۔''

''لیکن سر......''

وہ بات کاٹ کر بولے۔ ''تم کچھ بھی کہو، لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم پرسوں سے کچھ فکرمند ہو اور یہ فکرمندی گاؤں کے حالات والی فکرمندی سے علیحدہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ شہزادی والی فکرمندی کے علاوہ بھی کوئی پریشانی ہے۔''

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سر! مجھے ایک بات بتائیے۔ یہ مالکانے زادہ کون تھا؟ میرا مطلب ہے کیا یہ واقعی کوئی عامل وغیرہ تھا یا اس نے بس ڈھونگ رچایا ہوا تھا؟''

''یہ مالکانے زادہ کا خیال تمہارے دماغ میں اچانک کیوں آگیا؟''

''بس یونہی سر۔''

''مالکانے زادہ جیسے لوگوں کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال جب بہت سے لوگ کسی شخص کے انوکھے پن پر یقین رکھیں اور مسلسل رکھیں تو پھر اس کے پیچھے کوئی چھوٹی بڑی وجہ تو ضرور ہوتی ہے۔ بعض دفعہ وہ ''وجہ'' ہمارے عقیدے اور اعتقاد کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ بہرحال ذاتی طور پر تو یہ شخص مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔''

عادل نے کہا۔ ''سر! بدھ کی صبح کو جب میں آپ سے ملنے آپ کی رہائش گاہ کی طرف آرہا تھا، نسبت روڈ کے چوک میں، میں نے مالکانے زادہ کو دیکھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی...... بالکل واضح اور صاف......''

سرمد صاحب ایک دم خاموش سے ہوگئے۔ گاڑی تیزی سے ہائی وے پر بھاگی جارہی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر کھیتوں کھلیانوں کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''کہیں یہ وہی نظری دھوکے والی بات تو نہیں تھی؟''

عادل نے مودب لہجے میں کہا۔ ''سر! اس طرح کا وہم یا دھوکا تو تب ہوتا ہے جب آپ کے ذہن میں پہلے سے کوئی ڈر، اندیشہ یا پھر خواہش وغیرہ موجود ہو۔ میرے دماغ میں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا...... اور میں نے اُسے قریباً دس پندرہ قدم کے فاصلے سے دیکھا۔ وہ جیسے اپنے کسی خیال میں مگن تھا، تیزی سے چلتا ہوا لوگوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔''

سرمد صاحب کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی ایک لکیری نمودار ہوگئی۔ انہوں نے عادل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد تو کچھ نہیں ہوا؟ میرا مطلب ہے دوبارہ اس کی جھلک...... یا کچھ اور؟''

''اس کے بعد دو واقعے ہوئے ہیں سر! اب مجھے پتا نہیں کہ یہ علیحدہ معاملہ ہے یا پھر ان کا تعلق اسی واقعے سے ہے۔ صادق...... جو کباڑ کے کام میں میرا پارٹنر ہے، پرسوں سے لاپتا ہے۔ کم از کم ابھی تک تو اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ دوسری طرف گاؤں میں میرے ماموں کے گھر ڈکیتی کی

واردات ہوئی ہے۔''

عادل نے واردات کی تفصیل سرمد صاحب کے گوش گزار کی اور بتایا کہ گھر میں گھسنے والا اپنے حلیے اور ڈیل ڈول سے پہاڑی علاقے کا رہنے والا لگتا تھا...... اور اس نے بیدردی سے سب کے سروں پر ضرب لگائی ہے۔ اس نے ماموں کے بارے میں بھی بتایا جن کے سر پر بڑا فریکچر ہوا تھا اور وہ اسپتال میں زیرِعلاج تھے۔

سرمد صاحب نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان واقعات کا پتا پہلے چل جاتا تو روانگی کے پروگرام میں ردوبدل کرلیا جاتا...... یا پھر روانگی سے پہلے اس معاملے کو کلیئر کرلیا جاتا۔

عادل بھی اس بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اب سفر ملتوی کرنے یا اس میں تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ انہیں بہرصورت اب آگے ہی بڑھنا ہوگا۔ وہ جی ٹی روڈ پر سفر کرتے ہوئے راولپنڈی کی طرف رواں دواں رہے۔ ساتھ ہی اس موضوع پر بات بھی ہوتی رہی۔ سرمد صاحب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''مالکانے زادہ کی موت کی خبر واکی ٹاکی پر ہی سنی گئی تھی۔ بتانے والے اس کے پاؤندہ مرید تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سلسلے میں جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔''

عقبی نشست سے کرسٹل اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''یس سر! ہم نے بھی واکی ٹاکی پر وہ کال سنا تھا۔ بولنے والے بہت سیڈ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی ابھی مالکانے ایکسپائر ہوگیا۔''

سرمد صاحب نے کہا۔ ''ایسا ہوتا ہے بعض دفعہ کسی کو مردہ سمجھ لیا جاتا ہے لیکن اس میں وائٹل سائنز موجود ہوتے ہیں۔ بعد میں وہ سنبھل جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ مالکانے زادہ کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کی بات ہوئی ہے......''

''لیکن سر! اگر وہ زندہ بھی ہے......تو ایسا کیوں ہے کہ وہ اتنی دور سے لاہور آئے اور عادل کے فرینڈ اور فیملی ممبرز سے بدلہ لینے کی کوشش کرے؟'' کرسٹل نے آنکھیں جھپک کر کہا۔

سرمد صاحب نے کار کی کھڑکی سے باہر، پوٹھوہار کے اونچے نیچے ٹیلوں کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''ان پہاڑوں میں رہنے والے کچھ لوگوں کے مزاج بہت مختلف ہوتے تھا۔ ان میں بدلے اور انتقام کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اور یہ پاؤندے تو مذہبی لحاظ سے بھی ہم سے بہت مختلف ہیں۔ کچھ کچھ پرانے کیلاشیوں جیسی جھلک پائی جاتی ہے ان میں۔ مجھے بار بار وہ لڑائی یاد آرہی ہے جو پچھلے سفر میں کیمپ نمبر دو پر ہمارے اور راے خاں وغیرہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس میں خناب گل نام کے جس بندے کو عادل نے پہاڑ سے نیچے گرایا، وہ مالکانے زادہ کا حمایتی اور پرستار تھا۔ دور نزدیک سے اس کی مالکانے سے کوئی رشتے داری بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ راے خاں اور فولاد جان کو چوٹی پر جانے سے بار بار منع کرتا تھا اور وہ جھگڑا بھی اسی بات سے شروع ہوا تھا جس میں خناب کی جان گئی۔ اگر...... مالکانے واقعی لاہور میں نظر آیا ہے تو پھر اس کا واسطہ خناب کی موت سے بھی ہوسکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ عادل کو ڈھونڈ رہا ہو۔''

کرسٹل بولی۔ ''یہ تو ڈینجرس سچویشن ہے سر لیکن سوچنے کی بات ہے۔ مالکانے کو اس بات کا تاج کیسے ہوا کہ خناب کو عادل نے پہاڑ سے گرایا تھا؟''

''ہاں، یہ سوچنے کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ خناب پہاڑ سے گر کر فوری ہلاک نہ ہوا ہو۔ بعد میں جو پاؤنڈے ہمارے پیچھے اوپر آئے، انہوں نے اسے زندہ حالت میں دیکھا ہو...... بہرحال...... ابھی تو یہ سارے مفروضے ہی ہیں۔ سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ یہ مالکانے زندہ ہے یا نہیں۔''

عادل کو اپنی والدہ کی طرف سے بھی فکر لاحق تھی۔ انہوں نے راولپنڈی کے قریب گوجر خاں میں تھوڑی دیر کے لیے گاڑیاں روکیں تو عادل نے گوجرانوالہ میں اپنے خالو عطا شاہ کے ایک واقف کار کو فون کیا۔ اس نے خالو عطا شاہ سے عادل کی بات کرادی۔ عادل نے خالو عطا کو خطرے سے آگاہ کیا اور انہیں اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب رہا کہ وہ اس کی والدہ کو لے کر ڈیڑھ دو ہفتے کے لیے شیخوپورہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس چلے جائیں۔

☆☆☆

ان کا سفر جاری رہا...... دو روز بعد وہ ایبٹ آباد سے شاہراہِ قراقرم پر سفر کرتے ہوئے اور بشام...... داسو وغیرہ سے ہوتے ہوئے اسکردو روڈ پر آئے...... اور پھر معروف کنکورڈیا گلیشیر کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہاں Shigae نامی گاؤں سے آگے انہیں پاپیادہ سفر کرنا تھا۔ حسب سابق یہاں گاڑیاں چھوڑ دی گئیں۔ پروگرام کے مطابق سرمد صاحب کے لیے سواری کے واسطے ایک نہایت عمدہ خچر کا انتظام کیا گیا تھا۔ سامان وغیرہ کے لیے بھی دو ٹٹو موجود تھے۔ کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے ایک اضافی خچر کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ سرمد صاحب کی ہمت قابلِ داد تھی۔ وہ زخمی حالت میں اتنے کٹھن سفر کے لیے نہ صرف آمادہ تھے بلکہ لیڈنگ رول بھی ادا کر رہے تھے۔

عادل بہت گم صم تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بہرحال اپنی اندرونی کیفیت اس نے بس اپنے تک ہی رکھی تھی، وہ ساتھیوں کو پریشان کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ عادل کی پریشانی کی وجہ ایک فون کال تھی۔ یہ فون کال اس نے چلاس کے نزدیک ایک ریسٹ ہاؤس میں سنی تھی۔ کال کرنے والا اس کا گاؤں کا دوست عبدالقدیر تھا۔

قدیر نے کہا تھا کہ وہ اسے خواہ مخواہ پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن ضروری بات ہے اس لیے وہ بتانے پر مجبور ہو رہا ہے۔ تمہید کے بعد اس نے کہا تھا کہ وہاں لالی اور پال پور کے جڑواں دیہات میں زبردست ہلچل ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے تایا فراست کی حویلی میں کوئی بہت بڑا واقعہ ہوا ہے...... جسے عام لوگوں سے چھپایا جا رہا ہے۔ پال پور گاؤں میں جو شدید افراتفری مچی ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعہ بہت بڑا ہے...... اور اس واقعے کا ذمے دار بھی عادل ہی کو ٹھہرایا جا رہا ہے۔ خود کو ذمے دار ٹھہرائے جانے پر عادل ہکا بکا رہ گیا تھا۔ وہ تو باغ والے احاطے میں تایا فراست کے بیٹوں اور ملازموں سے اتنی بے عزتی کرا کے بھی مشتعل نہیں ہوا تھا اور اپنی والدہ کو لے کر خاموشی سے گاؤں سے نکل آیا تھا۔ اب پتا نہیں اس پر کیا الزام لگایا جا رہا تھا۔

عبدالقدیر نے اپنی اطلاع میں اس سفید پک اپ کا بھی ذکر کیا جو عادل کے دوست صادق کے استعمال میں تھی۔ قدیر نے بتایا کہ وہ سفید پک اپ پال پور سے قریباً دو میل دور سرکنڈوں میں کھڑی ملی ہے اور شاید اسی پک اپ کی وجہ سے حویلی میں ہونے والے واقعے میں عادل کو ملوث سمجھا جا رہا ہے۔ قدیر نے اطلاع دی کہ تایا فراست اور چودھری مختار کے کارندے ہتھیاروں سے لیس ہو کر چاروں طرف دندنا رہے ہیں اور ہر اس شخص سے برا سلوک کر رہے ہیں جس کا عادل یا اس کی والدہ اور ماموں سے کوئی تعلق واسطہ رہا ہو......

اس کال نے عادل کو بہت فکرمند کر دیا تھا۔ تسلی کی صرف ایک بات ہی تھی کہ وہ پہلے ہی والدہ کو خالو عطا شاہ کے ساتھ شیخوپورہ کے دور افتادہ گاؤں کی طرف روانہ کر چکا تھا۔ اب پتا نہیں، وہاں تایا کے گاؤں میں کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے اتنی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اگر حویلی میں کچھ ہوا تھا تو پھر یہ اور بھی خطرناک بات تھی۔ عادل کے دل سے شہزادی کے لیے خیر و عافیت کی دعا نکلی۔ ایک اور چیز جو بری طرح الجھا رہی تھی، وہ گاؤں کے قریب صادق کی سفید پک اپ کی موجودگی تھی۔ وہ پک اپ لاہور سے اتنا طویل سفر کر کے بہاولپور کے اس دور دراز گاؤں تک کیسے پہنچی؟ یہ بات تو بعید از امکان تھی کہ صادق نے گاؤں میں عادل کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے طور پر کوئی قدم اٹھایا ہوگا۔ حالانکہ اسے بہت رنج بھی تھا۔ شروع میں عادل نے اس سے اصل بات چھپائی تھی لیکن بعد میں بتا دی تھی۔

عادل کی سوچ کے گھوڑے ایک بار پھر نسبت روڈ کے چوک میں نظر آنے والے عجیب منظر کی طرف دوڑنے لگے۔ نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس بار بار کہہ رہی تھی کہ

اوپر تلے پیش آنے والے ان واقعات میں اور نسبت روڈ کے منظر میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے، کوئی گہرا تعلق۔

ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ وہ سرمد صاحب سے کہہ دے کہ وہ یہ سفر مزید جاری نہیں رکھ سکتا اور واپس جانا چاہتا ہے لیکن پھر اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ غیر معمولی عزت اور بے عزتی کا سوال تھا۔ سرمد صاحب مہینوں سے جس کام کے لیے جان مار رہے تھے، اس کا وقت آ گیا تھا۔ اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا۔ پھر عادل کی محبت کے لیے بھی یہی فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ اگلے چند روز میں اس نے شہزادی کو ہمیشہ کے لیے کھو دینا تھا، یا پھر پا لینا تھا۔ ہار جیت تو قدرت کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ اوپر والے کی بخشی ہوئی ہمت اور توانائی کو اس کی آخری حدوں تک استعمال کرنا چاہتا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس کی موت بھی واقع ہو جاتی تو وہ خود کو سرخرو سمجھتا۔

سرمد صاحب خچر پر سوار تھے اور اس کے ساتھ ساتھ واکی ٹاکی پر کسی سے بات بھی کر رہے تھے۔ بات ختم کرنے کے بعد انہوں نے عادل کو مخاطب کیا اور بولے۔ ''یہ یہاں کا ایک بہت تجربہ کار پورٹر انوار شاہ ہے۔ اس سے بات ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ ٹوبل راک تک جانے والا راستہ پچھلی دو بارشوں کے بعد کھل گیا ہے اور قریباً پندرہ انگریز فیملیز وہاں پہنچ چکی ہیں۔ ابھی دس پندرہ مزید آئیں گی۔ پچھلے سالوں میں یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی لیکن آج کل چونکہ سیکیورٹی کے مسائل ہیں، اس لیے لوگ محتاط ہیں۔''

عادل نے کہا۔ ''میں نے سنا تھا سر، یہ غیر ملکی اپنی سیکیورٹی باہر سے بھی لے کر آتے ہیں؟''

''ہاں بھئی! سب روپے کا کھیل ہے...... بلکہ پاؤنڈز کا کھیل ہے اور پاؤنڈز ان کے پاس بہت ہیں۔ ایک ایک گارڈ پر دس دس لاکھ بھی خرچ کرنا پڑے تو کر سکتے ہیں۔ مقامی پورٹرز کو بھی یہ لوگ کھل کر روپیا دیتے ہیں۔ اسی لیے جو ٹٹو ہمیں پچھلی دفعہ پانچ سو روپے روزانہ پر ملا تھا، اب تگنی قیمت پر بھی مشکل سے حاصل ہوا ہے...... اور ہاں، ایک اور خاص بات بھی انوار شاہ سے معلوم ہوئی ہے...... بلکہ بہت خاص بات۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے سرمد صاحب کا لہجہ دھیما اور رازدارانہ ہو گیا تھا۔

عادل نے چلتے چلتے خود کو ان کے کچھ اور نزدیک کر لیا۔ وہ خچر پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا عادل کی طرف جھک گئے اور بولے۔ ''مالکانے زادہ کے بارے میں ہمارا قیافہ درست ثابت ہوا ہے شاید۔''

''کیا مطلب سر؟''

''مالکانے زادہ...... مرا نہیں...... وہ قریباً بارہ گھنٹے سکتے کی سی حالت میں رہا تھا، پھر اس کے ہاتھ پاؤں میں حرکت نظر آنے لگی تھی۔ قریباً 18 گھنٹے بعد وہ ہوش میں آ گیا تھا۔'' اس خبر نے عادل کو بری طرح چونکایا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

عادل نے کہا۔ ''سر! اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ وہاں ہمارے دیہات میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں کسی نہ کسی طور اس مالکانے کا ہاتھ ہے......''

سرمد صاحب نے معاملہ فہم نظروں سے عادل کو دیکھا۔ ''کیا تمہیں، وہاں کے بارے میں کوئی اور اطلاع بھی ملی ہے؟''

''ہاں جناب!'' عادل نے جواب دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ تفصیل بتاتا، خچر کی چڑھائی میں دشواری پیش آنے لگی۔ ایک پورٹر نے آگے بڑھ کر اس کی لگام تھام لی۔ سرمد صاحب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر عادل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

تاہم رات کو کیمپ میں کھانا کھانے کے بعد جب سرمد صاحب اور عادل کو تنہائی ملی تو اس نے سرمد صاحب کو اس فون کال کے بارے میں بتا دیا جو اس نے چلاس کے قریب سنی تھی۔ اس فون کال کے بعد چونکہ سگنل آنا بند ہو گئے تھے اس لیے مزید کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی۔

عادل نے کہا۔ ''سر! وہاں تایا کے گاؤں پال پور میں کوئی بہت خاص واقعہ ہوا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس واقعے میں تایا کا چھوٹا بیٹا عاصم زخمی بھی ہوا ہے۔ حویلی میں اور پورے علاقے میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ مزید پریشانی کی بات یہ ہے کہ اس واقعے کا الزام مجھ پر لگایا جا رہا ہے۔ شاید یہ سمجھا جا رہا ہے کہ میں نے اپنے دوست صادق کے

عقلمندی

ایک شخص گاڑی کو پکڑنے کے لیے دوڑا لیکن گاڑی نکل گئی۔ پاس کھڑے ہوئے ایک آدمی نے اس سے کہا۔ ''اگر تم کچھ اور تیز دوڑتے تو گاڑی پکڑ سکتے تھے۔''

وہ شخص بولا۔ ''دراصل مجھے اپنی دوڑ کو چند منٹ پہلے شروع کرنا چاہیے تھا۔''

ساتھ مل کر اس مار پیٹ کا بدلہ لیا ہے جو باغ والے احاطے میں میرے ساتھ ہوئی......''

عادل نے سرمد صاحب کو بھی بعد میں تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا اور اس فون کال کے بارے میں بھی سرمد صاحب کو بتا دیا تھا۔ سرمد صاحب توجہ سے سنتے رہے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''لیکن تمہارے ساتھ ساتھ صادق کو بھی کیوں ملوث کیا جا رہا ہے؟''

''اس کی وجہ وہ پک اپ ہے سر جو گاؤں کے قریب سرکنڈوں سے ملی ہے۔ وہ صادق کی پک اپ ہے۔ گاؤں کے پرانے چوکیدار کے علاوہ اور کئی افراد نے بھی لاہور میں یہ پک اپ دیکھی ہوئی ہے۔''

سرمد صاحب کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ وہ بولے۔ ''اگر ان معاملات میں مالکانے کا ہاتھ ہی ہے تو ممکن ہے کہ اس نے پہلے صادق کو غائب کیا ہو اور پھر اس پر تشدد کر کے دیگر معلومات حاصل کی ہوں۔ ان معلومات کی روشنی میں وہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے تمہارے گاؤں جا پہنچا ہو۔ تمہاری خوش قسمتی کہ اس کی آمد سے ایک دن پہلے تم اور تمہاری والدہ گاؤں سے نکل آئے۔''

''بالکل سر! یہی باتیں میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔''

سرمد صاحب اور عادل تادیر اس سنگین موضوع پر بات کرتے رہے اور قیافہ لگانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہاں پال پور گاؤں میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تایا فراست کا چھوٹا بیٹا عاصم صرف زخمی نہ ہوا ہو بلکہ جان سے چلا گیا ہو۔ لیکن اگر ایسی بات ہوتی تو پھر پولیس میں رپورٹ ضروری تھی...... اور قدیر کی فون کال میں کہیں بھی اس طرح کا ذکر نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ہمایوں اور کرسٹل بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئے۔ مالکانے زادہ کے زندہ ہونے اور لاہور میں دیکھے جانے کی اطلاع ان دونوں کے لیے بھی حیرت انگیز تھی۔ عادل کا دل بہت بجھا ہوا تھا۔ کسی وقت تو اسے خدشہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں وہ آخری کوشش کرنے سے پہلے ہی شہزادی کو ہار نہ جائے۔ گاؤں میں جس طرح کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی، یقینی بات تھی کہ تایا کے دل میں اس کے لیے رہی سہی ہمدردی بھی ختم ہو جاتی۔ آخری ملاقات میں اس نے تایا سے پھر تھوڑا سا وقت لے لیا تھا۔ اب اس تازہ واقعے کے بعد پتا نہیں وہ وقت موجود رہتا تھا یا نہیں؟

اب وہ سفر کے ایسے مرحلے میں تھے کہ یہاں سے واپسی کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انہیں آگے بڑھنا تھا...... صرف آگے...... نوبل راک کی طرف...... جہاں ستارا برادری کے شوقین جمع ہو چکے تھے اور ایک نہایت خطرناک و پُرجوش کھیل شروع ہونے والا تھا۔

☆☆☆

انہوں نے چھ سات دن تک حتی الامکان تیز رفتاری سے سفر کیا۔ سردی اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے ہڈیوں میں گودا جما دینے والی ہوا سے بھی واسطہ پڑا تھا۔ دو راتیں ایسی بھی گزریں جب صبح تک آسمان سے چھاجوں پانی برستا رہا اور بادل دھاڑتے رہے۔ بڑی آسانی سے جب کے ٹو اور اس کی نواحی چوٹیاں روشن ہوتیں تو یوں لگتا جیسے اچانک ایک طلسمی منظر آنکھوں کے سامنے آ کر اوجھل ہو گیا ہے...... یہ بڑی ہمت اور برداشت کا سفر تھا لیکن ہمت اور برداشت کا اصل امتحان تو سرمد صاحب دے رہے تھے۔ ان کا حوصلہ دیکھ کر عادل کو ایک ایسا عملی سبق مل رہا تھا جو نصیحتوں کے ہزارہا الفاظ پر بھاری تھا۔ خوشی...... تکلیف میں پوشیدہ ہے۔ جتنی زیادہ تکلیف، اتنی زیادہ خوشی۔ کتنی سادہ مساوات تھی یہ...... شاید اسی مساوات کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاعرِ مشرق نے بھی کہا تھا کہ انسان خود کو اس درجے تک پہنچا سکتا ہے جہاں خدا، ہر تقدیر سے پہلے اپنے بندے سے پوچھتا ہے کہ اس کی مرضی کیا ہے۔ سرمد صاحب کا فلسفۂ حیات یہی تھا کہ اپنا سینہ کشادہ کر کے...... اور آنکھیں بند کر کے، اپنے راستے میں آنے والی تکلیفیں جھیلتے چلے جاؤ اور یہ ایمان رکھو کہ ان کا صلہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہتا ہے اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ یہ صلہ تمہاری من مرضی سے ملے تو پھر خود پر باقی خوشیوں اور راحتوں کے دروازے بھی بند کرتے چلے جاؤ۔ صرف وہی دروازہ کھلا رہنے دو جو تمہارا من چاہا ہے اور خدا سے دعا کرو کہ وہ اسی من چاہے دروازے سے تمہارے حصے کی خوشیاں تمہیں دے۔ اکثر و بیشتر ایسی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اسی طریق پر چلتے ہوئے عادل نے بھی اپنے حصے کی خوشیوں کے لیے صرف ''شہزادی والا دروازہ'' کھلا رہنے دیا تھا۔ باقی سارے دروازے بند کر دیے تھے۔ سرمد صاحب، ہمایوں اور کرسٹل وغیرہ کی طرح وہ بھی بالکل سادہ غذا کھا رہا تھا۔ خود کو دنیاوی آسائشوں سے دور کر رہا تھا۔ جان توڑ مشقت کو شعار بنا رہا تھا...... تن آسانی پر جہدِ مسلسل کے کوڑے برسا رہا تھا۔ بھوک پیاس کو اپنا مطیع کر رہا تھا۔ باقی راحتوں کے دروازے خود پر بند کرنے والی بات ہی تو تھی۔ اور ایک ایسا ہی دروازہ شاید حسین نیلگوں آنکھوں والی کرسٹل بھی تھی۔ پچھلے سفر میں ایک طوفانی شب میں ایک

ہیجان خیز تنہائی کے نرغے میں ہونے کے باوجود عادل نے خود پر یہ دروازہ یکسر بند رکھا تھا۔

آخر ان کے سفر کا وہ مرحلہ آیا جب انہوں نے ایک تنگ درّے کو کراس کیا اور ایک کشادہ وادی میں داخل ہو گئے۔ دراصل یہی وہ تنگ درّہ تھا جو جولائی اگست میں ہونے والی تیز بارشوں کے بعد کھلتا تھا اور وادی میں جانے کا راستہ بناتا تھا۔ بارش کا بہت سا پانی جھیل کی صورت میں جمع ہو کر لاکھوں ٹن برف کو درّے کے اندر سے دھکیل دیتا تھا۔ وادی میں چند گھنٹے کے سفر کے بعد ہی انہیں رنگ برنگے خیموں کی کئی قطاریں نظر آ گئیں۔ برف کی سفید چادر پر یہ ایک خوب صورت سی عارضی بستی تھی۔ بہت سے مرد و زن اس بستی میں چلتے پھرتے نظر آئے۔ کافی بڑی تعداد میں باربرداری کے جانور بھی یہاں موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر خچر تھے۔ انگریزوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کچھ تو انگریز فیملیز کے جاننے والے تھے۔ کچھ بوسیدہ لباسوں والے مقامی پورٹرز تھے۔ قریب پہنچنے پر کئی جگہ غیر ملکی مسلح گارڈز بھی دکھائی دیے۔ اس کے علاوہ جنریٹرز کی گھوں گھوں بھی سنائی دی۔ یہ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔

اور پھر عادل کی نگاہ اس عظیم الشان پہاڑ نما چٹان پر پڑی جس پر چڑھائی کے مقابلے ہونا تھے۔ اس ہیبت ناک چٹان کی اونچائی دو ہزار فٹ سے کچھ ہی کم ہوگی۔ اس کا بالائی سرا آسمان کو بوسہ دیتا محسوس ہوتا تھا۔ یہی نوبل راک تھی۔ نہ جانے کتنے زمانوں سے یہ اسی طرح سربلند کھڑی تھی اور اپنی عجیب ساخت پر داد کی طالب تھی۔ دائیں پہلو سے دیکھا جاتا تو اس کی بناوٹ کو کسی حد تک گرجے سے مشابہ بھی قرار دیا جا سکتا تھا۔

ان انگلش فیملیز میں سے ایک فیملی کرسٹل کی بھی تھی۔ کرسٹل کے والدین بھی یہاں موجود تھے۔ اس کا سگا باپ مائیکل جوناتھن اور سوتیلی ماں بارٹینا۔ کرسٹل نے عادل کو بتایا کہ یہ لوگ اس سے ناراض ہیں۔ اس ناراضی کی وجہ یقیناً کرسٹل کی روایت شکنی ہی تھی۔ وہ بے شک انگلینڈ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہتی تھی لیکن اس کا خاندان ان قدامت پسند خاندانوں میں سے تھا جو آج بھی سولہویں سترھویں صدی سے آگے نہیں نکلے تھے۔ یہ لوگ آج بھی رنگ و نسل کے قائل تھے اور ان تمام پرانے رسم و رواج کو سینے سے لگائے ہوئے تھے جن میں سے بوڑھی روائتی ذہنیت کی بو آتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ خود کو ترقی یافتہ بھی کہتے تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک کرسٹل کا لیوپڈ سے شادی سے انکار کرنا سنگین روایت شکنی ہی تھی۔

یہاں پہنچ کر عادل کو پہلی بار کئی ڈیوکس اور ارل وغیرہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اونچی ناک...... باریک ہونٹ...... اکڑی ہوئی گردنیں اور بیش قیمت لباس۔ وہ اپنی گوری چمڑی کو اپنی شان سمجھتے تھے اور مقامی لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی نگاہوں میں بے ساختہ ''احساسِ برتری'' چکارے مارنے لگتا تھا۔ بڑی توندوں اور سرخ و سپید چہروں والے دو انگلش نوابوں سے سرمد صاحب کی بھی بات ہوئی...... یہ بات چیت عادل سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر ہوئی۔ سرمد صاحب نے ایک دو بار ہاتھ سے عادل کی جانب اشارہ کیا۔ جیسے انگریز معززین کو بتا رہے ہوں کہ یہ وہ مقامی لڑکا ہے جو ان مقابلوں میں حصہ لے گا۔ دونوں انگریز معززین نے جس انداز سے عادل کو دیکھا وہ بہت تحقیر آمیز تھا۔ جیسے انہوں نے بہ زبانِ خاموشی کہا ہو کہ یہاں خوار کرنے کے لیے کس کو اٹھا لائے ہو۔ یہ اشرافیہ کے کھیل ہیں، ان میں ایسے ''مقامی'' کب اپنی عزت بچا پاتے ہیں۔

سرمد صاحب اور ان کی ٹیم کے لیے بھی تین ٹینٹ مناسب جگہ پر لگا دیے گئے۔ یہ دیکھ کر عادل کو حیرت ہوئی کہ اپنے والدین سے مختصر ملاقات کرنے کے بعد کرسٹل، سرمد صاحب کے ٹینٹ میں واپس آ گئی۔

سرمد صاحب نے عادل کو لیوپڈ کے حوالے سے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ مزید تاکید کے طور پر انہوں نے کہا۔ ''لیوپڈ بھی پہنچ چکا ہے، یہیں کہیں گھوم رہا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے کہ تم اکیلے خیمے سے نہیں نکلو گے۔ میں کسی طرح کی بدمزگی نہیں چاہتا۔''

''جو آپ کا حکم سر۔'' عادل نے کہا۔

''وہ تمہیں مشتعل کرنے کی کوشش بھی کرے تو تم نے مشتعل نہیں ہونا۔ ہم اس کی ہر زیادتی کا بدلہ اس سے کھیل کے میدان میں لیں گے۔''

''میں بالکل تیار ہوں سر۔'' عادل کے سینے میں ایک جوش سا لہر لینے لگا۔

سرمد صاحب نے کہا۔ ''اور کسی بھی مرحلے میں کسی سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں...... ہماری تیاری پوری ہے اور یہ تیاری اس مقابلے کے حساب سے ہی ہے۔ جب تم اس نوبل راک کو قریب سے دیکھو گے تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ اس کی ساخت اور سطح اسی چٹان کی طرح ہے جس پر ہم نے قریباً سات ہفتے تک مسلسل مشق کی تھی۔''

''مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے جناب۔''

''اصل مقابلوں سے پہلے ہمیں تین چار دن مشق کے لیے بھی ملیں گے۔ اس مشق سے تمہیں بہت فائدہ ہوگا...... میرا خیال ہے کہ ہم کل سے ہی اپنا کام شروع کرسکتے ہیں۔''

ٹمپریچر نقطۂ انجماد سے چودہ پندرہ درجے نیچے تھا۔ ایک خیمے میں کرسٹل اور سرمد صاحب تھے۔ دوسرے میں عادل اور ہمایوں۔ تیسرے خیمے میں ضروری سازوسامان تھا۔ ان کے دو ملازموں اور دو تین پورٹرز کو ان مشترکہ خیمے میں جگہ ملی تھی جو اسی مقصد کے لیے لگائے گئے تھے۔

کرسٹل آج کل کافی بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس میں سنجیدگی بڑھ گئی تھی۔ پچھلے سفر میں اس نے جو شوخیاں عادل کے ساتھ کی تھیں، انہیں بھی بریک لگ چکے تھے۔ شاید اس نے ذہنی طور پر عادل کو شہزادی کے لیے الوداع کہہ دیا تھا۔ یہ صورتِ حال عادل کے لیے بہت تسلی بخش تھی۔

رات کو ہمایوں اور عادل خیمے میں تنہا تھے۔ ہمایوں اتنا گم صم رہتا تھا کہ اس کے ساتھ رہ کر بوریت محسوس ہونے لگتی تھی۔ آج وہ معمول سے زیادہ ہی خاموش تھا۔

''کیا بات ہے ہمایوں بھائی...... آج تو بالکل ہی چپ لگی ہوئی ہے۔ کیا سوچ رہے ہو؟'' عادل نے کہا۔

اس نے گہری سانس لی اور اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹا کر بولا۔ ''سوچ رہا ہوں کہ تم کرسٹل کو اس عیاش امیرزادے (لیوپڈ) سے بچا پاؤ گے یا نہیں اور اگر خدانخواستہ وہ اس بار پھر کامیاب رہا تو وہ اس بے چاری کا کیا حشر کرے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اسے ایک شریکِ حیات کا درجہ دے گا۔ وہ اس کی لونڈی کی طرح ہوگی۔ بظاہر ترقی یافتہ نظر آنے والے یہ ''جاگیردار انگریز'' اندر سے اب بھی پرانی صدیوں میں جی رہے ہیں۔ جب یورپ میں بے تحاشا آقا ہوتے تھے اور لونڈی غلام کوڑیوں کے مول بکتے تھے۔''

عادل نے کہا۔ ''اگر ایسا ہو گیا اور کرسٹل، لیوپڈ کے پاس چلی گئی تو تمہیں دکھ ہوگا؟''

''ظاہر ہے ہوگا۔ کیا تمہیں نہیں ہوگا؟'' ہمایوں نے الٹا سوال کیا۔

''مجھے بھی ہوگا ہمایوں بھائی...... لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کچھ زیادہ ہوگا۔ مجھے اب یقین سا ہو گیا ہے ہمایوں بھائی...... کہ...... تم کرسٹل کو پسند کرتے ہو۔''

''تم نے یہ بات ایک بار پہلے بھی کہی تھی اور میں نے کہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔''

''اور اس وقت بھی انکار کرتے ہوئے تمہارے چہرے پر ایسا ہی رنگ گزر رہا تھا ہمایوں بھائی۔''

''کیسا رنگ؟'' اس نے خشک انداز میں کہا۔

''وہی رنگ جو کچھ چھپاتے ہوئے بندے کے چہرے پر آتا ہے۔'' عادل نے بے باکی سے کہا۔

ہمایوں چند لمحے تک جزبز نظر آیا۔ پھر حسبِ عادت گلا صاف کرکے بولا۔ ''یار چھوڑو، یہ بے کار کی باتیں ہیں۔ جیسا تم سوچ رہے ہو ویسا نہیں ہے...... لیکن...... اگر ہو بھی تو زمین آسمان کا کیا میل۔ ہمارے اور اس کے اسٹیٹس میں زمین آسمان سے بھی زیادہ کا فرق ہے۔''

عادل ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''لیکن ہمایوں بھائی، یہ زمین آسمان والا محاورہ اب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ یہ زمین آسمان کے ملنے کا دور ہے۔ ہم زمین کے باشندے چاند پر پہنچ رہے ہیں یا نہیں؟''

''لیکن یہ باشندے بھی تو سفید فام ہی ہیں۔'' ہمایوں کے مختصر جواب نے عادل کو لاجواب کر دیا۔ وہ ایسے ہی چھوٹی سی مگر بڑی کام کی بات کرتا تھا۔

اس سے پہلے کہ عادل کو کوئی جواب سوجھتا، کرسٹل اندر آگئی۔ وہ اپنا ہیڈفون ڈھونڈتے ہوئے آئی تھی۔ سخت سردی کے باوجود وہ جینز شرٹ میں تھی اور بہت اسمارٹ لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہمایوں کی آنکھیں جھک سی جاتی تھیں۔ جیسے وہ اسے دیکھنے کی تاب نہ رکھتا ہو۔ یا پھر یہ کہ اپنی نظروں سے اس کی خوب صورتی کو میلا کرنا نہ چاہتا ہو۔ وہ بھی ہمایوں سے کم کم ہی بات کرتی تھی۔

وہ ہیڈفون لے کر واپس چلی گئی۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر لیٹ گئے۔ ٹینٹ کے روزن کا Cover ہٹا کر عادل نے باہر دیکھا۔ دور بلند و بالا نوبل راک ایک ہیولے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ٹاپ پر برف موجود تھی۔ بائیں طرف بھی برف دکھائی دیتی تھی لیکن باقی اطراف میں سنگلاخ پتھر تھے۔ آج خلافِ توقع آسمان صاف تھا۔ شہروں کے دھوئیں اور گرد سے پاک یہ آسمان گہرا سیاہ نظر آتا تھا اور اس پر ہزارہا موتی جگمگا رہے تھے۔ یہ ستاروں کے جھرمٹ تھے۔ خیمے کے بچھونے پر لیٹے لیٹے عادل کو لگا جیسے نوبل راک ان ستاروں کو چھو رہی ہے۔ عادل کو اس نوبل راک پر کمند ڈالنا تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے نوبل راک پر نہیں ان جگمگاتے ستاروں پر کمند ڈالنا تھی۔ پھر ان ستاروں کو توڑ کر لانا ہے اور اپنی شہزادی کی مانگ میں بھرنا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس کی جان چلی گئی تو بھی پروا نہیں۔ زندگی یہیں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ

یہاں شہزادی سے مل نہ سکا تو پھر اگلی دنیا میں ملاقات کا انتظار کرے گا اور جب شہزادی اسے ملے گی...... تو اسے بتائے گا۔ ''شہزادی! میں نے اپنی سی پوری کوشش کی۔ اپنے جسم اور روح کی ساری توانائیاں تمہیں پانے کے لیے لگا دیں...... اب جو میرے بس میں ہی نہیں تھا وہ کیسے کرتا۔ اب میں تمہارے سامنے ہوں، ہارا ہوا ضرور ہوں لیکن پشیمان نہیں ہوں۔''

ایسے ہی عجیب و غریب خیالوں میں غلطاں وہ سو گیا۔ سلیپنگ بیگ کی نرم ملائم گرمی نے نہ جانے کب تک اسے ڈھانپے رکھا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو مکمل خاموشی تھی۔ بس دور کہیں جنریٹرز کی مدھم گھوں گھوں سنائی دیتی تھی۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ خیمے میں مدھم سی روشنی تھی۔ اس نے دیکھا ہمایوں بیٹھا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہیں لیٹے لیٹے عادل نے ذرا سا سر اٹھایا اور دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ ایک انگلش کتاب تھی۔ تحریر کے علاوہ اس پر اسکیچ بھی بنے ہوئے تھے۔ عادل نے ایک دو دفعہ پہلے بھی ہمایوں کے ہاتھ میں یہ کتاب دیکھی تھی۔ اس میں تین چار سو سال پہلے کے ہندوستان کے حالات و واقعات بیان کیے گئے تھے۔ عادل یہ دیکھ کر چونکا کہ خاموش طبع ہمایوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ کتاب کا جو صفحہ اس کے سامنے تھا...... اس پر ایک الاؤ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس الاؤ میں سے کئی انسانی ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ جیسے آگ میں جلنے والے مدد کے لیے پکار رہے ہوں۔ ایک اور اسکیچ بھی تھا جس میں گھوڑے وغیرہ دکھائی دیتے تھے لیکن وہ ٹھیک سے عادل کو نظر نہیں آیا۔

پتا نہیں اس کتاب سے ہمایوں کو کیا وابستگی تھی۔ وہ جس طرح خود ناقابلِ فہم تھا، اسی طرح اس کی ترجیحات اور دلچسپیاں بھی پراسرار تھیں۔ اس کے بارے میں عادل کو اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ چلاس اور اسکردو وغیرہ کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کے والدین اس کے بچپن میں ہی اسے داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ کچھ عرصہ دادی نے اس کی پرورش کی، پھر وہ بھی چل بسی۔ دس بارہ سالہ ہمایوں کو اپنے طور پر زندگی کے راستے بنانے پڑے۔ سخت محنت اور جاں فشانی اس کی گھٹی میں تھی۔ اس نے پہاڑوں کی دشوار گزار بلندیوں پر مختلف کام کیے۔ درخت کاٹے، شہد جمع کیا، کھالیں فروخت کرنے کے لیے جانوروں کا شکار کیا...... اور اس طرح کے بہت سے کام۔ وہ بلندیوں کا شناور ہو گیا۔ دشوار گزار پہاڑوں پر چڑھنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا پھر اس کا رابطہ سرمد صاحب سے ہوا اور وہ مستقل طور پر ان کے زیرِ سایہ آگیا۔ اس کے طور اطوار عجیب تھے، بہت کم بولتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو عادل کو لگتا کہ وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے۔

وہ جس طرح کتاب میں کھویا ہوا تھا، عادل نے مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور اسی طرح لیٹے لیٹے آنکھیں پھر بند کرلیں۔ کچھ دیر تک وہ اپنے گاؤں کے حالات اور واقعات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا پھر شہزادی کی صورت اس کی آنکھوں میں بس گئی اور وہ زیرِ لب شہزادی...... شہزادی پکارتے ہوئے دوبارہ سو گیا۔

اگلے روز نوبل راک کے عین نیچے اس کی ملاقات لیوپڈ سے ہوئی۔ اس وقت سرمد صاحب اور ہمایوں بھی عادل کے ساتھ تھے۔ لیوپڈ کے ساتھ بھی دو تین انگلش نوجوان تھے۔ کسرتی جسم والے لیوپڈ نے بڑی کینہ توز نظروں سے عادل کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک جگہ میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ گردن پر بھی چند دن پرانی چوٹ کے آثار تھے۔ یہ اس لڑائی کی نشانیاں تھیں جو ہوٹل کے آراستہ کمرے میں لیوپڈ اور عادل کے درمیان ہوئی تھی۔

لیوپڈ نے ایک جانب برف پر تھوکا اور سرمد صاحب سے مخاطب ہو کر انگریزی میں بولا۔ ''تو یہ ہے وہ پاکستانی گوریلا جسے جناب، ہمارے مقابلے کے لیے چڑیا گھر سے نکال کر لائے ہیں۔ اس سے تو پہلے بھی جان پہچان ہے۔''

سرمد صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیوپڈ! تمہیں اس طرح کسی کا مذاق اڑانے کا حق نہیں ہے۔ مقابلے سے پہلے تم سب برابر ہو۔ مقابلے کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ کون زیادہ عزت کا حق دار ہے اور کون نہیں۔''

''لیکن جناب! اس جوکر کو ہمارے مقابل کھڑا کرنے کے لیے تو آپ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے نا۔ اب اگر یہ آپ کی توقعات پر پورا نہیں اترا تو اس سے زیادہ بے عزتی آپ کو سہنا پڑے گی۔''

''میں ہر صورتِ حال کے لیے تیار ہوں۔'' سرمد صاحب نے انگلش میں جواب دیا۔

''غالباً آپ کو اس سے زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے آپ اس کے عادی ہیں۔''

سرمد صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ عادل کو بھی اس کاٹ دار فقرے کی پوری طرح سمجھ آگئی تھی۔ انگلش میں لیوپڈ نے کہا تھا...... ایز اے پاکستانی یو

آریوزٹو۔ عادل کے سینے میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔

"تم اپنی زبان سنبھال کر بات کرو سفید بندر۔" عادل اردو میں دہاڑا۔

لیوپڈ کا چہرہ بھی انگارہ ہوگیا۔ "یو باسٹرڈ...... سن آف بچ۔" وہ پھنکارا اور تیزی سے عادل کی طرف آیا۔ اس کا گھونسا عادل کی چھاتی پر لگا۔ لیوپڈ کے دو دوست بھی عادل کی طرف جھپٹے۔

سرمد صاحب بیساکھیوں کے سہارے آگے بڑھے اور اس کے سامنے آگئے۔ "رک جاؤ...... رک جاؤ۔" وہ زور سے بولے۔

عادل جوابی حملے کے لیے تیار تھا لیکن ایک مسلح گارڈ نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ چند دوسرے گارڈز نے لیوپڈ اور اس کے دونوں ساتھیوں کو روک لیا۔ ہمایوں سمیت کئی افراد بیچ میں پڑ گئے اور یہ ہنگامہ سنگین صورت اختیار کرتے کرتے رہ گیا۔

بعدازاں ان مقابلوں کے کرتا دھرتا لارڈ اوئس ماؤنٹے اور دیگر معززین میں ایک میٹنگ ہوئی۔ سر سرمد بھی اس میں شریک ہوئے۔ ایک ضابطۂ اخلاق بنایا گیا اور طے ہوا کہ اگر کوئی بھی فرد رولز کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کے خلاف کارروائی ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

اگلے روز عادل نے سر سرمد کی زیر نگرانی پہلی بار مشق میں حصہ لیا۔ اس نے پہلی دفعہ نوبل راک کو بالکل قریب سے دیکھا۔ اسے سرمد صاحب کی دوراندیشی کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ نوبل راک تو پچانوے فیصد اسی چٹان سے ملتی تھی جس میں وہ پچھلے سفر میں مسلسل مشق میں مصروف رہے تھے۔ عادل کو بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اس چٹان کی اصل چڑھائی تقریباً 1600 فٹ تھی۔ پتھروں کی ایک عمودی دیوار تھی جس میں جگہ جگہ دراڑیں تھیں۔ کلائمبر کو ان دراڑوں میں ہاتھوں کی انگلیاں اور پاؤں کی ٹوہ پھنسا پھنسا کر آگے بڑھنا ہوتا تھا۔ تقریباً بیس بیس فٹ کے فاصلے پر اینکر پوائنٹس پہلے سے موجود تھے۔ ان پوائنٹس سے رسّے کو منسلک کردینے کے بعد کوہ پیما کو گرنے سے تحفظ ملتا تھا۔ کوہ پیماؤں کے مسلسل چڑھنے اترنے سے چٹان پر نشان سے بن گئے تھے جو فاصلے سے دیکھنے پر لکیروں کی طرح نظر آتے تھے۔ اس دن عادل نے چار پانچ گھنٹے تک مسلسل مشق کی۔ وہ ایک بار راک کی چوٹی تک پہنچا اور دوبار آدھا آدھا سفر کیا۔ پسینا اس کے جسم سے دھاروں کی صورت بہا تو اس کا جسم کھلنے لگا۔ وہ ہاتھ پاؤں کو زیادہ تیزی سے حرکت دینے کے قابل ہوگیا۔ اسے دیکھنے والے غیرملکی چونک گئے۔ انہیں اندازہ ہوگیا کہ سرمد صاحب کسی معمولی لڑکے کو لے کر نہیں آئے۔

مشق ختم کرنے کے بعد جب وہ پسینے سے شرابور سرمد صاحب کے پاس آیا تو ان مقابلوں کے کرتا دھرتا لارڈ اوئس بھی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سرمد صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ لمبی ناک اور عقابی آنکھوں والے لارڈ اوئس نے بڑی فراخ دلی سے عادل کی کارکردگی کو سراہا اور امید ظاہر کی کہ وہ اپنے حریفوں کو ٹف ٹائم دے گا۔

موسم نہایت خوشگوار تھا۔ سہ پہر کے وقت تیز دھوپ نکل آئی۔ برف پوش وادیاں اور چوٹیاں دمک اٹھیں۔ کرسٹل بہت چست لباس میں نظر آئی۔ سلیولیس شرٹ اور شارٹ پہنے وہ جاگنگ کے لیے تیار دکھائی دیتی تھی۔ عادل نے اسے ایک طرف لے جاکر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو عادل بولا۔ "کرسٹل! تم نے پچھلے چند ہفتوں میں خود کو کافی بدلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ڈریسنگ کے سلسلے میں بھی احتیاط شروع کرو۔ لباس جسم چھپانے کے لیے ہوتا ہے، نمایاں کرنے کے لیے نہیں۔"

"ہام نے کیا کیا؟" وہ اپنی نیلی آنکھیں جھپک کر بولی۔

"خود کو آئینے میں دیکھو اور خود سے پوچھو۔" عادل نے اس کے بالائی جسم سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر مسکراتی نظروں سے عادل کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اوکے...... توم کہتا تو ہام اس بارے میں چینج لاتا۔ آر یو ہیپی؟"

"یس۔"

"لیکن توم کو بھی ہام کا ایک بات پر دھیان دینا ہوئیں گا۔"

"ہاں کہو۔"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "لیوپڈ اور اس کے فرینڈز کی طرف سے بہت ہوشیار رہنا ہوئیں گا۔ وہ توم کا کوئی نقصان کرسکتا۔ توم کو کھانے پینے میں بھی بہت بہت......" وہ اٹک گئی۔

"......احتیاط کرنا چاہیے۔" عادل نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

"یس...... ہام یہی کہنا مانگتا۔"

اسی دوران میں انگلش لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی وہاں پہنچ گئی۔ انہوں نے کرسٹل کو بتایا کہ شام کو ڈانس پارٹی ہے۔ وہ بھی ضرور انجوائے کرے۔

کرسٹل نے بہانہ بنایا کہ اس کے گھٹنے میں درد ہے۔

ایک لڑکی زور سے ہنسی اور بولی۔ "اتنی بڑی فزیو تھراپسٹ کے اپنے گھٹنے میں درد ہے۔ اب ہم بے چاروں کا کیا ہوگا۔"

شام کو واقعی جنگل میں منگل کا سماں ہوگیا۔ پورٹرز کے خیموں کے پاس سے بہت سی خشک لکڑیاں لاکر کیمپ کے بیچوں بیچ ایک انبار سا لگا دیا گیا۔ اندھیرا گہرا ہوا تو انبار کو آگ دکھا دی گئی۔ ایک بڑا الاؤ روشن ہوگیا۔ انگریز خواتین حضرات نے اس الاؤ کے گرد ڈیرے ڈال لیے۔ باربی کیو ہونے لگا۔ میوزک کی دھما دھم گونجنے لگی۔ نوجوان تھرکنا شروع ہوگئے۔ سرمد صاحب، عادل اور ہمایوں وغیرہ اس ہنگامے سے علیحدہ ہی رہے۔ کرسٹل وہاں چلی ضرور گئی لیکن ایک طرف بیٹھی رہی...... حیران کن طور پر اپنے والد اور سوتیلی والدہ سے اس کی بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ روایت پسند انگریز باپ یقیناً بیٹی کی بغاوت سے نالاں تھا۔ ویسے بھی اب کرسٹل بہت بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس پر مشرقی رنگ غالب آنے لگا تھا۔ دوسری لڑکیوں کی نسبت اس کا لباس بھی معقول تھا۔ وہ تو تقریباً نیم عریاں ہو رہی تھیں۔ اپنے بڑوں کے سامنے ہی اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مصروف تھیں۔ جوں جوں رات ہوتی گئی محفل جوبن پر آتی گئی۔ وہسکی اور واڈکا کے پیگ چکرا رہے تھے۔ الکحل اپنا رنگ جما رہی تھی۔ نشیلے قہقہوں کی آوازیں بتدریج بلند ہونے لگیں۔ اب کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی ترنگ میں آکر تھرکنے لگے تھے۔ پورٹرز اور دیگر مقامی لوگوں کو اس جگہ سے کافی دور رکھا گیا تھا۔

محفل عروج پر پہنچی تو لارڈ اوئس خیموں کی طرف آئے اور سرمد صاحب سمیت ان دونوں کو بھی کھینچ کھانچ کر الاؤ کے پاس لے گئے۔ میوزک کی دھما دھم اب بہت بلند ہوگئی تھی۔ لڑکے لڑکیوں کا ایک گروہ دیوانہ وار ناچ رہا تھا۔ نیم عریاں جسم سازوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ مچل رہے تھے اور دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ اچانک عادل کو ہمایوں کا خیال آیا۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایسے ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہتا تھا۔ خاص طور سے آگ کے گرد بیٹھنا تو اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ شروع میں عادل کا خیال تھا کہ شاید سرمد صاحب کے فلسفے کے مطابق اسے سردی جھیلنا پسند ہے...... اور جب ناقابلِ برداشت ٹھنڈ میں آگ کی راحت میسر ہوتی ہے تو وہ سرمد صاحب ہی کی طرح اس سے دور رہتا ہے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ اسے ویسے ہی انگیٹھی، آتش دان اور الاؤ وغیرہ پسند نہیں تھے۔

اب بھی وہ خاموشی سے کہیں کھسک گیا تھا۔ عادل اٹھا اور اس کی تلاش میں نکلا۔ وہ ٹینٹ میں بھی نہیں تھا۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے عادل کیمپ سے آگے تاریکی میں نکل آیا۔ جنریٹرز کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ڈھلوان پر آگیا۔ ہمایوں اگر کیمپ سے باہر آیا تھا تو اسی رخ پر گیا تھا۔ دوسری طرف تو پورٹرز کے خیمے تھے اور جانوروں کے سائبان وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ ٹارچ عادل کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں اور برف کے تودے تھے۔

اچانک عادل نے ہمایوں کو دیکھ لیا۔ پہلے عادل کو اس کے پاؤں ہی نظر آئے۔ وہ ایک پتھر کے پیچھے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح گم صم اور کھویا ہوا۔ عادل کو دیکھ کر وہ ذرا چونکا۔ عادل اس کے قریب ہی ایک ہموار پتھر پر بیٹھ گیا۔

"یار! تم کیوں کرتے ہو ایسا، ایک دم ہی الگ تھلگ سے ہوکر رہ جاتے ہو؟" عادل نے پوچھا۔

"بس عادت سی ہوگئی ہے۔" وہ حسبِ عادت ہولے سے بولا۔

"ہر عجیب عادت کے پیچھے کوئی وجہ ہوتی ہے اور تمہاری بہت سی عادتیں عجیب ہیں۔"

"بس، تمہیں لگتا ہوگا۔"

"نہیں ہمایوں بھائی! ایسا ہے...... بالکل ہے...... اب اپنی یہی عادت دیکھو۔ میں نے بہت دفعہ نوٹ کیا ہے کہ سخت سردی کے باوجود تم آگ کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ ایک دم بدک سے جاتے ہو۔ جیسے کوئی ڈر بیٹھا ہوا ہو تمہارے دماغ میں۔"

وہ چونک سا گیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ "تم کیوں رہتے ہو ہر وقت میری کھوج میں...... اس سے کیا ملے گا تمہیں؟"

"ہمایوں بھائی! جس کے ساتھ اتنا وقت گزرا ہو، اس کے بارے میں جاننے کو دل تو چاہتا ہی ہے نا...... اور پھر یہ بھی تو کہتے ہیں کہ کبھی کبھی بندہ دیواروں سے بات کرکے بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم مجھ سے بات کرو تو اس بات میں سے کوئی اچھی بات نکل آئے۔"

اس نے عجب یاس بھرے انداز میں سر کو نفی میں ہلایا۔ "کوئی اچھی بات نہیں نکلے گی عادل! یہ بہت پرانی باتیں ہیں۔ ان پر بس اب افسوس ہی کیا جاسکتا ہے یا آہیں بھری جاسکتی ہیں۔ گزرے دنوں کا نوحہ سنانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چلو چھوڑو، کوئی اور بات کرو۔"

"اچھا...... چلو یہ آگ والی بات تو بتاؤ۔ اتنا الرجک

کیوں ہو؟ کیا کوئی واقعہ ہے اس کے پیچھے؟'' عادل نے اسے دوسری طرح سے گھیرنے کی کوشش کی۔

ہمایوں کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک غیر محسوس مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''تم بڑے ضدی ہو عادل......''

''تم جو بھی کہہ لو، ہمایوں بھائی۔''

وہ پتھر سے ٹیک لگائے دور کہیں بلند و بالا چوٹیوں کے ہیولوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے اوپر تاریک آسمان تھا اور چمکتے ستارے۔ آج اس کا موڈ کچھ عجیب سا تھا۔ عادل کے دل نے گواہی دی کہ شاید وہ کچھ بتائے گا۔ اس نے حسب عادت کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''تم بانگڑی کے پیچھے بسنے والے پاؤندوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''یہی کہ وہ خانہ بدوش لوگ تھے جو یہاں آ کر پکے آباد ہو گئے ہیں۔''

''نہیں عادل!'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''ان میں سے کچھ خاندان خانہ بدوش ضرور ہوں گے لیکن ان میں سے اکثر وہی لوگ ہیں جنہوں نے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے راجپوت بستی پر حملہ کیا اور اسے تہس نہس کر دیا تھا۔''

''کیا مطلب ہمایوں بھائی؟''

''یہ انہی بے رحم لوگوں کی نسل ہے عادل! تمہیں سارا واقعہ معلوم ہی ہے۔ ہندو سردار وشوا ناتھ نے قبیلے کی ایک لڑکی سے زبردستی شادی رچانا چاہی تھی۔ راجپوت سرتاپا مزاحمت بن گئے تھے۔ کچھ نیک دل مسلمانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا مگر ہندو سالار کی طاقت کے سامنے ان کی پیش نہیں چلی تھی۔ وہ سب ملیامیٹ ہو گئے تھے۔''

''ہاں، میں نے یہ سارا واقعہ سنا ہوا ہے لیکن...... ہمایوں بھائی...... تم سے اور تمہاری اداسی سے اس کا کیا تعلق؟''

ہمایوں کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ وہ عجیب انداز میں بولا۔ ''میرا تعلق کیوں نہیں ہے؟ میرا تعلق ہے...... وہ...... وہ میری ہی کچھ لگتی تھی جس نے...... جس نے......'' بولتے بولتے اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ چپ ہو گیا۔ اس کے سارے جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔ پھر وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگا۔ اس نے اپنا سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں میں چھپا لیا۔ عادل ہکا بکا تھا۔ وہ عجب جذباتی انداز میں بولا۔ ''وہ میری ہی کچھ لگتی تھی جس نے...... اپنے دو سال کے بیٹے کو گلے سے لگا لگا کر چوما تھا اور پھر روتی ہوئی...... اور چلاتی ہوئی...... اور اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی تھی...... آگ میں کودنے کے لیے، جل

مرنے کے لیے...... اور وہ مر گئی تھی، بہت سی دوسری لڑکیوں اور عورتوں سمیت مر گئی تھی۔ اس کی آخری آوازیں اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں، میری روح میں چھید کرتی ہیں۔ وہ اپنے خاوند سے کہہ رہی تھی...... میرے بچے کا دھیان رکھنا، اس کے دودھ کا دھیان رکھنا...... اور اس کی دوائی کا...... اور اسے بہت پیار دینا۔ یہ میری نشانی ہے تمہارے پاس۔

''اور وہ چلی گئی تھی اور ایک دن بعد وہ بھی چلا گیا تھا جسے وہ نشانی سونپ کر گئی تھی۔ وشوا ناتھ کے سپاہیوں سے لڑتے لڑتے اس نے بھی جان دے دی تھی۔''

وہ گھٹنوں میں سر دیے سسکتا رہا۔ سناٹے میں اس کی آواز پھیلتی اور درد کو بڑھاتی رہی۔ دور کیمپ کے اندر موسیقی کی لہریں ڈوبتی اور ابھرتی رہیں۔ الاؤ کی سرخ روشنی دکھائی دیتی رہی۔ عادل بخوبی جانتا تھا کہ ہمایوں کا اشارہ کس واقعے کی طرف ہے۔ وہی سانحہ جب بہادر راجپوتوں نے اپنی عزت آبرو بچانے کے لیے اپنی نوجوان عورتوں کو آگ میں ڈال دیا تھا اور خود سر ہتھیلیوں پر رکھ کر لڑنے کے لیے نکل پڑے تھے۔

ایک دم عادل کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ ہمایوں کے پاس انگریزی زبان کی جو تاریخی کتاب ہے اس میں بھی ایک بڑے الاؤ کا اسکیچ ہے اور کل رات بھی اس نے ہمایوں کو اسی اسکیچ کو دیکھتے اور اشک بار ہوتے پایا تھا۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ پھر ایک اور بات عادل کو یاد آئی اور وہ مزید حیران ہوا۔ اس کی معلومات کے مطابق ہمایوں بھی راجپوت تھا۔ تو کیا...... کسی طور اس کا نسب انہی راجپوتوں سے جا ملتا تھا جو وشوا ناتھ سے لڑ مرے تھے؟

عادل کے ذہن میں اٹھنے والے خیالات جیسے ہمایوں نے پڑھ لیے۔ بالکل ٹیلی پیتھی جیسا عمل جو اکثر ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمایوں نے اپنا سر گھٹنوں پر سے اٹھایا۔ ٹانگیں سیدھی کیں اور ایک بار پھر پتھر سے ٹیک لگا لی۔ دور خلا میں دیکھتے ہوئے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایسا مت کہو عادل کہ میرا تعلق نہیں...... میری رگوں میں اسی راجپوت قبیلے کا خون ہے۔ جو چند بچے اور لڑکے کسی طرح بچ رہے تھے، وہ پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ پھر ایک اور راجپوت قبیلے نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ وہ بڑے ہوئے، ان کی شادیاں ہوئیں۔ نسل آگے چلنے لگی۔ چند نسلوں بعد کئی خاندان آباد ہو گئے۔ اورنگ زیب سے بعد کے زمانے میں کچھ خاندانوں نے اسلام قبول کر لیا اور

چترال وغیرہ کی طرف نکل گئے۔ میں نے اپنی ساری خاندانی تاریخ پڑھی ہوئی ہے عادل! اور میری یہی باخبری ہے جو مجھے ہمیشہ سے بے قرار رکھتی ہے۔ میرے بڑوں کے قاتل انہی پاؤندوں میں سے ہیں...... میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری رگوں میں انگارے سے جلنے لگتے ہیں۔'' عادل حیران تھا۔ اس نے یہ واقعہ سنا ہوا تھا لیکن یہ تو اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مرمٹنے والے اسی راجپوت قبیلے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بھی اسے کبھی ملے گا۔ وہ خود کو ان کی اولاد بتائے گا۔

عادل نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمایوں بھائی! یہ بہت پرانی باتیں ہیں اور سچ یہ ہے کہ میں اس بارے میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔''

وہ بدستور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ انسان کے خون میں ہوتا ہے، وہ ایک کے بعد دوسری نسل کی طرف چلتا رہتا ہے۔ ایک نسل اپنی آنے والی نسل کو اپنا غصہ، اپنا پیار، اپنا انتقام اور اپنے ادھورے کام...... بہت کچھ دیتی ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ کسی شخص کو کوئی الہام قسم کی چیز ہوئی اور...... اس نے اپنے دادا یا پردادا...... وغیرہ کا کوئی چھوڑا ہوا کام مکمل کیا۔ کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم ہے ہمایوں بھائی! میں بہت پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ ایسی باریکیاں میری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔''

''تم زیادہ پڑھے لکھوں سے کہیں زیادہ سوچ سکتے ہو اور اچھا سوچ سکتے ہو۔'' ہمایوں نے اس کی تعریف کی۔ پھر دوبارہ گہری سوچ میں گم ہو کر بولا۔ ''عادل! میں تمہیں اپنے دل کی باتیں بتا رہا ہوں اور پوری سچائی سے بتا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہر وقت میرے ارد گرد رہتا ہے، مجھے اپنی مظلومیت کے بارے میں بتاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے خون کو رائگاں نہ جانے دوں کیونکہ جب خون رائگاں جاتا ہے تو پھر انسانیت بھی رائگاں ہونے لگتی ہے۔''

برفانی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی لیکن وہ دونوں سرمد صاحب کی صحبت میں رہ کر سردی گرمی و بھوک پیاس کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ یہ چیزیں اب ان پر کچھ خاص اثر نہیں کرتی تھیں۔ خاص طور سے ہمایوں تو ایک بالکل مختلف سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں اپنا بھاری بھرکم جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور وہی کتاب نکال لی جسے وہ اکثر دیکھتا تھا۔ اس نے عادل کو پنسل ٹارچ روشن کرنے کا اشارہ کیا۔ عادل نے ٹارچ روشن کی۔ ہمایوں

نے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، ایک آرٹیکل نکالا۔ آرٹیکل کا عنوان کچھ اس طرح تھا۔ کے ٹو کے دامنوں میں دو ہزاری سردار وشوا ناتھ کی ظلم کہانی۔ اس آرٹیکل میں کچھ نفیس پنسل اسکیچز بھی تھے۔ ان میں وہ الاؤ والا اسکیچ بھی تھا۔ کچھ مناظر جنگ و جدل کے تھے۔ ایک منظر میں ایک جواں سال عورت اپنے دو ڈھائی سال کے بچے کی طرف بازو پھیلا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ چند بڑی عمر کی عورتیں جواں سال عورت کو کھینچ کر بچے سے دور لے جا رہی تھیں۔ ان عورتوں کے چہرے بھی الم کی تصویر تھے۔ بچہ اور بچے کا والد بھی رو رہے تھے۔

ہمایوں نے کہا۔ ''دیکھو اس عورت کو۔ یہ میری کچھ تو لگتی تھی نا۔ میری دادی کی دادی یا پھر اس کی دادی یا پڑدادی لیکن یہ ہے تو میرا ہی خون۔ اس کا چہرہ دیکھو، اس کا غم اور بے بسی دیکھو۔ عادل! آخر کیوں ہوتے ہیں ایسے ظلم؟ کیوں جنگ کے نام پر بہادر سورما ہمیشہ سے عورتوں کو پامال کرتے رہے ہیں؟ میں جب بھی اس عورت کو دیکھتا ہوں عادل! مجھے لگتا ہے...... یہ یہیں کہیں میرے آس پاس موجود ہے۔ ایک روح کی طرح بھٹک رہی ہے۔ مجھے کہہ رہی ہے...... تو جو بھی ہے، جس مذہب سے بھی ہے، جس خاندان سے بھی ہے، تو میرا بچہ ہے...... تیری ماں کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔ انہی پاؤندوں نے کیا تھا۔ ہم امن سے رہ رہے تھے۔ ہماری کھیتیاں ہری تھیں۔ ہماری گلیوں میں ہمارے بچوں کی چہکاریں گونجتی تھیں۔ ہم کسی کے دشمن نہیں تھے۔ ہم پر بے وجہ زندگی کے دروازے بند کیے گئے۔ ہمیں بے بس کیا گیا۔ اس حد تک مجبور کیا گیا کہ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لینا کوئی آسان ہوتا ہے میرے بچے؟ اس ظلم کو بھول نہ جانا۔ ہمیں فراموش نہ کر دینا...... ہاں عادل! یہ تصویر کہتی ہے مجھ سے...... یہ کہتی ہے۔''

عادل نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''لیکن...... ہمایوں بھائی...... یہ بات تو آپ مانو گے نا...... کہ یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔''

وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ ''باتیں پرانی ہو چکی ہیں لیکن بدلا کچھ نہیں ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں۔ ان کی رگوں میں وہی بے رحم خون لہریں لے رہا ہے۔ ان کو جب بھی موقع ملے گا پھر ایسی ہی درندگی دکھائیں گے۔ پھر میری ماں کو اس حد تک مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنے روتے بلکتے بچے کو چھوڑ کر آگ میں کود جائے۔ اپنے ہنستے بستے گھر کو الوداع کہہ دے۔ یہ پھر اسے مجبور کر دیں گے۔'' وہ جیسے نیم

دیوانگی کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس کی انگلیاں بے ساختہ عورت والے اسکیچ پر گردش کررہی تھیں۔

عادل نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہمایوں بھائی! یہ عورت بے شک تمہارے آباؤ اجداد میں سے ہے لیکن تمہاری ماں تو نہیں ہے نا۔ تم......“

”ماں نہیں ہے...... ماں نہیں ہے۔“ اس نے پھر تیزی سے عادل کی بات کاٹی۔ ”لیکن ماں جیسی تو ہے نا اور مائیں سب ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ ان کے سینوں میں ایک ہی طرح کے دل دھڑکتے ہیں۔ ٹھہرو، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ دکھاتا ہوں میں تمہیں۔“

اس نے ایک بار پھر اپنی جیکٹ کے اندرونی حصے میں ہاتھ گھمایا اور اپنا چرمی پرس نکال لیا۔ پرس کے بیرونی خانے میں ایک جواں سال عورت کی تصویر تھی۔ وہ سر پر پھول دار اوڑھنی لیے اپنے تین بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ عادل نے پنسل ٹارچ کی روشنی میں فوراً پہچان لیا۔ ان میں سے سات آٹھ سالہ ایک بچہ یقیناً ہمایوں تھا۔ وہ بولا۔ ”دیکھو، یہ ہے میری ماں...... اور یہ ہے اس اسکیچ میں دوسری ماں۔ کیا تمہیں ان کی شکلیں ملتی ہوئی نہیں لگتیں؟ ان کی آنکھیں، ان کے ہونٹ...... ان کے سینے، ممتا کے جذبے سے بھرے ہوئے، اپنی اولاد پر سب کچھ قربان کردینے کے جذبے سے سرشار۔ یہ دونوں مائیں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک اپنی طبعی موت مری لیکن دوسری کی موت طبعی نہیں تھی۔ وہ جوان تھی، تندرست تھی۔ ابھی تو اس نے بس جینا شروع کیا تھا...... اسے مجبور کیا گیا کہ وہ موت کو گلے لگائے...... ہاں دیکھو اس کو غور سے، یہ میری ماں نہیں تھی لیکن ماں جیسی تو تھی۔“

عادل واقعی حیران ہوا۔ دونوں عورتوں کے خدوخال اور ڈیل ڈول میں بہت مماثلت تھی۔ ظاہر ہے دونوں ایک ہی نسل اور لڑی کی عورتیں تھیں۔

اچانک عادل کو اپنی پنسل ٹارچ بجھانا پڑی۔ اسے شک ہوا تھا کہ کوئی ان پتھروں کی طرف آرہا ہے۔ اگلے دو تین منٹ میں یہ شک درست ثابت ہوگیا۔ قدموں کی آہٹ واضح ہوئی۔ پھر دو ہیولے نظر آئے۔ یہ ایک لڑکی لڑکا تھے۔ عادل اور ہمایوں بے حس و حرکت اس سات آٹھ فٹ اونچے پتھر کی اوٹ میں بیٹھے رہے۔ لڑکی لڑکا انگریز تھے اور نشے میں مست دکھائی دیتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ لڑکی نے کسی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا، جواب میں لڑکا بھی ہنسا اور انگلش میں بولا۔ ”اب کتنی دور جاؤ گی؟ کوئی بھیڑیا کھا جائے گا تمہیں۔“

”بھیڑیا تو میرے ساتھ ہی ہے۔“ لڑکی نے شرارت سے کہا۔

”اوہ یو بچ۔“ لڑکے نے بہکی آواز میں کہا اور لڑکی پر چڑھ دوڑا۔ دونوں ایک پتھر کی اوٹ میں گرے اور ہم آغوش ہونے لگے۔ لڑکی کی مدھم ہنسی ڈوبنے ابھرنے لگی۔

عادل سناٹے میں تھا۔ اس نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ لیوپڈ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ لڑکی کی آواز بھی عادل کے لیے اجنبی نہیں تھی...... یہ لارڈ اوٹس ماؤنٹے کی نوجوان بیٹی ڈوروتھی تھی۔ وہی اونچی ناک اور بڑی آن بان والا لارڈ اوٹس۔

پتھر کے پیچھے شراب بولتی رہی اور جسم کی بھوک ناچتی رہی۔ الکحل نے شاید ان دونوں کے بدن میں آگ بھڑکا رکھی تھی۔ ورنہ یہ سردی اور یہ کھلا آسمان اس قسم کی مصروفیت کے لیے ہرگز موزوں نہیں تھا۔ ایک بار تو عادل کا دل چاہا کہ وہ لیوپڈ کے سر پر پہنچ جائے اور اس کو ایک زوردار ٹانگ جما کر کہے۔ ”بدبخت! تو تو کرسٹل سے محبت کا دعویدار ہے۔ یہاں اس حرافہ کے ساتھ لیٹ کر اس محبت کی شان میں کون سا اضافہ فرما رہا ہے۔“ لیکن پھر اس نے ضبط کیا اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ دور کیمپ میں ابھی تک گٹار اور ڈرم بج رہے تھے۔ نہ جانے پتھر کے پیچھے حرص و ہوس کا مکروہ کھیل کب تک جاری رہتا لیکن پھر دو تین اور بدمست نوجوان وہاں پہنچ گئے۔ دور سے انہوں نے لیوپڈ کا نام لے کر آوازیں دیں۔ عادل اور ہمایوں کو لیوپڈ کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ان باسٹرڈز کو بھی ابھی آنا تھا۔“

چند سیکنڈ بعد لیوپڈ اور ڈوروتھی کے ہیولے نظر آئے۔ انہوں نے اپنے لباس درست کیے اور واپس تودوں اور پتھروں کے پیچھے اوجھل ہوگئے۔

اب ہوا کے جھکڑ تیز ہوگئے تھے۔ ان دونوں نے بھی گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا مناسب سمجھا۔ ہمایوں نے مڑ کر دیکھا۔ کیمپ میں الاؤ کی روشنی اب بالکل ماند پڑ چکی تھی۔ اس صورت حال نے اس کی بے قراری میں کمی واقع کی۔ وہ دونوں اٹھ کر خیموں کی طرف چل دیے۔

صبح بہت چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ برفانی پہاڑوں کا یخ بستہ اندھیرا دھیرے دھیرے اجالے میں ڈھل رہا تھا۔ کیمپ میں سب سے پہلے جاگنے والے عام طور پر ہرمز صاحب، عادل اور ہمایوں وغیرہ ہی ہوتے تھے۔ ہرمز صاحب تو اپنی ٹانگ کی وجہ سے صبح کی دوڑ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، تاہم کرسٹل، عادل اور ہمایوں یہ روٹین بحال رکھے ہوئے تھے۔ آج عادل زیادہ ہی جلدی اٹھ گیا۔ اس

نے ٹینٹ کے روزن سے cover ہٹا کر باہر جھانکا۔ شفاف آسمان پر سفید بادل کا ایک ٹکڑا تیر رہا تھا۔ ٹکڑے نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی شکل بدلی اور کسی ایسی دوشیزہ کی طرح دکھائی دینے لگا، جس کے کھلے بال تیز ہوا میں لہرا رہے ہوں۔ نہ جانے کیوں عادل کو یکایک شہزادی یاد آگئی۔ تایا کے باغ میں پیش آنے والے واقعات عادل کے ذہن پر نقش ہوچکے تھے۔ وہ منظر اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا، جب وہ احاطے میں داخل ہوا تھا اور شہزادی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے حسین بال ایسے ہی ہوا میں حرکت کررہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے تو بالکل یہی لگا تھا کہ وہ سب کچھ بھول بھال کر عادل کی طرف لپکے گی اور اس کے سینے سے لگ جائے گی اور شاید اس نے اپنی جگہ سے ذرا سی حرکت بھی کی تھی لیکن پھر زمانہ دیوار بن گیا تھا اور وہ جیسے کسی حسین سپنے سے ایک دم جاگ اٹھی تھی۔

عادل کو آج کل دن رات اس کی فکر کھائے جاتی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں لالی اور پال پورگاؤں میں کیا ہورہا ہے...... اور کون کررہا ہے۔ یکایک وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ ٹینٹ سے باہر کرسٹل کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو عادل! ٹائم ہوگیا۔ توم جاگ جاؤ۔“

عادل نے ہمایوں کو جگایا اور خود بھی جیکٹ پہنتا ہوا ٹینٹ سے باہر آگیا۔ جوگرز اس کے ہاتھ میں تھے۔ کرسٹل اب ایک دو روز سے بہتر لباس میں نظر آرہی تھی۔ چست پتلون کی جگہ بھی اب ”ٹیکی ٹائپ“ ٹراؤزر نے لے لی تھی۔ عادل بولا۔ ”کرسٹل! میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میں نے الارم لگایا ہوتا ہے، تم فکر نہ کیا کرو۔“

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ”ہام فکر کیوں نہ کرے۔ ہام کا سارا ہوپ توم ہی تو ہو۔ توم ہی ہو جو ہام کی لائف کو لیوپڈ والی ولدل سے نکال سکتے ہو۔“

عادل نے جوگرز پہنتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا کام تو دل و جان سے کوشش کرنا ہوتا ہے کرسٹل۔ کامیابی اور ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

”شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل گاڈ پر ہام کا ٹرسٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ ہام نے کل ”ایوننگ“ میں توم کے طریقے کے مطابق پوجا بھی کیا۔“

”خدا کا خوف کرو۔ اسے پوجا نہیں...... عبادت کہتے ہیں...... نماز کہتے ہیں۔“

”سوری...... سوری۔ ہام نے غلط بولا۔ ہام مانے مانگتا۔“

”اب پھر غلط بول رہی ہو۔ تمہارا کچھ نہیں ہوسکتا۔“ عادل نے کہا۔

اس دوران میں ہمایوں بھی ٹینٹ سے باہر آگیا۔ پورا کیمپ سو رہا تھا۔ رات کو جو الاؤ بھڑکایا گیا تھا، وہ ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ کوئلوں اور راکھ کے چاروں طرف وسکی اور واڈکا کی خالی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں باربی کیو کی ہڈیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ انگریز فیملیز کے خیموں سے باہر گارڈز پہرا دے رہے تھے۔

ایک گارڈ ٹہلتا ہوا ان کے پاس آیا اور اس نے کرسٹل سے انگلش میں پوچھا۔ ”میم، کچھ پتا چلا ان لوگوں کا؟“

”کن لوگوں کا؟“ کرسٹل نے غیر ملکی گارڈ سے الٹا سوال کیا۔

”آپ کو پتا نہیں...... رات کو کیا خبر پھیلی تھی؟“

”نہیں۔“

غیر ملکی گارڈ مؤدب انداز میں بولا۔ ”گلیشیر کی طرف کچھ مقامی لوگ دیکھے گئے تھے...... ان کا رخ ادھر نوبل راک کی طرف تھا۔“

”ہوسکتا ہے کہ کوہ پیما ہوں۔“ ہمایوں نے کہا۔

”نہیں سر۔ ان کے پاس شاید ہتھیار وغیرہ بھی ہیں۔“

”تو شکاری ہوسکتے ہیں۔ نیچے گلیشیر کی طرف شکار وغیرہ مل جاتا ہے۔“

گارڈ بولا۔ ”رات تو ہم پریشان ہوگئے تھے کہ کہیں فنکشن ہی خراب نہ ہوجائے لیکن تھینکس گاڈ... خیریت گزری۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں یا پھر انفارمر کو ہی غلطی ہوئی ہو۔“

کچھ دیر بعد عادل، ہمایوں اور کرسٹل جاگنگ کے لیے روانہ ہوگئے۔ انہوں نے گارڈ کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر وہ جانتے نہیں تھے کہ یہ بہت اہم اطلاع ہے اور اس اطلاع کے حوالے سے وہ سنگین صورت حال کا شکار ہونے والے ہیں۔ سنگین اور بالکل غیر متوقع۔

انہوں نے کیمپ کے آس پاس ایک نیم دائرے کی شکل میں جاگنگ کی اور دوڑ لگائی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل مشقت نے یخ بستہ ٹھنڈ میں بھی انہیں پسینے سے شرابور کردیا۔ کرسٹل اور ہمایوں ایک جگہ دم لینے کے لیے بیٹھ گئے۔ مگر عادل مسلسل بھاگتا رہا۔ ہر روز اپنی جان پر کچھ مزید ستم ڈھانا اور اپنے اسٹیمنا کو کچھ اور بڑھانا اس کی ہابی بن چکا تھا۔ وہ ہمایوں اور کرسٹل سے قریباً دو فرلانگ دور تھا اور یہ جگہ ڈھلوان پر تھی، اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اسے سفید برف پر کچھ لوگ حرکت کرتے دکھائی دیے۔ وہ اس کی

طرف بڑھ رہے تھے۔ عادل کے پاس ٹیلی اسکوپ نہیں تھی ورنہ وہ مزید وضاحت سے انہیں دیکھ سکتا۔ وہ غور ہی کر رہا تھا جب اسے بائیں جانب برفیلے تودوں کے پیچھے سو ڈیڑھ سو فٹ کی دوری پر آہٹیں سنائی دیں۔ اسے خطرے کا احساس ہوا اور وہ پلٹا...... لیکن اس کے لیے شاید اب دیر ہو چکی تھی۔ وہ پندرہ بیس قدم ہی دوڑا تھا کہ ایک تودے کے عقب سے للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ، گولی چلا دوں گا۔“

عادل ٹھٹک کر رک گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تودوں اور پتھروں کے پیچھے سے چار افراد نکل کر سامنے آگئے۔ انہوں نے شلوار قمیص پر بھاری بھرکم جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ ان کے چہرے گرم ٹوپیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ صرف ایک بندہ شلوار کے بجائے پتلون میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی روسی رائفل صاف نظر آرہی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد وہ لوگ عادل کے سر پر پہنچ گئے۔ شلوار قمیص والے ایک شخص نے عادل کے سامنے پہنچ کر اپنے سر پر سے ٹوپی ہٹائی، اس کا چہرہ دیکھ کر عادل سکتے میں رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس شخص کو یہاں دیکھے گا...... اس کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی...... اس کے سامنے چند فٹ کی دوری پر شہزادی کا بڑا بھائی قاسم کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکلنے لگے تھے۔ وہ پھنکارا۔ ”امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی، تمہاری یہ لعنتی صورت دیکھنے کو مل جائے گی۔“

عادل خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہیں۔ قاسم نے پھر زہر فشاں لہجے میں کہا۔ ”حیران کیوں ہو گیا ہے عادے؟ تو کیا سمجھتا تھا، بہت دور نکل آیا ہے۔ اب کوئی تجھ تک پہنچ نہیں سکے گا؟“

”میں واقعی حیران ہوں۔“ عادل دھیمے لہجے میں بولا۔

قاسم تیزی سے آگے آیا۔ اب اس کے ہاتھ میں بھی رائفل نظر آرہی تھی۔ اس نے رائفل کی سرد نال عادل کی گردن پر ٹھوڑی کے نیچے لگائی اور اسے اتنی وحشت سے دبایا کہ وہ گردن میں گھستی محسوس ہوئی۔ ”کہاں ہے میری بہن؟“ قاسم نے بے حد خطرناک لہجے میں سوال کیا۔

اب یہ عادل پر حیرت کا دوسرا شدید حملہ تھا۔ وہ گردن پر نال کا دباؤ کم کرنے کے لیے ذرا سا پیچھے ہٹا اور بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ شہزادی سے......“

عادل کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی قاسم نے رائفل گھما کر عادل کی کنپٹی پر رسید کی۔ وہ لہراتا ہوا برف پر گرا۔ قاسم نے رائفل کی نال اس کے سینے پر رکھ دی اور اسی لہجے میں بولا۔ ”میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ میں اسی جگہ تجھے مار دوں گا کتے۔ مجھے بتا کہاں ہے میری بہن؟“ وہ چنگھاڑا۔

عادل کی آنکھوں کے سامنے ایک برق سی لہرا گئی۔ ان لمحوں میں وہ سمجھ گیا کہ وہاں گاؤں میں وہ کون سا غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا جس کے بعد وہاں تہلکہ مچ گیا تھا اور تایا کے کارندوں نے ہر طرف بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔ شہزادی...... ہاں شہزادی کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا۔ اگر ہو گیا تھا تو اس نے نہیں کیا تھا۔ پھر کس نے کیا تھا؟ اس کے سینے میں آتش سی دہکنے لگی۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ”کیا ہوا ہے شہزادی کے ساتھ؟“

قاسم نے اندھا دھند اس کی پسلیوں میں ٹھوکر لگائی اور چنگھاڑا۔ ”اوئے کتے کی اولاد! مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ بتا مجھے کہاں ہے وہ؟ نہیں تو اسی تھان تجھے ٹھنڈا کر دوں گا۔“

گالی نے عادل کے سینے میں بھڑکتی آگ کو کچھ اور بلند کیا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ ایک بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ اسی طرح لیٹے لیٹے بولا۔ ”قاسم! شہزادی میرے پاس نہیں ہے، میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے......“ اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ قاسم اور اس کے ساتھی وحشیوں کی طرح اس پر پل پڑے۔ رائفلوں کے کندے، ٹھوکریں، گھونسے بے دریغ اس پر برسائے جانے لگے۔ ایک بار پھر یہ ویسا ہی منظر تھا جیسا تایا کے باغ والے احاطے میں پیش آیا تھا۔

لیکن اس بار عادل مار کھانے اور ذلت سہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سینے میں دھماکے سے ہوئے اور وہ پوری طاقت کے ساتھ پلٹ پڑا۔ اس کے سر کی زوردار ٹکر نے قاسم کے ساتھی کو رائفل سمیت نیچے نشیب میں لڑھکا دیا۔ قاسم نے لاٹھی کی طرح رائفل کو استعمال کیا اور اس کے سر کو نشانہ بنانا چاہا، عادل نے جھک کر یہ وار بچایا اور جوابی گھونسے سے قاسم کا چوڑا تھوبڑا رنگین کر دیا۔ ایک فربہ اندام شخص نے عادل کو عقب سے اپنے بازوؤں کے آہنی شکنجے میں لے لیا۔ یہی وقت تھا جب عادل کی نگاہ قدرے بلندی پر ہمایوں پر پڑی۔ اس نے سب دیکھ لیا تھا اور تیزی سے عادل کی مدد کو آرہا تھا۔ وہ کبھی بھاگتا اور کبھی برف پر سلائڈ کرتا ہوا آناً فاناً موقع پر پہنچ گیا۔ وہ ایک جی دار ساتھی تھا اور اس نے یہاں یہ جی داری ثابت کی۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں عادل اور ہمایوں نے ڈٹ کر ان چار

افراد کا مقابلہ کیا لیکن وقت ان کے خلاف جا رہا تھا۔ قاسم کے مزید ساتھی جو فاصلے پر تھے، بڑی تیزی سے ان کی طرف آرہے تھے۔ وہ پہنچ جاتے تو پھر ان لوگوں کا پلڑا بہت بھاری ہو جاتا تھا...... اور وہ بس پہنچا ہی چاہتے تھے۔

قاسم کے فربہ اندام ساتھی کے ہاتھ میں اب تیز دھار چاقو نظر آرہا تھا۔ یہ فربہ اندام شخص دراصل وہی ملازم انور تھا جس نے گاؤں میں یہ جھوٹ بولا تھا کہ عادل اسے گن پوائنٹ پر باغ والے احاطے میں لایا تھا اور احاطے کا دروازہ کھلوایا تھا۔ اب اس شخص کی بدقسمتی ہی تھی کہ وہ ان نازک لمحوں میں عادل کے سامنے آگیا تھا، اس نے عادل پر چاقو کے دو اندھا دھند وار کیے۔ عادل نے دائیں بائیں جھک کر یہ وار بچائے۔ اس کی چیتے جیسی سبک کمر اس کی بے پناہ پھرتی میں اس کی معاون تھی۔ فربہ اندام انور کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کا بازو عادل کی آہنی گرفت میں چلا گیا۔ عادل نے یہ بازو وحشت سے مروڑا کہ اس کے ٹوٹنے کی آواز دور تک سنائی دی۔ انور بھیانک آواز میں چلایا۔ اس کا چاقو اب عادل کے ہاتھ میں تھا۔ ایک شخص نے عادل پر سیدھا فائر کیا۔ سیون ایم ایم کا یہ فائر عادل کے کندھے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ قاسم کے باقی ساتھی اب بس پہنچنے ہی والے تھے۔ عادل نے ہوا میں جست کی اور سیدھا قاسم پر آیا جو اپنی گری ہوئی رائفل اٹھانے کے لیے لپک رہا تھا۔ عادل نے کسی جنگلی چیتے ہی کی طرح اسے عقب سے دبوچا اور چاقو کا پھل اس کی شہ رگ سے لگا دیا۔

”خبردار...... خبردار!“ وہ دہاڑا۔ ”کوئی آگے نہ آئے۔“

قاسم کے تازہ دم ساتھیوں کے تیور بہت خطرناک تھے لیکن قاسم کو عادل کے شکنجے میں دیکھ کر وہ جہاں کے تہاں رک گئے۔ عادل کسی جونک کی ہی طرح قاسم سے چمٹ گیا تھا اور اسے کسمسانے کی گنجائش بھی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر دہاڑا۔ ”کوئی آگے بڑھا تو کاٹ دوں گا اسے...... کاٹ دوں گا۔“

وہ واقعی مارنے اور مر جانے کے موڈ میں تھا۔ ہمایوں نے لپک کر قاسم کی گری ہوئی رائفل اٹھائی اور الٹے قدموں چل کر عادل کے شانہ بشانہ کھڑا ہو گیا۔ فربہ اندام انور...... کا بازو اس بری طرح ٹوٹا تھا کہ ٹوٹی ہوئی ایک ہڈی اس کی جیکٹ کی آستین پھاڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ لہو کے قطرے سفید برف پر گر رہے تھے۔

قاسم کے بعد میں آنے والے ساتھیوں میں دراز قد ناصر کو عادل نے صاف پہچان لیا۔ اسے دیکھتے ہی عادل کے غیظ و غضب میں اضافہ ہو گیا۔ وہ تنومند قاسم کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا چند قدم مزید پیچھے لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمایوں سے کہا۔ ”واکی ٹاکی ہے نا تمہارے پاس؟ کال کرو سرمد صاحب کو۔“

ہمایوں نے ایک ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالا اور واکی ٹاکی نکال لیا لیکن کال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ قاسم کے بعد میں آنے والے ساتھیوں سے ایک غلطی ہو چکی تھی۔ چند منٹ پہلے انہوں نے عادل اور ہمایوں کو ڈرانے کے لیے کئی ہوائی فائر کر دیے تھے۔ اس فائرنگ کی آواز کیمپ تک پہنچ چکی تھی۔ عادل نے مڑ کر دیکھا، اوپر بلندی پر برف کی سفید چادر تھی اور اس چادر پر حرکت کرتے ہوئے درجنوں افراد تیزی سے نیچے آرہے تھے۔ یہ ان کے کیمپ کے لوگ تھے۔

اگلے تین چار منٹ کافی تناؤ والے تھے۔ قاسم، عادل کی نہایت سخت گرفت میں تھا۔ پھل دار چاقو اس کی چربی دار گردن سے لگا ہوا تھا۔ عادل اپنے ہاتھ کا دباؤ ذرا سا بڑھاتا تو شہ رگ کٹنے کا عمل شروع ہو سکتا تھا۔ وہ بار بار قاسم کے ساتھیوں کو خبردار بھی کر رہا تھا کہ ان کی کسی مہم جوئی کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ دراز قد ناصر کو دیکھنے کے بعد عادل کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا اور اس کا دیوانگی آمیز لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔ قاسم اس کا تایا زاد تھا لیکن فی الوقت وہ صرف اور صرف ایک دشمن تھا...... جس سے رعایت کرنے کا مطلب، خود کو موت کے منہ میں دھکیلنا تھا...... اور پھر عادل اور ہمایوں کے مددگار پہنچ گئے۔ یہ کیمپ کے درجنوں ملکی اور غیر ملکی گارڈز تھے۔ دیگر لوگ بھی تھے جن میں لارڈ اوٹس اور کرسٹل وغیرہ بھی تھے۔

صورت حال بھانپنے کے بعد گارڈز نے ناصر اور اس کے قریباً ایک درجن ساتھیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک دو منٹ کے اندر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے پاس پانچ عدد رائفلیں تھیں جن میں سے ایک پہلے ہی ہمایوں کے قبضے میں آچکی تھی۔ باقی ہتھیاروں میں دو پستول اور دو چاقو شامل تھے۔ رائفلوں کے کم و بیش ڈیڑھ ہزار راؤنڈز بھی برآمد ہوئے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ بڑی تیاری سے یہاں پہنچے ہیں۔ ان کے ساتھ بشارت اور مدثر نامی دو ماہر گائڈ بھی تھے۔

انور کا بازو اس بری طرح ٹوٹا تھا کہ اب وہ تکلیف کی شدت سے نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے ایک ٹٹو پر بٹھا کر کیمپ پہنچایا گیا۔ باقی لوگ رائفلوں کے نرغے میں پا پیادہ

پہنچے۔ ان میں سے قاسم اب بھی غیظ وغضب کا مظاہرہ کررہا تھا اور عادل کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ عادل کی درخواست پر لارڈ اوٹس نے قاسم کے ہاتھ پشت پر بندھوا دیے تھے۔

کیمپ میں سرمد صاحب بڑی بے قراری سے ان کا انتظار کررہے تھے۔ وہ ناصر اور قاسم کو شکلوں سے جانتے تھے۔ انہیں یہاں اس برف زار میں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ عادل اور ہمایوں نے سرمد صاحب کو مختصر الفاظ میں سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یقیناً یہ سب کچھ سرمد صاحب کے لیے بھی حیران کن تھا۔ خاص طور سے جو کچھ شہزادی کے حوالے سے کہا گیا تھا، وہ تو ناقابلِ یقین تھا۔

''شہزادی والی بات تو بالکل سمجھ میں نہیں آرہی۔'' ہمایوں نے کہا۔

''لیکن میری سمجھ میں اب آنے لگی ہے۔'' عادل نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''مالکانے زادہ؟'' سرمد صاحب نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''جی سر! اسی خبیث نے پہلے لاہور سے صادق کو اٹھایا اور پھر اس کی مدد سے میرے گاؤں تک اور ماموں طفیل کے گھر تک پہنچا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ صادق کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا؟''

''سو فیصد جناب...... اور پھر گاؤں پہنچنے کے لیے اس نے صادق والا لوڈر ہی استعمال کیا۔ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا تھا لیکن میں اسے نہیں ملا۔ اس نے ماموں طفیل کو شدید زخمی کیا۔ صادق سے ہی اسے معلوم ہوگیا ہوگا کہ شہزادی میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے اس نے شہزادی کو اٹھالیا۔''

قاسم کا شور شرابا بند کرنے کے لیے عادل نے اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اب وہ غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ سرمد صاحب کے اشارے پر ہمایوں نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ ایک بار پھر عادل کو گالیاں دینے اور چلانے لگا۔ ''عادے! تیرا انجام چنگا نہیں ہونا۔ کتے کی موت ماروں گا تجھے۔ یہ مت سمجھنا ہم اکیلے ہیں۔ اور لوگ بھی آرہے ہیں پیچھے...... پولیس بھی ہے۔ سرعام تجھے چھتر نہ لگواؤں عادے تو میرا نام قاسم نہیں۔''

عادل نے اس کے عین سامنے پہنچ کر اس کا گریبان پکڑا اور جھنجوڑ کر کہا۔ ''قاسو! مجھے تیرا کوئی ڈر نہیں...... کیونکہ تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میں اب بھی تجھ سے یہی کہہ رہا ہوں کہ مجھے شہزادی کا کچھ پتا نہیں۔ یہ کوئی اور ہے جس نے میرے یار صادق کو بھی غائب کیا ہے اور پھر اسی کے لوڈر (پک اپ) پر پنڈ بھی پہنچا ہے۔ اس نے شہزادی کو......''

''بکواس بند کر۔'' قاسم، عادل کی بات کاٹ کر چنگھاڑا۔ ''اپنی پلید زبان سے نام نہ لے میری بہن کا۔ میں کاٹ ڈالوں گا تیری یہ زبان...... کاٹ ڈالوں گا۔''

طیش کے عالم میں اس نے اٹھ کر عادل پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہمایوں نے اسے جھانپڑ رسید کیا۔ وہ اوندھے منہ برف پر جا گرا۔ ناصر اور اس کے دو تین ساتھیوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر گارڈز نے رائفلیں ان کے جسم سے لگا دیں اور انہیں جہاں کا تہاں روک دیا۔

اب تقریباً پورے کیمپ کے لوگ اس تماشے کے گرد جمع ہوچکے تھے۔ انگریز مرد و زن کے چہروں پر دلچسپی کے ساتھ ساتھ خوف آمیز بیزاری بھی موجود تھی۔ وہ یہاں تفریح کے لیے آئے تھے اور اس کے لیے کثیر زرمبادلہ خرچ کیا تھا۔ اپنی مصروفیات میں اس طرح کی سنگین دخل اندازی ان کے لیے نہایت پریشان کن تھی۔ کئی لوگ تشویش آمیز انداز میں اوٹس اور کرسٹل وغیرہ سے مختلف سوالات پوچھ رہے تھے۔ انگریز مہمانوں میں ایک سرجن بھی موجود تھا۔ انور کے ٹوٹے ہوئے بازو کی حالتِ زار دیکھ کر وہ اسے طبی امداد دینے کے لیے اپنے ٹینٹ میں لے گیا۔

قاسم تو بالکل ''ہائپر'' ہورہا تھا۔ اس سے کوئی ڈھنگ کی بات کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ عادل کے اشارے پر دو گارڈز نے ایک بار پھر اس کے منہ میں زبردستی کپڑا ٹھونس دیا اور اوپر سے ایک مفلر باندھ دیا۔

عادل دراز قد ناصر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ بانس کی طرح لمبا اور سخت تھا۔ شہزادی کے حوالے سے وہ اس کا رقیبِ روسیاہ تھا۔ وہ کئی بار عادل سے دشمنی لے چکا تھا لیکن آج عادل کا پلڑا بھاری تھا۔ وہ چاہتا تو کوئی ایسی صورتِ حال بھی پیدا کرسکتا تھا کہ ناصر کی جان ہی چلی جاتی لیکن وہ صاف ستھری لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ اپنی ہمت اور طاقت سے شہزادی کو جیتنے کا خواہش مند تھا۔ عادل نے ناصر سے پوچھا۔ ''چھوٹے چودھری! ابھی قاسم نے کہا ہے کہ کچھ اور لوگ بھی پیچھے آرہے ہیں، وہ کون ہیں؟''

ناصر خشک لہجے میں بولا۔ ''تیرے تایا صاحب ہیں...... اور ان کے کارندے ہیں، پولیس کے لوگ بھی ہیں۔ کئی درجن لوگ ہیں...... ان کے آنے پر تم نے

مشکل میں پڑ جاتا ہے۔'' ناصر کا لہجہ دھمکانے والا تھا۔

تایا فراست کی آمد کی اطلاع نے عادل کو حیران کیا۔ بہر حال وہ صاف محسوس کر رہا تھا کہ ناصر ہمیشہ کی طرح سچ نہیں بول رہا۔ انہیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

عادل نے تایا فراست کے کارندوں میں سے اس مشتاق نامی شخص کو منتخب کیا جس نے باغ والی لڑائی میں لیڈنگ رول ادا کیا تھا اور عادل کو برہنہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ عادل اسے گریبان سے دبوچ کر خیموں کے پیچھے لے گیا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سنگین لہجے میں مشتاق کو وارننگ دی کہ اگر اس نے سب کچھ صاف صاف نہیں بتایا تو وہ اسے اس بری طرح زخمی کرے گا کہ وہ اس ویرانے میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک جائے گا۔

مشتاق جانتا تھا کہ یہاں عادل پوری طرح حاوی ہے اور اپنی باغ والی بے عزتی کا پورا پورا بدلہ لے سکتا ہے۔ اس نے عادل کی آنکھوں میں اس کے سنگین ارادے پڑھ لیے اور سچ بولنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''تایا فراست والا گروپ واقعی چار پانچ میل پیچھے آ رہا ہے لیکن اس میں زیادہ بندے نہیں ہیں۔''

''کتنے بندے ہیں؟''

''چودھری صاحب کے علاوہ حویلی کے چار ملازم ہیں۔ تین بندے چودھری مختار کے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک گائڈ رشید خاں ہے۔''

''پولیس کے کتنے لوگ ہیں؟'' عادل نے پوچھا۔

''پولیس کے صرف دو کانسٹیبل ہیں اور وہ سادہ لباس میں ہیں۔''

''ہتھیار کتنے ہیں ان لوگوں کے پاس؟''

''میرا خیال ہے کہ دو رائفلیں اور ایک پستول ہے۔''

''کوئی واکی ٹاکی بھی ہے ان لوگوں کے پاس؟''

''آہو..... گائڈ رشید خاں کے پاس ہے واکی ٹاکی۔''

ابھی واکی ٹاکی کی بات ہی ہوئی تھی کہ واکی ٹاکی کا سگنل آ گیا۔ یہ سگنل گائڈ مدثر کے پاس موجود واکی ٹاکی پر آیا تھا۔ عادل نے مشتاق کی طرف سے توجہ ہٹائی اور گائڈ کے پاس پہنچ گیا۔ پستول ہمایوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے گائڈ مدثر کو وارننگ دی کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ مدثر نے واکی ٹاکی پر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف غالباً دوسرا گائڈ رشید خاں ہی تھا۔ وہ بولا۔ ''مدثر! بڑی خاص خبر ہے، کہاں ہو تم لوگ؟''

''ام چھوٹے گلیشیر سے دو ڈھائی میل آگے نکل آیا ہے۔ تم خیریت سے ہو؟''

''ہاں ایک دم خیریت ہے، تم قاسم یا ناصر صاحب سے بات کراؤ۔ چودھری فراست صاحب خود بات کریں گے۔''

مدثر نے عادل کی طرف دیکھا۔ عادل نے مدثر کو اشارہ کیا کہ وہ واکی ٹاکی ناصر کو تھما دے۔ قاسم شور مچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کپڑے کی وجہ سے آواز اس کے گلے کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ ''ہیلو کون؟'' دوسری طرف سے تایا فراست کی آواز سنائی دی اور عادل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''مم..... میں ناصر بول رہا ہوں تایا جی۔'' ناصر نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''پتر جی! بڑی خوشی کی خبر ہے۔ دھی رانی مل گئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ملی ہے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ قاسو کہاں ہے، اسے بلاؤ.....'' تایا فراست کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

دھی رانی سے تایا فراست کی مراد یقیناً شہزادی ہی تھی۔ ناصر اور قاسم وغیرہ تو ہکا بکا تھے ہی، عادل بھی ششدر تھا۔ واقعات تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔

ناصر نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''یہ کیسے ہوا تایا جی..... کہاں ہے شہزادی؟''

''میرے پاس ہی ہے۔ ابھی تو بس روندی ہی چلی جا رہی ہے۔ ہمارے سارے اندازے غلط نکلے ہیں ناصر پتر۔ یہ..... یہ اس عادے کا چکر نہیں تھا۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ تم لوگ آتے ہو تو بتاتے ہیں سب کچھ۔ قاسو کہاں ہے؟''

''قق..... قاسم ذرا پیشاب کرنے گیا ہے۔ ابھی آتا ہے۔'' ناصر نے بہانہ بنایا۔

عادل نے واکی ٹاکی کے مائیک پر ہاتھ رکھا اور کرخت لہجے میں ناصر سے بولا۔ ''تایا جی سے کہو وہ ادھر ہی رکیں، ہم آ رہے ہیں۔''

ناصر کچھ دیر تذبذب میں رہا لیکن جب اس نے عادل کی آنکھوں میں خون اترتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ پستول اس کی پسلیوں سے قریب تر ہو گیا ہے تو اس نے تایا فراست کو یہ پیغام دیا کہ وہ آ رہے ہیں۔

یہ سب کچھ بے حد ڈرامائی تھا۔ بیٹھے بٹھائے عادل پر ایک سنگین الزام لگا تھا اور اب غلط بھی ثابت ہو رہا تھا۔ شہزادی بازیاب ہو گئی تھی لیکن کس سے اور کیسے؟ بہت سے سوال ذہن میں اودھم مچانے لگے تھے۔

عادل، ہمایوں، سرمد صاحب اور لارڈ اوٹس میں ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی۔ لارڈ صاحب اس سارے معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہ رہے تھے لیکن صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

ناصر، قاسم، مشتاق اور ان کے قریباً سولہ ساتھیوں کو ایک ہی جگہ زمین پر بٹھا دیا گیا تھا۔ چار رائفل بردار گارڈز جن میں سے دو مقامی تھے، ان کے اردگرد چوکس کھڑے تھے۔ چونکہ تمام افراد کی اچھی طرح تلاشی لی جا چکی تھی اس لیے ان کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ عادل، ہمایوں اور مدثر وغیرہ قریباً بیس افراد کے ساتھ مطلوبہ جگہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ وقتِ رخصت لیوپڈ نے عادل کو کینہ توز نظروں سے دیکھا۔ کئی دوسرے برٹشرز کی طرح وہ بھی اس حق میں نہیں تھا کہ سرمد صاحب اور عادل وغیرہ کے ذاتی مسائل حل کرنے کے لیے خود کو کسی بکھیڑے میں ملوث کیا جائے۔ بہر حال اب تو یہ ہو چکا تھا۔

عادل کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شہزادی کو اور تایا فراست کو اس ویرانے میں بھی دیکھے گا۔ وہ پتا نہیں کس حال میں تھی اور کیوں تھی؟ ماکانے زادہ کا منحوس چہرہ بار بار عادل کی نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ان تمام سنگین واقعات کا ذمے دار وہی سرمنڈا شرابی ہے جو باؤنڈوں کے نزدیک ایک پہنچا ہوا عامل ہے اور کسی حد تک لگتا بھی تھا کہ اس کے پاس کسی طرح کی ماورائی توانائی موجود ہے یا شاید یہ صرف اتفاق تھا کہ بانگڑی چوٹی کے بارے میں کہی ہوئی اس کی کچھ باتیں بالکل درست ثابت ہوئی تھیں۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے کے تیز رفتار سفر کے بعد وہ لوگ ایک بڑی چٹان کا کلاوا کاٹ کر ایک چھوٹے سے نشیب میں پہنچے اور آناً فاناً وہاں موجود قریباً دس افراد کو گھیر لیا۔ ان میں عادل کے تایا فراست اور گائڈ رشید خاں کے علاوہ ایک پورٹر اور اس کے تین خچر بھی تھے۔ عادل کی بے قرار نگاہوں نے سب سے پہلے اپنی شہزادی کو ڈھونڈا..... ہاں، وہ موجود تھی وہاں۔ ایک بڑی چادر میں لپٹی لپٹائی..... حیران و پریشان تایا فراست کے قریب کھڑی تھی۔ تایا فراست اور رشید خاں سمیت وہ سب لوگ اس اچانک افتاد پر دہشت زدہ تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ملکی اور غیر ملکی اجنبیوں نے ان پر رائفلیں کیوں تان لی ہیں۔ یہاں پتھروں کا بنا ہوا نیچی چھت والا ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ کمرے کے سامنے عادل کو لکڑی کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈولی نظر آئی۔ ڈولی کو اٹھانے کے لیے ایک لمبا بانس لگایا گیا تھا۔ عادل کو برف پر خون کی آلائش بھی دکھائی دی۔ عادل..... اپنے تایا فراست سے صرف دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑا تھا مگر اس کا ''منہ سر'' اونی ٹوپی میں چھپا ہوا تھا۔ آنکھوں پر گلاسز تھے۔ باقی افراد کا حلیہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' تایا فراست نے لرزتی آواز میں پوچھا اور شہزادی کو حفاظتی انداز میں اپنے پیچھے کر لیا۔ عادل کو شہزادی کی بس آنکھیں ہی دکھائی دیں۔ سہمی ہرنی جیسی گہری سیاہ آنکھیں۔ عادل نے اپنی اونی ٹوپی اتاری اور گلاسز بھی آنکھوں سے ہٹا لیے۔ تایا فراست کے سر پر جیسے ہزار پاؤنڈ کا بم پھٹ گیا۔ وہ ہکا بکا عادل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو دیگر افراد عادل کو جانتے تھے، ان کا حال بھی یہی تھا۔ عادل کو شہزادی کی آنکھوں میں بھی بے پناہ حیرت دکھائی دی۔

''عادے...... تم..... یہاں؟'' تایا فراست ہکلائے۔

''جی تایا جی۔'' عادل نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ یہ لوگ اپنے ہی ہیں۔ کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ہمیں بس یہ ڈر تھا کہ آپ کے ساتھ آنے والے کہیں گھبراہٹ میں فائر وغیرہ نہ کر دیں۔''

تایا خود کو مسلسل حیرت کے شدید دھچکوں سے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اور..... باقی لوگ؟ میرا مطلب ہے قاسم اور ناصر وغیرہ؟'' تایا نے پوچھا۔

''ان کے بارے میں بھی کوئی فکر نہ کریں۔ وہ ہمارے پاس ہیں اور بالکل حفاظت سے ہیں۔'' عادل نے تایا کو یقین دلایا۔

اگلے دو چار منٹ میں وہ نہ صرف تایا کو قائل کرنے میں کامیاب ہوا بلکہ تایا کے کارندوں نے اپنی دو رائفلیں اور پستول بھی گارڈز کے حوالے کر دیے۔ شہزادی پردے میں تھی لیکن اس کے جسم کی کپکپاہٹ عادل کو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ شہزادی کی ایک کلائی پر میلی کچیلی پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ ایک پولیس والے کی پیشانی اور ایک کارندے کی کلائی پر بالکل تازہ چوٹیں نظر آ رہی تھیں۔ دونوں پولیس والے سادہ کپڑوں میں تھے۔ شہزادی کسی نشہ آور دوا کے اثر میں لگتی تھی، شاید اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ کھڑے ہونے پر

بیٹھنے کو ترجیح دے رہی تھی۔ عادل کو صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ پیدل سفر نہیں کر سکتی۔ عادل کے مشورے پر تایا نے اسے ڈولی میں بٹھا دیا۔ تایا فراست جیسے اب خود بھی چاہ رہے تھے کہ جلد از جلد یہ جگہ چھوڑ دی جائے۔

راستے میں عادل نے تایا فراست سے پوچھنا چاہا کہ انہوں نے شہزادی کو کیسے بازیاب کرایا اور اسے زبردستی یہاں لانے والا کون تھا؟ لیکن تایا نے صاف کہا کہ وہ جب تک قاسم اور ناصر وغیرہ سے مل نہیں لیتے، کوئی بات نہیں کریں گے اور نہ کسی سوال کا جواب دیں گے۔

کیمپ میں واپس پہنچنے کے بعد ساری صورتِ حال تایا کے سامنے واضح ہوگئی۔ انہوں نے جان لیا کہ یہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہوا ہے اور ناصر، قاسم سمیت تمام افراد یہاں بندوق کی نوک پر موجود ہیں۔ تایا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خاص طور پر قاسم کو بندھی ہوئی حالت میں دیکھ کر انہیں تکلیف ہوئی تھی۔ شہزادی نے بھی باقاعدہ سسکنا شروع کر دیا تھا۔ عادل نے وضاحت کی کہ قاسم کو کیوں اس حالت میں رکھنا پڑا۔ اس نے تایا سے وعدہ کیا کہ جونہی وہ ذرا نارمل ہوتا ہے، وہ اسے کھول دیں گے۔

شہزادی کو پورے احترام سے خیمے میں کرسٹل کے پاس پہنچا دیا گیا۔ بندھے ہوئے قاسم کو بھی ایک خیمے کی خوشگوار حرارت میسر آگئی۔ عادل نے تایا فراست اور ناصر کو ساتھ لیا اور سرمد صاحب کے پاس ٹینٹ میں پہنچ گیا۔ دس پندرہ منٹ تو ''اعتماد سازی'' میں لگے پھر اصل گفتگو شروع ہوئی۔ تایا کے ایک سوال کے جواب میں عادل نے کہا۔ ''جیسا کہ میں نے بتایا ہے تایا جی! یہاں ایک پہاڑ پر چڑھنے کے مقابلے ہوتے ہیں ہر سال۔ ہم انہی مقابلوں کے لیے یہاں موجود تھے۔ ہمارے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اس طرح، پہلے قاسم اور ناصر بھائی سے اور پھر آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔''

تایا نے ایک آہ کھینچ کر کہا۔ ''یہ پچھلے پندرہ دس دن جو گزرے ہیں، میری زندگی کے سب سے بُرے دن تھے۔ سچی گل تو یہ ہے کہ وہاں پنڈ میں جو کچھ بھی ہوا، اس کے سارے اشارے تمہاری طرف ہی جاتے تھے۔ رات کو بارہ بجے کے قریب دو بندے حویلی میں گھسے۔ ایک پہرے دار کے سر پر رائفل کے دستے مار کر اسے بے ہوش کر دیا۔ انہوں نے دھی رانی کو اٹھانے کی کوشش کی۔ جب ان کو روکنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے فائرنگ کر دی۔ عاصم سخت زخمی ہوا ہے۔ ایک گولی اس کی چھاتی پر اور دوسری ٹانگ میں لگی۔ ایک پہریدار کو بھی گولی لگی۔ وہ لوگ شہزادی کو لے کر نکل گئے۔'' تایا فراست کی آواز بھرا گئی۔

کوشش کر کے انہوں نے خود کو سنبھالا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''یہ بہت بڑی بدنامی کی بات تھی۔ ہم نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی اور نہ کسی کو بتایا کہ ہم پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ میرے بس خاص خاص کارندوں کو اس گل کا پتا تھا۔ ہم نے عاصم اور پہریدار کو بہاولپور کے ایک واقف کار ڈاکٹر کے اسپتال میں بھیج دیا اور شہزادی کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ تمہارے یار صادق کی سفید گڈی پنڈ کے پاس کھیتوں سے مل گئی۔ اس کے بعد ہم سب کا یہ شک اور بھی پکا ہوا کہ یہ سب کچھ تم نے ہی کیا ہے۔ تیسرے دن جب ہم پولیس میں رپورٹ کرانے کا سوچ رہے تھے ایک بڑی خاص اطلاع مل گئی۔ بہاولپور شہر میں شہزادی کی ماں کے ایک رشتے دار صدیق کو ایک فون آیا۔ اس نے شہزادی کو روتے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے بچایا جائے۔ ابھی اس نے کچھ بتایا بھی نہیں تھا کہ فون بند ہو گیا۔ ہم نے بھاگ دوڑ کر کے پتا کروایا اور یہ جان کر حیران ہوئے کہ یہ فون کہیں آلے دوالے سے نہیں کیا گیا۔ یہ ایبٹ آباد اور داسو سے بھی آگے کہیں چلاس سے کیا گیا ہے۔ ہم نے فوراً انتظام کیا اور ایک کوسٹر پر بھاگم بھاگ لمبا پینڈا کر کے چلاس پہنچے۔ ہمارے پہنچنے تک ہمارے جاننے والوں نے فون والی جگہ کا پتا چلا لیا تھا۔ یہ چلاس کے اندر ہی بڑے ڈاک خانے کے پاس ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ پتا چلا کہ گھر کے مالک کا نام افضال خاں ہے اور وہ سیر کرنے والوں کو آگے پہاڑوں پر لے جانے کے لیے جیپ چلاتا ہے۔ ہم نے افضال خاں کو پکڑا۔ اس نے بتایا کہ پرسوں رات دو بندے اس کے پاس آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو انہی علاقوں کا رہنے والا لگتا تھا۔ دوسرا شاید ایبٹ آباد کا تھا۔ ان کے ساتھ ایک بیمار زنانی تھی۔ ایبٹ آباد سے اس کا علاج کروا کے لائے تھے اور واپس اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ وہ چار پانچ گھنٹے اسی کے گھر میں رہے پھر وہ ان کو جیپ پر لے کر آگے روانہ ہو گیا۔ وہ اسکردو روڈ کی کسی تھاں (جگہ) کا نام لے رہا تھا...... کہ وہ جیپ پر ان کو لے کر وہاں تک گیا۔ وہاں سے آگے انہوں نے ڈولی کا انتظام کیا اور بیمار لڑکی کو لے کر آگے چلے گئے۔''

تایا فراست کی آنکھوں میں نمی آچکی تھی۔ انہوں نے اپنے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور غمزدہ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے اس روداد کو آگے بڑھایا۔ ان کی بتائی روداد کا لب لباب کچھ یوں تھا۔ تایا فراست کی ہدایت پر پال پور گاؤں سے کچھ اور لوگ بھی طویل سفر کر کے پختان کے اس دور دراز قصبے چلاس میں پہنچ چکے تھے۔ افضال خاں کی زبانی معلوم ہوا کہ اسکردو روڈ کے پاس سے ان لوگوں نے شہزادی کو ایک مقامی طرز کی ڈولی میں بٹھایا تھا اور لے کر آگے نکل گئے تھے۔ ناصر کے ایک دوست نے ایبٹ آباد میں پولیس سے بھی آف دی ریکارڈ رابطہ کیا۔ دو ہیڈ کانسٹیبل سادہ لباس میں ان کے ساتھ روانہ کر دیے گئے۔ اسکردو روڈ سے آگے شہزادی کو تلاش کرنے والے دو گروپس میں بٹ گئے۔ شہزادی کا بھائی قاسم، منگیتر ناصر اور مشتاق وغیرہ آگے روانہ ہوئے۔ تایا فراست، ہیڈ کانسٹیبلز اور گائیڈ رشید خاں دوسرے گروپ میں تھے۔ نہایت سخت موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے ان لوگوں کے پاس پورا ساز وسامان اور ٹینٹ وغیرہ بھی موجود تھے۔ کئی روز تک یہ لوگ نہایت دشوار راستوں پر اور بے حد کٹھن موسم میں سفر کرتے رہے۔ بالآخر آج صبح سویرے ایک انہونی ہوئی۔ گائیڈ رشید خاں کو برف پر ایسے نشان نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ یہاں سے ایک ڈولی گزری ہے...... اور اسے گزرے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔ اپنے تجربے کی بنا پر رشید خاں نے تیزی سے ان نشانات کا تعاقب کیا اور آناً فاناً پتھروں کے اس کوٹھے تک جا پہنچا جو برفانی تودوں کے بیچوں بیچ بنایا گیا تھا۔ مقامی مسافروں کے لیے اس طرح کے پتھریلے کوٹھے کہیں کہیں بنے ہوئے تھے۔ کوٹھے کے باہر ڈولی پڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک درمیانی عمر کا شخص لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھی سو رہا تھا۔ اس کی رائفل پاس ہی پڑی تھی۔ تایا فراست اور ان کے ساتھیوں نے سب سے پہلے یہ رائفل قبضے میں لی۔ رائفل کے بہت سے راؤنڈ اور پستول کی گولیاں بھی انہوں نے قبضے میں لے لیں۔

اس شخص کو اٹھایا گیا۔ شکل صورت اور بول چال سے وہ ایبٹ آباد یا مانسہرہ وغیرہ کا لگتا تھا۔ اس نے مزاحمت کی مگر اسے مار کوٹ کر لمبا لٹا دیا گیا۔ پھر وہ لوگ شہزادی کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ نیم بے ہوش تھی۔ جب وہ لوگ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، درمیانی عمر والے اس شخص کو موقع مل گیا۔ اس نے چھوٹی دستے والی ایک کلہاڑی اٹھائی۔ کانسٹیبل مجید کے سر پر وار کیا اور ایک کارندے کے ہاتھ پر چوٹ لگا کر اس کے ہاتھ سے رائفل چھڑا دی۔ پھر اس نے نشیب میں چھلانگ لگائی اور ڈھلوان برف پر پھسلتا ہوا دور نکل گیا۔ تایا فراست تو شہزادی کے پاس رہے، باقیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ تین چار فائر بھی اس پر کیے گئے لیکن اسے فائر لگا نہیں۔ قریباً ایک فرلانگ آگے اس کا ایک ساتھی بھی موجود تھا۔ وہ شاید علی الصباح حاجت وغیرہ سے فارغ ہو کر واپس آرہا تھا۔ یہ منڈے ہوئے سر اور بھاری تن وتوش والا ایک پاؤنڈہ تھا۔ اس کے پاس پستول موجود تھا۔ اس نے فراست صاحب کے ساتھیوں پر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ یہ مقابلہ بس چار پانچ منٹ ہی جاری رہ سکا۔ اس پاؤنڈے کے پاس پستول کی فقط پانچ چھ گولیاں ہی تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ مارا جائے گا یا پکڑا جائے گا تو اپنے ایبٹ آبادی ساتھی سمیت بھاگ نکلا۔ وہ اس علاقے کے شناور تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پتھروں اور برفانی تودوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ عادل کے علم میں ہی تھا۔ گائیڈ رشید خاں اور گائیڈ مدثر میں واکی ٹاکی پر رابطہ تھا۔ رشید خاں نے ناصر سے تایا فراست کی بات کرائی اور یوں عادل وغیرہ کو علم ہو گیا کہ شہزادی کے حوالے سے ایک اچھی خبر موجود ہے۔

تایا فراست کی مکمل روداد سننے کے بعد عادل اور اس کے ساتھیوں پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ان کے اندازے اور اندیشے درست تھے۔ شہزادی، عاصم، صادق اور طفیل وغیرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا اصل ذمے دار وہی مالکانے زادہ ہے۔ تایا فراست اس شخص کا جو حلیہ بیان کر رہے تھے، اس کے بعد شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

اب بہت سے سوال ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ مالکانے زادہ نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ وہ شہزادی کو کہاں لے جانا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟ اور اس سے بھی اہم سوال جو عادل کا دل بار بار خون کر رہا تھا، یہ تھا کہ کیا شہزادی کی عزت آبرو محفوظ رہی ہے؟ وہ تو اسے کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ کہاں یہ کہ وہ کئی دن تک شب و روز ایک جنونی پاؤنڈے کے قبضے میں رہی تھی۔

اسی دوران میں ایک اور روح فرسا خبر بھی عادل کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے تایا فراست سے زخمی عاصم اور ماموں طفیل کی حالت کے بارے میں پوچھا تو تایا فراست کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''عاصم بچ تو گیا ہے لیکن اس کی ٹانگ کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا......''

''اور ماموں طفیل؟'' عادل نے پوچھا۔

''طفیل نہیں بچا عادل۔'' تایا نے بوجھل آواز میں

کہا۔ ”اس کے سر کی چوٹ بڑی سخت تھی، وہ تیسرے ہی دن اسپتال میں اللہ بیلی ہو گیا تھا۔“

عادل کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب اسے صادق کے بارے میں بھی زیادہ تشویش ہونے لگی۔ تایا فراست نے بتایا تھا کہ صادق کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ مالکانے کی کرخت صورت عادل کی نگاہوں میں گھومنے لگی اور اسے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تو عادل نے تایا کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ”تایا جی! شہزادی تو خیریت سے ہے نا؟ میرا مطلب ہے...... کہ...... اس سے آپ کی بات ہوئی ہے؟“

تایا فراست کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور بولے۔ ”میرے سوہنے رب کا لکھ لکھ شکر ہے، اس نے میری دھی رانی کی لاج رکھی ہے...... اس نے مجھے سب کچھ بتایا ہے، کوئی گل بھی چھپائی نہیں ہے مجھ سے۔“

”کیا بتایا ہے اس نے؟“

”وہ کہتی ہے کہ وہ موٹے سر والا جنونی بندہ تھا۔ اس کی بولی عجیب تھی۔ بس کوئی کوئی گل ہی سمجھ میں آتی تھی۔ پر اس کا ساتھی ہماری بولی میں ہی گل کرتا تھا۔ موٹے سر والا کہتا تھا کہ اس کا بھتیجا قتل ہوا ہے۔ اس کو پہاڑ سے گرا کر مارا گیا ہے۔ وہ جب تک اس کا بدلہ نہیں لے گا، اس کو چین نہیں آئے گا۔ مرنے والا اپنے پیو کی بس ایک ہی اولاد تھا۔ وہ اس کے غم میں دن رات روتا ہے۔ موٹے سر والا کہتا تھا کہ وہ شہزادی کو اپنے پنڈ لے جائے گا اور اس کا ویاہ، مرنے والے کے پیو یعنی اپنے بھرا سے کروائے گا۔ یہاں کی پہاڑی رسم کے مطابق اس کا بدلہ اسی طرح سے پورا ہوگا۔“

عادل کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ یہ سارا قصہ یقیناً اسی خناب گل سے شروع ہوا تھا جسے عادل نے لڑائی کے دوران میں بلندی سے گرا دیا تھا۔ خناب کا ساتھی فولاد جاں اسی وقت خناب کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور وہ لے بھی سکتا تھا لیکن رابے خاں نے وقتی طور پر اسے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ معاملہ دفینے تک پہنچنے کے بعد طے کریں گے۔ مگر پھر موت نے ان دونوں کو اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ اب یہ کام مالکانے زادہ نے اپنے ذمے لیا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو عادے؟“ تایا فراست نے پوچھا۔

”کک...... کچھ نہیں جی۔ ان لوگوں کے رسم و رواج عجیب ہیں۔ ان کے مذہب کی طرح، رواج بھی سمجھ میں نہیں آتے۔“

تایا نے کہا۔ ”سب سے زیادہ تو یہ گل پریشان کرتی ہے کہ یہاں پہاڑوں میں قتل ہونے والے کسی بندے کا میری دھی رانی سے کیا تعلق؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں پہاڑوں میں...... تم سے...... کوئی ایسا کام ہو گیا ہو...... جس کی وجہ سے شہزادی......“

تایا فراست نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سوالیہ نظروں سے عادل کو دیکھنے لگے۔ عادل خاموش تھا۔ یہ بات تو اچھی طرح اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ شہزادی کو مالکانے وغیرہ سے سب معلوم ہو گیا ہوگا لیکن اس نے اپنے والد کو جان بوجھ کر یہ بات نہیں بتائی تھی کہ مالکانے جس قتل کی بات کر رہا ہے، وہ عادل سے ہی ہوا ہے۔

عادل نے اس موقع پر گول مول بات کر دینا مناسب سمجھا۔ اس نے کہا۔ ”تایا جی! یہاں کچھ پریشان کرنے والے واقعات ضرور ہوئے ہیں۔ میں اس بارے میں آپ کو بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ مجھے تسلی صرف ایک بات کی ہے...... بلکہ خوشی ہے کہ شہزادی کے حوالے سے آپ مجھ پر جو شبہ کر رہے تھے، وہ غلط نکلا ہے۔ وہاں لالی اور پال پور میں جو کچھ ہوا، اس سے میں بھی اتنا ہی بے خبر تھا جتنے آپ تھے۔“

تایا فراست نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ”لیکن عادے! یہ بات تو ہے نا کہ اگر تمہارے ماموں طفیل پر حملہ کرنے والے اور شہزادی کو اٹھا کر یہاں پہنچانے والے اور...... تمہارے یار صادق کو غائب کرنے والے ایک ہی لوگ ہیں تو پھر انہوں نے تم سے دشمنی چکانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں...... تم سے واقعی کسی بندے کا...... خون تو نہیں ہوا؟“

”نہیں تایا! میرے اندر بھی آپ ہی کا خون ہے۔ اگر آپ کسی کو ناحق قتل نہیں کر سکتے تو میں کیسے کر سکتا ہوں۔ بہرحال اس بارے میں جلد ہی آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔“

تایا فراست کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر انہوں نے وہی سوال پوچھا جس کی عادل توقع کر رہا تھا۔ انہوں نے جاننا چاہا کہ عادل یہاں اس برف زار میں کیا کر رہا ہے...... یہ اتنے سارے انگریز مرد و عورت یہاں کیوں موجود ہیں...... اور یہاں کس طرح کا مقابلہ ہونے والا ہے۔

عادل نے انہیں مختصر الفاظ میں بتا دینا مناسب سمجھا کہ آئندہ اڑتالیس گھنٹوں میں یہاں کیا ہونے والا ہے اور جو کچھ یہاں ہونے والا ہے، اس کی ہسٹری کتنی پرانی ہے...... اور اس غیر معمولی ایونٹ میں حصہ لے کر اس کو کس طرح کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے...... تایا فراست حیرت سے سنتے رہے۔ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آئیں، کچھ نہیں آئیں۔

تایا فراست زیادہ باریکیوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے...... ان کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ شہزادی اور قاسم وغیرہ کے ساتھ جلد از جلد اس خطرناک علاقے سے نکل جائیں اور واپس اپنے گاؤں تک پہنچ جائیں۔

عادل نے انہیں سمجھایا کہ وہی ہوگا جو وہ چاہتے ہیں لیکن طریقے سے۔ بس اب صرف اڑتالیس گھنٹے کی بات ہے۔ یہاں کیمپ میں موجود سارے لوگ ایک قافلے کی صورت میں سفر کریں گے اور واپس کنکورڈیا گلیشیر تک پہنچیں گے۔ عادل نے تایا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تایا جی! یہاں آپ کے ساتھ آنے والا ہر شخص، مہمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کسی کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ انور کے بازو کا بھی بڑا اچھا علاج کیا گیا ہے۔ شاید شہر میں بھی اس طرح سے نہ ہوتا، اسے پلاستر چڑھایا گیا ہے۔ قاسم بھائی کی طرف سے بھی آپ تسلی دے دیں تو میں اس کے ہاتھ وغیرہ کھول دیتا ہوں۔ قاسم بھائی اتنے غصے میں تھا کہ ہمیں ہاتھ باندھنے کے سوا کوئی چارہ ہی نظر نہیں آیا۔“

تایا نے کہا۔ ”ہماری طرح اس کے دماغ میں بھی یہی تھا کہ شہزادی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، تم نے کیا ہے۔ اب اس گل کا فیصلہ تو ہو گیا ہے۔ اب قاسم کو بھی یہ گل سمجھ میں آجائے گی۔ میں اسے جا کر سمجھاتا ہوں۔ وہ اب کسی طرح کا غصہ نہیں دکھائے گا۔“

”تایا! آپ ناصر کو بھی سمجھا دیں۔ میری اس سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ آپ میرے بڑے ہیں، میرے لیے جو بھی حکم کریں گے، میں اسی طرح کروں گا۔ پنڈ میں جو کچھ بھی ہوا ہے، میں اسے بھول چکا ہوں اور آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں تایا جی کہ وہاں باغ میں میرے ساتھ ڈراما کیا گیا تھا۔ میں وہاں صرف آپ سے ملنے گیا تھا۔“ تایا سب کچھ اشکبار خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔

وہ رات بڑی تشویش بھری اور سنسنی خیز تھی۔ سرمد، عادل اور ہمایوں اپنے خیمے میں تادیر سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ بظاہر تو یہ بڑا زبردست اتفاق ہوا تھا کہ تایا فراست اور رشید خاں وغیرہ مالکانے زادہ سے شہزادی کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مالکانے زادہ اور اس کا نامعلوم ساتھی جان بچا کر بھاگ گئے تھے لیکن اسے بھاگنے کے بجائے پسپا ہونا کہا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ مالکانے زادہ کی خصلت کا اندازہ اب اچھی طرح ہو چکا تھا۔ وہ اتنی جلدی پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ اپنے پاؤندہ ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ اس طرف آئے گا۔ وہ لوگ بانگڑی پہاڑ کی مغربی جانب آباد تھے۔ فاصلہ بہت زیادہ تو نہیں تھا لیکن راستہ دشوار تھا۔ سرمد صاحب نے ”ٹینٹ لیمپ“ کی روشنی میں نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تیز رفتاری سے بھی سفر کیا جائے تو یہ تقریباً دو دن کا راستہ ہے۔ یعنی مالکانے اور اس کے ساتھی کو دو دن پاؤندہ بستی تک جانے میں لگیں گے اور دو دن آنے میں...... یعنی چار دن۔“

ہمایوں بولا۔ ”مطلب یہ کہ یہاں کے مقابلوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہمارے پاس کافی وقت بچا رہے گا۔“

”بہت زیادہ وقت تو نہیں، لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ ہم اس کیمپ کو سمیٹ کر یہاں سے کنکورڈیا کی طرف نکل سکیں۔ اس کے باوجود ہمیں کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مسز ادتس کا بھی یہی کہنا ہے کہ ایونٹ ختم ہوتے ہی ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

انگریز فیملیز یہاں کے کسی مقامی مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان میں ایک طرح کی تشویش پائی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ کل کے مقابلوں کی تیاریوں میں بھی لگے ہوئے تھے۔ نوبل راک کے گرد چار مختلف جگہوں پر کیمرے نصب کیے گئے تھے۔ ان کیمروں کے اوپر سائبان تھے۔ کسی حادثے کی صورت میں طبی امداد کا مناسب انتظام بھی موجود تھا۔ کل صاف موسم کی پیشین گوئی تھی۔

سپہر کو کرسٹلی، عادل کے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”تم کے لیے اچھی نیوز لائی ہوں، شہزادی تم سے ملنا چاہتا۔“

”کہاں؟“

”وہ وہیں ہام کے ٹینٹ میں ہے۔ اس کا فادر دوسرے ٹینٹ میں ہے، تھک کر سو رہا ہے۔“

شہزادی سے ملنے کو عادل کا دل بھی مچل رہا تھا۔ اب خود بخود ہی یہ سچویشن بن گئی تھی۔ ناصر، قاسم اور مشتاق وغیرہ سمیت سب لوگ ابھی تک سخت نگرانی میں تھے۔ انہیں ایک ہی جگہ زمین پر بٹھایا گیا تھا اور چار مسلح گارڈز ان پر پہرا دے رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں عادل اور شہزادی کی ملاقات میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط کی اور کسی کی نگاہ میں آئے بغیر شہزادی والے ٹینٹ

میں داخل ہوگیا۔ عادل کو دیکھ کر وہ سسک پڑی...... اور اس کا توانا بازو تھام کر...... بازو کے ساتھ لگ گئی۔ وہ اب غنودگی کی کیفیت سے نکل آئی تھی۔ اشکبار آواز میں بولی۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے عادل! اس سے تو...... موت آجاتی تو اچھا تھا۔''

عادل نے بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔ سب اچھا ہو جائے گا انشاء اللہ۔''

انہوں نے دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پھر وہ روتے ہوئے بولی۔ ''عادل! وہاں باغ میں تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس نے مجھے بڑا رلایا۔ میں اس کو بہت بڑا دکھ سمجھتی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ابھی اس سے بڑے بڑے دکھ سامنے آنے ہیں۔ اباجی کی عزت مٹی میں مل گئی ہے عادل! لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے؟''

''تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے، تم ویسی ہی ہو، جیسی اپنے گھر میں تھیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ...... کچھ ہو بھی جاتا تو تم میرے لیے اسی طرح پاک اور صاف تھیں شہزادی! تمہیں نہیں پتا، تم میرے لیے کیا ہو؟''

اس نے اپنی خوب صورت پلکیں اٹھا کر عادل کی طرف دیکھا۔ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''عادل...... کیا...... تم سے کسی کا...... خون ہو گیا ہے؟ مجھے اسی موٹے (سرمنڈے) کے ساتھی نے بتایا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہر صورت اس قتل کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ اس بدلے کے لیے انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ...... تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہو۔'' عادل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''لیکن کیسے عادل؟''

''ابھی اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' عادل نے جواب دیا۔ بہرحال، عادل کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ ماکا کو شہزادی اور ماموں طفیل وغیرہ کے بارے میں ساری معلومات صادق سے ہی حاصل ہوئی ہوں گی۔ وہ قسمت کا مارا پتا نہیں کس حال میں تھا۔

شہزادی ایک بار پھر روہانسی آواز میں بولی۔ ''عادل! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں اب اور کچھ نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ دوبارہ سسکنے لگی۔

''اب اور کچھ نہیں دیکھنا پڑے گا شہزادی! سمجھو اب ہم بس یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔''

وہ چپ ہوگئی۔ عادل بھی چپ رہا۔ اس کی انگلیوں کی گرفت بدستور عادل کے بازو پر قائم تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''عادل...... میں آج تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے بہت بُرے بُرے خیال آرہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونے والا۔ چودھری مختار اور اس کا بیٹا میرے رشتے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یا تو...... تم مجھے لے کر کہیں دور نکل جاؤ...... یا پھر بھول جاؤ مجھے...... اور زیادہ اچھا یہی ہے کہ بھول جاؤ۔ میں اپنے اباجی کی عزت کو اور مٹی میں رولوں گی تو شاید مجھے مر کے بھی چین نہیں آئے گا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان تھا۔

عادل نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں شہزادی! میں تمہیں اس طرح لے کر نہیں جاؤں گا...... اور نہ ہی تمہیں بھولوں گا۔ میرے اور تایا کے درمیان ایک وعدہ ہے۔ میں وہ وعدہ پورا کروں گا۔ تم میرے تایا کی عزت ہو۔ میں نے تمہیں عزت سے ہی حاصل کرنا ہے...... اور کر کے رہنا ہے۔ اچھی بات ہے کہ اب تم بھی یہیں ہو۔ تم دیکھنا شہزادی...... تم دیکھنا، میں کس طرح اپنی جان کی بازی لگا کر تمہارا ہاتھ جیتوں گا۔ وہ وقت اب بہت قریب آگیا ہے۔''

عادل کے لہجے میں فولادی ارادوں کی کھنک اور مہیب طوفانوں کی گرج تھی۔ ان لمحوں میں اس کے اندر ایسی توانائی تھی کہ اسے لگتا تھا کہ وہ شہزادی کی پیشانی چومنے کے بعد ستاروں کو بھی ہاتھ لگا سکتا ہے...... اور پھر اس نے واقعی شہزادی کی پیشانی چومی اور اسے بولنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے باہر نکل آیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ آئندہ چند گھنٹوں میں قسمت اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والی ہے۔

☆☆☆

اگلے روز موسم واقعی صاف تھا۔ نوبل راک کے اردگرد میلے کا سا سماں تھا۔ برٹش مرد و زن بہت پُرجوش نظر آرہے تھے اور اپنے اپنے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ بہت سے تماشائیوں کے گلے میں ٹیلی اسکوپس جھول رہی تھیں۔ کچھ نے ویڈیو کیمرے تھامے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے فلش لائٹس بھی چمک رہی تھیں۔

ایک دن پہلے فائنل مقابلوں کے لیے 18 کھلاڑی چن لیے گئے تھے۔ عادل کا نام ان میں شامل تھا۔ کئی سال پرانی ترتیب ہی اب تک چل رہی تھی۔ کھلاڑیوں کو

تین تین کی چھ ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ تین کھلاڑیوں کی ایک ٹولی کو ایک ساتھ چٹان پر چڑھائی کرنا تھی۔ ان میں سے پہلے نمبر پر آنے والا اگلے مرحلے میں جانے کا حق دار تھا۔ یوں چھ ٹولیوں یا ٹیموں میں سے چھ کھلاڑی اگلے مرحلے میں چلے جاتے۔ ان چھ کھلاڑیوں کو پھر دو ٹولیوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس مقابلے میں فائنل دو کھلاڑی منتخب ہونا تھے جن کے درمیان آخری مقابلہ ہونا تھا۔ عادل کو قوی امید تھی کہ وہ اس آخری مقابلے میں موجود ہوگا۔

عادل چوتھی ٹیم میں شامل تھا۔ اس ٹیم کی باری شام چار بجے کے قریب آئی۔ سرمد صاحب نے اس کا شانہ تھپکا۔ اپنی پلاسٹر شدہ ٹانگ کے باوجود وہ ہمہ وقت اس کی کوچنگ اور حوصلہ افزائی میں مصروف رہے تھے۔ عادل نے دور اس سرخ ٹینٹ کی طرف دیکھا جہاں شہزادی موجود تھی۔ اسے یہی لگا جیسے آج وہ پھر شاہ نوانہ کے میلے میں ہے اور کھجور کے تنوں پر چڑھائی کرنے والا ہے...... دور ایک رنگ برنگے تانگے کے گرد ریشمی پردے تنے ہیں اور اس کی شہزادی ان پردوں کے اندر سے اس کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے جسم میں نیا ولولہ بھر گیا۔

کلائمبنگ شروع ہوئی۔ آغاز میں تھامس نامی برٹش نوجوان آگے نکل گیا لیکن پانچ چھ سوفٹ کی چڑھائی کے بعد عادل نے اسے جالیا اور اس سے ''لیڈ'' لے لی۔ یہ لیڈ عادل نے آخر تک برقرار رکھی اور یہ Heat جیت گیا۔ چوٹی پر کھڑے ریفریز نے اسے اسٹاپ واچ دکھائی۔ عادل کا ٹائم تھا 48 منٹ۔ اور یہ کافی اچھا ٹائم تھا۔

اب وہ ان چھ خوش قسمت کھلاڑیوں میں شامل ہو چکا تھا جنہیں اگلے روز دوپہر سے پہلے کلائمبنگ میں حصہ لینا تھا۔ لیوپڈ بھی ان چھ کھلاڑیوں میں جگہ بنا چکا تھا۔ عادل کے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کا ٹائم لیوپڈ کے ٹائم سے قریباً تین منٹ کم تھا۔

سرمد صاحب کے حکم پر کرسٹل نے عادل کی فزیوتھراپی کی تاکہ اس کے کندھے اور بازو کل کی مشقت کے لیے تیار ہو جائیں۔ کرسٹل اسے ٹینٹ میں لے گئی۔ نیکر کے سوا اس کے سارے کپڑے اتار دیے اور اس کے رگ پٹھوں کی خوب مالش کی۔ مشقت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ دل جمعی سے لگی رہی۔ تاہم ایک بات عادل نے صاف محسوس کی۔ اب وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ عادل کے حوالے سے اس کے جذبات میں کوئی کج روی یا سفلی خواہش نظر نہیں آتی تھی۔ عادل کی گردن اور کندھوں کا

مساج کرتے ہوئے وہ مسکرائی اور بولی۔ ''آج ہام نے اپنا سارا ہنر توم کے مساج پر لگایا۔ ہام کو یقین ہے توم کل شہزادی کو مایوس نائیں کرے گا۔ وہ بہت آچھا...... بہت زیادہ آچھا۔''

عادل نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ ''توم بھی بہت آچھی۔ توم نے ہام کا بہت ساتھ دیا۔ کل ہم صرف شہزادی کے لیے ہی نائیں توم کے لیے بھی جیتے گا۔ توم کو لیوپڈ کے شکنجے سے نکال کر دکھائے گا۔ شکنجہ سمجھتی ہونا توم؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور عادل کے لہجے پر ہنس دی۔ عادل بھی ہنسا۔ ہنستے ہوئے اس کی پسلیوں کے نیچے ہلکی سی ٹیس اٹھی لیکن اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق لیٹنے کے لیے ''سلیپنگ بیگ'' میں گھسا تو اسے لگا کہ معدے کی جگہ پر ہلکا درد ہو رہا ہے...... اس نے درد کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ موجود تھا اور بڑھ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر یہ کیفیت ہوگئی کہ عادل کروٹ پر کروٹ بدلنے لگا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس نے کیا کھایا تھا۔

ہمایوں نے اس کی کیفیت کو بھانپا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے عادل، کچھ بے آرام لگ رہے ہو؟''

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔'' وہ بولا۔

''تم سینڈل رہے تھے۔ جلن وغیرہ تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

''ہاں، کچھ کچھ لگ رہا ہے۔''

ہمایوں اٹھ کر بیٹھ گیا اور لیمپ کی روشنی تیز کی۔ ''کھانا تو ہمارے ساتھ ہی کھایا تھا نا تم نے؟ اور اس کے بعد تو کوئی چیز نہیں کھائی؟''

''نہیں۔'' عادل نے کہا پھر جیسے اسے یاد آیا۔ تین لڑکوں کی ٹولی میں اول آنے کے بعد جب وہ نیچے اترا تھا اور سب خوشی کا اظہار کر رہے تھے تو اس نے کچھ پیا تھا۔ پھر اسے یاد آیا۔ برٹش تماشائیوں میں سے کسی نے زور سے اس کا کندھا تھپکا تھا اور جوس کا ٹن اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اس سے وہی غلطی ہو چکی ہے جس سے کرسٹل نے اور سرمد صاحب نے اسے بار بار خبردار کیا تھا۔ اس جوس کے سوا اور کیا چیز ہو سکتی تھی جو اب اس کے معدے میں باقاعدہ خنجر چلانے لگی تھی۔ بے شک وہ جوس ''ٹن پیک'' تھا اور سر بمہر تھا لیکن کرنے والے کیا نہیں کر لیتے۔

یکایک عادل کا دل بے طرح متلایا۔ وہ منہ دبا کر اٹھا۔ ہمایوں نے فوراً آگے بڑھ کر vomit bag اس کے سامنے کیا۔ عادل نے اس میں قے کی۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو بڑھتا چلا گیا۔ اگلے ایک گھنٹے میں عادل کو چار بار قے ہوئی اور آخری بار قے میں تھوڑا سا خون بھی آیا۔

ہمایوں نے بے قرار ہو کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ سر کو بتا دینا چاہیے۔''

عادل نے انگلی کے اشارے سے اسے منع کیا۔ اسے جیسے اب بھی امید تھی کہ شاید طبیعت سنبھل جائے۔ لیکن اسی دوران میں ٹینٹ سے باہر سرمد صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ عادل کو پکار رہے تھے۔ شاید یہ ان کی نہایت تیز چھٹی حس ہی تھی جس نے انہیں عادل کی مصیبت سے خبردار کر دیا تھا۔ اب سرمد صاحب کو باہر تو نہیں روکا جا سکتا تھا۔ وہ اندر آ گئے...... اور پھر ساری صورت حال سے آگاہ ہو گئے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وہ بہت حوصلے والے تھے لیکن ان گھڑیوں میں عادل انہیں پریشان دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نہایت تشویش ناک صورت حال تھی۔ صبح فائنل مقابلے تھے اور عادل بری طرح فوڈ پوائزنگ کا شکار ہو چکا تھا۔

اب چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اسی وقت ایک برٹش ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے بھی...فوڈ پوائزنگ کی تصدیق کی۔ اس سے جو کچھ بن پڑا، اس نے کیا۔ درد اور متلی کے لیے دوا انجکشن لگائے اور گلوکوز کی ڈرپ بھی چڑھا دی۔ وہ بڑی تکلیف دہ رات تھی۔ عادل کے بھی ہمراہ ساتھیوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ کرسٹل کا چہرہ برف کی طرح سفید دکھائی دیتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس شدید تکلیف کی حالت میں کلائمبنگ جیسی مشقت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مقابلے سے پہلے ہی باہر ہو گیا تھا...... لیکن عادل کی نگاہوں میں ایک اور ہی طرح کا منظر بسا ہوا تھا۔ یہ منظر جیسے اس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکا تھا۔ اس منظر کا تعلق سرمد صاحب سے تھا۔ اپنے شدید زخمی کندھے کے ساتھ وہ ایک ابر آلود، یخ بستہ دوپہر کو ''گمشدہ اینکر'' ڈھونڈنے کے لیے کرسٹل کے ساتھ دو ہزار فٹ بلند چٹان پر چڑھ گئے تھے۔ وہ واقعہ ان کے فلسفے ''نوپین نوگین'' کی عملی تفسیر تھا۔ ہاں...... انہوں نے اس دوپہر میں عادل کے سامنے غیر معمولی برداشت و ہمت کا بے مثل نمونہ پیش کیا تھا...... وہ آج پوری آب و تاب کے ساتھ عادل کی نگاہوں میں دمک رہا تھا...... اور اسے ایک

انہونی کی طرف بڑھا رہا تھا۔

☆☆☆

اس صبح چشم فلک نے ایک عجب نظارہ دیکھا۔ ساری رات الٹیاں کرنے اور پوائزننگ کا شکار رہنے کے بعد عادل مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اس کا رنگ ہلدی کے مانند تھا، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ وہ ہفتوں کا بیمار ہے۔ مگر اس کے ارادے اس چٹان سے زیادہ مضبوط تھے جس کے سامنے وہ کھڑا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ اسی بدباطن لیوپڈ کا کیا دھرا ہے۔ لیوپڈ کو دیکھنے کے بعد اس کے سینے میں بھڑکتے شعلے کچھ اور فروزاں ہو گئے۔ وہ آج مر جانا چاہتا تھا یا پھر اس گورے سے جیت جانا چاہتا تھا۔

سرمد صاحب، ہمایوں حتیٰ کہ کرسٹل نے بھی اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس نے کسی کی نہیں سنی تھی۔ وہ سن ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے آج صبح سویرے ہی اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ طے کر لیا تھا کہ جب تک اس کے جسم میں جان ہے، وہ جیتنے کی کوشش کرے گا۔

اس نے سرمد صاحب کی ایک بات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ ہی نے کہا تھا سر، جہاں انسان کی ہمت جواب دینے لگتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا جسم اور دماغ اس سے زیادہ مشقت نہیں جھیل سکتا، وہیں سے بڑی اور یادگار کامیابیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ نے کہا تھا نا سر؟''

''لیکن یہاں تمہاری جان کو خطرہ ہے عادل۔''

''مجھے ایسی زندگی چاہیے بھی نہیں سر۔'' اس نے باغیانہ انداز میں جواب دیا تھا۔

سرمد صاحب نے اس کے لب و لہجے کو نوٹ کیا اور پھر اس کے راستے سے ہٹ گئے تھے۔ یہ صبح سویرے کی باتیں تھیں اور اب دس بج چکے تھے...... اب وہ تھا اور نوبل راک تھی۔ تین تین کھلاڑیوں کی دو ٹولیاں فائنل مقابلوں کے لیے تیار تھیں۔ عادل پہلی ٹولی میں شامل تھا۔ تینوں کھلاڑی مخصوص جوتے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہیلمٹ، گلاسز اور دستانے وغیرہ بھی ان کے لباس کا حصہ تھے۔

فائر ہوا اور اس کے ساتھ ہی تینوں کھلاڑیوں نے کلائمبنگ شروع کر دی۔ اگلا قریباً پون گھنٹا عادل کی زندگی کا کٹھن ترین وقت تھا۔ اسے ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے سینے میں سانس ایک برچھی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے چھل رہا تھا۔ انگلیوں پر زخم آ رہے تھے مگر وہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ اوپر جانا اس کی فطرت میں تھا...... اس کے خون میں تھا۔ وہ بلندیاں طے کرنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا...... اور پھر اس نے کر دکھایا۔ ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ نہایت ابتر حالت میں ہونے کے باوجود وہ آٹھ دس سیکنڈ کے فرق سے یہ مقابلہ جیت گیا۔

تبصرہ کرنے والے کچھ حیران تھے۔ ان کی پیشین گوئی تھی کہ عادل یہ مقابلہ بہ آسانی چھ سات منٹ کے فرق کے ساتھ جیت جائے گا لیکن یہاں بس چند سیکنڈ کا فرق پڑا تھا۔ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو عادل کی ابتر حالت سے بے خبر تھے۔ عادل واپس آیا تو کرسٹل اور ہمایوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہیں احساس تھا کہ ان لمحوں میں عادل پر کیا گزر رہی ہے۔ جس طرح کوئی سپر سانک طیارہ، آواز کی حد کو توڑتا ہے، اسی طرح وہ بھی اپنی برداشت کی حد کو پار کر رہا تھا۔

سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح توقع کی گئی تھی۔ دوسری ٹیم میں سے لیوپڈ واضح فرق کے ساتھ جیت گیا تھا۔ اس کا ٹائم شاندار رہا تھا...... رنر اپ کھلاڑی سے قریباً پانچ منٹ کم۔

اور اب آخری مرحلہ تھا۔ وہی جس کے لیے دل دھڑک رہے تھے اور سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ نوبل راک کی قریباً 1600 فٹ خطرناک چڑھائی سامنے تھی اور اس ایونٹ کے دو تیز رفتار ترین کلائمبرز، اسٹارٹنگ پوائنٹ پر بالکل تیار تھے۔ لیوپڈ نے شعلہ بار نظروں سے عادل کو دیکھا۔ عادل نے اس کی شعلہ بار نظروں کا جواب شعلہ بار نظروں سے ہی دیا۔ اس نے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''اے سفید چمڑی والے جانور...... میں تیری ہر زیادتی کا جواب یہیں پر دینے کی کوشش کروں گا۔''

ہوائی فائر ہوا اور دونوں نے چڑھائی شروع کی۔ عادل کے لیے یہ زندگی اور موت کا کھیل بن چکا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ مر جائے گا، یا جیت جائے گا۔ چند منٹ پہلے سرمد صاحب نے اسے ایک انرجی ڈرنک قریباً آدھ لیٹر پانی میں ملا کر زبردستی پلایا تھا۔ وہ مشکل سے دو سو فٹ ہی اوپر گئے ہوں گے کہ عادل کے معدے نے یہ سارا ڈرنک الٹ دیا۔ اس قے میں بھی خون کی آمیزش تھی۔ عادل نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اب وہ ان چیزوں سے آگے نکل چکا تھا۔ اس کی نگاہیں بس نوبل راک کی چوٹی پر تھیں۔ جہاں سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا اور ریفریز کی سفید وردیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں سرمد صاحب کے الفاظ گونج رہے تھے...... انسان جب اپنی برداشت کی

حد پار کرتا ہے تو پھر اسے ناقابلِ یقین کامیابیاں سامنے کھڑی نظر آتی ہیں لیکن......

اس کے بعد انہوں نے کیا کہا تھا۔ شاید یہ کہا تھا کہ جب برداشت کی حد پار کی جاتی ہے تو طبی سائنس کے مطابق کبھی کبھی دماغ کام کرنا چھوڑ جاتا ہے اور بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے (جسم اور دماغ کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے) تو کیا اس پر بھی بے ہوشی طاری ہو رہی تھی؟ اس عمودی دیوار پر چڑھتے ہوئے بے ہوش ہو جانے کا مطلب کیا تھا؟ سیدھی...... سیدھی موت۔ لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اب رکنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اب اوپر چڑھنے کا وقت تھا یا سیکڑوں فٹ گہرائی میں گرنے کا وقت تھا۔

لیوپڈ شروع میں ہی اس سے چار پانچ فٹ آگے نکل گیا تھا اور اب وہ یہ برتری برقرار رکھے ہوئے تھا...... بلکہ دھیرے دھیرے اس میں اضافہ کر رہا تھا۔ سرمد صاحب کے فقرے ایک جادوئی اثر کے ساتھ عادل کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں چھوٹے چھوٹے ٹپس۔ انہوں نے کہا تھا...... پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں سے ایک کپ پانی تو ہر کوئی نکال سکتا ہے لیکن ایک گلاس میں سے ڈیڑھ گلاس پانی نکالنے کو ہمت کا کرشمہ کہتے ہیں...... اور وہ یہی کر رہا تھا۔ گلاس بھر پانی میں سے ڈیڑھ گلاس نکالنے کی دیوانی کوشش میں مصروف تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ ایسا کر لے گا۔

لیکن حقیقتیں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔ اس کا اور لیوپڈ کا فاصلہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اب فاصلہ پندرہ فٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نتیجہ صاف نظر آ رہا تھا لیکن کیا وہ ہمت چھوڑ دے؟ رک جائے؟ یا پھر آنکھیں بند کر کے موت کی گہرائی میں چھلانگ لگا دے؟ اور پھر اسے دوسری قے آئی۔ صرف پانی نکل رہا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ پاؤں سے جان جاتی محسوس ہوئی۔ اس کی ماں...... خود بھوکی رہ کر اسے کھانا دیتی تھی اور کبھی وہ دونوں ہی بھوکے رہتے تھے۔ اس فاقہ کشی نے عادل کے جسم میں اضافی برداشت پیدا کر دی تھی۔ سرمد صاحب کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ اپنے کسی لیکچر میں انہوں نے کہا تھا...... ''آخری سانس اور آخری گولی تک لڑنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بدترین حالات میں کوشش جاری رکھنا۔''

لیوپڈ سے اس کا فرق اب مزید بڑھ گیا تھا۔ نیچے سات آٹھ سو فٹ کی گہرائی میں تماشائیوں کا جوش دیدنی تھا۔ یقیناً وہ لیوپڈ کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ عادل کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب وہ لیوپڈ کی یہ لیڈ ختم نہیں کر پائے گا۔ لیڈ بڑھ رہی تھی، بیس فٹ سے زائد ہو چکی تھی۔

عادل نے آخری بار زور مارا۔ شہزادی اور کرنل کے مرجھائے ہوئے چہرے نگاہوں میں بسا کر اس نے دیوانہ وار اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دی۔ اب چوٹی کی طرف دو تہائی فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ بس پندرہ سولہ منٹ کی بات اور تھی...... تین چار منٹ اور گزر گئے۔ عادل لیڈ کم کرنے میں تقریباً ناکام رہا۔ لیکن ایک دیوانی کوشش کے طور پر ہاتھ پاؤں ضرور چلاتا رہا...... اور پھر معجزہ ہوا...... معجزے ایسے ہی وقتوں کا انتظار کرتے ہیں۔ جب عقل اور مصلحت کے پرخچے اڑا دیے جاتے ہیں، شیشوں سے پتھر توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پانیوں میں دیے جلانے کا تہیہ کیا جاتا ہے۔ کشتیاں جلا کر بے دریغ اجنبی سرزمینوں پر قدم رکھ دیے جاتے ہیں...... اور یہاں بھی ایک کرشمہ رونما ہوا۔ عادل کی دیوانہ وار جدوجہد دیکھ کر لیوپڈ میں جو اضطراب پیدا ہوا تھا، اس نے اس کا ''ٹیمپو'' خراب کر دیا۔ ایک دراڑ میں پاؤں جمانے کے بعد جب اس نے ایک اینکر پوائنٹ کو تھامنا چاہا تو دراڑ میں سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ ایک دھچکے کے ساتھ نیچے آیا اور پھسلتا ہوا عادل سے قریباً پندرہ فٹ نیچے چلا گیا۔ اس کے ''ہارنیس'' میں حفاظتی رسّا موجود تھا۔ اس ''بیک اپ'' نے اسے مزید نیچے جانے سے بچایا اور وہ مضبوط بولٹنگ کے ساتھ ہوا میں جھول گیا۔ شدید جھلاہٹ میں اس کے منہ سے بے ساختہ ننگی گالیوں کی بوچھاڑ نکل گئی۔ ان میں سے زیادہ تر گالیاں یقیناً عادل کے لیے ہی تھیں۔

یہ سنہری موقع قدرت نے عادل کو دیا تھا اور یہ اس کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو نوبل راک کی تاریخ کا ناکام ترین شخص کہلاتا۔ اس نے اپنی رہی سہی قوت جمع کی اور باقی ماندہ سو ڈیڑھ سو فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ لیوپڈ بلا کی تیزی سے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ عادل کی برتری بتدریج کم ہو رہی تھی۔ آٹھ فٹ...... سات فٹ...... پانچ فٹ...... تین فٹ...... عادل نے آخری زور مارا۔ اتنا قریب پہنچ کر وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا...... ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

> زندگی کے دشوار گزار رستوں پر لمحہ بہ لمحہ طوفان و باد و باراں سے نبرد آزما اس داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ...

غیبی امداد

تنویر ریاض

کہتے ہیں کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات... لیکن ایسا ہونے میں بھی اللہ کی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے جو عقلمندوں کے لیے دن بدلنے کا اشارہ ہے۔ ایسا ہی ایک اشارہ ان کی زندگی کو بھی بدل گیا جب اچانک ان کی لاٹری کھلی اور پھوٹی تقدیر کا ٹمٹماتا ستارہ عروج پر چمکنے لگا تو ہر آنکھ میں حیرت نمایاں تھی۔

رشتوں کو ٹھیس پہنچانے والے ایک روایت شکن کا احوال

میرے دادا پال جیکب کے سب سے چھوٹے بھائی انکل مارش کی پرانی زرد رنگ کی مرکری کار ہمارے گیٹ کے سامنے آ کر رکی تو میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں تھے کیونکہ ان میں بزرگوں جیسی کوئی بات نہیں تھی اور وہ اپنے آپ کو ابھی تک جوان ہی سمجھ رہے تھے۔ دادا کی شادی چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی جبکہ انکل مارش خاصی تاخیر سے اس دنیا میں تشریف لائے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور ڈیڈی سے چند

برس ہی بڑے ہوں گے۔ اس لحاظ سے ان کا اپنے آپ کو جوان سمجھنا کسی حد تک جائز تھا۔ البتہ مزاجاً وہ بہت اکھڑ، منہ پھٹ اور سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ خاص طور پر بچوں کے ساتھ ان کا رویہ بہت ہی توہین آمیز ہوا کرتا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ کبھی ہمارے گھر نہ آئیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ دادا کے سب سے چھوٹے اور چہیتے بھائی تھے اور انہیں یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اور دادا باہر لان میں درخت کے نیچے رکھی لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ انکل اپنی گاڑی سے برآمد ہوئے۔ ان کا ہیٹ پسینے میں بھیگ چکا تھا لیکن وہ گنجے ہونے کی وجہ سے اسے اتار نہیں سکتے تھے۔ اس وقت بھی ان کے ہونٹوں میں اپنے ہاتھ سے بنا ہوا سگریٹ دبا ہوا تھا۔ انہیں سگریٹ بنانے والی کمپنیوں پر اعتبار نہیں تھا۔

”کیا مارش آیا ہے؟“ دادا نے گاڑی کا انجن بند ہونے کی آواز سنی۔ موتیے کی وجہ سے ان کی بینائی شدید متاثر ہوئی تھی اور انہیں قریب کی چیزیں بھی مشکل سے ہی نظر آتی تھیں۔

”جی، انکل مارش آئے ہیں۔“ میں نے انہیں مطلع کیا۔ آنکھوں میں موتیا آجانے کے بعد وہ مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگے تھے اور میں سوچتا تھا کہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ ڈیڈی سے علیحدگی ہوجانے کے بعد میں اور مما، دادا کے پاس چلے آئے۔ دادا کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا اور مما کو بھی رہنے کے لیے ٹھکانا چاہیے تھا۔ انہوں نے ایک اسٹور میں ملازمت کرلی۔ دادا کو تھوڑی بہت پنشن ملتی تھی۔ اس طرح ہم لوگوں کا گزارہ ہونے لگا تھا۔ ڈیڈی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ انہوں نے کبھی پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی تھی۔ البتہ سال چھ مہینے میں ایک مرتبہ فون کرکے دادا کی خیریت معلوم کرلیتے تھے۔

طویل قامت انکل مارش کار سے باہر آئے تو ان کا زنگ آلود پستول کوٹ کی جیب سے گر پڑا۔ انکل نے اسے جلدی سے اٹھایا اور آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھنے لگے۔ وہ ہر کام اطمینان سے کرنے کے عادی تھے۔ جب وہ قریب آئے تو دادا نے ان کے قدموں کی چاپ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”ہرمن! مارش کے بیٹھنے کے لیے کرسی خالی کردو۔“

میرا نام کیوں رکھا گیا، اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ مما اور ڈیڈی کی پہلی ملاقات ہرمن کے مقام پر ہوئی تھی۔ مما کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا اور ڈیڈی ان کی مدد کے لیے وہاں رک گئے تھے۔ اس یادگار ملاقات کے بعد انہوں نے شادی کرلی اور میرا نام اس کی مناسبت سے ہرمن رکھا گیا۔

”یہ پستول کیسا ہے؟“ میں نے انکل سے پوچھا۔ دادا اور انکل مارش میں بڑی مشابہت تھی لیکن انکل کا رویہ دادا کی طرح دوستانہ نہیں تھا۔ اس لیے مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی جب انہوں نے میرے سوال کو قطعاً نظرانداز کردیا۔ وہ بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ لمبی نال والا پستول ابھی تک ان کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

”میں سارہ جم کو قتل کردوں گا۔“ انکل پُرجوش لہجے میں بولے۔ ”ورنہ میری بقیہ زندگی عذاب میں گزرے گی۔“

میں جانتا تھا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں، وہی کریں گے۔ انہوں نے کبھی کوئی بات مذاق میں نہیں کہی تھی۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ مذاق کیا ہوتا ہے۔ کسی دوست یا رشتے دار نے انہیں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

دادا آگے کی طرف جھکے اور انکل مارش کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”بہتر ہوگا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو۔“

”نہیں، سارہ جم کو مرنا ہوگا اور اب اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ انکل نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس جھگڑے سے تنگ آچکے ہیں۔

”تمہارے دماغ میں یہ خیال کیسے آیا؟“ دادا نے پوچھا۔

انکل مارش نے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”اس لڑکے کو سننے کی ضرورت نہیں، یہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا۔“

میرا خون کھول اٹھا۔ وہ کس تحقیر آمیز انداز میں میرا ذکر کررہے تھے۔ ”میں بارہ سال کا ہوچکا ہوں۔“ میرے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔ ”براہ کرم مجھے لڑکا کہنے کے بجائے نام سے پکاریں۔ مجھے ہرمن کہتے ہیں۔“ میں اس طرح کے جملے سن کر تنگ آچکا تھا۔ یہ لوگ ابھی تک مجھے بچہ ہی سمجھ رہے تھے۔

انکل مارش نے مجھے گھورا اور دادا سے باتیں کرنے لگے۔ دراصل ان کی جوان بیوی سارہ جم انہیں چھوڑ کر کسی اور شخص کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اب وہ اسے تلاش کرکے قتل کرنا چاہ رہے تھے بلکہ ان کی خواہش تھی کہ اگر وہ شخص بھی مل جائے تو دونوں کا ایک ساتھ ہی کام تمام کردیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا وہ ہر کام دیر سے کرنے کے عادی تھے چنانچہ شادی کرنے میں بھی انہوں نے کافی دیر لگائی۔ اس وقت تک وہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوچکے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی محنت کی اور خوب پیسا کمایا۔ ان کے تین ٹرک چل رہے تھے اور وہ ایک چھوٹے سے اسٹور کے مالک بھی تھے۔ اس کے علاوہ دریا کنارے شہد کی مکھیاں بھی پال رکھی تھیں۔ غرض وہ ہر طرح سے پیسے بنا رہے تھے۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ انکل اور سارہ جم کی ملاقات کیسے ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی کو اس بارے میں بتایا لیکن ایک سال پہلے انہوں نے شادی کرلی۔ تب پہلی بار ہم لوگوں نے سارہ جم کو دیکھا۔ اس نے اپنی انگلی میں بڑی سی ڈائمنڈ رنگ پہن رکھی تھی اور وہ ہر ایک سے مسکرا کر مل رہی تھی۔

شادی کے فوراً بعد انکل مارش نے اس کے لیے ایک نئی سرخ رنگ کی کار خریدی۔ گھر میں نیا فرنیچر ڈلوایا اور اسٹور چلانے کی ذمے داری سارہ کو سونپ دی۔ انکل سے ملنے سے پہلے وہ ایک کاٹن مل میں کام کررہی تھی اور رات بسر کرنے کے لیے اس نے ٹریلر پارک میں ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ انکل سے شادی کرنے کے بعد وہ بہت خوش نظر آنے لگی تھی۔ اس کا ایک جوان بیٹا نیوی میں تھا لیکن اس کے باوجود وہ انکل کے مقابلے میں بہت کم عمر نظر آتی تھی۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی زندہ دل اور ہنس مکھ واقع ہوئی تھی اور دوستوں میں بیٹھ کر خوب قہقہے لگاتی اور ہنسی مذاق کرتی جبکہ انکل زیادہ تر وقت سوچ میں غرق رہتے اور ان سے باتیں کرنا دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر تھا۔ اس لیے سارہ ان سے کہیں باہر چلنے کے لیے نہیں کہتی بلکہ خود ہی اپنی نئی کار میں بیٹھ کر گھومنے چلی جاتی۔ پھر نہ جانے کب اس کی ملاقات ایک نانبائی سے ہوگئی جو اسٹور پر ڈبل روٹی سپلائی کیا کرتا تھا پھر ایک دن سارہ انکل کی دی ہوئی نئی کار میں بیٹھ کر اس نانبائی کے ساتھ کہیں چلی گئی جس کی ایک بیوی اور تین معصوم بچیاں بھی تھیں۔

انکل مارش لوہے کی کرسی پر بیٹھے خلا میں گھور رہے تھے اور بار بار اپنے پرانے پستول کو دیکھنے لگتے۔ میں نے ایک بار پھر ان سے پوچھا۔ ”آپ اس پرانی ناکارہ سی چیز کو گن کہتے ہیں؟“

انکل نے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”ہاں، یہ گن ہی ہے اور میں اسی سے سارہ کو ہلاک کردوں گا۔“

وہ اسمتھ اینڈ ولسن کا اعشاریہ تین صفر کا پرانے ماڈل کا ریوالور تھا۔ دادا نے ایک نظر اس پر ڈال کر گہرا سانس لیا ”اب کمپنی یہ ماڈل نہیں بناتی۔ اس میں چھوٹی گولیاں استعمال ہوتی ہیں اور اعشاریہ تین آٹھ کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹا ہے۔ میرے کام کے لیے یہی کافی ہے۔“ انکل مطمئن انداز میں بولے۔

”مارش! تمہیں پُرسکون ہونے کی ضرورت ہے۔“ دادا نے کہا۔

”مجھے اسی وقت سکون ملے گا جب سارہ جم چھ فٹ گہری قبر میں دفن ہوجائے گی۔“ انکل بولے۔

☆☆☆

ماما جب اپنے کام سے واپس آئیں تو اس وقت میں اپنے بستر میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ دادا کا گھر اتنا پرانا تھا کہ میں دادا اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکتا۔ وہ انکل مارش کے بارے میں ہی باتیں کررہے تھے جو اس رات ہمارے گھر رک گئے تھے اور ہال کے آخری سرے پر واقع عقبی کمرے میں سو رہے تھے۔ ماما نے کہا کہ وہ سارہ کو پہلی بار دیکھتے ہی سمجھ گئی تھیں کہ یہ عورت آگے چل کر مسئلہ پیدا کرے گی۔ وہ اس عمر میں بھی مردوں کو بے وقوف بنانے سے باز نہیں آئی اور ابھی تک نوجوان لڑکیوں جیسی حرکتیں کرتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت کم عمری میں ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔

دادا نے کہا کہ انہیں بھی وہ پہلی نظر میں اچھی نہیں لگی تھی جبکہ موتیا کی وجہ سے وہ کسی کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے البتہ انہوں نے اس سے اتفاق کیا کہ سارہ نے پرفیوم کا بے دریغ استعمال کیا تھا۔ وہ مذاق اڑانے کے انداز میں بولے۔ ”میں اب بھی اس کی خوشبو محسوس کرسکتا ہوں۔“

”کاش میں بھی سارہ جیسی ہوتی۔“ مما نے اپنے دل میں چھپی ہوئی خواہش کا اظہار کیا۔ ”مجھے کسی چیز کا لالچ نہیں بس سارہ جم جیسے ایک دو لباس لینا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد میں یہ فضول سی ملازمت چھوڑ دیتی۔“

”جو کام بھی ایمان داری سے کیا جائے، وہ اچھا ہوتا ہے۔“ دادا ناصحانہ انداز میں بولے۔

"آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے۔" مما نے تڑخ کر جواب دیا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" دادا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

وہ دادا سے اس طرح بحث کرنا نہیں چاہتی تھیں جیسے کبھی ڈیڈی سے کیا کرتی تھیں۔ ڈیڈی سے تو ان کی معمولی معمولی باتوں پر جھڑپ ہوجاتی تھی جو بعض اوقات بڑھتے بڑھتے لڑائی کی شکل اختیار کرلیتی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا۔

انکل دوسرے روز صبح سویرے ہی واپس چلے گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے ناشتا بھی کیا تھا یا نہیں۔ جب وہ ایک ہفتے بعد دوبارہ آئے تو ان کی پرانی مرکری کار کے پیچھے ایک ٹریلر بندھا ہوا تھا اور اس میں پنچو سے لے کر بال تک ان کی تمام ذاتی اشیاء موجود تھیں۔ وہ پنچو نہیں بجاتے تھے اور نہ ہی انہیں باؤلنگ سے کوئی دلچسپی تھی۔ البتہ انہیں مختلف قسم کی چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بھی ان چیزوں کو ہاتھ لگائے یا انہیں نقصان پہنچائے۔

انہوں نے ٹریلر میں رکھے سامان کے ڈھیر میں سے ایک سوٹ کیس باہر نکالا اور اس کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولے۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم میری کسی چیز کو چھیڑو۔ ان میں سے کچھ بھی تمہارے مطلب کی چیز نہیں۔"

"یہ کس نے کہا کہ میں ان چیزوں کو ہاتھ لگا سکتا ہوں۔" میں نے جل کر کہا۔

انکل نے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ انگلی میں دبایا اور بولے۔ "زیادہ ہوشیار بننے کی ضرورت نہیں لڑکے!"

"ہرمن۔" میں نے کہا۔ "میرا نام ہرمن ہے۔"

کھانے کی میز پر انکل نے دادا کو بتایا کہ انہوں نے اپنا گھر اور فرنیچر فروخت کردیا ہے۔ اب وہ اپنے ٹرک اور اسٹور بھی بیچنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"تم یہ سب کیوں کررہے ہو؟" دادا حیران ہوتے ہوئے بولے۔ "کیا تمہیں رہنے کے لیے جگہ نہیں چاہیے؟"

انکل نے کہا کہ سارہ کو قتل کردینے کے بعد انہیں رہائش کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد انہیں جیل بھیج دیا جائے گا اور سزا ہونے کی صورت میں وہ بجلی کی کرسی پر بیٹھ کر دوسرے جہان چلے جائیں گے۔ جب تک وہ یہ کام نہیں کرلیتے، اسی گھر کے چھوٹے کمرے میں سوتے رہیں گے۔

انکل نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی شہد کی مکھیوں کو دیکھنے دریا پر گئے تھے۔ تمام شہد کی مکھیاں مرچکی تھیں۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ ان کی زندگی بھی ختم ہونے کو ہے۔

دادا بولے۔ "احمق مت بنو۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تمہاری شہد کی مکھیاں مرگئیں۔"

انکل نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش بیٹھے رہے۔

☆☆☆

اگلے روز انکل پھر چلے گئے اور کئی روز بعد ان کی واپسی ہوئی۔ وہ اسی درخت کے نیچے لوہے کی کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگریٹ نکال کر پینے لگے۔ کچھ دیر تک وہ کچھ نہیں بولے پھر کچھ دیر بعد حواس بحال ہوئے تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے جارجیا کے شہر کولمبس میں رہنے والے ایک پرائیویٹ سراغ رساں گریگوری کی خدمات حاصل کرلی ہیں جو سارہ جم اور اس نانبائی کو تلاش کرے گا۔

"جیسے ہی گریگوری نے انہیں تلاش کرکے بتایا کہ وہ کہاں ہیں تو میں دونوں کو قتل کردوں گا۔" انکل نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "پہلے میں اس نانبائی کو گولی ماروں گا تاکہ سارہ اسے مرتا ہوا دیکھ سکے اور اسے معلوم ہوجائے کہ بے وفائی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ پھر میں سارہ کی بھی دونوں آنکھوں کے درمیان کا نشانہ لوں گا۔"

دادا نے موضوع بدلنے کی کوشش کی اور بولے۔ "مجھے نہیں معلوم کہ کولمبس میں کوئی پرائیویٹ سراغ رساں ہے یا نہیں۔"

انکل نے کہا۔ "کولمبس کوئی چھوٹی موٹی جگہ نہیں۔ وہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔ بشرطیکہ آپ پیسے خرچ کرسکیں اور یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون کہاں ملے گا۔" انکل نے بتایا کہ کولمبس پہلے فوجیوں کا قصبہ تھا اور ان کی اولادیں ہر طرح کے کام کرتی ہیں۔ انکل نے انکشاف کیا کہ انہوں نے اپنی ہر چیز بیچ کر تمام رقم بینک میں رکھ دی ہے تاکہ وہ محفوظ رہے اور اس میں سے وہ سراغ رساں اور وکیل کی فیس ادا کرسکیں۔ انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کے بعد بھی کچھ پیسے بچ گئے تو وہ دادا کے حصے میں آئیں گے۔ وہ اس رقم سے موتیا کا آپریشن

کرواسکتے ہیں تاکہ دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوسکیں۔

"اگر انہوں نے مجھے بجلی کی کرسی پر نہ بٹھایا تب بھی جیل میں مجھے زیادہ پیسوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

میں نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اب وہ بجلی کی کرسی پر نہیں بٹھاتے بلکہ بازو میں زہر کا انجکشن لگاتے ہیں تاکہ تم آہستہ آہستہ موت کی آغوش میں چلے جاؤ۔"

انکل اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس طرح اچھلے جیسے مجھے ٹھوکر ماردیں گے۔ میں تیزی سے پیچھے کی طرف ہٹا اور انکل نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے گرنے سے بچایا۔

"آئندہ میں اس طرح کی باتیں سننا نہیں چاہتا۔" دادا بولے۔ "بعض اوقات لگتا ہے کہ تم اپنے ہوش وحواس کھو چکے ہو۔"

"میں واقعی اپنے ہوش وحواس میں رہتا اگر سارہ مجھے برباد کرکے نہ جاتی۔ میں نے اسے وہ سب کچھ دیا جو وہ چاہتی تھی۔ وہ جس چیز کی طرف اشارہ کرتی، وہ اس کے قدموں میں لاکر ڈھیر کردیتا اور دیکھو، اس نے مجھے کیا صلہ دیا۔"

"اس کے جانے کے بعد تمہیں اپنے آپ کو بہتر محسوس کرنا چاہیے۔" دادا بولے۔ "کیا تم نے کبھی اس بارے میں سوچا؟"

"میں اسے چھ گولیاں مارنے کے بعد اپنے آپ کو بہتر محسوس کرسکوں گا۔" انکل بولے۔

دادا اپنی کرسی سے اٹھے اور اس جانب بڑھے جہاں انکل بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ انکل کے کندھے پر رکھا اور بولے۔ "مارش! میں تمہیں کبھی بھی سارہ کو گولی نہیں مارنے دوں گا۔"

"تم مجھے کیسے روک سکتے ہو؟"

"کوئی نہ کوئی طریقہ سوچنا پڑے گا۔" دادا عجیب سے لہجے میں بولے۔

"طریقہ..... کیسا طریقہ؟" انکل سوچ میں پڑ گئے۔ دادا کہا کرتے تھے کہ انکل کی سمجھ میں بات دیر سے آتی ہے۔

☆☆☆

میرا اسکول شروع ہوچکا تھا اور نومبر کے شروع ہونے تک بھی انکل اسی چھوٹے کمرے میں سوتے رہے۔ میں اکثر انہیں کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا کرتا۔ وہ بستر پر بیٹھے اپنے ہاتھ سے سگریٹ بنا کر پیتے

آپ بھی پوچھئے!

سوال: دن میں تارے کب نظر آتے ہیں؟

جواب: جب کسی کا ہاتھ کھوپڑی گھما کر رکھ دے۔

سوال: گھر میں آنے والے مہمانوں پہ زیادہ پیار آتا ہے یا گھر سے واپس جانے والوں پر؟

جواب: یہ تو مہمانوں پر منحصر ہے کہ وہ جمالی ہیں یا جلالی!

سوال: لڑکیوں کے لیے کونسا شعبۂ ملازمت بہتر ہوتا ہے؟

جواب: ٹیچنگ..... کیونکہ شادی کے بعد بھی وہ مس ہی کہلاتی ہیں۔

سوال: محبت قربانی مانگتی ہے اور شادی؟

جواب: آبادی مانگتی ہے.....

لاجواب

ایک نوجوان نے بزرگ سے پوچھا۔

"جب دنیا فانی ہے تو پھر لوگ اس کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟"

"فانی چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے دوستوں کو دشمن کیوں سمجھتے ہیں؟"

"پیسہ دنیا میں رہ جائے گا تو پھر لوگ اس کے پیچھے ایمان بیچ کر بے ایمان اور ملک بیچ کر غدار کیوں کہلاتے ہیں؟"

بزرگ نے مسکراتے ہوئے زمین سے کانٹا اٹھایا اور نوجوان کے تینوں سوالوں کا جواب ایک خوب صورت جملے میں دیا۔

انہوں نے کانٹا اٹھایا اور منہ کے قریب لاکے دانتوں میں پھنسی ہوئی چھالیہ نکالی اور کہا۔

"جا بھئی اپنا کام کر۔"

مرسلہ۔ قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

اور خلا میں گھورتے رہتے۔ اگر کوئی کمرے کے سامنے سے گزرتا تب بھی انہیں خبر نہ ہوتی۔ کبھی کبھی جب انہیں رات میں نیند نہیں آتی تو وہ باہر نکل کر اپنی پرانی مرکری کار میں بیٹھ کر ریڈیو سنتے۔ جب میں صبح کو اسکول جانے کے لیے اٹھتا تو وہ اپنی کار کی سیٹ پر آنکھوں پر ہیٹ رکھے سو رہے ہوتے۔

جب بھی دادا نے ان سے کہا کہ اس طرح ساری رات ریڈیو سننے کی صورت میں کار کی بیٹری ڈاؤن ہو سکتی ہے تو انکل نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ بیٹری اتنی زیادہ مہنگی نہیں ہے۔ انکل نہیں چاہتے تھے کہ کوئی شخص انہیں کچھ کہے۔

شروع شروع میں انکل چند روز بعد سراغ رساں سے ملنے کولمبس جاتے یا وہ انہیں فون کرلیا کرتا۔ اس کی آواز بڑی کرخت تھی۔ وہ ہمیشہ گفتگو کا آغاز اس طرح کرتا۔ ”میں سراغ رساں گریگوری بول رہا ہوں۔ مجھے ایک اہم معاملے پر مسٹر مارش سے بات کرنی ہے۔“ وہ اس طرح بولتا جیسے کوئی بڑی چیز ہو۔ اس کے بعد گریگوری نے باقاعدگی سے ہمارے گھر آنا شروع کردیا۔ وہ انکل کو سارہ کی تلاش میں ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کرتا اور فیس کے نام پر اچھی خاصی رقم بٹور کر چلا جاتا۔

میں نے ٹیلی وژن پر جس طرح کے سراغ رساں دیکھے تھے، اس کا حلیہ ان سے مختلف تھا۔ وہ چھوٹے قد کا گنجا اور موٹا شخص تھا جو ہمیشہ سر پر ہیٹ پہنے رہتا۔ اسے آدھی آستینوں والی پھول دار قمیص پہننے کا شوق تھا۔ اس کے بازو ٹیٹوز سے بھرے ہوئے تھے۔ جب وہ پہلی بار ہمارے گھر آیا تو دادا نے اس کے بازو دیکھے اور بولے کہ کیا اس نے ان پر رنگ چڑھا رکھا ہے۔

سراغ رساں گریگوری کو معلوم نہیں تھا کہ دادا کو موتیا کی وجہ سے صاف نظر نہیں آتا۔ وہ غصے سے بولا۔ ”نہیں۔“ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ دادا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

سراغ رساں گریگوری اور انکل اکثر باہر چلے جاتے اور دیر تک گریگوری کی نئی کار میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ میں دیکھتا کہ گریگوری بار بار اپنا سر ہلا کر انکل کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوتا اور انکل کبھی کبھی غصے میں آکر اپنے ہاتھ چلانے لگتے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب صبر کا پیمانہ لبریز ہونے والا ہے اور وہ جلد از جلد سارہ کا پتا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

ایک دن ماما نے کام سے چھٹی کی اور خصوصی ڈنر کی تیاری کرنے لگیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں دادا کو بتایا تھا کہ وہ اس ڈنر کا اہتمام اس لیے کر رہی ہیں نہ کہ اس طرح گھر کے سب افراد مل بیٹھ کر کھانا کھا سکیں۔

دادا کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری دادی کے انتقال کے بعد یہ پہلا ڈنر ہے جس میں ہم سب شریک ہو رہے ہیں اور یہ کہ ان سے انتظار نہیں ہو رہا ہے۔ کھانا تیار ہوگیا تو ہم سب میز کے گرد بیٹھ گئے اور مما کھانا لگانے لگیں۔ اچانک ہی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ یہ سراغ رساں گریگوری تھا جو انکل سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ دادا نے اس سے کہا کہ وہ عقبی دروازے سے کچن کی طرف آجائے۔ سردیاں شروع ہوچکی تھیں اور گریگوری نے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس کی وجہ سے اس کے ٹیٹوز بھرے بازو چھپ گئے تھے۔ وہ کچن کے دروازے میں آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اسے انکل سے تنہائی میں بات کرنی ہے۔ اس سے پہلے کہ انکل اپنی جگہ سے اٹھتے، اس موٹے جاسوس نے اپنے نتھنے سکیڑے اور بولا۔ ”آہا...... بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے۔“

مما نے اسے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ اس کے پاس بالکل بھی فرصت نہیں ہے اور وہ انکل کے کیس پر بہت زیادہ محنت کر رہا ہے لیکن مما کے کہنے پر وہ ڈنر میں شریک ہوگیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی چیزوں پر یوں ہاتھ صاف کیا جیسے مہینوں سے کچھ نہ کھایا ہو۔ وہ کھانے کے دوران ہر چیز کی تعریف کرتا جا رہا تھا۔ اسے یوں بے تحاشا کھاتا دیکھ کر مجھے ڈر لگا کہ کہیں اس کا پیٹ ہی نہ پھٹ جائے۔ جب اس کے مساموں اور گنجے سر سے پسینا بہنے لگا تو اس نے زوردار ڈکار لی اور میٹھے آلوؤں کی پلیٹ اپنی طرف کھینچنے لگا۔ کانی ختم کرنے کے بعد اس نے مما کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ان میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ اس سے پہلے وہ جتنی بار ہمارے گھر آیا تو مما اپنے کام پر ہوتی تھیں۔ اس دن اس نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا۔ مما پینتیس سال کی ہوجانے کے بعد اب بھی بہت خوب صورت تھیں۔ وہ اگر چاہتیں تو کئی لوگوں سے دوستی کرسکتی تھیں لیکن ڈیڈی کے ساتھ رہ کر انہیں جو تلخ تجربہ ہوا تھا، اس کے بعد وہ

مردوں سے نفرت کرنے لگی تھیں۔

سراغ رساں گریگوری کھانے کے بعد بھی مما کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کی بھوک اب بھی باقی ہے۔ مما اس کی نظروں کا مفہوم اچھی طرح جانتی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے منہج کو زیادہ لفٹ نہیں کرائی۔ تبھی اس نے مما سے پوچھا کہ کیا ان کے شوہر نے کھانا کھالیا ہے؟ شاید اس طرح وہ مما کی ازدواجی حیثیت کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ جب مما نے بتایا کہ ان کا کوئی شوہر نہیں ہے اور نہ ہی وہ دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں تو اس کا بڑا سا گول چہرہ یوں روشن ہوگیا جیسے کسی ٹرک کی بریک لائٹس جل جاتی ہیں۔

یہ جاننے کے بعد کہ مما کی شادی ختم ہوچکی ہے، وہ ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مما کا اصل نام یونی ہے لیکن سب انہیں فلوسی کے نام سے پکارتے ہیں، تو وہ بھی ہر جملے میں فلوسی استعمال کرنے لگا۔ مثلاً فلوسی...... یہ ہوا اور فلوسی ایسا ہوا۔

رات گئے رخصت ہوتے وقت اس نے انکل کو بتایا کہ وہ سارہ جم کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے اور اسے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے اسے مزید پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مما کے ساتھ آنے والے سنیچر کی رات ڈیٹ بھی طے کرلی۔

مما نے بعد میں بتایا کہ اگلے دو دن گریگوری نے ان کے اسٹور کے گرد چکر لگاتے گزارے اور ان کے اعصاب پر سوار رہا۔ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ سارہ جم اور اس کا نابینا دوست اتفاقاً اس اسٹور کی طرف آجائیں لیکن... درحقیقت وہ مما سے فلرٹ کر رہا تھا۔ ہفتے کی شام آنے تک مما اس سے بری طرح بیزار ہوچکی تھیں لیکن انہیں بھی اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ وہ کام سے واپس آتے ہی باتھ روم میں گھس گئیں تاکہ گریگوری کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کے لیے تیار ہوسکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس سے وعدہ کرچکی ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اپنا وعدہ نبھانے کی کوشش کی ہے۔ گوکہ وہ یہ بھی سمجھ رہی تھیں کہ ان سے ایک بڑی غلطی سرزد ہوچکی ہے۔

مما باتھ روم سے باہر بھی نہیں آئی تھیں کہ گریگوری انہیں لینے آگیا۔ اس نے سرخ رنگ کا فینسی کاؤبوائے سوٹ پہن رکھا تھا اور کسی غبارے کی طرح نظر آرہا تھا۔ جب اس نے اپنا سفید کاؤبوائے ہیٹ اتارا تو اس کا گنجا سر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمکنے لگا۔

وہ مما کے انتظار میں ہمارے ساتھ ہی کچن ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میرے علاوہ دادا اور انکل بھی وہاں موجود تھے اور اس کی چھچھوری حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جیسے ہی مما تیار ہوکر وہاں آئیں، وہ انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ پر اچھلا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ”ہائے، میری گڑیا۔ مجھے امید ہے کہ تم نے رقص کرنے کے لیے جوتے ضرور پہنے ہوں گے۔“ اس کے بعد وہ خود بھی کچن کے فرش پر بے ہنگم طریقے سے ڈانس کرنے لگا۔

☆☆☆

میں اس وقت سوچکا تھا جب گریگوری مما کو چھوڑنے نصف شب کے قریب واپس آیا۔ وہ دونوں صحن میں کھڑے کسی بات پر بحث کر رہے تھے جس سے میری آنکھ کھل گئی اور اب میں ان کی باتیں سن سکتا تھا۔ وہ دونوں اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ جب مما کو غصہ آتا تو وہ اسی طرح چیخنا شروع کردیتی تھیں۔ میں بستر سے اٹھ گیا اور کھڑکی میں کھڑے ہوکر ان کی باتیں سننے لگا۔ دادا نے پورچ کی لائٹ آن کردی تھی جس کی زرد روشنی میں مما ایک نوجوان لڑکی کی طرح نظر آرہی تھیں۔

مما نے اپنی انگلی گریگوری کے چہرے کے سامنے لہرائی اور بولیں۔ ”تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم شادی شدہ ہو؟“

گریگوری نے کہا۔ ”اوہ فلوسی! یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہر شخص شادی کرتا ہے۔“ اس کے الفاظ سپاٹ اور لہجہ بوجھل تھا جیسا کہ عام طور پر شراب کے نشے میں ہوتا ہے۔

جب گریگوری نے مما کا بوسہ لینے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے دور دھکیل دیا اور اسے ان خطابات و القابات سے نوازنے لگیں جو کبھی ڈیڈی کے لیے مخصوص تھے۔ گریگوری نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا کہ اسے یہ زبان سن کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ سارہ جم پہلے ہی اسے مما کے غصے کے بارے میں بتاچکی تھی۔

یہ سنتے ہی مما چونک پڑیں اور بولیں۔ ”کیا کہا تم نے؟ تم سارہ جم سے کب ملے؟“

سراغ رساں گریگوری بری طرح بوکھلا گیا اور اس سے فوری طور پر کوئی جواب بن نہ پڑا۔ پہلے تو اس نے کہا کہ اس کی سارہ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی پھر اس نے قہقہہ لگایا اور تالیاں بجانے لگا۔ وہ کار کے پیچھے جھک کر

باتیں کرنے لگا۔

”میں بتاتا ہوں فلوی کہ یہ سب کس طرح ہوا۔ ایک مہینا پہلے وہ نانبائی میرے گھر آیا تھا۔ میں نے اُسے ایک ہزار ڈالر دیے تو اس نے مجھے سارہ جم کا پتا بتا دیا۔ میں نے سارہ سے کہا کہ اگر وہ مجھے معقول رقم دے سکتی ہے تو میں مارش کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں چھپی ہوئی ہے۔“

مما نے کہا۔ ”میں جانتی تھی کہ تم انکل مارش کو بے وقوف بنا کر ان سے رقم اینٹھ رہے ہو۔“ اس کے بعد انہوں نے گریگوری کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کیے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ گریگوری پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی رو میں بولتا رہا جیسے مما نے اسے کچھ نہ کہا ہو۔ زیادہ شراب پینے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو رہی تھی۔

سارہ جم کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے لہٰذا اسے ایک دوسرا منصوبہ بنانا پڑا۔ مارش کے پاس بہت دولت ہے۔ وہ اس سے ایک معقول رقم لینے کے بعد سارہ جم کے بارے میں بتا دے گا تاکہ اس کی کار کی قسطیں ادا ہو سکیں۔

مما نے گریگوری سے کہا کہ وہ اتنی اونچی آواز میں بات نہ کرے۔ ممکن ہے کہ انکل جاگ رہے ہوں ورنہ وہ انہیں جا کر سب کچھ بتا دیں گی۔ اس پر گریگوری نے کہا کہ وہ اندر جا کر انہیں لے آئے۔ وہ خود ان سے بات کرنا چاہتا ہے۔

انکل کی پرانی مرکری کار صحن کے بالکل سامنے کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنی کار میں بیٹھے ان کی ساری باتیں سن رہے تھے۔ وہ آہستہ سے اپنی کار سے باہر آئے اور گریگوری کی گاڑی کی جانب چل دیے پھر انہوں نے اس کی نئی کار کے اگنیشن سے چابیاں نکالیں اور انہیں اندھیرے میں کہیں دور پھینک دیا۔ گریگوری نے یہ منظر اس طرح دیکھا جیسے کوئی کتا کسی شخص کو ٹینس بال پھینکتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ حیران ہوتے ہوئے انکل سے بولا۔

”مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم ایسا کرسکتے ہو۔“

انکل نے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے پوچھا کہ سارہ جم کہاں چھپی ہوئی ہے۔ گریگوری نشے میں جھومتے ہوئے بولا۔ ”بوڑھے آدمی! مجھ سے جھگڑا مت کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے انکل کے چہرے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔

اس پر انکل غصے میں آگئے اور بولے کہ وہ یہیں رک کر ان کا انتظار کرے۔ یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلے گئے۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو مما چلّاتے ہوئے بولیں۔

”اوہ میرے خدا...... وہ اپنی گن لینے گیا ہے۔“

یہ کہہ کر مما انکل کے پیچھے پیچھے گئیں اور ان سے التجا کرنے لگیں کہ وہ کوئی پاگل پن نہ کریں لیکن انکل انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اس چھوٹے کمرے میں چلے گئے جہاں وہ سویا کرتے تھے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں وہی پرانا زنگ آلود پستول تھا اور وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔

مما جلدی سے دادا کے کمرے کی طرف گئیں۔ وہ پہلے ہی جاگ چکے تھے اور اپنی پتلون پہن رہے تھے۔ جب وہ ہال میں داخل ہوئے تو انکل مارش دروازہ کھول کر باہر جا چکے تھے۔ وہ پورچ میں کھڑے ہوگئے اور پستول کی نال کا رخ سراغ رساں گریگوری کی جانب کرتے ہوئے بولے۔

”تم مجھے بتاؤ گے کہ سارہ جم کہاں چھپی ہوئی ہے ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔“

گریگوری اپنی کار کی جانب لپکا۔ اس نے دروازہ کھولا اور کار کے اندر گھس گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا آٹو میٹک پستول تھا جو اس نے گاڑی کی سیٹ کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اس نے بھی جواباً انکل پر پستول تان لیا۔

اس وقت تک دادا بھی دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”مارش! صبر کرو اور اپنا پستول نیچے کرلو۔“

ان کا جملہ ختم ہوتے ہی سراغ رساں گریگوری نے انکل پر فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا اور گولی انکل مارش اور دادا کے عقب میں پورچ کی دیوار پر جا کر لگی۔

انکل نے اپنے پستول کی نال سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور بس۔ انکل نے بار بار ٹریگر دبایا لیکن ہر مرتبہ کلک کی ہی آواز آئی۔

دادا نے کہا۔ ”مارش! میں تم سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے تمہارے پستول کی فائرنگ پن کو ذرا سا موڑ دیا تھا۔ اب اس سے گولی نہیں چلے گی۔“

انکل مارش مڑے اور دادا کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ پاگل ہوگئے ہوں پھر چلاتے ہوئے بولے۔ ”جیک! یہ تم نے کیا کر دیا؟“

دادا بولے۔ ”میں نہیں چاہتا تھا کہ تم سارہ جم کو گولی مار دو لہٰذا میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔“

انکل جواب میں کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن سراغ رساں گریگوری آہستہ آہستہ پورچ سے قریب ہوتا جا رہا تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے پستول پکڑ کر انکل کو نشانہ بنا رکھا تھا۔ اس مرتبہ جب اس نے فائر کیا تو گولی سیدھی انکل کے سینے میں اتر گئی۔

☆☆☆

جب مما کے فون کرنے پر پولیس وہاں پہنچی، اس وقت بھی گریگوری اندھیرے میں زمین پر جھک کر اپنی کار کی چابیاں تلاش کر رہا تھا۔ وہ کیسا سراغ رساں تھا کہ اس کے پاس ٹارچ بھی نہیں تھی۔ سبھی پولیس والے مما کو ان کے اسٹوری کی وجہ سے جانتے تھے۔ ان میں سب سے سینئر پولیس والے نے مما سے واقعے کی تفصیل پوچھی۔ سراغ رساں گریگوری ابھی تک نشے کی حالت میں تھا اور اسے بیان دینے میں مشکل پیش آرہی تھی بس وہ اتنا ہی کہہ سکا کہ وہ یقین سے کچھ نہیں بتا سکتا۔

مما نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے پولیس کو یہ نہیں بتایا کہ وہ انکل کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہا تھا تو وہ اس کا حلیہ بگاڑ دیں گی۔

گریگوری نے اپنا گلا صاف کیا اور پولیس والوں سے بولا۔ ”میں نہیں بلکہ مارش مجھے بے وقوف بنا رہا تھا جبکہ میری ماں نے احمقوں کی پرورش نہیں کی۔“ وہ پولیس والوں کی طرف دیکھ کر یوں مسکرایا جیسے اس نے کوئی بہت عقل کی بات کہی ہو لیکن اس کی مسکراہٹ اس وقت ماند... پڑ گئی جب مما نے کہا۔

”اچھا...... تو پھر کس نے تمہاری پرورش کی؟“

☆☆☆

انکل مارش کی تجہیز و تکفین میں زیادہ لوگوں نے شرکت نہیں کی۔ صرف گھر کے افراد اور چند پڑوسی موجود تھے۔ البتہ سارہ جم کی آمد ہم سب کے لیے حیرت کا باعث تھی۔ اس نے سیاہ ماتمی لباس پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں ایک سفید رومال لیے ہوئے تھی۔ وہ بناوٹی اداسی کے ساتھ بولی۔

”میرا اندازہ ہے کہ آپ لوگوں کو میرا آنا اچھا نہیں لگا ہوگا۔“

مما بولیں۔ ”تم میرے اندازے سے بھی زیادہ ہوشیار اور چالاک ہو۔“

دادا اپنی کمزور بینائی کی وجہ سے سارہ جم کو نہ پہچان سکے لیکن بعد میں بتایا کہ انہوں نے پرفیوم کی خوشبو سے اسے پہچان لیا تھا جو اتنی تیز تھی کہ ان کی آنکھوں میں پانی آگیا۔

سارہ جم کچھ دیر وہاں کھڑی غمگین نظر آنے کی کوشش کرتی رہی پھر مطلب کی بات پر آگئی۔ اس نے دادا سے پوچھا کہ کیا انہیں انکل کی وصیت کے بارے میں علم ہے کہ وہ کہاں رکھی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ انکل نے شادی کے بعد نئی وصیت تیار کی تھی جس میں اپنا سب کچھ اس کے نام کر دیا تھا۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تم انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔“ مما طنزیہ انداز میں بولیں جس طرح وہ ڈیڈی سے بات کیا کرتی تھیں۔

سارہ جم نے رونے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ بہا۔ وہ اداس نظر آنے کی کوشش

بیوی کا خوف

شوہر۔ ”بیگم ایک کپ چائے بنادو۔“

بیوی (غصے سے) ”کیا کیا؟ ذرا پھر کہنا......“

شوہر۔ ”میں نے کہا بیگم ایک کپ چائے بنادوں؟“

☆☆☆

ایک صاحب نے شادی کے 10 سال بعد تک کبھی بیوی کے بنائے کھانے کی تعریف نہیں کی تھی۔ ایک جمعہ کو مولوی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بیوی کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کی تعریف کرتے رہنے چاہیے۔

وہ شخص گھر گیا تو قورمہ کھاتے ہوئے ہر لقمے کے ساتھ ”واہ واہ کیا ذائقہ ہے“ کہتا رہا۔ بیوی چپکے سے کچن میں گئی اور بیلن لاکر شوہر کو مارنے لگی اور چلاتے ہوئے کہا۔ ”10 سال میں کبھی میرے بنائے کھانے کی تعریف نہیں کی آج پڑوسن نے قورمہ بھیجا تو ”واہ واہ“ کرنے لگے ہو؟“

(مرسلہ: ایم افضال انصاری، ڈنگہ شہر)

کرتے ہوئے بولی۔ ”میں کچھ عرصے کے لیے اس سے علیحدہ ہوئی تھی لیکن ہمارے درمیان طلاق نہیں ہوئی تھی۔ میں اب بھی قانونی طور پر اس کی بیوی ہوں۔ البتہ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔“

”اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم اور وہ نانبائی کیا سوچ رہے تھے۔“ مما نے ایک اور تیر چلایا۔ ”یہی نا کہ انکل کی تمام دولت اور جائداد پر کس طرح قبضہ کیا جائے۔ اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ سب کچھ کسی کوشش کے بغیر ہی مل رہا ہے۔“

☆☆☆

مقدمے کی سماعت کے دوران ہمیں بھی عدالت جانا پڑا۔ انہوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں پوچھا لیکن میں نے مقدمے کی ساری کارروائی دیکھی۔ البتہ مما اور دادا پال جیک کو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا گیا۔ مما نے بتایا کہ وہ گریگوری کے ساتھ کنٹری میوزک کلب گئی تھیں جہاں اس نے اتنی زیادہ شراب پی کہ اس کے لیے چلنا مشکل ہوگیا۔ اس کی کار بھی وہ چلا کر لائی تھیں۔ اس نے یہ بات بھی نہیں بتائی کہ کولمبس میں اس کی بیوی بھی رہتی ہے۔

دادا نے اپنے بیان میں کہا کہ انکل مارٹن نے ایک سے زائد مرتبہ سارہ جم کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ اس نانبائی کو بھی قتل کرنا چاہ رہے تھے جس کے ساتھ سارہ جم فرار ہوئی تھی۔ انہوں نے انکل کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئے۔ مجبوراً انہوں نے انکل کے پستول کو ناکارہ بنا دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انکل، سارہ اور اس نانبائی کو قتل کریں۔ اس وقت یہ فیصلہ صحیح معلوم ہو رہا تھا لیکن اب انہیں احساس ہو رہا ہے کہ ان سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ اگر پستول کام کر رہا ہوتا تو انکل کی جان بچ سکتی تھی۔ ان کا نشانہ بہت اچھا تھا اور وہ رینگتے ہوئے سانپ کو بھی مار دیا کرتے تھے۔

سارہ جم گواہی دینے آئی تو اس نے ایک بار پھر انکل کو یاد کرکے رونے کی کوشش کی۔ اس نے سراغ رساں گریگوری کے ساتھ کسی بھی ذاتی نوعیت کے تعلق کی تردید کی حالانکہ وہ کئی مرتبہ اسے انکل کے خلاف ورغلانے کی کوشش کر چکا تھا۔ اس نے یہ بھی پیشکش کی تھی کہ اگر سارہ اسے اتنی رقم دے دے جس سے وہ اپنی کار کی قسطیں ادا کر سکے تو وہ انکل کو کبھی اس کا پتا نہیں بتائے گا۔

مقدمے کے اختتام پر جیوری نے فیصلہ سنا دیا کہ سراغ رساں گریگوری نے اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی کیونکہ اس سے پہلے انکل اس پر پستول تان چکے تھے اور انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے سارہ جم کا پتا نہیں بتایا تو وہ اسے گولی مار دیں گے۔ گریگوری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ انکل کا پستول ناکارہ ہو چکا ہے۔ اس کے وکیل نے گریگوری کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کی جگہ [illegible] ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ اس نے جیوری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ایسی صورت حال میں وہ بھی یہی کرتے۔ میں نے دیکھا کہ جیوری کے ممبران کی اکثریت نے تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ وکیل کے دلائل سے متاثر نظر آ رہے تھے۔

بعد میں دادا نے مجھے اور مما کو بتایا کہ وہ اپنے آپ کو انکل کی موت کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ شاید ایسا ہی ہو لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں اتنا احمق بھی نہیں ہوں۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ انکل کی موت کا اصل ذمے دار کون تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی سوچتا۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد سب کچھ معمول پر آ گیا۔ دادا کی بینائی مزید کمزور ہوگئی اور مما بدستور اپنے کام پر جاتی رہیں۔ انکل نے اپنا مکان اور سارا سامان بیچنے کے بعد پیسا بینک میں جمع کروا دیا تھا اور وعدے کے مطابق کوئی نئی وصیت تیار نہیں کی جس کے مطابق بینک میں بچی ہوئی رقم دادا کو ان کے علاج کے لیے مل سکتی۔ لہٰذا سارہ نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں اور وصیت کے مطابق بینک میں موجود رقم اسے مل گئی۔ البتہ اس میں سے وکیل کو فیس کی ادائیگی ضرور کی گئی جو انکل کے مقدمے کی پیروی کے لیے کیا گیا تھا۔

سارہ جم کے قبضے میں وہ سارا سامان بھی چلا گیا جو ہمارے گھر کے باہر کھڑے ٹریلر میں رکھا ہوا تھا۔ سراغ رساں گریگوری اس ٹریلر کو اپنی کار میں باندھ کر لے گیا۔ سارہ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس طرح اس کا جھوٹ ثابت ہوگیا کہ اس کے گریگوری کے ساتھ کسی قسم کے ذاتی نوعیت کے تعلقات نہیں تھے۔ وہ اپنے ہمراہ ڈپٹی شیرف کو بھی لائے تھے مبادا مما یا دادا کوئی رکاوٹ ڈالیں۔

دادا نے اس معاملے میں بالکل مداخلت نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور ڈپٹی شیرف سے جھگڑا نہیں کر سکتے۔ البتہ تیس سال پہلے کہانی

[illegible] ہوتی۔

مما اس وقت کام پر گئی ہوئی تھیں۔ جب دادا نے انہیں اس بارے میں بتایا تو انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور بولیں کہ وہ دونوں یعنی سارہ اور گریگوری مجرمانہ ذہنیت کے حامل ہیں اور ایک دوسرے کے لیے بالکل موزوں ہیں۔ دادا اور مما کچن میں بیٹھے اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ دادا جیک کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ انکل مارٹن نے اپنی ساری رقم بینک میں کیوں رکھی۔ وہ مما سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

”اس نے کبھی بینک پر بھروسا نہیں کیا۔ وہ عام طور پر گھر میں ہی پیسے چھپا کر رکھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنے پیسے مٹی کے برتن میں رکھتا اور اسے زمین میں دبا دیا کرتا تھا۔“

مما اچانک اپنی کرسی سے اٹھیں اور دوڑتی ہوئی اس چھوٹے کمرے تک گئیں جہاں انکل سویا کرتے تھے۔ وہ کمرے کی ایک ایک چیز ہٹا کر پیسے تلاش کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے انہوں نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر آنے والی تھیں کہ ان کی نظر اچانک انکل کے پرانے سوٹ کیس پر گئی جو بستر کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں اسّی ہزار ڈالرز رکھے ہوئے تھے۔

مما نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ دادا بھی اپنی جگہ پر اچھل پڑے اور پڑوسی کا کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔

☆☆☆

بہار کا موسم آیا تو ہم تینوں یعنی میں، مما اور دادا، پکنک منانے مما کی نئی سبز رنگ کی کیمرو میں پائین ماؤنٹین گئے۔ مما اب بھی اسٹور پر کام کرتی تھیں لیکن انہوں نے اپنے استعمال کے لیے یہ کار خرید لی تھی۔ وہاں کسی کو اس سے غرض نہیں تھی کہ کار کے لیے پیسے کہاں سے آئے۔ وہ کام کے دوران اپنی گاڑی اسٹور کے باہر کھڑی کر دیتیں اور جب کام کی زیادتی سے پریشان ہو جاتیں تو کھڑکی میں سے جھانک کر اپنی نئی سواری کو دیکھنے لگتیں۔

دادا کا آپریشن ہوگیا تھا اور اب انہیں ہر چیز صاف نظر آنے لگی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا ایک بار پھر ان کے لیے حسین ہوگئی ہے۔ ہم تینوں پہاڑی کی اونچائی پر پکنک ٹیبل سجائے سینڈوچ کھانے اور گرد و نواح کا نظارہ کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک دادا نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ میرا ڈر کے مارے دم نکلنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دادا کی طبیعت بگڑ گئی ہے یا ان پر فالج وغیرہ کا حملہ ہوا ہے۔

مما بھی گھبرا گئیں اور بولیں۔ ”ڈیڈی! کیا ہوا۔ میں نے پہلے کبھی آپ کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

دادا بولے۔ ”ان خوب صورت مناظر کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ہماری زندگی میں کیا معجزہ رونما ہوا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مارٹن کے چھوڑے ہوئے پیسوں سے میری آنکھیں ٹھیک ہوگئیں اور تم نے نئی کار خرید لی۔ اس سے پہلے کیا ہم کبھی ان چیزوں کا تصور کر سکتے تھے۔ تم ساری عمر ملازمت کرتی رہتیں تب بھی میرے آپریشن کے لیے پیسے جمع نہ ہو سکتے اور کار خریدنے کے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ گو کہ مارٹن نے وعدے کے مطابق نئی وصیت نہیں بنوائی جس کے مطابق بینک میں رکھی ہوئی بقیہ رقم میرے حصے میں آتی لیکن دیکھا جائے تو اس نے ایک طرح سے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔“

”شاید اسے ڈر تھا کہ سارہ کہیں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر دے۔ اسی لیے اس نے اپنے باقی پیسے سوٹ کیس میں چھپا کر رکھ دیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ سارہ کو اس کا بینک بیلنس دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی ہوگی۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرح سے میرا اندھا ہونا اچھا ہی ثابت ہوا۔ یہ سب خدا کی مہربانی ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی سنا ہے کہ خدا غیب سے ہماری مدد کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں ان نعمتوں سے مالا مال کیا۔ واقعی مارٹن کی چھپائی ہوئی رقم ہمارے لیے کسی طرح بھی غیبی مدد سے کم نہیں۔“

میں ان دونوں کی سادگی پر ہنس رہا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں جان پائے تھے کہ انکل کی پیسے چھپانے کی عادت ہمارے کام آ گئی۔ پھر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ دادا نے مجھے گھورا اور بولے۔ ”تم کس بات پر ہنس رہے ہو لڑکے؟“

میں نے سینڈوچ کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ کیا مجھے آپ کو بھی یاد دلانا ہوگا کہ میرا نام ہرمن ہے۔“

مما مسکرانے لگیں اور دادا زوردار قہقہہ لگا کر ایک بار پھر خوب صورت نظاروں کے حسن میں کھو گئے۔

نیکی آباد

ملک صفدر حیات

قدرت کے قانون میں ایک بات بہت نمایاں ہے... عمل کا ردِّعمل... اور یہ عمل چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، رائگاں کبھی نہیں جاتا... چاہے ساری عمر رائگانی کے عذاب میں تمام ہوجائے مگر کوئی لمحہ ردِّعمل سے محفوظ نہیں۔ انہوں نے بھی جو بویا تھا ایک دن وہی کاٹنا تھا لیکن خوش قسمتی سے ان کے پاس کچھ ایسے بیج بھی تھے جن سے پھوٹنے والے پودے رفتہ رفتہ تناور درخت بنتے گئے اور ان کی گھنیری چھایا نے انہیں جلتی دھوپ سے بچالیا۔ تب انہیں احساس ہوا کہ انسان نادانی میں غلطیاں ہی نہیں کرتا بلکہ بے خبری میں کچھ نیکیاں بھی کرجاتا ہے جو دعا بن کر انہیں اپنے حصار میں لے لیتی ہیں... جس کا ادراک انسان کو بہت آخر میں ہوتا ہے۔ اسی لیے جانے انجانے میں نیکیاں کرتے رہنے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ جانے کب اجر کی ضرورت پیش آجائے۔

ایک چھوٹی سی نیکی سے ملے والے اجر عظیم کا ایک اثر انگیز واقعہ

ڈاکو اور چور میں کوئی زمین آسمان کا فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک آنکھیں دکھا کر زور زبردستی سے لوٹ مار کرتا ہے، دوسرا آنکھیں بچا کر چپکے سے چرا لے جاتا ہے۔ یہ بھی چند ایسے ہی کرداروں کی کہانی ہے جو چور بھی تھے، ڈاکو بھی تھے اور ہلاکو بھی تھے......

ایک ابر آلود صبح میں تھانے میں بیٹھا اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہا تھا کہ دو دیہاتی مجھ سے ملنے آ گئے۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ان میں سے ایک کا نام اللہ رکھا اور دوسرے کا فیض محمد معلوم ہوا۔ دونوں کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ میں نے انہیں آرام سے بٹھایا اور باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ لوگ کہاں سے آئے ہو؟''

''جناب! میرا تعلق فرید کوٹ سے ہے۔'' فیض محمد نامی آدمی نے بتایا پھر اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اللہ رکھا ریلوے پھاٹک پر ہوتا ہے۔''

فرید کوٹ میرے تھانے سے تھوڑے فاصلے پر ریلوے لائن کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور ریلوے کا پھاٹک فرید کوٹ سے چند قدموں کی دوری پر تھا۔ ان دونوں کی حالت بتاتی تھی کہ کسی بہت بڑی مصیبت نے انہیں میرے پاس آنے پر مجبور کیا تھا۔

''اس برستی بارش میں پولیس کے پاس آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' میں نے ایک بار پھر دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''تھانے دار صاحب! اللہ رکھا کی لڑکی کو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا ہے......'' فیض محمد نے بتایا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''پچھلی رات کا جی......'' اس مرتبہ اللہ رکھا نے براہ راست جواب دیا۔ ''کوئی آدھی رات کے وقت دو ڈاکو ہمارے کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے وہاں موجود ہر شے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ انہیں ہمارے کوارٹر میں کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ وہ اپنی مطلوبہ چیز کو ڈھونڈنے کے دوران میں صندل سے بار بار یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ تا جانے جنہیں جو نیلی پوٹلی دی تھی، وہ کہاں ہے جب وہ اس تلاش میں ناکام رہے تو جانے

ہوئے صندل کو اٹھالے گئے۔ ہم سب دیکھتے ہی رہ گئے جناب......“ لمحاتی توقف کرکے اللہ رکھا نے ایک گہری سانس لی پھر گلوگیر آواز میں بولا۔

”پتا نہیں، میری صندل کا کیا حال ہوگا......؟“

صندل یقیناً اللہ رکھا کی بیٹی کا نام تھا جسے ڈاکو اٹھالے گئے تھے۔ اللہ رکھا محکمۂ ریلوے کا ملازم تھا اور اس کی ڈیوٹی ریلوے پھاٹک پر تھی۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ پھاٹک کے نزدیک بنے ریلوے کوارٹر میں رہتا تھا۔ سب لوگ اسے ”پھاٹک والا“ کہتے تھے۔

”تمہارے کوارٹر میں کل کتنے افراد رہتے ہیں؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں، میری بیوی سلمٰی، صندل اور اس کا چھوٹا بیٹا سلطان......“ اس نے بتایا۔ ”اور...... صندل کو ڈاکو اٹھالے گئے ہیں۔“

”جب ڈاکو تمہاری بیٹی کو اٹھا رہے تھے، تم لوگوں نے مزاحمت نہیں کی......؟“

”مزاحمت کیا کرتے سرکار۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”وہ دونوں مسلح تھے۔ انہوں نے ہمیں خطرناک بندوقوں کے نشانے پر رکھ کر یہ کارروائی کی ہے۔“

”اگر وہ ڈاکو تمہارے سامنے لائیں جائیں تو تم انہیں پہچان لوگے؟“ میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک اہم سوال کیا۔

”نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں نے اپنے چہروں کو چھپانے کے لیے ڈھاٹے لگا رکھے تھے۔“

”یہ تاجا کون ہے......“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”اور نیلی پوٹلی کا کیا قصہ ہے؟“

”آپ مجھ سے، بڑی سے بڑی قسم لے لیں جناب۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ”میں نہ تو کسی تاجا کو جانتا ہوں اور نہ ہی نیلی پوٹلی کے بارے میں مجھے کچھ پتا ہے۔“

”لیکن......“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ان ڈاکوؤں نے بڑی شدت کے ساتھ تمہاری بیٹی سے پوچھا تھا کہ...... تاجا نے تمہیں جو نیلی پوٹلی دی تھی وہ کہاں ہے...... پوچھا تھا کہ نہیں؟“

”جی بالکل پوچھا تھا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہ صرف پوچھا تھا بلکہ اس منحوس پوٹلی کی تلاش میں ہمارے کوارٹر کی ہر شے اوپر نیچے کردی تھی۔“

”اس سے ظاہر ہوتا ہے......“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہاری بیٹی صندل کسی تاجا نامی بندے کو اچھی طرح جانتی ہے......“

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے جناب کہ ڈاکوؤں کو شدید قسم کی غلط فہمی ہوگئی ہو۔“ اللہ رکھا کا ساتھی فیض محمد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔“ میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”مگر اس کے امکانات ایک فیصد سے زیادہ نہیں۔ ڈاکوؤں نے پچھلی رات جس سرگرمی سے وہاں کارروائی کی ہے اور نیلی پوٹلی بازیاب نہ ہونے پر وہ صندل کو اٹھالے گئے تھے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں یقین تھا، کسی تاجا نے صندل کو کوئی نیلی پوٹلی دی تھی......“

”آپ صندل کو ڈاکوؤں کے قبضے سے نکالیں تو پھر ہی حقیقت کھل کر سامنے آئے گی۔“ اللہ رکھا بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔

”ابھی تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا ہے کہ تم دونوں میاں بیوی کے علاوہ صندل اور اس کا بیٹا سلطان بھی تمہارے ساتھ رہتا ہے۔“ میں نے معاملے کے ایک اہم پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا صندل تم لوگوں سے ملنے آئی ہوئی تھی یا وہ مستقل طور پر ادھر ہی رہتی تھی؟“

”جی وہ پچھلے ایک سال سے ہمارے پاس ہی رہ رہی ہے۔“ وہ دکھی لہجے میں بولا۔

”کیوں...... اس کا گھر والا کہاں ہے؟“

”نیاز علی نے ایک سال پہلے صندل کو طلاق دے دی تھی۔“ اللہ رکھا نے بتایا۔ ”جب سے وہ ہمارے پاس ہی ہے۔“

”اوہ......!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”اس طلاق کا کوئی خاص سبب تھا؟“

”ساس بہو کے اختلافات!“ اس نے جواب دیا۔ ”صندل کی اپنی ساس فضیلت سے ایک دن نہیں بنی تھی۔ دو تین سال لڑائی جھگڑے میں گزر گئے اور پھر کوئی ایک سال پہلے فضیلت صندل کو طلاق دلوانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔“

”نیاز علی کے صندل کے ساتھ کیسے تعلقات تھے؟“

”نہ اچھے اور...... نہ برے!“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”نیاز اپنی ماں کی بہت سنتا تھا اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ صندل کو طلاق دے کر اپنے گھر سے نہ نکالتا لیکن...... وہی بات ہے کہ وہ ماں کی بات کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ جو دو ڈھائی سال صندل نے جہال پور میں، نیاز علی کے ساتھ گزارے بھی تو اس میں صندل کی برداشت اور تحمل کا

ہاتھ تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو شادی کے دوسرے دن ہی واپس میکے آجاتی......“

”اللہ رکھا! یہ تو ہوتا ہے۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”جو شوہر اپنی ماں کے اتنے زیادہ فرماں بردار ہوتے ہیں کہ اس اطاعت گزاری میں وہ اپنی بیوی کے حقوق بھول جاتے ہیں، ان کا انجام کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔“

”نیاز علی تو اتنا بے حس اور پتھر دل نکلا ہے کہ اس ایک سال میں اسے اپنے بیٹے کی بھی یاد نہیں آئی۔“ وہ کڑوے انداز میں بولا۔ ”طلاق کے وقت بھی اس نے جھوٹے منہ بھی ایک بار یہ نہیں کہا تھا کہ وہ سلطان کو اپنے پاس رکھے گا۔“

”ہاں...... بعض لوگ ایسے ہی شقی القلب ہوتے ہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”رات والی کارروائی میں کہیں نیاز علی کا ہاتھ تو نہیں......؟“

”میرا نہیں خیال کہ اس اغوا میں نیاز علی کا ہاتھ ہو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”باقی...... آپ کی تفتیش ہی سے صحیح صورت حال کا پتا چلے گا۔“

”تفتیش......!“ میں نے گمبھیر انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”تم لوگ تھانے کیسے پہنچے ہو...... میرا مطلب ہے، کس سواری سے؟“

”جی...... ہم تانگے میں بیٹھ کر آئے ہیں۔“ فیض محمد نے جواب دیا۔

”تانگا چھوڑ دیا یا......؟“

”باہر کھڑا ہے جناب۔“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اللہ رکھا بول اٹھا۔ ”ہم اسی میں واپس جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں بیٹھو۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”میں بھی چلتا ہوں تم لوگوں کے ساتھ......“

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

جب ہم ریلوے پھاٹک تک پہنچے تو ہلکی بارش کا سلسلہ رک چکا تھا۔ یہ بارش آج علی الصباح ہی شروع ہوئی تھی۔ وہ فروری کا مہینا تھا۔ موسم سرما رخصت ہورہا تھا تاہم پچھلے چند روز سے جو گاہے بگاہے ہلکی اور کبھی تیز بارش ہونے لگی تھی اس نے جاتی ہوئی سردیوں کو پیچھے سے آواز دے کر کچھ عرصے تک مزید روک لیا تھا۔ فضا میں موجود خنکی لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتی تھی۔ میں نے تھانے سے نکلتے ہوئے کانسٹیبل ناصر کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

ریلوے لائن کے ساتھ قدرے نشیب میں ایک مخصوص طرز کا سرکاری کوارٹر نظر آرہا تھا جیسا کہ پھاٹک کے پاس عموماً بنے ہوتے ہیں۔ اللہ رکھا اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ اس کوارٹر میں رہتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی، ٹرینوں کی آمدورفت کے اوقات میں پھاٹک کو بند کرنا اور ٹرینوں کو دن میں سبز جھنڈی اور رات میں سبز بتی دکھانا تھا۔ وہ اپنے شب و روز سے مطمئن تھا کہ اچانک اس پر ایک افتاد ٹوٹ پڑی۔ دو نامراد ڈاکوؤں نے اس کے گھر میں خاصی افراتفری مچائی تھی اور اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد وہ اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ راستے میں اللہ رکھا نے مجھے بتایا تھا کہ دونوں ڈاکو گھوڑوں پر سوار ہوکر وہاں پہنچے تھے۔

میں نے پندرہ بیس منٹ تک نہایت ہی توجہ کے ساتھ اللہ رکھا کے کوارٹر کا جائزہ لیا۔ گھریلو سامان اور مختلف اشیا کی افراتفری سے بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں کو وہاں کسی بہت ہی قیمتی اور اہم شے کی تلاش تھی اور وہ شے نیلی پوٹلی کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ ڈاکوؤں کے جارحانہ استفسار کی روشنی میں مذکورہ پوٹلی کسی تاجا نامی شخص نے صندل کو دی تھی لیکن اللہ رکھا کسی تاجا یا نیلی پوٹلی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

صندل کا بیٹا سلطان تین، سوا تین سال کا ایک خوب صورت اور گول مٹول بچہ تھا۔ وہ حالات کی سنگینی سے کما حقہ آگاہ نہیں تھا لہٰذا کھیل کود میں مصروف تھا۔ جائے وقوعہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد میں اللہ رکھا کی بیوی سلمٰی سے بات چیت کرنے لگا۔ اللہ رکھا اپنی پھاٹک والی ڈیوٹی میں مصروف ہوگیا تھا۔ اس وقت تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین پسنجر اور دو مال گاڑیاں وہاں سے گزرتی تھیں اور ہر گاڑی کی آمد سے چند منٹ پہلے پھاٹک بند کرنا اس کے فرائضِ منصبی کا حصہ تھا۔ وہ ایک کچی سڑک جس پر ریلوے پھاٹک بنا ہوا تھا وہ زیادہ مصروف نہیں تھی۔ اکادکا بیل گاڑیاں، تانگے یا سائیکل سوار وہاں سے گزرا کرتے تھے یا پھر ڈھورڈنگر کی لمبی قطاریں۔ بہرحال، پھاٹک بند کرکے آنے والی گاڑی کو ہری جھنڈی یا ہری بتی دکھانا اس کا فرض تھا۔ محکمۂ ریلوے اسی کام کی اسے تنخواہ دیتا تھا۔

سلمٰی بی بی ادھیڑ عمر کی ایک قبول صورت عورت تھی۔ بیٹی کے اغوا پر ظاہر ہے، وہ بھی بہت افسردہ اور دل شکستہ تھی۔ میں نے اس سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''سلمیٰ! تم لوگوں کے ساتھ رات جو بھی واقعہ پیش آیا اس کا مجھے بہت دکھ ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں لیکن اس کام کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہوگی۔''

''ہم ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں تھانے دار صاحب......'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ کسی بھی طرح میری صندل کو واپس لے آئیں۔''

''انشاء اللہ! وہ بہت جلد تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''سلمیٰ! تم ان ڈاکوؤں کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''جی...... وہ دو تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''آدھی رات کو گھوڑوں پر سوار ہوکر یہاں پہنچے تھے۔ دونوں کے پاس بندوقیں تھیں اور انہوں نے ڈھاٹوں میں اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ بہت ہی ظالم اور وحشی تھے...... بس، میں اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''یہ سب تو تمہارا خاوند اللہ رکھا مجھے بتا چکا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ان ڈاکوؤں کی شناخت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں تاکہ ان تک پہنچنے میں مجھے آسانی حاصل ہو۔''

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ایسی تو کوئی بات ہمیں پتا نہیں۔''

''اللہ رکھا نے مجھے جو حالات بتائے ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ڈاکو تمہاری بیٹی صندل کو اچھی طرح جانتے تھے۔'' میں نے سلمیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''انہوں نے کسی تاجا اور نیلی پوٹلی کا بھی ذکر کیا تھا۔ ان کے مطابق انہیں کسی نیلی پوٹلی کی تلاش تھی جو تاجا نے صندل کو دی تھی۔''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' سلمیٰ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جب صندل نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا اور نیلی پوٹلی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو انہوں نے منحوس پوٹلی کی تلاش میں ہمارا پورا گھر الٹ کر رکھ دیا۔ آپ نے ہمارے سامان کی حالت دیکھی ہے نا۔''

''ہاں دیکھی ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''اس افراتفری سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ نیلی پوٹلی ان کے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ جب وہ پوٹلی تلاش کرنے میں ناکام رہے تو تمہاری بیٹی کو اٹھا لے گئے......''

''جی، وہ نامراد میری صندل کو اٹھا لے گئے......'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

''وہ لوگ جاتے ہوئے آپ کو کوئی دھمکی وغیرہ بھی دے کر گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی...... ہمیں تو کوئی دھمکی نہیں دی پر......''

''پر کیا......؟'' وہ بولتے بولتے اٹکی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

''جناب! جب وہ صندل کو گھوڑے پر لاد رہے تھے تو ان میں سے ایک نے کہا تھا......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں کہ یہاں بیٹھ کر تم سے سوال جواب کریں۔ تاجا کے پاس پہنچ کر خود ہی تمہاری زبان کھل جائے گی۔''

سلمیٰ کی زبان سے یہ ایک اہم انکشاف ہوا تھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکو صندل کو تاجا کے پاس لے کر گئے ہیں؟''

''سوہنا رب ہی بہتر جانتا ہے جی۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہم نے تو تاجا کا نام پہلی بار ڈاکوؤں کی زبان سے سنا ہے۔ پتا نہیں، بیٹھے بٹھائے ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔''

''ایک بات تو طے ہے سلمیٰ بی بی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ لوگوں کو پتا ہو یا نہ ہو لیکن صندل ضرور کسی تاجا کو جانتی ہے۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر وہ لوگ آدھی رات کو ایسی کارروائی نہیں کرسکتے اور جہاں تک اس نیلی پوٹلی کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی کوئی فرضی کہانی نہیں۔ صندل جانتی ہو یا نہیں جانتی ہو مگر نیلی پوٹلی کا اپنا ایک وجود ضرور ہے جو ڈاکوؤں کے مطابق تاجا نے صندل کو دی تھی۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھانے دار صاحب کہ یہ کیا چکر ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''سب چکر سمجھ میں آجائے گا اگر تاجا کا سراغ مل جائے تو۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اپنے ذہن پر زور دو سلمیٰ بی بی...... تاجا تک پہنچے بغیر تمہاری بیٹی سلمیٰ کو واپس نہیں لایا جاسکتا......''

''ذہن پر کیا زور دوں جی؟'' وہ پریشانی سے بولی۔ ''یہ نام پہلے کبھی سنا ہی نہیں۔''

میں نے صندل کی سسرال کے حوالے سے بھی گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے لیکن کام کی کوئی بات سامنے نہ آسکی۔ سلمیٰ کا خیال بھی اللہ رکھا کے ذہن کی عکاسی کرتا

دکھائی دیا تھا کہ گزشتہ رات والے افسوسناک واقعے میں صندل کے سابق شوہر نیاز علی یا اس کے گھر والوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہوسکتا تھا۔

''جس وقت ڈاکوؤں نے تمہارے کوارٹر پر یلغار کی، تم لوگوں نے چیخنے چلانے یا لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے کی کوشش نہیں کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ جناب کہ ہم مسلح ڈاکوؤں کو دیکھ کر دہشت میں آگئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور اگر ہم چیخ چلا کر کسی کو مدد کے لیے پکارتے بھی تو کون آتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا، یہاں قریب میں کوئی آبادی وغیرہ بھی تو نہیں......''

اس کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں شہری یا دیہی آبادی میں اس قدر پھیلاؤ نہیں آیا تھا۔ میں اس وقت جس ریلوے پھاٹک پر کھڑا تھا وہاں سے نزدیک ترین آبادی موضع فرید کوٹ تھی جو اللہ رکھا کے کوارٹر سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ فیض محمد کا تعلق موضع فرید کوٹ ہی سے تھا جو اللہ رکھا کے ساتھ اس افسوس ناک واقعے کی رپورٹ درج کرانے تھانے پہنچا تھا۔

میں نے سلمیٰ سے پوچھا۔ ''رات کو جس وقت ڈاکو یہاں کارروائی کررہے تھے، صندل کا بیٹا کہاں تھا...... کیا یہ سارا تماشا اس معصوم بچے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟''

''سلطان اس وقت سو رہا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا ورنہ اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ یہ صندل کو نہ پاکر خاصا اداس تو ہے لیکن ابھی تک اس نے ہنگامہ مچانے کی کوشش نہیں کی۔''

''تمہیں بڑی توجہ سے اس کا خیال رکھنا ہوگا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ مچل گیا تو تمہارے لیے بڑی مشکل ہوجائے گی۔''

''مجھے یقین ہے، میں اسے سنبھال لوں گی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''یہ پچھلے ایک سال سے میری ہی گود میں پل رہا ہے۔ صندل اس کی ماں ضرور ہے لیکن اس کا زیادہ تر وقت میرے پاس ہی گزرتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے دور کھیلتے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ دعا کرو، میں جلد از جلد صندل کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔''

''آمین......!'' اس نے تہ دل سے کہا۔

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اللہ رکھا بھی آگیا۔ اس نے آکر بتایا۔ ''اب دو گھنٹے تک ادھر سے کسی گاڑی کا گزر نہیں ہوگا لہٰذا میں فارغ ہی ہوں۔''

میں نے اللہ رکھا سے بھی مختلف سوالات گھما پھرا کر کیے لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہ آسکی جس کے سہارے میں ان دو ڈاکوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوسکتا۔ ان لوگوں نے ڈاکوؤں کے چہرے نہیں دیکھے تھے۔ وہ انہیں آواز سے بھی نہیں پہچانتے تھے۔ نیلی پوٹلی اور تاجا کے حوالے سے بھی انہوں نے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ان حالات کی روشنی میں اللہ رکھا سے پوچھا۔

''تم نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ وہ ڈاکو کس طرف گئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ لوگ اس طرف اندھیرے میں گم ہوگئے تھے......''

اللہ رکھا نے جس سمت اشارہ کیا تھا، یہ وہی کچی سڑک تھی جس پر ریلوے پھاٹک بنا ہوا تھا۔ مذکورہ سڑک مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق کی طرف جاتی تھی اور اللہ رکھا نے دونوں ڈاکوؤں کو مغرب کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں پر سوار تھے اور اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو بھی اپنے ساتھ اٹھا لے گئے تھے۔

سمت کا تعین تو ہوگیا تھا لیکن علی الصباح ہونے والی بارش نے تفتیشی مراحل میں خاصی پیچیدگی پیدا کردی تھی۔ میں گھوڑوں کے کھرے کی مدد سے ڈاکوؤں کی تلاش کا کام جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں تانگے میں بیٹھ کر اس کچی سڑک پر کافی آگے تک گیا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ڈاکو کس طرف گئے ہوں گے۔ مذکورہ سڑک کی دونوں جانب سرسبز و شاداب کھیتوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ یہ واردات پچھلی رات کو پیش آئی تھی۔ کم و بیش اس واقعے کو بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تک تو وہ ڈاکو پتا نہیں، کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ فوری طور پر ان کے خلاف کوئی بھی عملی کارروائی ممکن نہیں تھی۔ وہ آج کل کا تیز رفتار زمانہ نہیں تھا کہ میں فون کھڑکا کر اردگرد کے علاقوں کو چوکنا کردیتا۔ بہرحال، میری سوچ صرف دو نکات پر رک سی گئی تھی۔ نمبر ایک، تاجا...... نمبر دو، نیلی پوٹلی!

اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوجاتیں تو میں بہ آسانی ان ڈاکوؤں تک پہنچنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ بارش نے سارا کام خراب کردیا تھا ورنہ میں کھوجی کی مدد سے یہ ضرور جان لیتا کہ وہ نامراد ڈاکو کدھر سے آئے تھے اور کہاں گئے تھے۔

تمام تر صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے تسلی بخش لہجے میں اللہ رکھا سے کہا۔ ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں انشاءاللہ! بہت جلد تمہاری بیٹی کو بازیاب کرلوں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جناب۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک کام کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کردی۔ ”اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو اور کسی طرح بھی یہ جاننے کی کوشش کرو کہ ”تاجا“ اور ”نیلی پوٹلی“ کا کیا قصہ ہے۔ اگر اس راز سے پردہ اٹھ گیا تو پھر یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ ڈاکو کون لوگ تھے اور وہ تمہاری بیٹی صندل کو کہاں لے گئے ہیں۔“

”جی اچھا..... میں پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”صندل کے علاوہ بھی وہ ڈاکو تمہارے گھر سے کچھ اٹھا لے گئے ہیں؟“

”نہیں جی..... کچھ بھی نہیں۔“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں کسی نیلی پوٹلی کی تلاش میں آئے تھے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جو ان کے خیال میں کسی تاجا نے صندل کو دی تھی۔ سلمٰی نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ڈاکو جاتے ہوئے یہ کہہ گئے ہیں کہ وہ لوگ صندل کو تاجا کے پاس لے کر جارہے ہیں.....؟“

”جی.....“ اللہ رکھا نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”انہوں نے یہ بات کی تھی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تاجا ان کے قبضے میں ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ان کی اصل دشمنی تاجا سے ہے اور یہ دشمنی کسی نیلی پوٹلی کی وجہ سے ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ تاجا نے نیلی پوٹلی صندل کو دی تھی۔ یقیناً یہ بات تاجا ہی نے انہیں بتائی ہوگی۔ وہ صندل کے دشمن نہیں ہیں۔ اگر مذکورہ نیلی پوٹلی انہیں حاصل ہوجائے تو وہ صندل کو چھوڑ دیں گے۔“

”جناب! آپ کی ساری بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔“ اللہ رکھا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”لیکن مسئلہ تو نیلی پوٹلی اور تاجا کا ہے نا..... ہم نہ تو کسی تاجا کو جانتے ہیں اور نہ ہی کسی نیلی پوٹلی کا ذکر سنا ہے۔“

بولتے بولتے اللہ رکھا کی آواز بھرا گئی تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”اللہ رکھا! مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم تاجا اور نیلی پوٹلی کے بارے میں جاننے اور سراغ لگانے کی کوشش کرو۔ میں بھی ان ڈاکوؤں کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اللہ کے حکم سے تمہاری بیٹی جلد ہی مل جائے گی۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب!“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے حکم کے مطابق ضرور کوشش کروں گا۔“

میں اللہ رکھا کو تسلی دلاسا دے کر واپس آگیا۔

☆☆☆

اگرچہ میں اللہ رکھا اور اس کی بیوی سلمٰی کو یہ یقین دلا آیا تھا کہ میں بہت جلد ان کی بیٹی صندل کو ڈھونڈ نکالوں گا لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے ڈاکوؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میری سوچ کی تان گھوم پھر کر ”تاجا“ اور ”نیلی پوٹلی“ پر ہی ٹوٹتی تھی۔ میرا ذاتی تجربہ اس واردات کے بارے میں کچھ اس طرح تھا۔

وہ دو ڈاکو جو تاحال نامعلوم تھے ان کی صندل سے کسی قسم کی دشمنی نہیں تھی۔ ان کا اصل شکار تاجا نامی کوئی شخص تھا جو اس وقت ان کے قبضے میں تھا۔ وہ تاجا سے کسی نیلی پوٹلی کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مذکورہ نیلی پوٹلی میں یقیناً کوئی نہایت ہی قیمتی شے مثلاً طلائی زیورات یا کوئی تگڑی نقدی موجود تھی۔ اس بات کے امکانات بھی موجود تھے کہ تاجا نے جھوٹ بولا ہو۔ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس نے صندل کا نام لے دیا ہو۔ کچھ بھی تھا لیکن ایک بات کا مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اللہ رکھا کی مغوی بیٹی صندل کسی تاجا کو ضرور جانتی تھی۔

جب میں تھانے پہنچا تو بارش کا سلسلہ ایک بار پھر جڑ چکا تھا۔ ہلکی پھلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔ موسم میں اگرچہ ابھی خاصی خنکی موجود تھی لیکن میری نظر میں یہ بڑا خوشگوار اور رومانٹک موسم تھا۔

اس ڈرامائی بارش کی وجہ سے اگرچہ کھرے کھوج کا کوئی امکان تو باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میرے تھانے کی حدود میں سے گزشتہ رات دو ڈاکوؤں نے ایک عورت کو اغوا کرلیا تھا۔ میں مغوی کی بازیابی تک سکون کی سانس کیسے لے سکتا تھا۔

وقوعہ سے نزدیک ترین تین گاؤں واقع تھے۔ نصف میل شمال میں ریلوے کی پٹری کے ساتھ موضع فریدکوٹ، مشرق میں کچے راستے کے کنارے، ریلوے پھاٹک سے لگ بھگ دو میل کے فاصلے پر موضع شاہ پور اور مغربی سمت تین میل کی دوری پر جمال پور۔ جمال پور وہی گاؤں تھا جہاں صندل بھی بیاہ کر گئی تھی اور پھر ایک سال پہلے طلاق لے کر واپس آگئی تھی۔

میں نے اپنے عملے کے تین ہوشیار قسم کے اہلکاروں کو سادہ لباس میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ان تینوں موضعات کی جانب روانہ کردیا۔ انہیں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ کسی تاجا نامی شخص کے بارے میں پتا چلانا تھا یا کسی ایسے بندے کا سراغ لگانا تھا جو اپنے علاقے سے پراسرار طور پر غائب ہوگیا ہو۔ میرا ذہن اس زاویے پر بھی سوچ رہا تھا کہ عین ممکن ہے، ڈاکوؤں نے جس شخص کو ”تاجا“ کہا، درحقیقت اس کا نام کوئی اور ہو......

تین اہلکاروں کو برستی بارش میں تین مختلف گاؤں کی سمت روانہ کرنے کے بعد بھی مجھے چین نہیں آیا تھا۔ میرا ذہن مسلسل اس معمے کو حل کرنے میں مصروف تھا۔ ڈاکوؤں نے صندل کو گھوڑے پر لادنے کے بعد جس طرف کا رخ کیا تھا، وہ سمت بھی میری سوچ میں تازہ تھی۔ یہ وہ کچا راستہ یا کچی سڑک تھی جو کھیتوں کے بیچوں بیچ مشرق سے مغرب کی جانب چلی جارہی تھی اور انتہائی مغرب میں جاکر یہ کچی سڑک چک چون نامی ایک گاؤں کی زمین پر ختم ہوجاتی تھی تاہم چک چون جائے وقوعہ سے لگ بھگ بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس بات کے زیادہ امکانات نہیں تھے کہ ڈاکو صندل کو چک چون لے کر گئے ہوں گے۔ میرے اندازے کے مطابق انہوں نے بیچ میں کہیں اپنا راستہ بدل لیا ہوگا کیونکہ ایک ڈاکو کا یہ کہنا کہ...... وہ صندل سے باقی کی پوچھ گچھ تاجا کے سامنے کریں گے، اس امر کا ثبوت فراہم کرتا تھا کہ تاجا کو انہوں نے جائے وقوعہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں رکھا ہوگا۔ یہاں پر ایک بات کا خاص طور پر ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چک چون ایک سرحدی گاؤں تھا۔ اس کی دوسری جانب دوسرے ضلع کی حدود شروع ہوجاتی تھی۔ میرا ابھی چک چون جانا تو نہیں ہوا تھا۔ یہ گاؤں میرے تھانے کی حدود میں بھی نہیں آتا تھا البتہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ چک چون میں چودھری حیات اللہ کی عملداری تھی۔

جہاں میں نے اپنے تھانے کی حدود کی اتنی زیادہ تفصیلات بیان کردی ہیں وہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس کچے راستے کے متوازی، جنوب مشرق سے شمال مغرب کی سمت ایک نہر بھی رواں دواں تھی۔ یہ کچی سڑک مشرق میں نہر سے ذرا ہٹ کر تھی لیکن مغرب میں آگے جاکر نہر کے اوپر سے گزر کر قدرے ترچھی ہوکر سرحدی گاؤں تک چلی گئی تھی۔ گویا اس پل کے بعد نہر اور کچی سڑک کے درمیان فاصلہ بتدریج بڑھتا چلا گیا تھا۔ جائے وقوعہ پر یعنی ریلوے پھاٹک کے مقام پر نہر اور کچی سڑک میں کم و بیش ایک فرلانگ کا فاصلہ حائل تھا۔ جائے وقوعہ سے لگ بھگ تین میل آگے جاکر ایک پل کی مدد سے سڑک، نہر کے اوپر سے گزر جاتی تھی۔ میرا خیال ہے، اس تفصیل کے بعد اس علاقے کا نقشہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہوگیا ہوگا۔

دوپہر کے بعد بارش ایک مرتبہ پھر رک سی گئی۔ بہت ہی ہلکی پھلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر تھانے کے احاطے میں ٹہلنے لگا۔ اس دوران میں میرا ذہن مسلسل صندل کے اغوا کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ اہلکار واپس آگیا جسے میں نے تاجا کی ”تلاش“ میں فریدکوٹ بھیجا تھا۔ مذکورہ اہلکار نے مجھے جو رپورٹ دی اس کے مطابق فریدکوٹ میں تاجا نامی کوئی شخص رہائش پذیر نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فریدکوٹ میں رہنے والے افراد میں سے کوئی گم نہیں تھا۔ وہاں سب امن و امان چل رہا تھا البتہ صندل کے اغوا والی بات سے پورا فریدکوٹ آگاہ ہوچکا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کیونکہ آج صبح اللہ رکھا کے ہمراہ جو شخص صندل کے اغوا کی رپورٹ درج کرانے آیا تھا اس کا تعلق موضع فریدکوٹ ہی سے تھا۔

اگلی صبح بڑی چمکیلی مگر خوشگوار تھی۔ آج آسمان پر دور دور تک بادلوں کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ شاہ پور جانے والا کانسٹیبل لوٹ آیا۔ وہ اپنے ساتھ وہاں کے ایک رہائشی کبیر احمد کو بھی لے کر آیا تھا۔ میں نے فوراً دونوں کو اپنے پاس بلالیا۔ کانسٹیبل نے مجھے جو تفصیلات بتائیں ان کے مطابق کبیر احمد کا بیٹا پچھلے دو دن سے غائب تھا البتہ ”تاجا“ کے بارے میں شاہ پور سے بھی کوئی سن گن نہیں مل سکی تھی۔

کبیر احمد کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان نظر آتی تھی۔ وہ پستہ قامت اور دوہرے بدن کا مالک تھا جس کے کندھے معمولی سے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کانسٹیبل کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور کبیر احمد کی جانب متوجہ

ہوگیا۔

''تمہارے بیٹے کا نام کیا ہے کبیر احمد؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اسلم جی......'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن سب اسے ''اچھو'' کہتے ہیں جناب۔ وہ میرے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ پتا نہیں، کہاں چلا گیا......'' بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

''وہ دو دن سے غائب ہے۔'' میں نے کبیر احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ابھی تک اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کیوں نہیں کرائی؟''

''ایک آدھ دن کے لیے تو وہ پہلے بھی اِدھر اُدھر ہوجایا کرتا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس لیے میں نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی...... اور اب تو دو دن ہوگئے ہیں۔''

''کبیر احمد! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اچھو تمہارے بڑھاپے کا سہارا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اس کے علاوہ تمہاری کوئی اولاد نہیں......؟''

''جی نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''بس ہم دونوں ہی ادھر شاہ پور میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔''

''اور تمہاری بیوی وغیرہ......؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''جناب! میں نے تو شادی ہی نہیں کی۔'' وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''جب شادی نہیں کی تو بیٹا کہاں سے آگیا؟''

''وہ جی...... میرا اپنایا ہوا بیٹا ہے......''

''بنایا ہوا...... مطلب منہ بولا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''گویا تم نے اپنے کسی رشتے دار کی اولاد کو بیٹا بنایا ہوا ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اس کے والدین سے جا کر پوچھنا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے، پچھلے دو دن سے وہ اپنے سگے ماں باپ کے پاس ہو۔''

''نہیں جی، ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ خاصی فکرمندی سے بولا۔ ''اس کا کوئی عزیز رشتے دار اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ''کبیر احمد! وہ تمہارے ہتھے کیسے چڑھ گیا تھا؟''

''جناب! یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''شاہ پور میں ہر سال میلا لگتا ہے۔ وہ مجھے میلے میں ملا تھا۔ جلد ہی وہ میرے بہت قریب آگیا۔ ہمارے درمیان اچھی خاصی ہم آہنگی ہوگئی۔ اس کے پاس ہنر تھا مگر رہنے کا ٹھکانا نہیں تھا۔ میرے پاس شاہ پور میں ایک چھوٹا سا گھر ہے مگر کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں۔ اچھو نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اسے اپنے گھر رہائش کی جگہ دے دوں تو وہ مجھے رزق روزگار سے بالکل بے نیاز کردے گا۔ کمائے گا وہ، کھائیں گے ہم دونوں......''

''ہوں......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھو کے پاس کمائی کا ایسا کون سا ہنر تھا؟''

''تھانے دار صاحب! وہ سموسے، پکوڑے اور آلو لڈو کھٹائی والے بنانے کا ماہر ہے۔'' کبیر احمد نے بتایا۔ ''وہ صبح چھابڑی لے کر گھر سے نکل جاتا تھا اور دن ڈھلنے پر واپس آتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں دیہات میں گھوم پھر کر اپنا تیار کردہ سامان بیچتا تھا۔ وہ یہاں آپ کے علاقے تک بھی آتا ہے۔ اچھو کو پیدل چلنے کا بہت شوق ہے۔''

''ٹھیک ہے کبیر احمد۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم دو میل کا سفر طے کرکے میرے پاس آئے ہو۔ میں اچھو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرلیتا ہوں۔ تم مطمئن ہوکر واپس جاؤ۔ میں جلد از جلد اسے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔''

''آپ ضرور اچھو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کریں تھانے دار صاحب۔'' وہ میرے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ابھی میں آپ کے پاس ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔''

اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ذہن میں اچھو کی گمشدگی سے بھی زیادہ اہم کوئی چیز موجود تھی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کون سا خاص مقصد کبیر احمد؟''

''آپ کا جو آدمی کسی تاجا کی تلاش میں شاہ پور گیا تھا، میں نے اسے بھی اپنے مقصد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' وہ نہایت ہی رازداری سے بولا۔ ''سنا ہے، یہاں پھاٹک والے کی لڑکی کو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا ہے......''

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے کبیر احمد......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو دو ڈاکوؤں نے واقعی اغوا کرلیا ہے اور میرے اندازے کے مطابق تاجا جانتا ہے کہ صندل کو کیوں اغوا کیا گیا ہے......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے اسے صندل کے اغوا کی تفصیل سے آگاہ

کردیا۔

پوری توجہ سے اس نے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔ ''یہ تو بہت بُرا ہوا جناب۔''

''ہاں واقعی...... بہت بُرا ہوا۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''تم نے ابھی تک اپنے مقصد کی وضاحت نہیں کی۔ کیا تمہارے پاس تاجا یا صندل کے حوالے سے کچھ معلومات ہیں؟''

''میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھانے دار صاحب۔'' وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں جی۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد کبیر احمد نے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے مذکورہ تصویر اس کے ہاتھ سے لی اور اس پر نظر جما دی۔ وہ پچیس سے تیس سال تک کی ایک عورت کی تصویر تھی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر کبیر احمد کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کون ہے یہ؟''

''میں اس عورت کو بالکل نہیں جانتا۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

''یہ تصویر تمہیں کہاں سے ملی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور مجھے دکھانے کا آخر مقصد کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے، آپ اس تصویر کی مدد سے اچھو کو تلاش کرسکتے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ مجھے اچھو کے سامان سے ملی ہے۔''

''اوہ......'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔ ''اس کا مطلب ہے، تمہارا اچھو اس عورت کے ساتھ پیار کی پینگیں چڑھا رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس عورت کو بھگا لے گیا ہو......؟''

''مجھے بھی اسی چیز کا خدشہ ہے جناب۔'' وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے، یہ عورت شاہ پور کی رہنے والی نہیں۔ آپ کو تصویر دینے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اسے اپنے آس پاس کے علاقوں میں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ وہ سارا دن چھابڑی اٹھائے نگر نگر گھومتا رہتا تھا۔ پتا نہیں، کہاں کس کے ساتھ ٹاکرا ہوگیا ہو۔''

''ہاں کبیر احمد، یہ تم نے اچھی راہ سجھائی ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم اس تصویر کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ اگر یہ پتا چل گیا کہ یہ کون ہے، کہاں کی رہنے والی ہے تو اس کی مدد سے اچھو کو ڈھونڈنے میں کافی آسانی ہوجائے گی۔''

کبیر احمد نے میرا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر تھانے سے رخصت ہوگیا۔ میں موجودہ صورتِ حال پر غور و فکر کرنے لگا۔

صندل کے اغوا اور ڈاکوؤں کے حوالے سے نیلی پوٹلی اور تاجا والا معاملہ ابھی حل نہیں ہوا تھا کہ کبیر احمد اچھو کی گمشدگی کا قصہ لے کر آگیا تھا۔ جو تصویر اچھو کے سامان میں سے نکلی تھی، اس عورت کا یقیناً اچھو کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق رہا ہوگا۔ اگر میں تصویر والی عورت تک پہنچ جاتا تو اس کی مدد سے اچھو کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ بہرحال، اچھو کی گمشدگی سے کہیں زیادہ اہم معاملہ صندل کے اغوا کا تھا جس کے حوالے سے تاحال کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اب مجھے اس پولیس اہلکار کی واپسی کا انتظار تھا جسے میں نے موضع بنال پور کی طرف روانہ کیا تھا۔

☆☆☆

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے فیض محمد میرے پاس آیا۔ یہ بندہ موضع فرید کوٹ کا رہنے والا تھا اور اللہ رکھا کا دوست بھی تھا۔ میں نے اسے فوراً اپنے پاس بلالیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

''فیض محمد! اور کیا خبریں ہیں؟''

''خبریں اچھی نہیں ہیں جناب۔'' وہ اپنے لہجے میں اداسی سموتے ہوئے بولا۔ ''اللہ رکھا کی حالت بہت خراب ہے۔ میں اسی کے کہنے پر آپ سے ملنے آیا ہوں جی۔ وہ اپنی بیٹی صندل کے لیے بہت پریشان ہے۔''

''میں بڑی شد و مد سے صندل اور ان نامراد ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''انشاء اللہ! میں بہت جلد اس مقصد میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جی......!'' وہ خلوصِ دل سے بولا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''فیض محمد! تم کسی اچھو کو جانتے ہو؟''

''اچھو......!'' وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ''کیا یہ بندہ فرید کوٹ کا رہنے والا ہے؟''

''فرید کوٹ کا نہیں، شاہ پور کا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو چھابڑی اٹھائے آلو لڈو کھٹائی والے بیچتا پھرتا تھا......؟''

''اچھا اچھا...... وہ اچھو۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس اچھو کو تو میں کیا، پورا علاقہ

جانتا ہے۔ اس کے سموسے اور آلو لڈو کھٹائی والے بہت چٹ پٹے اور مزے کے ہوتے ہیں۔ میں نے خود کئی بار لے کر کھائے ہیں......" وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھو کو کیا ہوا جناب...... آپ نے ایسا کیوں کہا کہ وہ آلو لڈو کھٹائی والے بیچتا پھرتا تھا۔ کہیں وہ......؟"

"وہ پچھلے دو دن سے غائب ہے۔" میں نے فیض محمد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے اچھو کا باپ کبیر احمد شاہ پور سے میرے پاس آیا تھا، اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے۔"

میں نے کبیر احمد کا جان بوجھ کر ذکر کیا تھا تاکہ یہ جان سکوں کہ آیا فیض محمد اس حقیقت سے آگاہ ہے یا نہیں کہ اچھو، کبیر احمد کا سگا بیٹا نہیں تھا لیکن فیض محمد نے اس حوالے سے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اچھو بھلا کہاں گم ہوسکتا ہے۔ میں نے دو تین دن پہلے بھی اس سے آلو لڈو کھٹائی والے لے کر کھائے تھے بلکہ...... یہ اسی دن کی بات ہے جب صندل کو اغوا کیا گیا ہے یعنی جس دن میں نے اچھو سے آلو لڈو کھٹائی والے لیے تھے اس آنے والی رات میں صندل کو اغوا کیا گیا تھا۔"

"مجھے پتا چلا ہے......" میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک چال چلی۔ "اچھو اکیلا ہی گم نہیں ہوا......"

"اکیلا گم نہیں ہوا۔" اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ "اس بات کا کیا مطلب ہے جی......؟"

"مطلب یہ کہ وہ اپنے ساتھ ایک عورت کو بھی بھگا لے گیا ہے۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس عورت کا تعلق تمہارے گاؤں فرید کوٹ سے ہے......"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔" وہ اچھل پڑا۔ "آپ کس عورت کا ذکر کر رہے ہیں...... فرید کوٹ سے تو کوئی بھی عورت غیر حاضر نہیں۔ اگر ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو میں کیسے بے خبر رہ سکتا تھا......؟"

"اس عورت کی تصویر ہے میرے پاس۔" میں نے اپنی میز کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے، دیکھ کر تم اسے پہچان جاؤ۔"

میں نے اپنی میز کی دراز سے وہ تصویر نکال لی جو کبیر احمد نے مجھے دی تھی، پھر میں نے مذکورہ تصویر کو فیض محمد کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی تو اچھل پڑا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"یہ...... یہ تو صندل ہے...... اللہ رکھا کی بیٹی......"

اس کے انکشاف نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے چبھتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "فیض محمد! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ اسی صندل کی تصویر ہے جسے ڈاکوؤں نے اللہ رکھا کے کوارٹر سے اغوا کرلیا ہے؟"

"جناب! اس میں یقین ہونے یا نہ ہونے کی کون سی بات ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "اللہ رکھا کی ایک ہی لڑکی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا نام صندل ہے اور یہ اسی صندل کی تصویر ہے۔ اگر آپ کو......" وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہ ہو تو آپ اللہ رکھا سے اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"اس سے تو میں بڑی ٹھیک ٹھاک تصدیق کروں گا۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صندل کی تصویر اچھو کے پاس پہنچی کیسے؟"

"تھانے دار صاحب! اچھو پھیری لگا کر نگر نگر آلو لڈو کھٹائی والے اور سموسے وغیرہ بیچا کرتا تھا۔" وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اللہ رکھا کے گھر والے بھی اس سے چٹ پٹی اور مسالے دار چیزیں لے کر کھاتے تھے۔ ہوسکتا ہے...... آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا......؟"

"جان لو کہ میں انتہائی ناسمجھ تھانے دار ہوں۔" میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف الفاظ میں مجھے بتاؤ۔"

"آپ ناسمجھ نہیں ہیں جناب۔" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ "بہرحال، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے جی کہ...... ہوسکتا ہے، اچھو اور صندل میں کسی قسم کا ربط ضبط پیدا ہوگیا ہو اور صندل نے اپنی تصویر خود اسے دی ہو۔ آپ تو جانتے ہیں، سال ڈیڑھ سال پہلے صندل کی طلاق ہوگئی تھی۔ میں نے ایک دو بار صندل اور اچھو کو کھڑے باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ان کے بیچ پیار محبت کا کوئی سلسلہ چل نکلا ہو۔"

فیض محمد کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ ایسا ہوجانا عین فطری بات تھی۔ صندل نے ایک مرد کی صحبت میں شادی شدہ زندگی کے چند سال گزارے تھے۔ اگر اس کا رجحان

اچھو کی طرف ہوگیا تھا تو اس میں اچنبھے والی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے آواز دے کر ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلالیا۔ جب وہ میرے سامنے پہنچ کر باادب، باملاحظہ، ہوشیار کھڑا ہوگیا تو میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''وہ جو پھاٹک والا اللہ رکھا ہے نا...... اسے بلا لاؤ۔''

''جو حکم ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے فرماں برداری سے کہا۔

''اور سنو......'' وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔

وہ رک گیا اور سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''اس سے پوچھ لینا کہ گاڑیوں وغیرہ کی آمد کے کیا اوقات ہیں۔ اگر ابھی اس کا وہاں سے ہلنا ممکن نہ ہو تو اس سے کہنا، شام سے پہلے کسی وقت بھی تھانے آکر مجھ سے مل لے۔''

''جی...... بہت بہتر......'' یہ کہہ کر کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا۔

فیض محمد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اس وقت اللہ رکھا فارغ ہی ہوگا۔ اب دو بجے سے پہلے کوئی گاڑی ادھر سے نہیں گزرے گی۔''

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ دو بجنے میں ابھی سوا دو گھنٹے باقی تھے۔ اس کا مطلب تھا، اللہ رکھا بہ آسانی تھانے کا چکر لگا کر واپس اپنی ڈیوٹی پر جاسکتا تھا۔ میں نے فیض محمد کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اس علاقے کے تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن تم تو سدا سے یہیں کے رہنے والے ہو۔ کیا یہاں پہلے بھی ڈاکوؤں نے اس قسم کی کوئی واردات کی ہے جیسی اللہ رکھا کے گھر میں ہوئی ہے؟''

''نہیں جناب......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''فرید کوٹ اور آس پاس کے گاؤں میں کبھی ڈکیتی یا اغوا کی واردات نہیں ہوئی۔''

''تم فرید کوٹ کے گردونواح میں پائے جانے والے گاؤں دیہات میں بھی اکثر جاتے ہوگے۔'' میں نے ایک خاص مقصد کی خاطر سوال کیا۔ ''اور وہاں پر رہنے والے لوگوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوگے؟''

''سارے گاؤں تو دیکھے بھالے ہیں جناب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن وہاں بسنے والے تمام لوگوں سے واقفیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔''

''شاہ پور تو جانا ہوتا ہے نا......'' میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آلو لڈو کھٹائی والے اچھو کے گاؤں کی بات کررہا ہوں؟''

''جی بالکل۔ وہاں تو جانا ہوتا ہے۔'' اس نے متذبذب لہجے میں جواب دیا پھر خود ہی سے سوال کردیا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کررہا جناب تو...... آپ اچھو کے بارے میں مجھ سے کوئی خاص بات پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے فیض محمد۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''تم اچھو کو کب سے جانتے ہو؟''

''یہی...... کوئی سال بھر سے۔'' اس نے بتایا۔

''اور اس کے باپ کبیر احمد کو؟''

''جی، میں سمجھا نہیں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ''آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''یہی کہ اچھو کے باپ کبیر احمد کو کب سے جانتے ہو؟'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اس بندے سے تو میرا کبھی واسطہ نہیں رہا جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''اس لیے جاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ دو چار بار دیکھا ہے اسے۔''

''کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ اچھو کبیر احمد ہی کا بیٹا ہے؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی، کیا مطلب ہے آپ کا۔'' وہ بوکھلاہٹ آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''ابھی آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ کبیر احمد اپنے بیٹے اچھو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آپ کے پاس آیا تھا اور...... صندل کی تصویر بھی اسی نے دی ہے؟''

''میں نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا فیض محمد۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن حقیقت اس سے خاصی مختلف ہے۔''

''جی......!'' وہ حیرت بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ''حقیقت کیا مختلف ہے جناب؟''

''اچھو، کبیر احمد کا سگا بیٹا نہیں۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... جناب!'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں فیض محمد!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

جب اسے میری بات کا یقین نہ آیا تو میں نے کبیر احمد سے حاصل شدہ معلومات کا خلاصہ اسے سنادیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''یہ تو آپ بڑی عجیب کہانی سنا رہے ہیں جناب......!''

''کہانی عجیب ہے یا غریب...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے جو بھی تمہیں بتایا ہے وہ سو فیصد سچ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کبیر احمد خود یہ انکشاف کرکے گیا ہے کہ اچھو لگ بھگ ایک سال سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا اور یہ کہ وہ اس کا سگا بیٹا نہیں۔''

''جناب! میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ اچھو شاہ پور کا رہنے والا ہے۔'' وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور بڑے لذیذ آلو لڈو کھٹائی والے بناتا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔''

''میں تم سے، اس سے زیادہ کچھ پوچھوں گا بھی نہیں، تم خوامخواہ پریشان ہونے کی کوشش نہ کرو۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس وقت یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ اچھو، کبیر احمد کا سگا بیٹا تھا یا نہیں۔''

''پھر کون سی بات اہم ہے جی؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اچھو اچانک کہیں غائب ہوگیا ہے، اپنی چھابڑی سمیت۔'' میں نے سنجیدہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ایک دن بعد اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو دو ڈاکوؤں نے رات کی تاریکی میں اغوا کرلیا...... یہ کہیں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تو نہیں ہیں فیض محمد؟''

''سوہنا رب ہی بہتر جانتا ہے جناب......'' وہ سادگی سے بولا۔

''سوہنا رب تو ہمیشہ سب سے بہتر ہی جانتا ہے اور اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی فیض محمد۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ ''لیکن اس نے سوچنے اور سمجھنے کے لیے ہمیں بھی دماغ دیا ہے لہٰذا ہم بھی بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ میں تم سے یہ ساری باتیں اس لیے کررہا ہوں کہ تم مجھے ایک بھلے مانس انسان اور اللہ رکھا کے سچے ہمدرد نظر آئے ہو۔ تم بھی یہی چاہتے ہوگے کہ اللہ رکھا کی بیٹی جلد از جلد بازیاب ہوجائے......؟''

''بالکل جناب!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہورہا ہے جیسے میری اپنی بیٹی کو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا ہو۔''

''اللہ رکھا کے لیے تمہارے اخلاص کو تو میں نے پہلے دن ہی محسوس کرلیا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس تصویر کی بنا پر اچھو اور صندل کے درمیان کسی سنجیدہ رابطے کا تو سراغ مل گیا ہے۔ میں تمہارے سامنے اللہ رکھا سے اس حوالے سے پوچھ گچھ کروں گا لیکن تم اپنے طور پر بھی علیحدگی میں اسے کریدنے کی کوشش کرنا۔ یہ نہایت ہی اہم معاملہ ہے۔''

''آپ بے فکر ہوجائیں جناب۔'' وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں اللہ رکھا کو کرید کر حقیقت اگلوا لوں گا۔''

''اگر اچھو صندل سے ایک دن پہلے اچانک غائب نہ ہوگیا ہوتا تو اسے شامل تفتیش کرکے بہت کچھ اگلوایا جاسکتا تھا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب تو یہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہوگیا ہے۔'' میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا تو فیض محمد سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا تاہم اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پیچیدہ بھی اور خاصا خطرناک بھی...... اللہ رکھا اور اس کی گھر والی سلمیٰ صندل کے کسی بھی مرد کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ دوسری جانب ڈاکوؤں کے الفاظ بھی تمہیں یاد ہوں گے...... وہ صندل کو اٹھا کر لے جانے کی نیت سے اللہ رکھا کے کوارٹر میں نہیں گھسے تھے بلکہ انہیں کسی نیلی پوٹلی کی تلاش تھی جو ان ڈاکوؤں کے مطابق تاجا نامی کسی شخص نے صندل کو دی تھی۔ صندل نے جب تاجا اور نیلی پوٹلی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ یہ کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ باقی کی پوچھ گچھ وہ صندل کو تاجا کے سامنے بٹھا کر کریں گے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ تاجا اس وقت ان کے قبضے میں تھا......''

''تھانے دار صاحب......!'' فیض محمد نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کہیں یہ اچھو اور تاجا ایک ہی شخص کے دو نام تو نہیں؟''

''ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیونکہ کبیر احمد بھی اچھو کے ماضی سے پوری طرح واقف نہیں۔ ممکن ہے، اس کے پاس آنے سے پہلے وہ تاجا ہی ہو۔''

''یہ تو بڑا ہی الجھا ہوا معاملہ نظر آرہا ہے جناب......!'' فیض محمد کے چہرے پر فکرمندی جھلکنے لگی۔

''ہاں، ابھی تک تو الجھا ہوا ہی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن میں بہت جلد اس معاملے کو سلجھا لوں گا۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر مجھے اللہ رکھا کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلالیا۔ اس نے میرے پاس پہنچ کر ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اسے

بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ فیض محمد کو پہلے سے میرے پاس موجود پا کر وہ ایک لمحے کے لیے چونکا ضرور تھا تاہم اس نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''اور سناؤ اللہ رکھا۔ تمہاری ڈیوٹی کیسی چل رہی ہے؟''

''ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے جناب!'' وہ پژمردہ سی آواز میں بولا۔ ''ہر حال میں کرنی ہے۔ نہ تو ٹرینیں رک سکتی ہیں اور نہ ہی میری ڈیوٹی، چاہے دنیا میں کچھ بھی ہوتا رہے......''

بات کے اختتام پر اس نے اپنی آنکھوں کے نم ہوتے گوشوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور امید بھری مگر شکستہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی نگاہ کے مفہوم کو بہت گہرائی تک پڑھ لیا اور تسلی بخش لہجے میں کہا۔

''اللہ رکھا! مایوسی گناہ ہے۔ اس کی رحمت سے ہر حال میں امید رکھنا چاہیے، وہ بڑا نکتہ نواز ہے۔''

''میں مایوس نہیں ہوں جناب...... پر کیا کروں......'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''صندل کا چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔''

''ایک سراغ ملا ہے مجھے......!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''سراغ......!'' اس کی ویران آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ ''کیسا سراغ تھانے دار صاحب۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کیا آپ نے میری صندل کا پتا چلا لیا ہے؟''

''کسی حد تک یہ بات کہی جاسکتی ہے۔'' میں نے ... بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بجھارتیں نہیں ڈالیں تھانے دار صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''بتائیں، آپ کو صندل کے بارے میں کون سا سراغ ملا ہے۔ میرے...... میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے......''

''جب ڈاکو تمہارے کوارٹر میں گھسے تھے تو انہوں نے کسی تاجا اور نیلی پوٹلی کا ذکر کیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تھا یا نہیں؟''

''جی...... کیا تھا......'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''نیلی پوٹلی تو ابھی تک معمابنی ہوئی ہے۔'' میں نے نفسیاتی حربے کو دھیرے دھیرے آزمانے کا عمل جاری رکھا۔ ''لیکن میں نے تاجا کا کھوج لگا لیا ہے......''

''کک...... کون ہے وہ......؟'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''تم بھی اسے جانتے ہو۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہم...... میں......'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی پھر فیض محمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب کیا کہہ رہے ہیں......؟''

میں نے اللہ رکھا کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی صندل کی تصویر کو اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ میں نے مذکورہ تصویر اللہ رکھا کو دکھانے کے لیے دراز کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

فیض محمد نے اللہ رکھا کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''پتا نہیں یار...... ابھی تمہارے آنے سے پہلے تھانے دار صاحب مجھ سے بھی یہی بات کر رہے تھے۔''

''یہ تصویر دیکھو اللہ رکھا۔'' میں نے صندل کی تصویر اس کی جانب سرکا دی۔

اس نے مذکورہ تصویر دیکھی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ...... یہ تو میری بیٹی...... میری صندل کی تصویر ہے۔''

''تم نے اپنی بیٹی کی تصویر کو اچھی طرح پہچان لیا ہے نا......؟''

''جی...... صندل کو میں نہیں پہچانوں گا تو پھر کون پہچانے گا۔''

''پتا ہے یہ تصویر مجھے کہاں سے ملی ہے؟''

''نہیں!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''تاجا کے سامان میں سے۔'' میں نے نفسیاتی ٹریٹمنٹ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مجھے بتاؤ گے کہ تمہاری بیٹی کی تصویر تاجا کے پاس کیسے پہنچی، تم تو کسی تاجا کو جانتے ہی نہیں۔''

میری اس نوعیت کی پوچھ گچھ کا مقصد ہرگز اللہ رکھا کو ہراساں یا پریشان کرنا نہیں تھا۔ وہ بے چارہ تو پہلے ہی بے حد پریشان تھا۔ میں دراصل کوئی ایسا سراغ لگانا چاہتا تھا جو صندل کی تلاش میں میرے لیے مددگار ثابت ہوسکتا۔ ابھی تک جو حالات منظر پر آئے تھے وہ میرے لیے اطمینان بخش نہیں تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دو ڈاکوؤں نے دو روز پہلے اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو رات کی تاریکی میں اغوا کر لیا تھا۔ یہ حقیقت بھی واضح ہوچکی تھی کہ ڈاکو وہاں صندل کے لیے نہیں بلکہ کسی نیلی پوٹلی کی تلاش میں آئے تھے جو تاجا نے صندل کو دی تھی۔ صندل کو وہ پوچھ گچھ کرنے کے لیے اٹھا لے گئے تھے اور جاتے جاتے یہ انکشاف بھی کر گئے تھے کہ تاجا بھی انہی کے پاس ہے۔ اس صورت حال میں صندل کے ساتھ کسی مرد کا کنکشن لازمی ٹھہرتا تھا چاہے وہ تاجا ہو یا اچھو۔ صندل کی تصویر کا اچھو کے سامان سے برآمد ہونا اور صندل

کے اغوا سے ایک دن پہلے اچھو کا غائب ہو جانا اس زنجیر کی کڑیوں کو ملاتا نظر آتا تھا۔ اگرچہ ابھی تک میرے ہاتھ ایسا کوئی سرا نہیں لگا تھا کہ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا... دراصل تاجا اور اچھو ایک ہی شخصیت کے دو نام تھا۔

''لیکن یہ تاجا ہے کون؟'' اللہ رکھا کی چیخ سے مشابہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''اگر آپ نے اس کے سامان میں سے صندل کی تصویر ڈھونڈ نکالی ہے تو اسی سے کیوں نہیں پوچھتے کہ اس نے یہ تصویر کہاں سے حاصل کی۔ میں کسی تاجا کو نہیں جانتا......''

''یہی تو مصیبت ہے۔'' میں نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سوال میں فی الحال تاجا سے کر نہیں سکتا کیونکہ......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اللہ رکھا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیونکہ...... کیا جی؟''

''کیونکہ......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ صندل کے اغوا سے ایک دن پہلے اچانک کہیں گم ہوگیا ہے۔ ان حالات میں ڈاکوؤں کی بات درست ہی نظر آتی ہے کہ تاجا ان کے پاس ہے۔''

''لیکن اس سارے معاملے سے میری صندل کا کیا تعلق ہے؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اسے کس جرم کی سزا دی جارہی ہے؟''

''اللہ رکھا!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں صرف صندل اور تاجا کے باہمی تعلق کی تصدیق چاہتا ہوں۔ باقی معاملے سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔''

''آپ قرآن پاک لا کر میرے سر پر رکھ دیں جناب۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے میں کسی تاجا سے واقف نہیں ہوں......''

''اچھو سے تو واقف ہونا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آلو لڈو کھٹائی والے اچھو سے جو ادھر شاہ پور میں رہتا ہے؟''

''جی...... جی...... اس کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بڑا ہی بیبا بندہ ہے وہ......''

''یہ بیبا بندہ صندل کے اغوا سے ایک دن پہلے گم ہو گیا تھا اور ابھی تک گمشدہ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''صندل کی تصویر اسی کے سامان میں سے برآمد ہوئی ہے۔ آج صبح شاہ پور سے کبیر احمد اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آیا تھا۔ یہ تصویر بھی اسی نے مجھے دی ہے۔''

''اوہ......!'' اللہ رکھا نے افسوسناک انداز میں گردن ہلائی۔ ''جبھی میں کہوں، وہ اتنے دن سے کہاں غائب ہے۔ وہ تو روزانہ پھیری لگانے آتا تھا۔ ہم اس سے سموسے اور آلو لڈو کھٹائی والے خریدا کرتے تھے۔ بڑا ہی شریف اور بھلا مانس بندہ ہے جی۔''

اللہ رکھا نے ایک بار پھر اچھو کی تعریف کی تو مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اچھو صندل کے ساتھ ساتھ اللہ رکھا کو بھی اپنے شیشے میں اتار چکا تھا۔ خاصا کاریگر معلوم ہوتا تھا۔

''تمہارا یہ بیبا بندہ اچھو بڑی بیبائی سے تمہاری بیٹی صندل کے ساتھ محبت کا کھیل کھیل رہا تھا اللہ رکھا......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور مجھے شک ہے کہ وہ اچھو نہیں

بلکہ...... تاجا ہے!"

"جی...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میری تو اس سے اکثر بات ہوتی تھی۔ وہ مجھے اپنے اور اپنے باپ کبیر احمد کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ وہ تاجا کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کی بات کو میں بالکل نہیں سمجھ سکا جناب......!"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یقین ہے، اچھو کبیر احمد ہی کا بیٹا ہے؟"

"جی، اچھو نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"وہ کب سے ادھر پھیری لگانے آرہا ہے؟"

"کوئی سال، سوا سال ہوا ہے جناب۔" اس نے بتایا۔

"اچھو کی عمر کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے اللہ رکھا؟"

"یہی جی پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی اس کی عمر۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ سال، سوا سال سے سموسے اور آلو لڈو کھنائی والے بیچ رہا تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے وہ چوبیس سال کیا کرتا رہا ہے اس کے بارے میں بھی اچھو نے تمہیں کچھ بتایا کہ نہیں؟"

"نہیں جی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی اس نے بتایا۔"

"تم پوچھتے بھی تو وہ کبھی نہ بتاتا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ وہ سال، سوا سال پہلے ہی شاہ پور پہنچا تھا اور کبیر احمد کا بیٹا بنا تھا۔"

"بیٹا بنا تھا؟" اس کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہوئی۔ "کیا وہ کبیر احمد کا بیٹا نہیں ہے؟"

"نہیں؟" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ "یہ ساری کہانی کبیر احمد مجھے سنا گیا ہے اور مجھے یقین ہے وہ اچھو نہیں بلکہ وہی تاجا ہے جسے ڈاکوؤں نے صندل سے ایک دن پہلے گم کر دیا تھا۔ وہ تاجا سے کسی نیلی پوٹلی کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یقیناً اس نے ڈاکوؤں کو بتایا ہوگا کہ اس نے نیلی پوٹلی صندل کو دی ہے جبھی انہوں نے تمہارے کوارٹر پر دھاوا بولا تھا اور پوٹلی کی تلاش میں ناکامی کے بعد وہ تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"او میرے خدایا......!" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ "میں... کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"تم پر یہ مصیبت تمہاری بیٹی کی وجہ سے نازل ہوئی ہے اللہ رکھا!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "صندل نے غلطی یا نادانی میں ایک ایسے آدمی سے دل لگا لیا تھا جو خطرناک ڈاکوؤں کو مطلوب تھا۔ بس، یہ سب اسی دل لگی کا کیا دھرا ہے۔ اچھو تمہارے ساتھ اسی لیے میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا کہ صندل کے ساتھ اس کا معاملہ چل رہا تھا۔"

"اب...... اب کیا ہوگا جی؟" اس نے متفکر انداز میں مجھے دیکھا۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔" میں نے بدترین حالات میں بھی پورے یقین کے ساتھ اسے تسلی دی۔ "تم پریشان نہ ہو اور جاکر اپنی گھر والی کو بھی تسلی دو۔ میں انشاء اللہ بہت جلد صندل کو ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"اللہ آپ کو حیاتی دے جی۔" وہ دعائیہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ "اردگرد کے گاؤں دیہات میں تو تلاش کرلیا گیا ہے۔ اب میں اپنی تفتیش کا دائرۂ کار بڑھا رہا ہوں۔ ڈاکو کہیں بچ کر نہیں جاسکتے۔"

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اللہ رکھا اور فیض محمد کو تسلی دلاسا دے کر تھانے سے رخصت کر دیا۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ پچھلے تین چار روز میں، میں نے صندل اور ڈاکوؤں کی تلاش کے سلسلے میں جو بھی کارروائی کی تھی، وہ بے نتیجہ ثابت ہوئی تھی البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دوران میں "اچھو آلو لڈو کھنائی والے" کے حوالے سے جو انکشافات ہوئے تھے، چاہے وہ صندل کے بارے میں ہوں یا کبیر احمد سے متعلق، وہ دلچسپ اور سنسنی خیز تھے اور انہی انکشافات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں...... اچھو وہی تاجا تو نہیں جس کی ڈاکوؤں کو تلاش تھی۔

اس رات سونے سے پہلے میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اگلے روز میں ایک دو اہلکاروں کو ساتھ لے کر خود تھانے سے نکلوں گا پھر جو اللہ کو منظور ہو......

☆☆☆

آئندہ روز مطلع ابر آلود تھا تاہم ابھی آسمان نے رونا دھونا شروع نہیں کیا تھا۔ میں تیار ہوکر اپنے کمرے میں آیا اور کانسٹیبل محمود کو اپنے پاس بلالیا۔ محمود نہایت ہی چاق و چوبند اور ذہین اہلکار تھا۔ میں اس کی معاملہ فہمی کا بھی قائل تھا۔

"جی ملک صاحب......!" وہ میرے پاس آکر شائستگی سے بولا۔

"ہمیں ابھی اور اسی وقت نکلنا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ضروری تیاری کرلو۔ تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے۔

واپسی شام تک ہوگی۔"

"جانا کہاں ہے ملک صاحب؟" محمود نے پوچھا۔

"منزل کا تعین بعد میں کریں گے البتہ مقصد طے شدہ ہے، صندل اور ڈاکوؤں کی تلاش۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہمیں سڑک سے ہٹ کر کھیتوں اور کھلیانوں میں بھی سفر کرنا ہوگا لہٰذا میرا خیال ہے کہ گھوڑوں کی سواری زیادہ موزوں رہے گی۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "میں دس پندرہ منٹ میں دو صحت مند گھوڑوں کا بندوبست کر دیتا ہوں۔"

"گھوڑوں کے ساتھ ہی اس امر کو بھی یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ اگر اچانک بارش شروع ہوجاتی ہے تو ہمارے پاس بچاؤ کا کیا انتظام ہوگا؟"

"جی، میں سمجھ گیا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ بے فکر ہوجائیں۔"

میں محمود کی طرف سے بے فکر ہوگیا اور حوالدار ارشاد کو اپنے پاس بلالیا۔ میں نے اسے بتایا کہ آج کا پورا دن میں تھانے سے باہر رہوں گا لہٰذا میری غیر موجودگی میں تھانے کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ ارشاد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ ارشاد ایک ذمے دار شخص تھا۔

لگ بھگ دس بجے میں اور کانسٹیبل محمود دو گھوڑوں پر سوار ہوکر تھانے سے نکل پڑے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ فضا میں خنکی رچی بسی محسوس ہوتی تھی۔ اللہ رکھا اور اس کی گھر والی کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ وقوعہ کی رات ڈاکو صندل کو اغوا کرنے کے بعد کس طرف لے گئے تھے۔ میں نے بھی اسی سمت میں سفر کا آغاز کیا۔

یہ ایک کچی سڑک تھی جو جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف جاتی تھی۔ ریلوے پھاٹک سے لگ بھگ تین میل آگے جاکر یہ سڑک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی اور اپنا رخ تبدیل کرتے ہوئے جنوب مغرب کی جانب مڑ جاتی تھی اور بالآخر لگ بھگ بیس میل آگے ایک سرحدی گاؤں چک چون پر جاکر ختم ہوجاتی تھی۔

میرے اور کانسٹیبل محمود کے درمیان صندل اور اچھو کے حوالے سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آلو لڈو کھنائی والے اچھو سے وہ بھی واقف تھا تاہم اس کی چٹ پٹی اور مزے دار "پروڈکٹس" کھانے کا محمود کو کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

وہ لگ بھگ گیارہ بجے کا وقت تھا جب ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ ہم لوگ کچی سڑک پر کم وبیش دو میل کا سفر طے کر چکے تھے۔ یعنی نہر والے پل تک پہنچنے میں ایک میل کا فاصلہ باقی تھا۔ مجھے سامنے وہ کانسٹیبل آتا نظر آیا جسے میں نے صندل کی سابق سسرال یعنی جمال پور کی طرف روانہ کیا تھا۔ موضع جمال پور ریلوے پھاٹک سے تین میل کی دوری پر واقع تھا اور نہر کے پل سے اس کا فاصلہ لگ بھگ ایک میل کا رہا ہوگا۔

کانسٹیبل کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا جو اندرونی جوش وخروش کی خبر دیتا تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس نے گھوڑا روک لیا اور باری باری ہم دونوں کو دیکھنے کے بعد بولا۔

"ملک صاحب! آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"ہم کہاں جارہے ہیں یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم اپنی سناؤ...... میں نے تمہیں جس کام سے بھیجا تھا اس کا کیا ہوا...... اور یہ تمہارے حواس کیوں خطا ہو رہے ہیں؟ لگتا ہے، تم نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہے۔"

کانسٹیبل حفیظ میرا تبصرہ سن کر خجل سا ہوا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ "جناب! جس کام سے آپ نے بھیجا تھا اس کا تو کچھ پتا نہیں چلا مگر ادھر نہر کے پل کے قریب آج صبح ایک آدمی کی لاش ملی ہے۔ میں ابھی ادھر ہی سے آرہا ہوں......"

میں چونک اٹھا اور پوچھا۔ "کس کی لاش؟"

"ملک صاحب! اس آدمی کا نام اچھو ہے۔" حفیظ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "وہ بندہ جو ہمارے علاقے میں آلو لڈو کھنائی والے بیچتا تھا۔"

"اوہ......!" میں نے اور کانسٹیبل محمود نے یک بیک ایک دوسرے کو دیکھا پھر میں نے کانسٹیبل حفیظ سے پوچھا۔ "میں نے تو تمہیں موضع جمال پور بھیجا تھا۔ تم نہر کے پل کی طرف کیا لینے گئے تھے......" لمحاتی توقف کے بعد میں نے اضافہ کر دیا۔ "ابھی تم نے بتایا ہے کہ جائے وقوعہ سے آرہے ہو؟"

ریلوے پھاٹک سے نہر کا پل اور موضع جمال پور ایک جیسی دوری یعنی لگ بھگ تین میل کے فاصلے پر واقع تھے تاہم دونوں کی سمت اور رخ میں اچھا خاصا فرق تھا اور جمال پور و نہر کے پل کے بیچ کم وبیش شمالاً جنوباً ایک میل کا فاصلہ حائل تھا۔ جمال پور سے ایک کچا راستہ نکل کر اس کچی سڑک سے مل جاتا تھا جس پر اس وقت ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے تاہم

کچی سڑک اور کچے راستے کا ملاپ پل سے آدھا میل پہلے ہی ہو جاتا تھا یعنی اگر ریلوے پھاٹک کی طرف سے آئیں تو لگ بھگ ڈھائی میل کے بعد سڑک سے وہ راستہ نکل کر جمال پور گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ کانسٹیبل حفیظ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"ملک صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں تو آج صبح جمال پور سے واپسی کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن جب میں تھوڑا سا ہی آگے آیا تو مجھے پتا چل گیا کہ ادھر نہر والے پل کے قریب کھیتوں میں کسی بندے کی لاش پڑی ملی ہے۔ اندرونی تجسس مجھے کھینچ کر جائے وقوعہ کی طرف لے گیا۔ بس اتنی سی بات ہے......" ذرا دیر کو رک کر اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"جب میں وقوعہ پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ لاش اچھو آلو لڈو کھٹائی والے کی تھی۔ اس علاقے میں اچھو کو کوئی نہیں جانتا لیکن میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ہمارے علاقے میں چھابڑی سر پر اٹھائے "آلو لڈو کھٹائی والے" کی آوازیں لگاتا پھرتا تھا۔"

"تم اس کی لاش کو دیکھ کر فوراً یہ تو پہچان گئے کہ وہ اچھو تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ وہ اچھو آلو لڈو کھٹائی والا نہیں بلکہ تاجا تھا...... وہی تاجا جس کی وجہ سے ڈاکوؤں نے اللہ رکھا پھاٹک والے کی بیٹی صندل کو رات کی تاریکی میں اغوا کر لیا تھا۔"

"ملک صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" حفیظ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "آؤ، جائے وقوعہ کی طرف چلتے ہیں۔ باقی کی باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔"

اس کے بعد ہم اپنے گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے نہر کے پل کی جانب بڑھنے لگے جو وہاں سے کم و بیش ایک میل کی دوری پر تھا۔ گزشتہ روز اچھی خاصی اور چمکیلی دھوپ نکلی تھی لہٰذا سڑک خشک ہو گئی تھی۔ اگر راستہ گیلا ہوتا تو ہمیں گھوڑوں کو بھگانے میں اچھی خاصی مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔

اگرچہ ابھی تک ایسا کوئی ٹھوس ثبوت یا واقعاتی شہادت میرے ہاتھ نہیں لگ سکی تھی جس کی بنیاد پر میں دعوے سے کہہ سکتا کہ اچھو اور تاجا ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں لیکن اندر سے مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہے۔

جلد ہی ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ وہ مقام نہر کے پل کے قریب ہی کھیتوں میں واقع تھا۔ وہاں پر درجن بھر افراد بھی جمع تھے جو اپنی اپنی عقل کے مطابق چہ میگوئیوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور لاش کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔

اچھو (تاجا) کا پورا بدن زخموں سے چور تھا۔ اسے بڑی اذیت دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں اچھو کی موت کے حوالے سے تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا ہی جان لینا کافی ہوگا کہ وہ بے بسی کی موت مارا گیا تھا۔ کانسٹیبل حفیظ اور محمود نے اسے اچھو آلو لڈو کھٹائی والے کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا۔

میں نے موقع پر موجود افراد سے بھی پوچھ گچھ کی۔ ان میں سے کوئی بھی اچھو کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس کی موت کے سبب سے واقف تھا۔ اچھو کی لاش کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے پچھلی رات ہی سپرد موت کیا گیا تھا۔

میں نے وقوعہ کی کارروائی نمٹائی اور اچھو کی لاش کو حفیظ کی ذمے داری میں تھانے بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔ مذکورہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھیجنا ضروری تھا اور اس کے لیے تھانے کے پاس ہی سے گزرنا پڑتا تھا۔ میں نے نہایت ہی سنجیدہ الفاظ میں کانسٹیبل کو ہدایات دیں۔

"حفیظ! تم اس بندے کی لاش کو تھانے پہنچاؤ اور اگر وہاں کبیر احمد موجود ہو تو اسے لاش دکھا دینا۔ اس کے بعد اسپتال لے جانا۔"

میں نے گزشتہ روز کی صبح جب کبیر احمد کو رخصت کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ وہ کل (یعنی آج) بھی تھانے کا چکر لگائے گا۔ میں نے ابھی اسی خیال کے تحت کانسٹیبل کو ہدایت دی تھی کہ ممکن ہے، جب حفیظ اچھو کی لاش کو لے کر تھانے پہنچے تو کبیر احمد وہاں موجود ہو۔

"ملک صاحب!" حفیظ نے میری طرف دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟"

"نہیں......" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں تھوڑی دیر کے بعد آؤں گا اور...... لاش کے ساتھ صرف تم جا رہے ہو۔ محمود میرے ساتھ ہی واپس آئے گا۔"

اس نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

لاش کو جائے وقوعہ سے "روانہ" کرنے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ چاروں جانب سرسبز و شاداب کھیت دکھائی دیتے تھے۔ وہاں سے نزدیکی گاؤں جمال پور ہی تھا جو نہر والے پل سے کم و بیش ایک میل کے فاصلے پر

واقع تھا۔ میرے ذہن میں کافی دیر سے یہ سوال چکرا رہا تھا کہ اچھو یا تاجا کی لاش کو وہاں پھینکنے والے کون تھے اور انہوں نے پچھلے دو ڈھائی دن اسے کہاں رکھا تھا؟ اگر آلو لڈو کھٹائی والے بیچنے والا اچھو ہی تاجا تھا تو یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ اسے بھی انہی ڈاکوؤں نے اغوا کیا ہوگا جنہوں نے صندل کو اغوا کیا تھا۔ میں موقع پر موجود لوگوں سے خاصی تفصیلی پوچھ گچھ کر چکا تھا۔ ان میں سے مقتول اچھو کو کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی مذکورہ بالا ڈاکوؤں سے کوئی واقف تھا۔

اچھو کی لاش کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے پچھلی رات موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور اس کا قتل جائے وقوعہ پر نہیں ہوا تھا یعنی اسے کسی اور مقام پر قتل کرنے کے بعد وہاں لا کر پھینکا گیا تھا۔ اگر میں اس "مقام" کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا جہاں اچھو کو زندگی سے محروم کیا گیا تھا تو اس کے قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔

کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ ویسے مجھے اس محاورے سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیونکہ ڈھونڈا صرف اسی شے کو جاتا ہے جو گم ہو گئی ہو۔ خدا کی ذات تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اسے اپنی ذات سے باہر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کبھی کوئی خلوصِ نیت کے ساتھ ایک بار اپنے من میں جھانک کر دیکھ لے تو اس کی چشمِ بینا کو پھر کسی اور چیز کی حسرت نہیں رہے گی۔

بہرحال...... اس مقام کی تلاش بہت ضروری تھی جہاں پچھلے دو، ڈھائی دن سے اچھو آلو لڈو کھٹائی والے کو رکھا گیا تھا۔ میں نے گرد و پیش میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"محمود! میں تھوڑا آگے جانا چاہتا ہوں۔"

کانسٹیبل محمود نے میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میں کس جانب کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مجھ سے پوچھا۔

"کس طرف جائیں گے ملک صاحب؟"

"جدھر یہ کچا راستہ لے جائے۔" میں نے نہر کے پل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

"او کے ملک صاحب!" اس نے اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہم گھوڑوں پر سوار، پہلو بہ پہلو سفر کرتے ہوئے نہر کے پل پر پہنچے پھر مذکورہ پل کو عبور کر کے آگے بڑھ گئے۔ اس کچی سڑک کا اختتام ایک سرحدی گاؤں چک چون پر جا کر ہوتا تھا۔ اس چک کے بعد دوسرا ضلع شروع ہو جاتا تھا۔ میرے تھانے سے یا یوں سمجھ لیں ریلوے پھاٹک سے چک چون لگ بھگ بائیس تئیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

ہم اس سفر کے دوران میں بات چیت بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ محمود نے مجھ سے کہا۔ "ملک صاحب! اگر ہم اسی سڑک پر آگے بڑھتے رہے تو شام تک چک چون پہنچ جائیں گے......"

"میرا چک چون جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے محمود!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بس تھوڑا گھوم پھر کر میں اس علاقے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ پھر ہم واپسی کا رخ کریں گے۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کہاں اور کیوں جا رہا ہوں۔ بس، اندر سے کوئی انجانی قوت سمجھا رہی تھی کہ مجھے جائے وقوعہ کے اردگرد کے علاقے کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے اور میں یہی کر بھی رہا تھا۔

جائے وقوعہ سے کوئی دو فرلانگ آگے آئے تھے کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ گاؤں دیہات اور کھیت کھلیان میں کسی کتے کا بھونکنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن میرے چونکنے کا سبب ان کی آواز کی شدت اور تسلسل تھا۔ وہ مخصوص لَے کے ساتھ بھونک رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی غیر معمولی شے دیکھ لی ہو اور انسانوں کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"محمود! یہ کیسی آواز ہے؟" میں نے اپنے ساتھی کانسٹیبل سے استفسار کیا۔

"ملک صاحب...... یہ تین چار کتوں کے بھونکنے کی آواز ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی فقیر کا پیچھا کر رہے ہوں۔"

اس نے کافی حد تک معقول جواب دیا تھا کہ کتے عموماً ایسا کرتے ہیں لیکن محمود کے جواب سے میری تسلی نہ ہو سکی اور میں نے اس جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا جدھر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔

"نہیں محمود...... مجھے یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔"

اس گفتگو کے دوران میں ہمارا سفر بھی جاری تھا۔ وہ متامل انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ "کوئی اور معاملہ کیسا ملک صاحب؟"

"جب کتے کسی گداگر کے پیچھے لگ جاتے ہیں تو وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر ان کی 'بھوں بھوں' نہیں سنتا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یا تو وہ انہیں اپنی لاٹھی دکھا کر بھگانے کی کوشش کرتا ہے یا پھر زمین سے کوئی پتھر وغیرہ اٹھا

کر مارتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ کتے یا تو اس کا تعاقب چھوڑ دیتے ہیں یا پھر بھونکتے ہوئے اس کے پیچھے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں لیکن......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن پچھلے دس منٹ سے، ایک ہی جگہ سے ان کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی ہیں۔ کیا تم نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے محمود......؟''

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ بدبخت ایک ہی جگہ کھڑے بھونکے جا رہے ہیں......''

''ہمیں فوراً وہاں پہنچ کر ان کے بھونکنے کا سبب جاننا ہوگا۔'' میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں آس پاس کوئی آبادی نظر نہیں آرہی اسی لیے ابھی تک کسی نے ان کے بھونکنے کی طرف توجہ نہیں دی۔''

ہم تقریباً گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی کھیتوں کے بیچوں بیچ میں ایک چھوٹی سی عمارت کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی اسی سمت سے آرہی تھی۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر واضح ہوا کہ وہ عمارت دراصل ایک کمرا تھا جو کچی سڑک سے تھوڑا ہٹ کر کھیتوں کے درمیان بنا ہوا تھا۔ کتے بھی، میرے اندازے کے مطابق، اس کمرے کے آس پاس ہی کہیں موجود تھے اور لگاتار بھونک کر کسی خاص معاملے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس صورتِ حال نے مجھے بے چین کر دیا۔ اندر سے مسلسل ایک آواز اٹھ رہی تھی کہ کسی سنسنی خیز منظر سے میرا واسطہ پڑنے والا ہے۔ ہم گھوڑے دوڑاتے ہوئے مذکورہ کمرے کے ...... قریب پہنچے تو تین کتے بھی نظر آگئے جو کمرے کے دروازے کی طرف منہ اٹھا کر بھونکے جا رہے تھے۔ یہ مقام نہر والے پل سے لگ بھگ آدھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم نے کچی سڑک کو چھوڑا اور کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔

ہمیں اپنی جانب آتا دیکھ کر کتوں نے بھونکنا بند کر دیا اور تھوڑے فاصلے پر ہٹ کر کھڑے ہو گئے تاہم ان کی نگاہیں اب بھی کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنی دموں کو اضطراری حرکت بھی دے رہے تھے۔ ہم کمرے کے سامنے جا کر رکے اور گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔

وہ نیچی چھت والا ایک عام سا کمرا تھا جس کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے محمود کی طرف دیکھا اور کمرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی دروازے کے پاس پہنچا، میری سماعت نے سسکیوں کی آواز سنی۔ محمود بھی میری تقلید میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! کمرے کے اندر کوئی عورت مصیبت میں لگتی ہے......''

اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ سسکیوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کا مخرج کسی خاتون کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ عورت کا خیال آتے ہی میرا دھیان آپوں آپ اللہ رکھا کی مغوی بیٹی صندل کی طرف چلا گیا۔ میں نے سروس ریوالور نکال لیا اور گرج دار آواز میں پکارا۔

''کون ہے کمرے کے اندر......؟''

''م...... میں ہوں......'' کسی عورت کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔

ویسے تو کتوں کی مسلسل ''بھوں بھوں'' نے یہ راز کھول دیا تھا کہ کمرے کے اندر ایسا کوئی شخص موجود نہیں تھا جو آسانی سے حرکت کے قابل ہو ورنہ وہ باہر نکل کر انہیں دھتکار سکتا تھا لیکن پھر بھی احتیاط اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ اندر داخل ہونے سے پہلے تسلی کر لی جائے۔

''تمہارے ساتھ اور کتنے افراد ہیں؟'' میں نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔ ''کک...... کوئی نہیں...... وہ لوگ چلے گئے ہیں...... خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالیں...... تم جو کوئی بھی ہو، تمہیں اللہ رسول کا واسطہ......''

''کیا تم اللہ رکھا کی بیٹی صندل ہو؟'' میں نے کمرے کے اندر قدم رکھنے سے پہلے پوچھا۔

''جی...... میں صندل ہی ہوں......''

اگلے ہی لمحے میں کمرے کے اندر تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کانسٹیبل محمود مجھ سے پیچھے رہ جاتا۔ وہ بھی پلک جھپکتے میں میرے ساتھ کھڑا تھا۔ کمرے کے اندرونی منظر نے ہمیں شرمسار کر کے رکھ دیا اور ہم آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

کمرے کے فرش پر پرال بچھا کر اسے بیٹھنے اور سونے کے قابل بنایا گیا تھا اور اسی پرال پر کمرے کے ایک کونے میں صندل نیم برہنہ حالت میں پڑی تھی۔ اس کے

ہاتھ پاؤں کو مضبوط رسیوں سے باندھ کر اسے بے بس کر دیا گیا تھا۔ اس کے منہ پر بھی دوپٹے کی پٹی باندھی گئی تھی تاہم وہ پٹی اپنی جگہ سے کھسک گئی تھی جس کی وجہ سے وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولنے کے قابل ہو سکی تھی۔

میں صندل کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”صندل! میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں تمہارے علاقے کا تھانے دار ہوں۔ پچھلے دو دن سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو اور آنکھیں بند کر لو۔ جب تک میں تمہارے ہاتھ پاؤں کی بندشیں نہیں کھولوں گا، تم اپنے بدن پر لباس کو درست نہیں کر سکو گی۔“

ایک لمحے میں، میری نگاہ نے جو منظر دیکھا تھا اس میں مجھے صندل نیم برہنہ ہی نظر آئی تھی۔ وہ کسی حد تک لباس میں تھی۔ اس کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”جی...... ٹھیک ہے......“

آئندہ پندرہ منٹ میں، میں نے کوشش کر کے صندل کے ہاتھ پاؤں اور منہ کو بندشوں سے آزاد کر دیا اور اس نے لباس کو اپنے بدن پر درست کر کے برہنگی کا دروازہ بند کر دیا۔ میرے ایما پر وہ کمرے کے دروازے تک چلی آئی۔ میں نے اسے پرال پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی حالت خاصی نازک ہو رہی تھی۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ڈاکوؤں نے اسے زدوکوب کرنے کے علاوہ اس پر مجرمانہ حملے بھی کیے تھے۔ ہر قسم کی زیادتی کا نشانہ بننے کے بعد وہ اس قابل نہیں رہی تھی کہ میں فوری طور پر پوچھ گچھ شروع کر دیتا تاہم چند بنیادی نوعیت کے سوالات نہایت ہی اہم تھے۔ میں نے پوچھا۔

”وہ دونوں ڈاکو کہاں گئے جو تمہیں تمہارے گھر سے اٹھا کر لائے تھے؟“

”وہ دو نہیں، تین تھے۔“ صندل نے روہانسی آواز میں بتایا۔ ”ان کا ایک ساتھی یہاں موجود تھا۔ یہ تینوں آج صبح ہی یہاں سے گئے ہیں۔ سمجھیں کہ فجر کی اذان کے وقت۔“ وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر رو دینے والے انداز میں بولی۔ ”ان ظالموں نے مجھے کئی بار برباد کیا ہے اور...... اور...... میری آنکھوں کے سامنے اچھو کو بھی قتل کر ڈالا......“

”اچھو کی لاش مجھے نہر والے پل کے قریب سے مل گئی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ اچھو کو تاجا کیوں سمجھ رہے تھے......؟“

میں نے اپنے ذہن میں موجود ایک نہایت ہی اہم سوال کا جواب لینا چاہا تو وہ جلدی سے بولی۔ ”تھانے دار صاحب! وہ لوگ اسے تاجا سمجھ نہیں رہے تھے بلکہ وہ تاجا ہی تھا۔ ان کا کوئی پرانا یار بیلی...... اس نے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہوا تھا۔ میں نے ان کے درمیان ہونے والی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ وہ سب جرائم پیشہ لوگ تھے......“

میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ گویا پچھلے دو تین دن سے میرے دماغ میں سنسنی خیز خیالات کی جو کھچڑی پک رہی تھی، وہ اب تیار ہو چکی تھی۔ میں جس رخ پر سوچ رہا تھا، صندل نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔

”تفصیلی باتیں تو تھانے جا کر ہوں گی۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے صرف اتنا بتا دو کہ وہ نامراد ڈاکو کس طرف گئے ہیں؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھانے دار صاحب۔“ وہ بے بسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”وہ جب یہاں سے نکلے تو رات کا وقت تھا۔ ان کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے مجھے رسیوں سے اس طرح باندھ دیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ مجھے نہیں پتا، وہ کہاں گئے ہیں۔ میں تو دل ہی دل میں یہ دعائیں کر رہی تھی کہ اللہ جلد از جلد کسی کو اس طرف بھیج دے اور وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے...... اللہ نے آخرکار میری دعا سن ہی لی......“

”وہ سب کی سنتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ بس اسے محسوس کرنے اور سمجھنے کی بات ہے۔“

وہ عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

میں نے صندل کو واپسی میں، اس کے گھر چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ خود کو سنبھال سکے۔ پوچھ گچھ تو بعد میں بھی ہو سکتی تھی۔ وہ جس ذہنی، جسمانی اور جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی، اس میں اسے فوری طور پر اشد آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے ایک دن کے لیے سنبھلنے کا موقع دیا اور آئندہ روز آنے کا کہہ کر اس کے کوارٹر سے باہر نکل آیا۔

اگلے روز میں صندل کا بیان لینے کے لیے دوبارہ اللہ رکھا کے کوارٹر پر پہنچ گیا۔ صندل نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اللہ رکھا اور اس کی بیوی اپنی بیٹی کی زندہ سلامت بازیابی پر بے حد خوش تھے کہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی زبان

سوکھ رہی تھیں۔ ننھا سلطان بھی تین راتیں اپنی ماں کے بغیر سویا تھا۔ اگرچہ وہ اپنی نانی سے زیادہ مانوس تھا تاہم ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ وہ اس وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھا مٹی سے کھیل رہا تھا۔

صندل نے اپنے بیان میں مجھے جو کچھ بتایا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کا ذہن بھی اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ ساری باتیں صندل نے ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو سے اخذ کی تھیں۔ باقی میری ذاتی تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہے۔

اب یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ اسلم عرف اچھو آلو لڈو کھٹائی والا درحقیقت تاج دین عرف تاجا ہی تھا۔ تاجا کوئی اچھا انسان نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تاجا نے اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ مل کر کسی دوسرے ضلع کے ایک گاؤں میں بڑی ٹھیک ٹھاک ڈکیتی ماری تھی جس میں ایک خطیر رقم کے علاوہ طلائی زیورات بھی ان کے ہتھے لگے تھے۔ یہ ڈکیتی اس گاؤں کے چودھری کی حویلی میں ماری گئی تھی۔ حویلی سے نہ صرف یہ کہ ڈاکوؤں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی گئی بلکہ ان کا راستہ کھوٹا کرنے کے لیے ان پر فائرنگ بھی کی گئی تھی جس کے نتیجے میں تاجا کا ایک ساتھی مارا گیا تھا۔ تاجا اور دیگر تین ڈاکو ڈکیتی کے مال سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جائے واردات سے بہت دور نکل آنے کے بعد انہوں نے ایک محفوظ خفیہ مقام پر قیام کیا اور تازہ ترین صورت حال پر بات چیت کرنے لگے۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے جاں بحق ہونے والے ساتھی منظور عرف منظورے کے انجام پر افسوس کا اظہار کرتے رہے پھر ان کے لیڈر صمدو نے مال غنیمت کو حصہ بہ قدر مرتبہ تقسیم کر ڈالا۔ سب کو رات اس محفوظ مقام پر گزار کر اگلے روز مختلف سمتوں میں الگ الگ روانہ ہونا تھا لیکن دوسری صبح جب وہ سو کر اٹھے تو ایک ناقابلِ یقین حیرت ان کی منتظر تھی۔

تاجا غائب ہو چکا تھا...... اور جاتے ہوئے وہ اپنے حصے کے علاوہ لیڈر کا حصہ (جو کہ سب سے زیادہ تھا) بھی چرا کر لے گیا تھا۔ اس صورتِ حال نے صمدو سمیت سب کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ انہوں نے مختلف سمتوں میں بکھرنے کے بجائے یکجا رہ کر تاجا کی تلاش شروع کر دی۔ اس تلاش میں انہیں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا بالآخر وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اب اسلم عرف اچھو کی حیثیت سے کبیر احمد کے گھر واقع شاہ پور میں رہ رہا تھا اور آلو لڈو کھٹائی والے بیچا کرتا تھا۔

ڈاکوؤں نے تاجا پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس ویران کمرے کو اپنا مسکن بنایا جہاں سے میں صندل کو نکال کر لایا تھا پھر ایک رات انہوں نے تاجا کو زبردستی اغوا کر کے مذکورہ کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ مقام پوچھ گچھ کے لیے بہت موزوں تھا۔ تاجا کی آلو لڈو کھٹائی والی چھابڑی کو ڈاکوؤں نے نہر والا پل عبور کرتے ہوئے نہر میں پھینک دیا تھا۔

پہلے تو صمدو اور اس کے دو ساتھیوں الیاس اور بھولا نے تاجا کی خوب درگت بنائی اور اس کے بعد پوچھا کہ...... بتا، تیری رضا کیا ہے...... شرافت سے ”مال“ کے بارے میں بتاتا ہے یا تیری کھال کھینچی جائے......؟

تاجا صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے بیٹے تلے الفاظ میں اپنے بھائی بندوں پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ اس کے اپنے حصے کے ساتھ ساتھ لیڈر کا چرایا ہوا مال بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ کوئی اس سے بھی بڑا لٹیرا سب کچھ چھین کر لے گیا تھا اور...... اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

صمدو، الیاس اور بھولا کو تاجا کی کہانی پر یقین نہ آیا۔ وہ سمجھے، تاجا انہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے لہٰذا انہوں نے جھنجلا کر اسے اور مارنا شروع کر دیا۔ قریب تھا کہ وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتے، اس نے انہیں بتایا کہ مال ایک نیلی پوٹلی میں بند ہے اور وہ پوٹلی اس نے صندل کے پاس رکھوائی ہوئی ہے۔ ڈاکوؤں نے اس سے صندل کا حدود اربعہ معلوم کیا اور صمدو اور الیاس نے گیارہ فروری کی رات اللہ رکھا پھاٹک والے کے کوارٹر پر دھاوا بول دیا۔ بھولا تاجا کی نگرانی کے لیے کمرے میں رک گیا تھا۔ انہیں نیلی پوٹلی کی تلاش تھی اور جب وہ اس تلاش میں ناکام رہے اور صندل نے بھی نیلی پوٹلی اور تاجا کے حوالے سے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ جھنجلاہٹ میں صندل کو اٹھا کر لے گئے تھے کہ باقی کی تفتیش وہ اس سے تاجا کے سامنے بٹھا کر کریں گے۔

صندل کو اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب اسے پتا چلا کہ اچھو دراصل تاجا ڈاکو ہے جو اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو دھوکا دے کر شاہ پور میں چھپا بیٹھا تھا۔ بہر حال جب صندل اس کمرے میں پہنچی اور صورتِ حال ان ڈاکوؤں پر واضح ہوئی تو تاجا دوبارہ سے اپنے پہلے والے بیان پر آ گیا کہ ڈکیتی کا سارا مال اس سے بھی بڑے کسی ڈاکو نے چھین لیا تھا۔ تاجا کے جواب نے ڈاکوؤں کے صبر و برداشت کے سارے بند توڑ دیے اور انہوں نے اذیت دے دے کر

تاجا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب اس پر بھی ان کے انتقامی جذبات ٹھنڈے نہ ہوئے تو انہوں نے حسبِ توفیق صندل کو بھی پامال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ایک رات وہ صندل کو کمرے میں چھوڑ کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ تاجا کی لاش کو پل کے قریب کھیتوں میں پھینک چکے تھے۔

صندل پچھلے دنوں وحشی ڈاکوؤں کے ہاتھوں جس عذاب سے گزری تھی، میں نے اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی صندل۔ اچھو یا تاجا، وہ جو کوئی بھی تھا، تم سے محبت کرنے لگا تھا اور تمہیں اپنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پھر اس نے کسی نیلی پوٹلی کے حوالے سے جھوٹ کیوں بولا......؟''

''تھانے دار صاحب! تاجا کے رویّے کو دیکھ کر تو میرا پیار اور محبت پر سے یقین ہی اٹھ گیا ہے۔'' وہ زخمی لہجے میں بولی۔ ''جو شخص اپنی جان بچانے کے لیے کوئی ایسا جھوٹ بول سکتا ہے جس کی وجہ سے میرے جسم و جان اور روح کا جنازہ اٹھ گیا، اس شخص کے پیار یا محبت کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے بلکہ اگر...... آپ کو برا نہ لگے تو میں ایک بات کہوں......؟''

بات مکمل کر کے اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہاں...... بولو......''

''سچی بات تو یہ ہے تھانے دار صاحب......'' وہ اذیت بھری آواز میں بولی۔ ''میری نظر میں دنیا بھر کے مرد فریبی اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔''

''صندل! میں تمہاری بات کا بُرا نہیں مناؤں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تمہارے تجزیے سے مکمل اتفاق نہیں کر سکتا۔ ہر انسان اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں بات کرتا ہے اور کسی ایک انسان کے تجربے یا مشاہدے کو فارمولا بنا کر تمام انسانوں پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''میں مانتا ہوں کہ تاجا ایک بُرا مرد تھا اور تمہارا سابق شوہر نیاز علی بھی کوئی اچھا مرد نہیں تھا۔ ان دونوں کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت سے بُرے مرد موجود ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس جہان میں پائے جانے والے سارے کے سارے مرد ہی فریبی اور دھوکے باز ہیں۔ اچھے لوگ اگرچہ کم ہوتے ہیں مگر ضرور ہوتے ہیں اور مثبت و تعمیری عمل سے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔''

''تھانے دار صاحب! آپ بڑی مشکل باتیں کرتے ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ ''میرے تو سر میں درد ہونے لگا ہے۔''

''صندل! فی الحال، میری باتوں پر زیادہ دھیان نہ دو۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس وقت تمہیں زیادہ سے زیادہ اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنا چاہیے جس کے کرم سے تم زندہ سلامت اپنے ماں باپ اور بچے تک پہنچ گئی ہو ورنہ وہ سفاک ڈاکو تمہیں بھی قتل کر کے تاجا کی طرح، تمہاری لاش بھی کھیتوں میں پھینک دیتے تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ میں تو یہ سمجھ رہا ہوں کہ...... تمہاری کسی وقت کی کوئی نیکی کام آ گئی ہے......''

''میں نے ایک بار چوزوں والی مرغی کو ایک بدمعاش بلّے کے حملے سے بچایا تھا۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اگر میں نے بروقت مداخلت کر کے اس بلّے کو نہ کھدیڑا ہوتا تو مرغی کے ساتھ ہی اس کے آٹھ دس ننھے منے چوزے بھی اس بلّے کے پیٹ میں چلے جاتے۔''

''بس، تمہاری یہی ادا اور اس بچوں والی مرغی کی دعا قدرت کو پسند آ گئی ہو گی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے آج ننھے سلطان کی ماں صندل بھی زندہ سلامت میرے سامنے بیٹھی ہے۔''

وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''میری ایک بات ذہن نشین کر لو صندل!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''نیکی کسی سایہ دار درخت کے مانند ہوتی ہے جو سدا ہری بھری اور آباد رہتی ہے اور اپنے وجود سے زندگی بھر نیکی کرنے والے کو فیض پہنچاتی رہتی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری وہ نیکی آباد ہے۔''

صندل نے اثبات میں سر ہلایا پھر گردن جھکا لی۔

صمد اینڈ کمپنی کو تلاش کرنے کے لیے میں نے حتی المقدور کوشش کی مگر مجھے کامیابی نہ مل سکی۔ یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی دور دراز ضلع کی طرف نکل گئے ہوں گے۔ جلد یا بدیر ان تینوں کا انجام بھی اپنے ساتھیوں کی طرح عبرت ناک ہونا تھا...... منظورے اور تاجا کی طرح انہیں بھی ایک دن حرام موت ہی مرنا تھا، چاہے ان کی موت قانون کے رکھوالوں یا قانون شکنوں کے ہاتھوں ہوتی۔

(تحریر: حسام بٹ)

تحفہ

سلیم انور

وہ زندگی ہی کیا جو حادثات و واقعات سے مزین نہ ہو۔ یہ اور بات کہ ان واقعات کا تعلق خوشگوار ہے یا ناگوار لیکن... اس کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا اس نے اس کی زندگی کو ایک نیا رخ ضرور عطا کیا تھا جیسے کسی نے کوئی قیمتی تحفہ عنایت کر دیا ہو۔

مثبت اور منفی سوچوں میں الجھے ایک مسافر کی بے خبری کا عالم

یہ کرسمس سے دو روز قبل کی بات ہے۔ میں شاپنگ مال کے مجمع سے پُر فوڈ کورٹ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی مال کے بند ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔

وہ لڑکی مجھے فوڈ کورٹ کے پاس دکھائی دی۔ لڑکی دلکش تھی۔

جب میں نے اپنے چیز فرائز سے سر اٹھا کر دوبارہ دیکھا تو وہ میری میز کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن الفاظ اس کے ہونٹوں پر کپکپا رہے تھے۔

میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''ہائے!'' وہ بول پڑی۔ ''میں ...... ہوں...... میں سوچ رہی ہوں کہ کیا تم...... تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

تذبذب اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

میں نے شانے اچکا دیے۔ ''میں...... میرا تعلق اس علاقے سے نہیں ہے۔ بس فیملی کے ساتھ تعطیلات منانے کے لیے آیا ہوا ہوں۔ میرے والدین آج رات مجھے یہاں کھینچ کر لے آئے ہیں۔ مجھے اس مال یا باہر کسی بھی سڑک کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے۔''

''نہیں، میرا مطلب ہے......'' یہ کہتے ہوئے اس کے گال تمتمانے لگے۔ ''میں کرسمس کے لیے کلیولینڈ پہنچنا چاہتی ہوں...... اپنی بہن کے پاس۔ لیکن میں...... میں

ایک طریقے سے خالی ہاتھ ہو چکی ہوں اور مجھے کرسمس سے پہلے ہر حال میں کلیولینڈ پہنچنا ہے۔"

"میں......" میں جملہ بھول گیا تھا کہ میں کیا کہنے جا رہا تھا۔ میں اس کے حلیے کا جائزہ لینے لگا۔ باہر ہونے والی برف باری سے اس کی جینز اور کینوس کے جوتے بھیگے ہوئے تھے اور بدنما دکھائی دے رہے تھے۔ سادہ سا بلاؤز بھی مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ یقیناً جب یہ خریدا گیا ہوگا تو اس کی یہ حالت نہیں رہی ہوگی۔

"یقیناً، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن سنو، پہلے تم اس بات کی اجازت دو کہ میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ خرید لوں۔ جو تمہارا جی چاہے تم کھا سکتی ہو۔"

اس کی مسکراہٹ نروس زدہ اور ہلکی سی تھی۔ البتہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا نام کیتھی تھا اور اسے چائنیز کھانے پسند تھے۔ اس نے "دی گولڈن بدھا" نامی بوتھ سے موگوگائے کا ایک چین خرید لیا جس کی قیمت میں نے ادا کر دی۔ اس نے بتایا کہ وہ لاس اینجلس سے صورتِ حال ابتر ہونے کی وجہ سے بھاگی ہے اور اپنی بہن کے پاس کلیولینڈ جا رہی ہے۔ اس نے لاس اینجلس سے اپنے بھاگنے اور صورتِ حال کی ابتری کی تفصیل بیان نہیں کی۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس ایک انتہائی قدیم نوعیت کی شیورلیٹ کار ہے جو کسی بھی لمحے خراب ہو سکتی ہے۔ وہ یہاں نبراسکا تک کے تمام سفر میں ہر رات اسی کھٹارا کار میں سوتی رہی ہے کیونکہ اس کے پاس کسی موٹیل میں رات قیام کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔

اور اب وہ بالکل کنگال ہو چکی ہے اور اس کے پاس کھانے اور پیٹرول کے لیے کوئی نقدی نہیں ہے۔

گو میں نے کیتھی کے لیے صرف ایک کھانا خریدا تھا لیکن کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے ہم دونوں کو ایک ایک "فارچیون کوکی" تھما دی۔

"آؤ انہیں کھول کر دیکھتے ہیں کہ ان میں ہماری قسمت کے بارے میں کیا لکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ تمہاری تقدیر اچانک بدلنے والی ہو۔"

اس نے اپنی کوکی توڑی تو اس کی پیشانی پر بل نمودار ہو گئے۔ وہ دو خالی ہلال تھامے ہوئے تھی۔ "میرا خیال ہے کہ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔" اس نے مایوس لہجے میں کہا۔

میں ہنس دیا۔ میں نے اپنی قسمت کا حال پڑھے بغیر وہ کوکی کیتھی کی جانب بڑھا دی۔ "مجھے اپنے مستقبل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہارا ہوا۔"

اس نے میری کوکی کا قسمت کا حال پڑھا، مسکرائی اور اس تحریر کو اپنی جینز کی جیب میں اڑس لیا۔

"کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گی کہ اس میں کیا لکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"اگر میں نے بتا دیا تو یہ درست ثابت نہیں ہوگا۔"

"اوکے۔" میں نے کہا۔ "پھر اس صورت میں تمہیں شاپنگ مال کے بند ہونے تک میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

اس نے جواب دیا کہ وہ میرے ساتھ رہے گی۔ ہم نے میوزک اسٹور میں جانے کا فیصلہ کیا۔ متحرک سیڑھیوں پر کیتھی نے کہا کہ میں بے حد نفیس اور ہمدرد شخص ہوں۔ وہ میری اس عنایت کے جواب میں مجھے کچھ نہ کچھ ضرور دے گی۔ مجھے اس بارے میں کوئی یقین نہیں تھا کہ حقیقت میں اس بات کا کیا مطلب تھا جو وہ کہنا چاہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ایک اچھا آدمی ہوں۔ واقعی!"

"مجھے یقین ہے کہ تم حقیقت میں...... ایک اچھے آدمی ہو۔" کیتھی نے کہا۔ "لیکن کیا ہم ہر اسٹور سے کچھ نہ کچھ خریداری نہیں کر سکتے؟ جیسے کہ رقم کی کوئی بات ہی نہ ہو۔ تب تم کیا خریدنا پسند کرو گے؟"

میں نے رد کر دینے والے انداز میں ہاتھ لہرا دیا۔ ہم متحرک سیڑھیوں سے مال کی دوسری منزل پر اتر گئے جہاں لوگوں کی خاصی بھیڑ تھی۔

"مجھے اس شاپنگ مال میں موجود کوئی شے درکار نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "جن چند چیزوں کی مجھے ضرورت ہوتی ہے، ان کا میں آن لائن آرڈر دے دیتا ہوں۔"

"میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ ہر ایک اسٹور میں کوئی نہ کوئی ایسی شے ضرور ہوگی جو تم لینا چاہو گے۔"

"نہیں......"

"یقیناً ایسا ہی ہے۔ فرض کرو کہ ہمارے پاس دنیا کی تمام دولت ہے۔ تم مجھے کیا دلانا پسند کرو گے؟" کیتھی نے کہا۔

میوزک اسٹور میں، میں نے اسے نیل ینگ کی سی ڈی، دی ہولنڈ اسٹڈی اور ڈائلن خرید کر دیے۔ اس نے میرے لیے دی مس فٹس، دی ڈورز اور دی بزکوکس کو خرید لیا۔ بارنس اینڈ نوبل اسٹور میں کیتھی نے خلیل جبران اور رچرڈ باخ کی تصانیف پسند کیں۔ میں نے اس کے لیے ہارلن ایلیسن کی، ڈیتھ برڈ اسٹوریز اور مائیکل چیبون کی تصانیف خرید لیں۔ اس نے میرے لیے اداکار جیمز ڈین کا

پوسٹر پسند کیا۔ میں نے اسے لیس مس کا پلے بل دلا دیا۔ اس نے میرے لیے جس لیمپ کا انتخاب کیا، وہ آرٹ ڈیکوریشن کا ایک عمدہ پیس تھا۔ میرا منتخب کردہ لیمپ سادہ لیکن پیتل کے فریم میں تھا۔ کیتھی نے میرے لیے ایک پیلے سلک شرٹ پسند کی۔ دی گیپ اسٹور میں، میں نے اسے ڈے گلو رینبو سویٹرز دلا دیے۔ میں نے سلویڈور ڈالی کا انتخاب کیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ اسے پسند ہے لیکن اس وقت میں گنگ رہ گیا جب اس نے مجھے ایک مونٹ دلایا۔ اس نے مجھے ستر سالہ وہ طوطا خرید کر دلایا جو تین زبانیں بولتا تھا۔ میں نے اس کے لیے پندرہ بلی کے بچے، ایک روئیں دار بڑی ٹکڑی اور اسپائیکڈ کالر والا بل ڈاگ خرید لیا۔

کیتھی کا پسندیدہ تفریحی مقام کوہِ ہمالیہ تھا۔ میں نے کیریبین جزیروں کی بحری بجرے میں سیر اور اس کے بعد ایک ہفتہ کیٹسکلن میں گزارنے پر اکتفا کیا۔ میں نے اپنے ضخیم ڈی وی ڈی کلیکشن میں اسپالڈنگ گرے کی "مونسٹران اے بکس" کا اضافہ کیا۔ اس نے اس کلیکشن میں "گاڈ فادر ٹو" کو بھی شامل کر دیا اور ساتھ ہی گریٹ ال پسینو کا فلمی سین بھی دہرا دیا۔ اس نے میرے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور مجھے جھنجوڑتے ہوئے میرے ہونٹوں کا ہلکا سا بوسہ لے لیا۔ ساتھ ہی اس کا ڈائیلاگ بھی دہرا دیا۔ "میں جانتی ہوں کہ یہ تم ہی تھے، فریڈو! تم نے میرا دل توڑ دیا...... تم نے میرا دل توڑ دیا۔"

میں نے اسے ڈائمنڈ کی انگوٹھی خرید کر دی۔ اس نے میرے لیے ٹھوس سونے کا انتخاب کیا جس کے اندر ایک پرائیویٹ لطیفہ کندہ تھا۔ میں نے اپنی خلوت گاہ کے لیے شاہ بلوط کی لکڑی پسند کی۔ اس نے ہمارے بقیہ گھر کی آرائش کے لیے پلش کے تکیوں اور ہلکے گلابی رنگ کا انتخاب کیا۔ سی وی ایس فارمیسی سے میں نے اس کے لیے مشہور ایموز کوکیز خریدے۔ کیتھی نے میرے لیے چاکلیٹس پسند کیے۔

جب اسٹورز کے گیٹ بند ہونا شروع ہوئے تو ہم خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہاں دو خواتین آپس میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں لبالب بھرے ہوئے تھیلے تھے۔ میں اور کیتھی خاموشی سے گیٹ کی جانب رواں تھے۔

ابھی میں نے یہ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسے کتنی رقم درکار ہے کہ وہ میری جانب گھوم گئی اور مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی اس نے میرے ہاتھ میں سرامک کی بنی ہوئی ہموار اور قدرے گرم سی شے پکڑا دی۔

میں نے دیکھا تو وہ دو ماسک تھے...... ایک ہنستا ہوا چہرہ اور ایک منہ بسورتا ہوا۔ وہی ماسک جو تھیٹر میں استعمال کیے جاتے ہیں۔

"یہ کہاں سے آئے......؟"

"میں نے اس اسٹور سے اٹھائے ہیں جہاں ہر شے ایک ڈالر میں فروخت ہوتی ہے۔ میں تمہیں کوئی ایسی شے دینا چاہتی تھی کہ جس کی وجہ سے تم مجھے ہمیشہ یاد رکھ سکو۔" کیتھی نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تم نے یہ ماسک چوری کیے ہیں؟"

"یقیناً۔ اور میں کیا کرتی؟ یاد نہیں کہ میں ایک چھوٹی سی آوارہ لڑکی ہوں جو بالکل کنگال ہو چکی ہے؟"

"کیتھی...... میں......" الفاظ میری زبان پر اٹکنے لگے۔

"پلیز کہہ دو کہ تم اسے آج کی ملاقات کے حوالے سے ایک یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھو گے؟" کیتھی نے ملتجی لہجے میں کہا۔

تب دروازے پر کھڑی دو خواتین میں سے ایک نے ہماری جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ لہرا دیا اور آواز دی۔ "کیسی! اب آ جاؤ...... جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"کیسی؟" میں چونک گیا۔

اس لڑکی کا نام کیتھی یا کیسی جو بھی تھا، اس نے اپنی انگلی میرے لبوں پر رکھ دی۔ "تھینک یو۔" اس نے کہا۔ "ہر اس شے کے لیے جو آج تم نے مجھے دی ہے۔"

پھر اس نے میرا ایک بھرپور رخصتی بوسہ لیا۔

پھر وہ جاگنگ کرتی ہوئی ان خواتین کی جانب بڑھ گئی۔

میں اپنی جگہ خاموش کھڑا انہیں پارکنگ لاٹ کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ باہر ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔

پھر ان خواتین نے اپنے شاپنگ بیگز ایک بالکل نئی جگمگاتی بے داغ بی ایم ڈبلیو کار میں رکھے اور وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

"اف خدایا! نئی جگمگاتی بے داغ بی ایم ڈبلیو!"

بی ایم ڈبلیو کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد میں اپنے ہاتھ میں موجود دونوں تھیٹر ماسک کو تکنے لگا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے چہرے پر کون سا ماسک سجاؤں؟

ہنستے ہوئے چہرے والا ماسک یا منہ بسورتے ہوئے چہرے والا ماسک......!

محفلِ شعروسخن

❊ ذاکم علی گورچانی......داجل

میں منزلوں کی کھوج میں خود سے بچھڑ گیا
پھر عمر بھر تلاش ہی اپنی رہی مجھے

❊ فہیم شناس صدیقی......گلشن ظہور، کراچی

خواب کے شہر میں ایک شخص ستارے جیسا
نظر آیا تو سہی کوئی تمہارے جیسا
تشنگی جسم میں صحرا کی طرح پھیل گئی
ہم کو دریا نظر آتا ہے کنارے جیسا

❊ ایم افضال انصاری......ڈنگہ شہر

نہیں فرصت یقین مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تیری یادیں تیری باتیں بہت مصروف رکھتی ہیں

❊ دشتِ خیال......خواب نگر

ہم جو پہنچے سرِ مقتل، تو یہ منظر دیکھا
سب سے اونچا تھا جو سر، نوکِ سناں پر دیکھا
زندگی بھر نہ ہوا ختم، قیامت کا عذاب
ہم نے ہر سانس میں برپا نیا "محشر" دیکھا!

❊ رمضان پاشا......گلشنِ اقبال، کراچی

کہہ دینا سمندر سے ہم اوس کے موتی ہیں
دریا کی طرح تجھ سے ملنے نہیں آئیں گے

❊ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، کراچی

اس بار اس کا ہدف میری انا تھی
سو صلح کا پرچم جلا دیا میں نے

❊ جبران احمد ملک......گلشنِ اقبال، کراچی

اس نے کہا ہم سے ! بھول جاؤ ہمیں
ہم نے بھی روتے روتے کہہ دیا کون ہو تم؟

❊ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی، سکھیکی

بہت حفاظت سے رکھا ہے ان چراغوں کو
بجھتے بجھتے بھی ہواؤں سے الجھ پڑتے ہیں
دیکھ فرعون کے لہجے میں بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ پڑتے ہیں
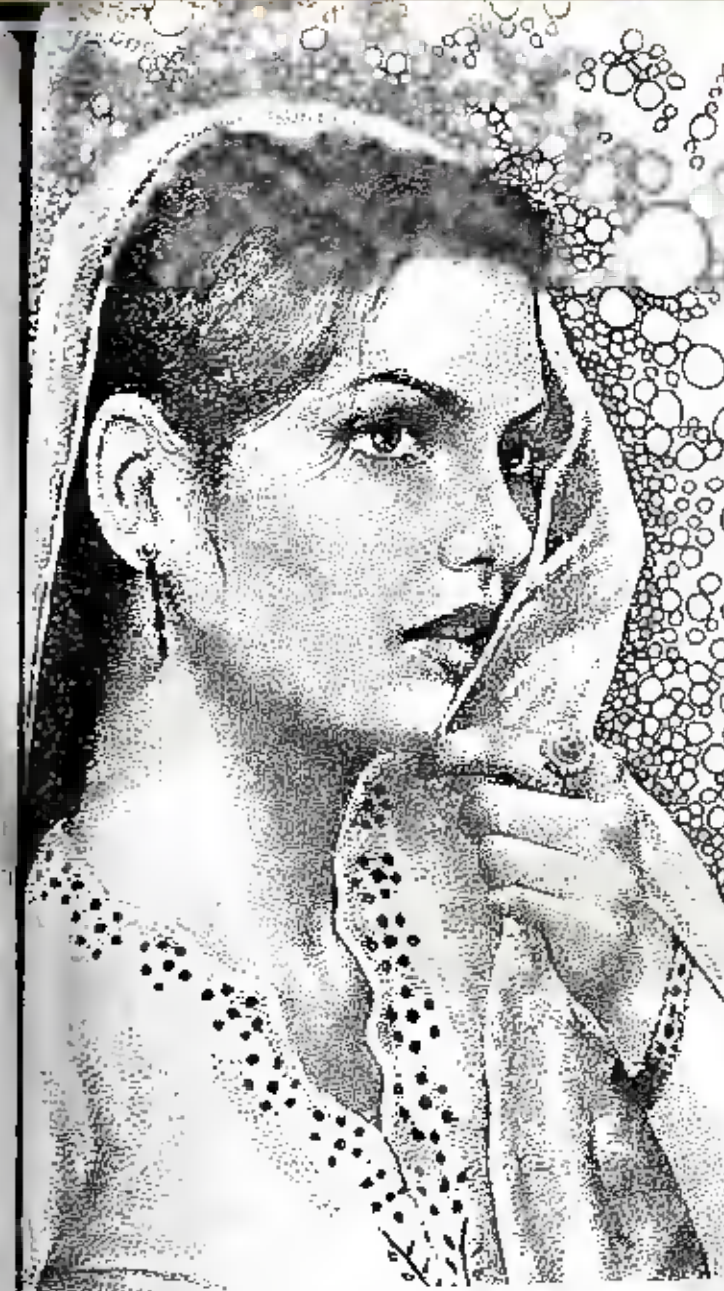
❊ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......فورٹ عباس

ہر چیز حد میں اچھی لگتی ہے
اک تم ہی ہو جو بے حد اچھے لگتے ہو

❊ ڈاکٹر ناہید شیخ......سرگودھا

مجھ سے ناراض نہ ہونا پیارے لوگو
دل نے چنا فقط وہی سنگدل شخص

❊ قاری وقاص، صدام......جیل سرگودھا

تیرے فراق کے لمحے شمار کرتے ہوئے
بکھر چلے ہیں تیرا انتظار کرتے ہوئے
تجھے خبر ہی نہیں ہے کہ کوئی ٹوٹ گیا
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے

❊ عاصم اقبال چپال......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

روٹھے تو پھر نہیں آئیں گے تیرے نگر
سن لے کہ قیامت کی انا ہم بھی رکھتے ہیں

❊ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

❊ بشیر احمد بھٹی......بہاولپور

کانچ کو خالص ہیرا سمجھے، ساری بھول ہماری تھی
اک صحرا کو دریا سمجھے ساری بھول ہماری تھی
کتنی خوش فہمی تھی ہم کو، ان کی نہ کو ہاں گردانا
وہ کیا بولے ہم کیا سمجھے ساری بھول ہماری تھی

❊ اعجاز احمد راحیل......ساہیوال

اب کوئی کیا میرے قدموں کے نشان ڈھونڈے گا
تیز آندھی میں تو خیمے بھی اکھڑ جاتے ہیں
محفلِ اربابِ ہنر پوچھتے کیا ہو کہ یہ لوگ
پتھروں میں بھی کبھی آئینے جڑ جاتے ہیں

❊ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی

برائیاں نظر انداز کرتا رہتا ہوں
کہ دل تمہاری کچھ اچھائیوں سے واقف ہے

❊ ناصر حسین......اسلام آباد

کاش میری قسمت کی لکیروں پہ نام تیرا ہوتا
آنکھ سے بہنے والے نیروں پہ نام تیرا ہوتا
جان تو جانے والی تھی مرتے تجھ اس طرح
کہ ہم پہ چلنے والے تیروں پہ نام تیرا ہوتا

❊ ابرار وارث......سندیلیانوالی

اسی لیے مانگا نہیں اسے خدا سے کبھی
دعائیں ہوتی ہیں مغموم بے ثمر ہوکر
بچھا بجھا اسے پایا تو ہوئی کچھ تسکین
کہ خوش تو وہ بھی نہیں ہم سے بے خبر ہوکر

❊ سید امتیاز حسین شاہ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

جو جلاتا ہے کسی کو خود بھی جلتا ہے ضرور
شمع بھی جل جاتی ہے پروانے کے بعد

❊ ملک مزمل اسلم......میانوالی

میں تیری بارگاہِ ناز میں کیا پیش کروں
میری جھولی میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

❊ مریم کلثوم......پشاور

کوئی آہٹ، کوئی جنبش، کوئی دستک نہیں ملتی
ہمارے دشتِ ویراں میں بڑی فرصت کا موسم ہے

❊ فیصل ربانی......سرگودھا

اب یہ آنکھیں نہیں دیکھیں گی زمانے تیرے
اب کہاں غیر سنائیں گے فسانے تیرے
اب تو بس یادوں کی دستک ہی رہے گی باقی
اب کہاں آئے گا وہ دل قول نبھانے تیرے

❊ عثمان انصاری......نیو سینٹرل جیل ملتان

یہ اس کے پیار کی باتیں فقط قصے پرانے ہیں
بھلا کچے گھڑے پر کون دریا پار کرتا ہے
ہمیں یہ دکھ کہ وہ اکثر کئی موسم نہیں ملتا
مگر ملنے کا وعدہ ہم سے وہ ہر بار کرتا ہے

❊ سوہا جی......حیدرآباد

رات گہری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے تھے
تم جو بچھڑے تو یہ بھی نہ سوچا
کہ ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

❊ محمد صدیق تاجک......پرنس روڈ، کوئٹہ

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی میری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں

❊ محمد نعمان ندیم......صدر

صد حیف کے برباد ہوئے ہم تیری خاطر
صد شکر کے تجھ پہ کوئی الزام نہ آیا

❊ رعنا رضوی......مانچسٹر

اے نسیمِ سحر تجھ کو ان کی قسم
ان سے جاکر نہ کہنا میرا حالِ غم

❊ عاطف عمیر......کراچی

چراغِ جاں لیے کسی دشت میں کھڑا ہوں میں
کوئی قافلہ یاں سے گزرنے والا نہیں
میں کیا کروں کوئی تصویر گر ادھوری ہے
میں اپنے رنگ تو اب اس میں بھرنے والا نہیں

❊ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی

دیوانگی نہیں ہماری تو اسے اور کیا کہیں گے
انسان ڈھونڈتے رہ گئے پرچھائیوں میں ہم

❊ سید ظفر عباس زیدی......چنیوٹ

آنکھ میں پانی بھر کے لایا جاسکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جاسکتا ہے

❊ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
میں تو سورج سے الجھنے کے لیے نکلا تھا
کون لایا ہے تہ سایہ دار مجھے؟

❊ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
ان کا قاصد لے چلا ہے دل میرا
تازہ فرمائش، نئی سوغات ہے

❊ حفیظ انصاری ....سکھر
میرے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھر کے صنم
آج بت خانے میں بھگوان بنے بیٹھے ہیں

❊ اظہر حسین......ہزاری، جتوئی
یوں تو کچھ غلط بھی نہیں ہوتے چہروں کے تاثر
لوگ ویسے ہوتے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں

❊ گڑیا......سرگودھا
تو نے آنا ہی نہ تھا دیے جلاتا کیسے
تیری راہوں کو میں پلکوں سے سجاتا کیسے

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
آوارہ ہوگئے ہیں اس آرزو میں ہم
شاید جہاں میں کوئی ہمارا دکھائی دے

❊ مہ جبیں......لاہور
وقت کی قید میں خود ہی گرفتار رہا
دلِ ناداں کو تری دستک کا انتظار رہا

❊ محمد اسلم......خانیوال
نہ اہلِ تخت نہ ان کے مخالفین کے ساتھ
میری ساری ہمدردیاں ہیں زمین کے ساتھ

❊ مسز رباب احمد حسن عرضی......قبولہ شریف
طلاق تو دے رہے ہو غرور و قہر کے ساتھ
مرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ

❊ مہرین ناز......حیدرآباد
ہم تو شجر تھے اور شجر ہی رہے
وہ بدلتا رہا موسموں کی طرح

❊ ریاض بٹ......حسن ابدال
سمجھ کے کانچ کا ٹکڑا تراشا مجھ کو دنیا نے
بنا پھر بھی نہیں کنگن تیری نازک کلائی کا

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
مانا کہ پُرخطر ہیں محبت کی منزلیں
لیکن سکونِ دل بھی انہی منزلوں میں ہے

❊ فہیم احمد......سرگودھا
اب تک میری یادوں میں ہے رنگوں کا تلاطم
دیکھا تھا کبھی جھیل کنارے تیرا آنچل

❊ صفدر علی......کوٹری
اے خدا مجھے طارق کا حوصلہ ہو عطا
ضرورت آن پڑی کشتیاں جلانے کی

❊ قاضی عرفان احمد عاجز......آڑہ، چوآسیدن شاہ
تو میری ذات کا مالک ہے بخش دے مجھ کو یارب
حساب مجھ سے نہ دیا جائے گا میری خطاؤں کا

❊ اشوک کمار......میرپور خاص
پتھروں کا وہ دور بھی ایسا نہ تھا
کہ آدمی وحشی تھا بے چہرہ نہ تھا

❊ سعدیہ جعفر......میرپور خاص
ملاقاتیں مسلسل ہوں تو دلداری نہیں رہتی
بڑے دلچسپ ہوتے ہیں یہ بے ترتیب یارانے

❊ رضوان احمد......ملتان
اک منظر خوش رنگ دکھا جاتا ہے پانی
بہتا ہوا چپ چاپ چلا جاتا ہے پانی

❊ محمد زریان سلطان......اردو بازار، کراچی
تصور میں بھی تو اونچی اڑانیں بھول جائے گا
میری چاہت کو اپنے پاؤں کی زنجیر بننے دے

❊ مہوش......لاہور
زندگی کی راہوں میں ہر طرف اندھیرا ہے
کھو گیا خدا جانے ہمسفر کہاں اپنا

کوپن برائے شمارہ نومبر 2014	محفلِ شعر و سخن
	نام: --
	پتا: --

وعدہ تو کیا ہوتا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

کہتے ہیں بنیا گڑ نہ دے کم از کم گڑ جیسی بات تو کرے... یہی فارمولا زندگی کے بیشتر موڑ پر بہت سچا اور کھرا اترتا ہے۔ وہ جو اس کی راہ تکتے تکتے تھک نہیں رہی تھی اور سماعت چند خوب صورت جملوں کو ترس رہی تھی جانے کیوں رفتہ رفتہ مایوسی دل میں ڈیرے ڈالنے لگی تھی۔ ایسے میں ایک ہوک سی دل میں اٹھی کاش... ساتھ نہ سہی کم از کم ساتھ نبھانے کا وعدہ تو کیا ہوتا... اب اس ہوک میں ٹیسیں بھی شامل ہوتی جارہی تھیں... ایسے میں زخموں کو مرہم کی بہت شدت سے تلاش تھی۔

محبتوں کے اسیر... کسی کی چاہ میں فقیر بنے والوں کا ماجرا
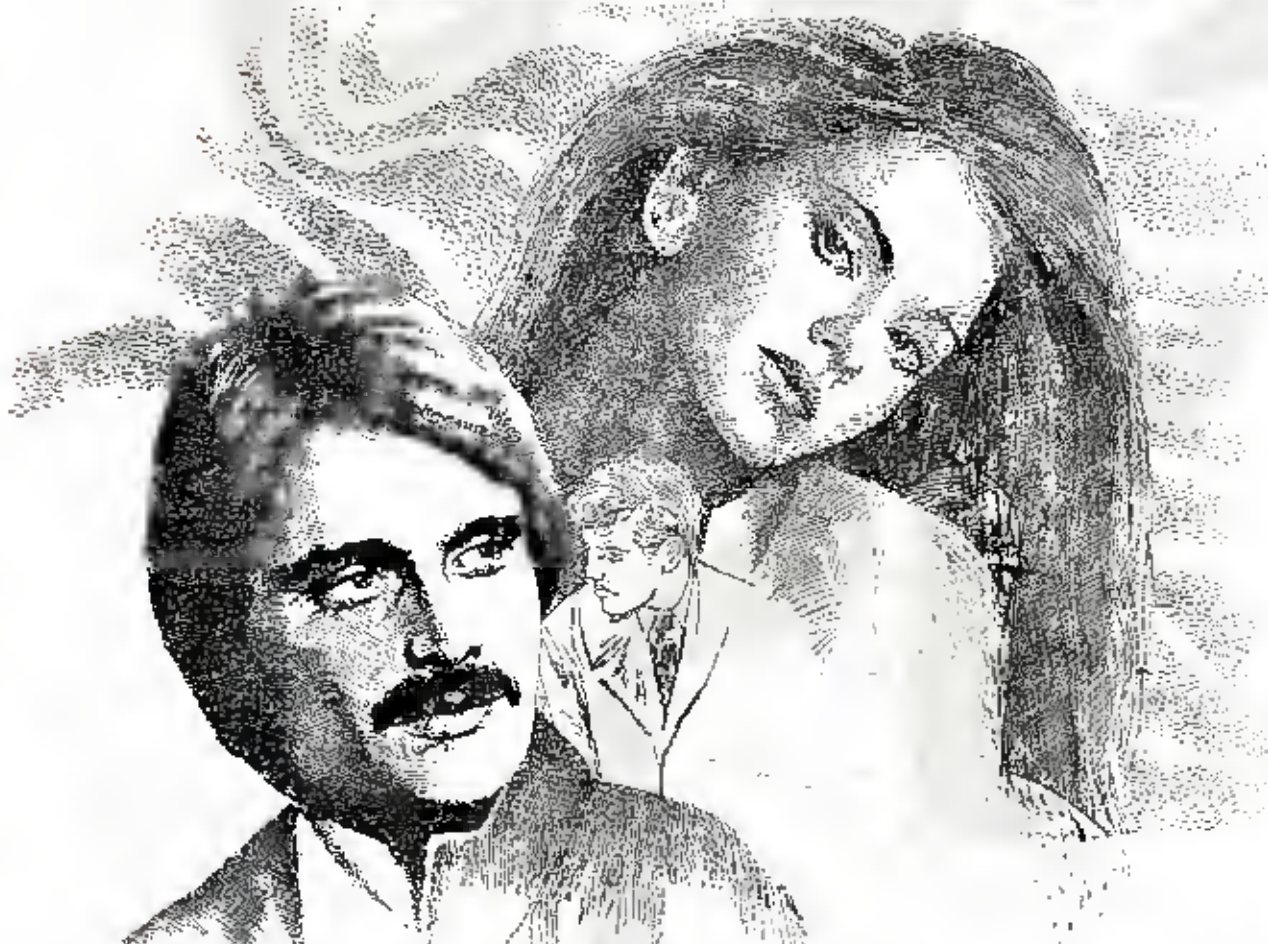
میں شراب پیتا تھا، یہی ایک خرابی تھی مجھ میں۔ ہمارے گھر میں کوئی بھی نہیں پیتا تھا بلکہ اٹھتے بیٹھتے سگریٹ اور شراب کے خلاف ہی بات کی جاتی تھی۔ شاید میں بھی نہیں پیتا اگر کراچی یونیورسٹی میں میری ملاقات شبیر سے نہیں ہوتی۔ ہم دونوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ کراچی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں شراب سے ہمارا تعارف ہوا تھا۔ میں اور شبیر دونوں ہی ہاسٹل میں سلیم سے ملنے گئے تھے۔ سلیم کے کمرے کے ساتھ ہی اگلا دو کابلی کا کمرا تھا۔

وکابی نیروبی سے پڑھنے کراچی آیا تھا۔ سلیم کی سارے غیر ملکی طالب علموں سے دوستی تھی۔ وہاں پر ایک شام وکابی اور سوڈان کے لڑکے سلیم کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ سلیم نے شبیر کو بھی ایک گلاس پکڑا دیا۔ ہم دونوں نے نہ چاہنے کے باوجود آہستہ آہستہ گھونٹ لینے شروع کیے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ مزہ خراب ہونے کے باوجود مجھے اچھا لگا پھر ہم لوگ یونیورسٹی کی اس خفیہ جماعت میں باقاعدہ شامل ہوگئے تھے۔ کبھی کبھار ہاسٹل آنا اور آ کر پینا ایک معمول سا بن گیا تھا۔ ایسا معمول کہ شراب کو ہم برا سمجھتے ہی نہیں تھے۔

غیر ملکی طالب علموں میں بھی دو گروپ تھے۔ ایک گروپ مذہبی قسم کے طالب علموں کا تھا جو اسلامی جمعیت طلبا کا حامی تھا۔ دوسرا گروپ آزاد خیال قسم کا تھا جو اپنے آپ میں مست رہتا تھا۔ کبھی پروگریسیو کی حمایت کر دی کبھی نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو ووٹ دے دیا۔ ہم دونوں کا تعلق کسی بھی قسم کی سیاست سے تو تھا نہیں، تھوڑا بہت پڑھائی کے بعد آزاد خیال غیر ملکیوں کے ساتھ گھومتے رہتے تھے۔

وہ یونیورسٹی کے اچھے دن تھے، میں نے اور شبیر نے تو بڑی بھرپور زندگی گزاری۔

ایم اے کرنے کے بعد شبیر کو پی آئی اے میں نوکری مل گئی تھی اور میں بھی تھوڑے دن بے روزگار رہنے کے بعد ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازم ہوگیا جس میں کام کے دوران میں نے بہت کچھ سیکھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میری ٹریننگ ہی یہاں پر ہوئی تھی۔ مجھے ایک اسسٹنٹ کے طور پر لیا گیا تھا۔ ملک کی کئی قومی اور بین الاقوامی کمپنیوں نے ہماری ایجنسی کی خدمات حاصل کی ہوئی تھیں۔

ہماری ایجنسی کے مالک بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے کلاس فیلو، ان کے آشنا، ان کے والد کے دوست، ان کے بھائی کے جاننے والے، ان کی بیوی کے قدردان اور ان کے سسرال کی رشتے داریاں سب نے مل کر ایجنسی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ پارٹیاں ایک معمول سا تھیں۔ وہ خود بھی بڑی محنت کرتے تھے اور ہم سب بھی ایک طرح سے ان کی شخصیت کے جال میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ کوئی بھی ان سے ”نہ“ نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں کام لینے کی زبردست صلاحیت تھی۔ انہوں نے میری ٹریننگ میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ ان کی ساری اچھی باتیں سیکھ لوں اور میں نے سیکھی بھی تھیں۔ صرف شراب ان کی ایسی برائی تھی جس کو پہلے ہی میں نے اپنا لیا تھا۔ پانچ سال میں نے اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کیا۔ اس کے بعد ایک امریکن کمپنی میں ایک اچھی جگہ مل گئی اور میں نے وہ کمپنی جوائن کر لی تھی۔ یہ کمپنی پاکستان میں تیل اور گیس تلاش کر رہے تھے۔ کچھ جگہوں پر تیل کی تلاش میں کامیابی کے بعد کھدائی بھی شروع ہو چکی تھی۔ اسی کمپنی کا ایک دوسرا حصہ تھا جو پاکستان میں غربت کے خلاف اور ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے کام کر رہا تھا۔ مجھے اس دوسرے حصے کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے رکھا گیا تھا۔

شبنم بھی یہی کام کرتی تھی۔ اس نے لاہور کے لمس (Lums) سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لی تھی اور اسی کمپنی میں ملازم ہوگئی تھی۔ دوسرے ہفتے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ بہت ہی جاذب نظر شخصیت کی مالک تھی۔ اس کو گورا نہیں کہا جا سکتا تھا مگر کوئی خاص بات تھی اس میں، لانبے اور گھنے بال، درمیانہ قد، کتابی چہرہ اور بہت بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اس کے چہرے پر نظر نہیں رکتی تھی، اس کی آنکھوں پر نظر رکتی تھی اور پورے وجود میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگتی تھیں ٹن ٹن ٹن ٹن۔

اس دن یہ گھنٹیاں ہی بجی تھیں اور میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ نہ ہمارا کوئی جھگڑا ہوا تھا، نہ اس نے مجھ سے کوئی بدتمیزی کی تھی، نہ میں نے اس کو خوش آمدید کہا تھا، ہم نئے تھے اور نہ جانے کیوں ایک دوسرے کو پسند آ گئے تھے۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی اور میں بھی اسے اچھا لگا تھا اور ایک معصوم سی دوستی کا یکایک آغاز ہو گیا تھا۔

پھر تو ہم روز ہی ملتے تھے۔ کبھی وہ کافی پینے میرے کیبن میں آ جاتی تھی، کبھی میں چائے پینے اس کے کمرے میں چلا جاتا تھا اور لنچ تو ہم لوگ تقریباً روز ہی ساتھ کیا کرتے تھے۔ وہ اندر سے بھی بڑی خوب صورت تھی۔ بہت ذہین اور بے انتہا سمجھدار۔

ہماری دوستی آہستہ آہستہ چاہت میں بدلتی گئی تھی۔ مجھے وہ بہت اچھی لگی تھی، خاص طور پر اس کا آزاد رویہ، اس کا اپنے پر بلا کا اعتماد۔ وہ نارتھ ناظم آباد سے روزانہ اپنی ٹویوٹا اسٹارلٹ پر میکلوڈ روڈ آتی تھی اور کراچی کے اس جنگل میں جہاں لڑکیوں کو لوگ عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں، وہ بلا کی خود اعتمادی کے ساتھ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔

ایک دن مجھے وہ سخت غصے میں ملی۔ میں نے پوچھا۔ ”ارے بھائی اتنی لال بھبوکا کیوں بنی ہوئی ہو؟“ وہ غصے کے باوجود مسکرا دی تھی۔ ”نہیں کوئی بات نہیں ہے، بس غصہ آتا ہے بس شہر میں پیدا ہو گئی ہوں سارے کمینے ہیں اندر سے۔“

مجھے اس کی بات سے کوئی خاص اختلاف تو نہیں تھا لیکن پھر بھی میں پوچھ بیٹھا۔ ”ارے کیا ہو گیا ہے، آخر بات کیا ہوئی ہے؟“

”ارے بات کیا ہوئی ہے روز کا چکر ہے۔ آج پھر گاڑی ٹریفک میں پھنس گئی تھی اور کوئی بھی راستہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ پیدل چلنے والے لوگ بھی میرے سامنے آ رہے تھے اور کم بخت دیکھتے تو ایسے ہیں جیسے کھا جائیں گے۔ لڑکی کا گاڑی چلانا تو عذاب ہی ہے۔ اگر بس چلے تو شیشے توڑ کر مجھے اغوا ہی کر لیں۔ ہر کوئی گزرتے ہوئے گاڑی پر اس طرح ہاتھ پھیرتا ہے جیسے میں اس کے قابو میں آ گئی ہوں۔“

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ”ارے، تم ہنس رہے ہو، ہنسنے کی بات ہے۔ یہ شرم کی بات ہے۔“ بات تو شرم کی ہی تھی مگر روڈ پر چلنے والے ان بے شمار لوگوں کو کیا کہا جا سکتا تھا۔ سارا شہر فرسٹریشن کا شکار تھا۔ ہر قسم کی فرسٹریشن تھی لوگوں کو اور ہر کوئی اپنے طریقے سے اس فرسٹریشن کو مٹا رہا تھا۔ کوئی دیواروں پر الٹے سیدھے نعرے لکھتا ہے، کوئی بسوں کو جلاتا ہے، کوئی سڑکوں کی روشنیوں کو توڑتا ہے، کوئی گاڑی چلانے والی لڑکی کی گاڑی پر ہاتھ پھیرتا ہے، میں نے اسے سمجھایا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کا غصہ ختم ہو گیا تھا مگر ہم دونوں ہی سوچ رہے تھے، بہت کچھ۔ وہ ایک لڑکی ہونے کے ناتے اور میں ایک مرد ہونے کے حوالے سے۔

ایک دن اس کی گاڑی کے چاروں پہیوں کی ہوا کسی نے نکال دی تھی، حالانکہ گاڑی محفوظ جگہ پر کھڑی تھی مگر نہ جانے کیوں کسی نے یہ شرارت کی تھی۔ وہ تو یہ کہیے کہ میکلوڈ روڈ پر ہمارے آفس کے قریب ہی پنکچر والے کی دکان تھی، اسے میں نے بلا لیا تھا۔ اس نے جیک لگا کر چاروں پہیے ایک ساتھ اتار لیے تھے اور اپنی دکان سے ہوا بھر دی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا مگر وہ بے انتہا ٹینشن کا شکار ہو گئی تھی۔ شاید کچھ خوف زدہ بھی۔ میں نے کہا تھا، گاڑی آفس میں ہی چھوڑ دو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ کل صبح تمہیں تمہارے گھر سے لیتا ہوا آ جاؤں گا، گلشن سے فاصلہ ہی کتنا ہے۔ اس نے شدید غصے میں کہا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ شاید غصے میں کوئی حادثہ ہی کر بیٹھوں گی۔“

اس دن میں نارتھ ناظم آباد میں فائیو اسٹار ہوٹل کے پاس اس کے گھر گیا تھا جہاں اس کے ابو، امی اور بھائی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لوگ بڑے سلیقے کے لوگ تھے۔ اس کے ابو حبیب بینک میں منیجر تھے، ماں ایک اسکول میں پڑھاتی تھیں اور بھائی این ای ڈی میں انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔ میں بہت دیر تک ان کے گھر بیٹھا گپ شپ لگاتا رہا۔ مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے میں اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہوا ہوں۔

اس رات میں نے اپنی امی کو کہہ دیا تھا کہ میں نے لڑکی تلاش کر لی ہے اب عنقریب آپ کو ان کے گھر جانا ہوگا۔ ہمارے گھر میں بھی خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔

پھر دسمبر کا مہینا آ گیا۔ نئے سال کی پارٹیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ ہمارے آفس کے کنٹری منیجر نے اپنے گھر پر ایک دعوت رکھی تھی جہاں آفس کے کچھ لوگ مدعو تھے۔ کافی اچھی دعوت تھی۔ میں اور شبنم ساتھ ہی پہنچے تھے۔ اس نے بہت ہی خوب صورت، نئے انداز کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کے ساتھ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دعوت میں شراب بھی مل رہی تھی اور میں نے بھی اپنی پسند کی بیئر پی لی تھی۔ خوب صورت پارٹی، خوب صورت انداز سے شروع ہو کر خوب صورت انداز سے ہی ختم ہو گئی تھی۔

زندگی گزر رہی تھی، آفس کا روزانہ کا کام، ماحول کی

سگریٹ اور نوشی

سگریٹ نوش کو جتنا نقصان سگریٹ نوشی سے ہوتا ہے۔ اس سے کئی گنا نقصان سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھ کر ہوتا ہے۔

میں جب بھی سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھتا ہوں تو مجھے اختلاج قلب کی بیماری تو اسی وقت ہو جاتی ہے، سانس میں رکاوٹ بھی محسوس ہونے لگتی ہے، بلڈ پریشر بھی ہائی ہو جاتا ہے چنانچہ کینسر ہونے سے پہلے میں اخبار لپیٹ کر پرے رکھ دیتا ہوں۔ میرا ایک دوست سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھ کر اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس نے سگریٹ بھی چھوڑ دی اور نوشی بھی..... حالانکہ بے چاری نوشی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ (عطاالحق قاسمی)

مرسلہ۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

بڑھتی ہوئی آلودگی کے بارے میں شہریوں کی بے حسی، اس بے حسی کو دور کرنے کی ہماری ناکام کوششیں۔ غربت کو دور کرنے کے لیے حکومت کے مختلف اداروں کو دیے جانے والے ہمارے مشورے اور فنڈ جو حکومت کے افسران اپنی امیری کو بڑھانے میں صرف کر رہے تھے۔ شہر کی بگڑتی ہوئی حالت، ابلتے ہوئے گٹر اور روزانہ بجلی کے چلے جانے کا عمل اس میں سوائے ڈپریشن کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس بے رنگ تصویر میں صرف شبنم کی رنگینی تھی، اس کی فلسفیانہ باتیں، اس کا عورتوں کے حقوق کے لیے جہاد، زندگی میں ہونے والے حادثات پر اس کا ردِعمل، اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے، وقت خوب گزرتا تھا جس سے ساتھ ساتھ وہ اب میری کمزوری بھی بن گئی تھی۔

پھر ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تھا کہ کیا ارادے ہیں، مجھ سے شادی کرو گی یا بغیر شادی کے اسی طرح سے بور کرتی رہو گی۔ وہ یکا یک ہنسی، پھر سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ہاں کر سکتی ہوں، مگر ایک شرط ہے۔"

"شرط ہے، کیسی شرط؟ ہمالیہ پہاڑ سے جا کر سونے کے انڈے لانے کو مت کہنا۔"

"نہیں، اس سے بھی آسان ہے۔" اس نے ہنس کر کہا تھا۔ "اگر مانو گے تو بولوں گی۔"

"جب پتا ہی نہ ہو تو ماننے کا کیسے وعدہ کر سکتا ہوں۔ بڑی بے وقوفی کی بات کر رہی ہو۔" میں ہنس دیا تھا۔

نہیں ہای تو بھرو۔ پھر میں ایسی کون سی شرط رکھوں گی کہ تم مان نہیں سکتے ہو۔" اس نے پھر ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا بابا! بولو۔ ماننے والی بات ہوئی تو مان لوں گا۔ تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"وعدہ؟"

"وعدہ۔"

"اچھا تو پھر شراب پینا چھوڑ دو۔" اس نے رک رک کر بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ارے، میں روز تھوڑی پیتا ہوں یہ کیا شرط ہوئی۔" میں نے احتجاج کیا تھا۔ "مجھے پتا ہے تم روز نہیں پیتے ہو مگر میں چاہتی ہوں کہ تم کبھی بھی نہ پیو۔" اس نے پھر اسی لہجے میں کہا تھا۔

"مگر یہ میری ذاتی آزادی میں تمہاری دخل اندازی ہے۔ تم یہ کیسی شرط رکھ رہی ہو؟" میں نے پھر احتجاج کیا تھا۔

"دیکھو، یہ تو ہمارے مذہب میں بھی منع ہے اور ایسی کون سی بڑی بات ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن میں مذہبی نہیں ہوں۔ تمہیں پتا ہے، اچھی طرح سے معلوم ہے۔" میں نے بھی ذرا سختی سے کہا تھا۔

"تم خدا کو مانتے ہو؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں مانتا ہوں۔" میں نے تھوڑا غصے سے کہا تھا۔

"رسول کو مانتے ہوں؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔

"ہاں مانتا ہوں مگر یہ کیا سوال ہے؟" میں نے احتجاج کیا تھا۔

"تم نماز پڑھتے ہو؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔

"عید، بقر عید پر پڑھ لیتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"پڑھتے تو ہو نا؟ یہ کافی ہے۔" اس نے اسی لہجے میں کہا تھا۔ "خدا کو مانتے ہو، رسول کو مانتے ہو، نماز پڑھتے ہو تو شراب بھی چھوڑ دو۔"

مجھے غصے کے باوجود ہنسی آ گئی تھی۔ "کیسی بے وقوفی کی بات کر رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے میں کتنا مسلمان ہوں اور جتنا ہوں اتنا ہی رہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے تعلقات میں ان چیزوں کو نہ لاؤ تو بہتر ہے۔" میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا تھا۔

"تم میرے لیے ایک چھوٹا سا وعدہ بھی نہیں کر سکتے؟" اس نے بڑے عجیب انداز سے مجھ سے پوچھا تھا۔ کچھ التجا تھی، کچھ شکوہ تھا، کچھ نصیحت سی تھی اور کچھ حکم تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پاس جواب دینے کے لیے الفاظ ہی نہ ہوں مگر پھر میں بولا تھا۔

"دیکھو اگر میں وعدہ کر لوں گا تو پھر مجھے زندگی میں کبھی بھی نہیں پینی ہو گی اور شاید میں ایسا نہیں کر سکوں۔ مجھے شراب اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے پینا اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھار مہینے دو مہینے میں ایک بار دوستوں میں بیٹھ کر تھوڑی سی پی لیتا ہوں۔ تھوڑا سا ہنس لیتا ہوں تو ایسی کون سی برائی ہے۔ میں شرابی نہیں ہوں، کبھی کبھار شاید پیتا رہوں گا۔ آج اگر میں تم سے وعدہ کر لیتا ہوں اور پھر وعدہ نہیں نبھا سکا تو پھر تم سے جھوٹ بولوں گا۔ مجھے یہ جھوٹ بولنا منظور نہیں ہے۔ تم مجھ سے یہ وعدہ نہ لو تو بہتر ہے بلکہ اس چکر میں ہی نہ پڑو۔"

اس نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا تھا۔ "تو کیا تمہاری ماں کو پتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو؟"

"نہیں، شاید نہیں پتا۔" میں نے جواب دیا تھا۔

"کیوں نہیں پتا۔ تم نے ان سے جھوٹ بولا ہے نا...؟" اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"نہیں، میں نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ میں نے

دیکشن کی ہی نہیں ہے، اس موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔ وہ ایک چیز سے لاعلم ہیں، انہیں لاعلم ہی رکھوں گا، اگر کبھی کسی بھی وجہ سے شراب کا ذکر آیا بھی تو ٹال دوں گا۔ میں جھوٹ اور سچ بولے بغیر بھی رہ سکتا ہوں۔ خدا کے لیے اس چیز کو درمیان میں مت لاؤ۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "نہیں اقبال! تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا۔ تمہیں شراب چھوڑنی ہو گی۔ جب تم یہ وعدہ کرو گے تو پھر بات آگے بڑھے گی۔ تم سوچو، خوب سوچو اور سوچ کر مجھے بتانا۔ تمہارے فیصلے کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گی۔"

یہ اس کا ایک دوسرا رخ تھا۔ میں نے سمجھنے کی کوشش کی تھی، نہیں سمجھ سکا تھا۔ میری ماں کی نسل اور تھی، ہماری نسل اور ہے۔ میں اپنی ماں سے شاید جھوٹ بول کر مطمئن رہ سکتا تھا مگر اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ ایک نسل کا فاصلہ تھا۔ میری ماں سہگل اور ملکہ پکھراج کے گانے سنتی تھی، ہم لوگ اسپرنگ میڈونا اور ایلٹن جان سنتے تھے۔ ہماری دلچسپیاں مختلف تھیں، ہم مختلف ادوار میں تھے، میں سوچ سوچ کر بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ ہماری چاہت کے اس رشتے میں شراب کہاں سے آ جائے گی۔

معمولی سی بات بڑھتی چلی گئی۔ مجھے پتا تھا کہ وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہے جتنا میں چاہتا ہوں مگر اس ایک شرط نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ میں جھوٹا وعدہ کرنے پر راضی نہیں تھا اور وہ اپنی بات پر اڑ گئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے یکا یک بہت دور ہو گئے تھے۔

میرے لیے اس جگہ کام کرنا مشکل ہو گیا تھا اور مجھے جلد ہی ایک اور امریکن کمپنی میں نوکری مل گئی تھی۔ پھر مجھے شبنم کی شادی کا کارڈ ملا، کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ میں نے بڑے کرب کے ساتھ اس کی شادی میں شرکت کی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اسد اس کے شوہر کا نام تھا۔ اسٹیج پر وہ دونوں اچھے لگے تھے۔

میری بھی شادی حنا سے ہو گئی، میری ماں نے ہی اسے پسند کیا تھا۔ شبنم کے بعد میری پسند ناپسند ختم ہو گئی تھی۔ حنا ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ عام بیویوں کی طرح سے شوہر کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار۔ وہ کافی مذہبی لڑکی تھی مگر اس نے مجھ سے میرے بارے میں نہ کوئی سوال کیا تھا اور نہ میں نے اپنی طرف سے ان سوالوں کا جواب دیا تھا جو پوچھے ہی نہیں گئے تھے۔

مجھے پتا لگا تھا کہ شبنم نے نوکری چھوڑ دی ہے بلکہ شوہر نے چھڑوا دی ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا کیونکہ اسے تو ہمیشہ کام کرنے کا شوق تھا۔ مجھے پھر بعد میں پتا لگا تھا کہ وہ اسد کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی ہے۔ اس کا بھی مجھے افسوس ہوا تھا کیونکہ وہ اکثر باتوں میں کہتی تھی کہ سعودی عرب عمرہ حج کے لیے صحیح ہے، میں کبھی وہاں کام نہیں کروں گی۔ کوئی بات ہے کہ عورت گاڑی تک نہیں چلا سکتی وہاں۔

میں زندگی کے چکروں میں الجھا رہا تھا مگر لگتا ہے... کبھی کبھار اس کی یاد آ جاتی تھی۔ میں حنا کے ساتھ خوش تھا مگر وہ بھی میری زندگی کا ہی ایک حصہ رہی تھی۔ بہت سی باتیں کی تھیں ہم نے۔ کچھ وعدے کیے تھے اور کچھ وعدے نہیں کیے تھے۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے پھر ایک دن وہ نظر آ گئی تھی۔

میں شاہراہِ فیصل کے عوامی مرکز میں حنا کے ساتھ کچھ خریداری کرنے گیا تھا۔ وہ اندر کچھ سامان اکٹھا کر رہی تھی کہ سفید برقع میں ملبوس ایک عورت مجھے نظر آئی تھی۔ سر تا پا جسم کا ہر حصہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھوں پر بھی دستانے پہنے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہی بڑی بڑی سیاہ سوچنے والی شریر آنکھیں۔ میں پہچان گیا تھا، شبنم تھی وہ۔ وہ بھی آہستہ آہستہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"اقبال! کیسے ہو؟" اس نے اسی لہجے میں، اسی پیار سے پوچھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک، یہ تم نے کیا کر لیا ہے اپنے ساتھ۔ خوش تو ہو نا...؟" میں نے بے اختیار ہو کر سوال کر لیا تھا جو شاید مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔

وہ مجھے تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی، آنکھوں میں وہی جذبہ تھا، وہی پیار کا سمندر تھا پھر وہ آہستہ آہستہ بولی تھی۔

"تم اگر ایک جھوٹا وعدہ کر لیتے تو تمہارا کیا جاتا، کیا بگڑتا، ایک چھوٹی سی بات تھی، ختم ہو جاتی۔ اچھا نہیں کیا تم نے۔" یہ کہہ کر وہ بڑی تیزی سے میرے سامنے سے چلی گئی۔ میں بے تاب ہو کر اس کی طرف بڑھا کہ اسے روکوں اور کچھ اور بات کروں کہ سامنے سے حنا آ گئی۔

"میں یہاں ہوں آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے زور سے آواز دے کر کہا تھا۔

اب بھی کبھی کبھی راتوں کو میری آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ بڑی بڑی سیاہ اور شریر، سوچنے والی اداس آنکھیں مجھے بے قرار کر جاتی ہیں۔

محی الدین نواب

گیارہویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتی، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر داد اور چاچی بشی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گاؤں چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کروانی چاہی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک قیمتی ہار بھی تحفتاً دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون ہونے کے ساتھ ساتھ ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا مگر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک لڑکی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔ ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف تجلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مر مٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور نقد رقم کے ساتھ زلیخا کا وہ ہار بھی لے گئے لیکن پکڑے گئے یوں مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ جو کہ جیلر کی بیٹی ہے، دیگر دو ساتھی بہرام اور دارا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی کی خاطر ماروی سے دور کر رہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کر لے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ جب ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہو گئی جس میں سمیرا بھی مددگار رہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آ جائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور تجلی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرینہ مراد کا پیچھا کرتے ہوئے راستے میں ماروی تک پہنچ گئی اور محبوب سے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کرایا تو اسی خبر سے محبوب میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ اتفاق سے راستے میں ماروی چاچی اور چاچا کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مرینہ ماروی کو جام تماچی کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرا لیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ محبوب اور مراد کے جگہ بدل لینے سے حالات بھی بدلتے جا رہے تھے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ دوسری جانب ماروی کے علاج کے لیے باہر سے ایک ڈاکٹر عدیلہ کو بلایا جاتا ہے جو خود بھی دہری شخصیت کا شکار ہے۔ وہ عدیلہ بھی ہے اور عادل بھی۔ مرد بھی ہے اور عورت بھی۔ عدیلہ کی باتوں میں کچھ ایسی اپنائیت تھی کہ ماروی اس کے قریب ہوتی چلی گئی تاہم اسے علم نہیں تھا کہ وہ دہری شخصیت کی مالک ہے ادھر عدیلہ بھی ماروی میں دلچسپی محسوس کرنے لگی۔ مراد بھی محبوب کے گھر پہنچ گیا تھا مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو پہچاننے کی کوشش میں تھی مگر اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ماروی کو عدیلہ کی حقیقت کا علم ہو گیا اور اس نے عدیلہ کو سختی کے ساتھ خود سے دور رہنے کا کہا۔ عدیلہ لندن چلی گئی۔ ادھر غیر ملکی ایجنٹ نے مراد کو قتل کرنے کا حکم دیا اس پر حملہ ہوا تاہم وہ بچ گیا۔ مراد نے ایک ایجنٹ کو پکڑ لیا۔ ایجنٹ بھی مراد کے ساتھ مل گیا۔ مراد عمرکوٹ میں تھا۔ پولیس نے مراد کو چاروں طرف سے گھیر لیا مگر اسی دوران مرینہ نے دھاوا بول دیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مراد مرینہ کے لیے چھلاوا بن گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماروی ہنسنا بولنا بھول گئی تھی۔ اس کوٹھی میں سب ہی کو چپ لگ گئی تھی۔ چاچی چاچا میڈم روزینہ سب ہی صدمے سے دوچار تھے۔ محبوب نے کتنے ہی لوگوں کو اس کی تلاش میں لگایا تھا۔ مراد کی تصویر تمام اخبارات میں شائع کرا رہا تھا۔ اس کے ساتھ مرینہ کی ہسٹری بھی شائع کرا رہا تھا۔ اخبارات کے ذریعے یہ بتا رہا تھا کہ وہ ایک ملک دشمن عورت ہے۔ برنارڈ کو جیل سے فرار کرانے لندن سے آئی تھی۔ اس کا جیلر باپ اسی جرم کا مرتکب ہو کر فرار ہو گیا ہے۔ وہی عورت مراد کو اغوا کر کے کہیں لے گئی ہے۔ جو بھی اس عورت کو ڈھونڈ نکالے گا، اسے انعام کے طور پر دس لاکھ روپے دیے جائیں گے۔

یوں دس دن گزر چکے تھے اور کہیں سے مراد اور مرینہ کی سن گن نہیں مل رہی تھی۔ حماد نے کہا۔ ”عمرکوٹ سے ہندوستانی سرحد بہت قریب ہے۔ مرینہ اسے بارڈر پار لے گئی ہے۔ پاکستان میں ہوتی تو کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتی۔“

معروف تجلی نے کہا۔ ”اگر مراد سرحد پار گیا ہے تو یہ بات اس پہلو سے اطمینان بخش ہے کہ وہ زندہ تو ہے۔ آج نہیں تو کل واپس آئے گا۔“

سمیرا سب سے زیادہ دل شکستہ تھی۔ مراد نے گم ہو کر ماروی کو محبوب کے لیے فری پاس بنا دیا تھا۔ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ کوئی کسی کے لیے ساری عمر نہیں روتا۔ دنیا میں بہلنے اور بہلانے کا بہت سامان ہے اور عورت تو کبھی تمام عمر تنہا رہ نہیں سکتی۔ وہ ایک جیون ساتھی کے سہارے کی محتاج رہتی ہے۔

یہ سوچ سوچ کر سمیرا کا کلیجا جل رہا تھا۔ وہ اپنے حالات کے مطابق بیچاری بن گئی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ ماروی اپنے اس محبوب کا صدمہ اٹھا رہی تھی جو بچھڑ چکا تھا۔ سمیرا اس محبوب کی آہیں بھر رہی تھی جو بچھڑنے والا تھا۔

ماروی صبر کرتی آ رہی تھی، خود کو سمجھاتی آ رہی تھی کہ مراد آج نہیں تو کل اچانک ہی آئے گا لیکن دو ہفتے گزر گئے تھے اور وہ موت کی طرح خاموش تھا۔

تب وہ ہمت ہار گئی۔ اندر سے ٹوٹ گئی۔ وہ محبوب معروف، سمیرا اور چاچی کے سامنے صدمے سے چیخ پڑی۔ ”وہ نہیں آئے گا... نہیں آئے گا...“

سب ہی اسے پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔ وہ رو پڑی تھی۔ صبر کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔ محبوب نے کہا۔ ”ماروی! اچھی امیدیں رکھو۔ خدا پر بھروسا کرو، وہ آئے گا۔“

وہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر پھر چیخنے لگی۔ ”وہ نہیں آئے گا۔ کوئی دس تک گن رہا تھا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ دس تک گننے کے بعد کیا ہوا ہوگا...؟“

وہ سب چپ رہے۔ صاف سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ گنتی ختم ہوتے ہی گولیاں چلی ہوں گی۔

محبوب نے کہا۔ ”عمرکوٹ کا پولیس انسپکٹر اور کئی سپاہی گواہ ہیں کہ مراد کو کسی نے گولی نہیں ماری تھی۔“

”ماروی! تم سے حماد نے بھی کہا ہے میں بھی کہہ چکا ہوں کہ مرینہ اسے بچانے آ گئی تھی۔ وہی اسے کہیں لے گئی ہے۔ یہ خیال دماغ سے نکال دو کہ دس تک گننے والوں نے اسے گولی ماری ہے......“

ماروی نے کہا۔ ”مرینہ بھی اس کی جان کی دشمن ہے۔ کیا اس نے اسے زندہ رہنے دیا ہوگا؟ اس کا ایک فون تک نہیں آیا۔“

محبوب نے کہا۔ ”ہاں۔ وہ اس کے شکنجے میں مجبور ہوگا اور وہاں سے رہائی پانے کی کوششیں کر رہا ہوگا۔“

”میں تنہائی میں روتی ہوں۔ دل کہتا ہے اسے ڈھونڈنے... نکل جاؤں۔ یا کسی ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں کوئی نہ ہو۔“

وہ سمیرا، معروف اور محبوب کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں تنہا ڈھونڈنے نہیں جا سکتی۔ چاچی چاچا کو اور آپ جیسے تمام چاہنے والوں کو چھوڑ کر بھلا کر کہاں جا سکتی ہوں۔“

ابھی اس نے کہا۔ ”آپ جیسے چاہنے والے...“

ان چاہنے والوں میں محبوب بھی شامل تھا اور محبوب کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ سامنے بیٹھی اس کی چاہت کا اعتراف کر رہی ہے۔ مراد کی غیر موجودگی میں اس حد تک ہی اعتراف کافی تھا۔

وہ بول رہی تھی۔ ”میں نے سوچ لیا ہے اب چپ رہوں گی۔ منہ سے آواز نہیں نکالوں گی۔ مراد مجھے آواز نہیں سنا رہا ہے۔ میں بھی کسی کو اپنی آواز نہیں سناؤں گی۔ گونگی بن جاؤں گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟ ہم سے کیا ناراضی ہے؟ ہم سے کیوں نہیں بولو گی؟“

”آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ آپ سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ لیکن مراد کو پانے کی ضد کر رہی ہوں۔ وہ جب تک مجھ سے نہیں بولے گا، میں بھی بولنا چھوڑ دوں گی۔“

”یہ تو تم مجھ سے ناانصافی کرو گی۔ یہ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے لیے جی رہا ہوں۔ یہاں دن رات تمہارے لیے آتا ہوں۔ تم نہیں بولو گی تو یہ سراسر مجھ پر ظلم

ہوگا۔‘‘

ماروی نے ذرا چپ ہوکر اسے دیکھا۔ اس نے پہلی بار کھل کر کہا تھا‘ تمہارے لیے جی رہا ہوں...

وہ ذرا ہچکچائی پھر بولی۔ ’’آپ بہت اچھے ہیں۔ مجھے چاہتے ہیں مگر میں کیا کروں؟ میں دل وجان سے اور پورے ایمان سے آپ کی قدر کرتی ہوں۔ آپ جیسا نیک اور شریف انسان میں نے نہیں دیکھا۔ آپ کی محبت کا یہ انداز مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں آپ کو دنیا کی ساری محبتیں دوں گی لیکن یہ سمجھ گئی ہوں کہ جو محبت مراد کے لیے ہے...‘‘

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ’’وہ مراد کے لیے ہی رہے گی۔‘‘

وہ بولا۔ ’’تم بچپن سے اس کی ہو۔ اسی کی رہو گی۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ میں بھی تمہارے دل میں رہتا ہوں۔ اللہ کرے جلد ہی اس کی دلہن بن جاؤ۔ محبت کی ایک روحانی حیثیت بھی ہے۔ وہ حیثیت میرے لیے رہے گی۔ مراد کے بعد میرا ہی نام تمہاری زبان پر آئے گا۔ میں نے تمہیں اتنی محبتیں دی ہیں کہ تم کبھی مجھے دل سے نکال نہیں پاؤ گی۔‘‘

’’آپ درست کہتے ہیں۔ آپ اکثر میرے خیالوں میں آتے ہیں اور بے اختیار آتے ہیں۔ میں نے کہا نا۔ میں آپ کی قدر کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے لیے میری چاہت کیسی ہے تو پھر گونگی بن جاؤں تو شکایت نہ کریں۔ میں مراد کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ مجھے چاہتے ہیں تو میرے بولنے کا انتظار کریں۔‘‘

وہ چلی گئی۔ محبوب سوچ میں پڑ گیا۔ اس دیوانے کی محبت تو یہی تھی کہ اسے دیکھتا تھا تو اوروں کو دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ ورنہ دنیا بے رنگ و بو سی لگتی تھی۔ اس کی آواز سنتا تھا تو دنیا کی ہر آواز سریلی لگتی تھی۔ اب نہیں بولے گی تو سُر سنگیت کا دم نکل جائے گا۔

وہ سر جھکا کر سوچ رہا تھا‘ اب کیا ہوگا۔ میں یہاں آتا رہوں گا اور اسے دور سے دیکھتا رہوں گا۔ وہ گونگی بن کر چپ رہے گی۔ میں بولوں گا‘ وہ جواب نہیں دے گی۔ کوئی ضروری بات ہوگی تو شاید گونگے اشاروں سے جواب مل جائے گا۔

سمیرا بہت خوش تھی۔ سوچ رہی تھی۔ نہ وہ بولے گی، نہ اس کی کسی بات سے محبوب صاحب خوش فہمی میں مبتلا ہوں گے۔ یہ نہیں بولے گی تو ملاقات کرنے کی آدھی دلچسپی ختم ہوجائے گی۔ جیو ماروی! آج تم نے دل خوش کردیا ہے۔

وہ خوش ہوگئی تھی کسی حد تک لیکن پھر وہی کاروباری معاملات سے اس کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ وہ دوسرے دن آفس نہیں آیا تو گویا سمیرا کے پاس نہیں آیا۔ اس کے دیدار نہیں ہوئے‘ اس دیوانے نے سمیرا کو بھی نظر انداز کردیا تھا۔

وہ دوسرے دن ماروی کے پاس گیا تو وہ پہلے کی طرح ڈرائنگ روم میں اس سے ملنے نہیں آئی۔ وہ رات کا کھانا اس کے ساتھ کھاتا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر آئی۔ ہاتھ کے اشارے سے اسے سلام کرکے میز کے دوسری طرف بیٹھ گئی۔

محبوب نے کھانے کے دوران کہا۔ ’’چاچی! کیسا عجیب سا لگ رہا ہے۔ ہم بول رہے ہیں اور ماروی چپ ہے۔ ہم مراد کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کرے وہ ابھی واپس آجائے۔‘‘

اس بات پر ماروی نے بے اختیار سر اٹھایا جیسے آسمان کو دیکھ کر آمین کہہ رہی ہو۔

محبوب اپنی کوٹھی میں آکر سوچنے لگا۔ وہ نہیں بول رہی تھی۔ پرائی لگ رہی تھی۔ ایسے کس طرح دن گزریں گے؟ پتا نہیں مراد کب واپس آئے گا۔ آئے گا بھی یا نہیں؟

جس دن سے وہ حواس پر چھائی تھی۔ اس دن سے اب تک جتنی امیدیں اس سے وابستہ تھیں‘ وہ دم توڑتی رہی تھیں۔ لیکن امیدیں کبھی نہیں مرتیں۔ پھر نئے سرے سے حوصلہ دیتی ہیں۔

وہ رات گئے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ دل کہتا رہا۔ اس کی آواز نہیں سنے گا تو وہ اور دور ہوتی ہوئی لگے گی۔

’’اے ماروی! میرے جیسا اسیر کوئی نہ ہوگا۔ آزاد پھرتا ہوں اور تیرے زنداں سے نکل نہیں پا رہا ہوں۔ بہت ہوچکا۔ اب اسے کسی طرح بولنے پر مجبور کرنا ہی ہوگا۔ لیکن کیسے...؟‘‘

پھر اس کے ذہن میں ایک تدبیر پکنے لگی۔

اس نے دوسرے دن ایک نئی سم خریدی اور گھر آکر ماروی کے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ وہ کسی سے بولتی نہیں تھی۔ پھر فون کیوں اٹینڈ کرتی لیکن دل میں پیا ملن کی آس تھی۔ امید تھی کہ مراد کسی دن کسی وقت بھی کال کرسکتا ہے۔

ماروی اپنے فون سے ابھرتی ہوئی رنگ ٹون کو سن رہی تھی۔ اس نے سوچا۔ ’’اگر مراد کی کال نہیں ہوگی تو وہ کوئی جواب نہیں دے گی۔ فون بند کردے گی۔‘‘

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگالیا۔ اسے بہت ہی کمزور سی بیمار سی آواز سنائی دی۔ ’’ماروی! میں تمہارا مراد

بول رہا ہوں۔‘‘

وہ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ تقریباً چیختی ہوئی بولی۔ ’’مراد...! یہ تم ہو؟ تم ہی بول رہے ہو نا؟‘‘

وہ بے چینی کے مارے ادھر سے ادھر جارہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ’’تمہاری آواز ایسی کیوں ہے؟ کیا بیمار ہو؟ کہاں ہو بولو؟ میں ابھی آجاؤں گی۔‘‘

وہ کھانستے ہوئے بولا۔ ’’میں تم سے بہت دور ہوں۔ اپنے ملک سے باہر ہندوستان میں ہوں۔‘‘

’’یا خدا! تم وہاں کیسے چلے گئے؟‘‘

’’تم نہ بولو۔ مجھے بولنے دو۔ فون کی بیٹری ڈاؤن ہو رہی ہے۔ یہاں نہ چارجر ہے نہ بجلی ہے۔ میں زخمی ہوں اور بیمار ہوں۔ ایک جگہ چھپا ہوا ہوں۔ کسی طرح یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔

’’دشمن میرے پیچھے لگے ہیں۔ تم پریشان نہ ہونا۔ اتفاق سے یہ فون ہاتھ آیا ہے تو تمہیں تسلی دے رہا ہوں۔ میری جان...! خدا پر بھروسا رکھو۔ میں ضرور واپس آؤں گا۔

’’وعدہ کرو‘ تم آنسو نہیں بہاؤ گی۔ میرے آنے تک ہنستی بولتی رہو گی۔ وعدہ کرو۔‘‘

وہ بولی۔ ’’آج تو میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اطمینان ہوگیا ہے تم زندہ سلامت ہو اور بہت ہمت والے ہو۔ ضرور میرے پاس آؤ گے‘ وعدہ کرو۔ فون کرتے رہو گے۔‘‘

’’یہ وعدہ نہیں کرسکتا۔ میں نہیں جانتا کہ یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گا۔ ویسے امید ہے‘ کہیں نہ کہیں پھر تم سے باتیں کرنے کا موقع ضرور...‘‘

فون اچانک بند ہوگیا۔ وہ آوازیں دینے لگی۔

’’ہیلو۔ ہیلو مراد... ہیلو۔ ہیلو۔‘‘

پھر سمجھ میں آیا کہ اس کے فون کی بیٹری جواب دے گئی۔ وہ مجبور ہوگیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہ سب سے اہم بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ زندہ ہے۔

وہ خوشی سے جھومتی ہوئی بیڈ پر آکر چاروں شانے چت ہوگئی۔ پھر کروٹ لے کر تکیے کو کھینچ کر سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے خوشیاں منائے؟

اگرچہ وہ اب بھی برے حالات سے گزر رہا تھا۔ تاہم یہ امید قوی ہوگئی کہ وہ کسی دن ضرور واپس آئے گا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ گنگنائے‘ گائے اور خوشی سے چیخ چیخ کر بولے۔ اب تو وہ بول سکتی تھی۔ ساری دنیا کو اپنے مراد کی زندگی اور سلامتی کی خوش خبری سنا سکتی تھی۔

وہ بیڈ سے اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ چاچی لاؤنج کی طرف جارہی تھی۔ اس نے چیخ کر آواز دی۔ وہ بیچاری گھبرا گئی۔ وہ آکر اس سے لپٹ کر گھومتے ہوئے بولی۔ ’’مراد زندہ ہیں۔ چاچی! مراد زندہ ہیں۔ ابھی ابھی فون پر بات کی ہے۔‘‘

منی نے اسے خوشی سے اور لپٹا لیا۔ اسے چومنے لگی۔ خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ مراد کو سلامتی کی دعائیں دینے لگی پھر پوچھا۔ ’’وہ کہاں ہے؟ کیا ابھی آرہا ہے؟‘‘

وہ ذرا اداس ہوکر بولی۔ ’’نہیں چاچی! وہ یہاں سے بہت دور ہندوستان میں ہیں۔ مجھ سے بہت دور چلے گئے ہیں۔‘‘

وہ پاؤں پٹختی ہوئی منی سے دور ہوکر بولی۔ ’’ان کی مصیبتیں ختم کیوں نہیں ہو رہی ہیں؟ وہاں اور زیادہ مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے‘ زخمی ہیں اور بیمار بھی ہیں۔ ان سے زیادہ باتیں نہیں ہوسکیں۔‘‘

منی نے کہا۔ ’’یہ خوش خبری سائیں کو سناؤ۔ وہ تو اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں گر پڑیں گے۔‘‘

’’وہ بہت اچھے ہیں‘ ہمارے محافظ ہیں۔ ہمارے سرپرست ہیں۔ میرے چپ رہنے سے‘ نہ بولنے سے پریشان ہوگئے ہیں۔‘‘

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی پھر بیڈ پر سے اپنا فون اٹھا کر محبوب کے نمبر پنچ کیے۔ وہ اندازہ کر رہا تھا۔ تصور میں دیکھ رہا تھا کہ ماروی خوشی سے پاگل ہورہی ہے۔ جب اسے خوش خبری سنانے کا خیال آئے گا تو وہ ضرور اسے کال کرے گی۔

اور یہی ہو رہا تھا۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ’’میں حیران ہوں ماروی! تم نے تو چپ کا روزہ رکھا ہے پھر یہ کال کیسی؟‘‘

اس کی آواز مسرتوں سے لبریز تھی۔ وہ بولی۔ ’’ہائے میں خوشی سے مر جاؤں گی۔ مراد زندہ ہے۔ میرا کلیجا خوشی سے پھٹ رہا ہے۔ مراد زندہ ہے۔‘‘

اس نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ ’’ماروی! یہ تو معجزہ ہوگیا۔ ہم مایوس بھی ہوتے تھے اور اس کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری سن لی۔ ماروی! آج ہماری عید ہوگئی ہے۔ یہ بتاؤ‘ کیا اس نے فون کیا ہے؟ یا کسی سے پیغام بھیجا ہے؟‘‘

وہ چہکتی ہوئی بولی۔ ’’اس نے خود فون کیا ہے۔ اللہ! کتنے دنوں کے بعد میں نے اس کی آواز سنی ہے۔ میں کیا بتاؤں‘ خوشی

سے چیخنے چلانے ہنسنے بولنے کے لیے ہی مچل رہا ہے۔"
وہ ہنستے ہوئے بولا۔"دیکھو خوشی سے پاگل نہ ہو جانا۔یہ بتاؤ وہ کہاں ہے اور کب آرہا ہے؟"
وہ ذرا سنجیدہ ہوگئی۔اُداسی سے بولی۔"وہ بہت بیمار ہے۔انڈیا میں کہیں چھپا ہوا ہے۔اس کی آواز سے پتا چل رہا تھا کہ بہت کمزور ہوگیا ہے۔"
"فکر نہ کرو۔وہ دلیر جوان ہے۔بیماریوں اور دشمنوں سے لڑتا ہوا جلد ہی تمہارے پاس آئے گا۔"
"آپ بہت اچھے ہیں۔پلیز ابھی آجائیں۔واقعی آج ہمارے لیے عید کا دن ہے۔ہم خوب خوشیاں منائیں گے۔"
وہ بولا۔"خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی زندگی اور سلامتی کا ثبوت دے رہا ہے۔میں ابھی آرہا ہوں۔ہم اس کے بارے میں خوب باتیں کریں گے۔"
وہ مسرتوں سے کھنکھناتی ہوئی آواز میں بولی۔"ہاں خوب باتیں کریں گے۔میں تو پاگل ہورہی ہوں۔آپ آجائیں۔"
"بس سمجھو کہ آرہا ہوں۔"
وہ فون بند کر کے مسکرانے لگا۔اس کی تدبیر نے رونے والی کو ہنسا دیا تھا۔اس نے بڑی ذہانت سے رس بھرے گلابی ہونٹوں کے تالے توڑ دیے تھے۔وہ گونگی بننے والی اب اس سے دن رات باتیں کرنے والی تھی۔

☆☆☆

مرینہ تقدیر کو نہیں مانتی تھی۔اس کا دعویٰ تھا کہ وہ تدبیر سے اب تک اپنی تقدیر بناتی آئی ہے۔اس کے لیے یہ پریشانی کی بات نہیں تھی کہ مراد کے معاملے میں دوبار تقدیر سے مات کھا چکی تھی۔
وہ حوصلہ ہارنے والی نہیں تھی۔اس کی قوتِ ارادی کہہ رہی تھی کہ مراد کو انڈیا سے جانے نہیں دے گی۔یہاں ہر قیمت پر ضرور اسے تابع دار بنالے گی۔
وہ بڑی کامیابی سے اسے لوہے میں جکڑ کر سرحد پار لے آئی تھی لیکن کامیاب ہوتے ہوتے اسے دماغی جھٹکا لگا تھا۔لوہا بھی موم ہوگیا تھا۔ٹوٹ کر اس کی بالکونی میں آگیا تھا۔
یہ تو پریشانی تھی کہ وہ آزاد ہوگیا ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ خوف بھی سما گیا تھا کہ وہ نادیدہ ہوگیا ہے۔نظر نہیں آرہا ہے۔پتا نہیں کب کہاں سے چھپ کر اس کی موت بن کر آجائے گا۔
دوسرے دن جگ دیو نے بالکونی میں آکر دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔"وہ ہمارے اس بنگلے کے اندر نہیں آسکتا تھا۔دونوں گارڈ جاگ رہے تھے۔وہ ان ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کو دور ہی سے بالکونی میں پھینک کر گیا ہے۔"
مرینہ نے کہا۔"ان چیزوں کو پھینک کر جانے کا مطلب یہ ہے مجھے دہشت زدہ کرتا ہے۔"
"ہاں تمہیں یہ جتا رہا ہے کہ دور سے یہ چیزیں یہاں پہنچا سکتا ہے تو دور سے تمہیں گولی بھی مار سکتا ہے۔"
وہ بولی۔"نہیں۔ہماری دشمنی ایسی ہے کہ وہ دور سے گولی نہیں مارے گا۔مجھے دوڑائے گا۔ہلکان کرے گا۔پہلے کی طرح زخموں سے چور کرے گا پھر مارے گا۔"
جگ دیو نے کہا۔"عجیب دشمنی ہے تم دونوں کی۔"
"ہاں تم دیکھو گے۔میں پھر اسے زنجیر پہناؤں گی۔ابھی تو یہ چیزیں یہاں پھینک کر وہ جتا رہا ہے کہ کسی کی قید میں نہیں ہے۔آزاد ہے اور کسی وقت بھی میری موت بننے والا ہے۔اچھا ہے۔میرا غلام بننے کے لیے آزاد رہے۔"
"پلیز یہ معلوم کرو کہ وہ آزاد کیسے پھر رہا ہے اور اسی علاقے میں کہاں چھپا ہوا ہے؟"
جگ دیو نے کہا۔"میں حیران ہوں کہ وینکٹ راؤ کی قید سے کیسے نکل بھاگا ہے؟ میرا خیال ہے اس نے وینکٹ راؤ سے کسی طرح کی ڈیلنگ کی ہے۔"
"وہ مجھے مار ڈالنے یا پہلے کی طرح نیم مردہ کردینے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔"
وہ بولا۔"اب میں تمہیں بتا دوں کہ ماسٹر کوبوبو نے بھی اسے آفر دی تھی کہ وہ ہمارا تابع دار بن کر رہے گا تو اسے تمہاری زنجیروں سے نجات دلا دی جائے گی۔وہ راضی ہوگیا تھا۔لیکن اس نے ماسٹر کی یہ بات نہیں مانی کہ وہ تمہارا ماتحت رہ کر کام کرے گا۔"
وہ بولی۔"ہاں۔وہ اپنی ناک نیچی نہیں کرے گا۔"
وہ بولا۔"ماسٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم دونوں کے درمیان کسی طرح سمجھوتا کرادوں۔میں اس رات اسے تمہارے پاس لا رہا تھا۔تم دونوں کے درمیان صلح کرانا چاہتا تھا۔لیکن اس سے پہلے ہی وینکٹ راؤ کے آدمی اسے لے گئے۔"
پھر وہ بولا۔"مرینہ! ایسی کیا بات ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے ہوگئے ہو؟"
"کوئی سنگین مسئلہ نہیں ہے۔وہ ایک ماروی نامی لڑکی کا دیوانہ ہے۔اس کے سوا کسی دوسری عورت کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔بڑا پارسا بنتا ہے۔میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے

ساتھ زندگی گزارے۔
"لیکن مجھے ٹھکرا کر اس نے میری انسلٹ کی ہے۔اب تو یہ ضد ہے کہ اسے اپنے ساتھ کچھ راتیں گزارنے پر مجبور کروں گی جب دل بھر جائے گا تو اسے گولی ماردوں گی۔اس ذلیل کتے سے اپنی توہین کا بدلہ ضرور لوں گی۔"
"مرینہ! تم مانو یا نہ مانو۔تمہاری یہ ضد تمہیں مہنگی پڑ رہی ہے۔دیکھ لو کہ اس نے لوہے کی بندشیں توڑ دی ہیں۔اب تمہاری نیندیں اڑاتا رہے گا۔"
"ہاں اس نے فکر میں مبتلا کردیا ہے۔ویسے میں بے یار و مددگار نہیں ہوں۔ماسٹر کوبوبو کی پناہ میں ہوں۔"
"بے شک تم یہاں محفوظ رہو گی۔ہماری پوری کوشش ہوگی کہ وہ دوبارہ ادھر نہ آئے۔"
مراد واقعی پھر اُدھر نہیں گیا۔مرینہ کے لیے اس کا نہ آنا بھی عذاب ہوگیا۔ہر آنے والا دن ہر آنے والی رات دھمکی بن جاتی تھی کہ کل نہیں تو آج آئے گا۔
اگر آکر گزر جاتا۔وہ نقصان اٹھاتی یا فائدہ حاصل کرتی تو سکون حاصل ہوتا کہ طوفان آکر گزر گیا ہے۔یہ اس کی کامیابی تھی کہ اسے دل دھڑکانے والے انتظار میں مبتلا کرچکا تھا۔
وہ جگ دیو کی ایک رہائش گاہ میں سکون سے تھا۔ماسٹر کوبوبو نے کہا تھا کہ وہ مکمل ٹریننگ حاصل کرلے گا تو اس پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں گی۔اسے موبائل فون اور ایک گاڑی ملے گی۔ہندی زبان اور وہاں کے طور طریقے سیکھ لینے کے بعد اسے کہیں بھی آزادی سے جانے دیا جائے گا۔
اس کی تربیت کے لیے ایک عورت اور ایک مرد صبح و شام آتے تھے۔اسے ہندی زبان سکھانے اور ہندوستانی رسم و رواج کو اچھی طرح سمجھانے کے علاوہ مختلف ہتھیاروں کو استعمال کرنا بھی سکھاتے رہتے تھے اور بڑے اہم ذرائع سے اس کی ہندوستانی شہریت کے لیے اہم کاغذات بھی تیار کرائے جارہے تھے۔
مراد نے ان کی تمام ضروری شرائط تسلیم کی تھیں اور اپنی بھی یہ شرط تسلیم کرائی تھی کہ ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد وہ ایک آزاد ہندوستانی شہری کی طرح کسی بھی شہر، کسی بھی علاقے میں رہے گا۔ماسٹر کوبوبو بھی اچانک آدھی رات کو بھی کسی مشن پر جانے کے لیے کہے گا تو وہ فوراً روانہ ہوجائے گا۔
ماسٹر نے کہا تھا۔"کبھی وقتِ ضرورت مرینہ کے ساتھ رہ کر کوئی ڈیوٹی انجام دینی ہوگی۔تم دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے رہو۔ہم مداخلت نہیں کریں گے لیکن آپس کے جھگڑے کے باعث ہمارے کسی پروجیکٹ کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"
اس نے وعدہ کیا تھا کہ ان کے کسی پروجیکٹ کو کبھی نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔وہ بڑی لگن سے ہندی زبان اور وہاں کے طور طریقے سیکھ رہا تھا۔وہ چاہتا تھا جلد سے جلد تربیت حاصل کرلے تاکہ موبائل فون ہاتھ میں آئے اور وہ سب سے پہلے ماروی کو مخاطب کرے۔اسے بتائے کہ وہ اس کے لیے زندہ ہے اور جلد ہی اس کے پاس آنے والا ہے۔
سنڈیکیٹ دی ماسٹرز کو اپنی خدمات سونپنے کے بعد یہ آسان نہیں تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان ماروی کے پاس چلا جاتا۔وہاں سے جانے کے لیے لازمی تھا کہ وہ سنڈیکیٹ کے لیے بڑے کارنامے انجام دے اور انہیں مالی فائدہ پہنچائے۔
وہ آئندہ اپنی جانِ حیات سے کب ملے گا؟ کیسے ملے گا؟ یہ ابھی سوچا نہیں تھا۔رفتہ رفتہ مجرموں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر سنڈیکیٹ دی ماسٹرز کی طاقت کا اندازہ کرنے کے بعد وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے والا تھا۔اس نے یہ بات صاف طور سے کہہ دی تھی کہ پاکستان کے خلاف نہ کوئی کام کرے گا نہ کسی کو کبھی کچھ کرنے دے گا۔
ماسٹر کوبوبو عالمی سطح کے مجرموں کے درمیان اس کی جنگجوئی کو آزمانا چاہتا تھا۔اس لیے اس کی نہ ماننے والی کچھ شرطیں بھی کسی بحث کے بغیر مان گیا تھا۔
مراد پندرہ دنوں میں ہندی کتاب اٹک اٹک کر پڑھنے لگا۔لکھنے کی بھی مشقیں کررہا تھا۔دہلی میں نیشنل اسمبلی کا ایک رکن جگ دیو کے غنڈوں کی مدد سے الیکشن میں کامیابیاں حاصل کرتا تھا اور اس کا احسان مند تھا۔اس نے مراد کے نئے نام سے ہندوستانی شہریت کے کاغذات تیار کیے تھے۔
مراد کا نیا نام نوشاد علی تھا۔اس ایم این اے کے علاقے میں رہنے والے بے شمار لوگ انکوائری کے وقت یہ گواہی دیتے کہ نوشاد علی اس علاقے میں پیدا ہوا تھا اور وہیں پڑھ لکھ کر جوان ہوا تھا۔
اسے ہر پہلو سے ایک ہندوستانی مسلمان ثابت کرنے کے تمام قانونی کاغذات تیار ہوچکے تھے۔
وہ ایک ماہ میں اچھی طرح ہندی بولنے لگا۔بڑی حد تک لکھنے پڑھنے بھی لگا۔ایک ماہ کے بعد جگ دیو اسے ایک

قریبی شہر جے پور لے گیا۔ وہاں اسے آزاد چھوڑ دیا گیا تاکہ وہاں کے لوگوں سے چلتے پھرتے بولتا رہے۔

اس نے وہاں دو دن دو راتیں گزاریں۔ جگ دیو دور سے اس کی نگرانی کرتا رہا۔ پھر خوش ہوکر بولا۔ ''کسی کو شبہ نہیں ہوا سب ہی تمہیں ہندوستانی مسلمان سمجھتے رہے اور آگے دو چار مہینوں میں پکے ہندوستانی بن جاؤ گے۔''

اس نے ایک نیا موبائل فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''ماسٹر نے کہا تھا کہ جب میں تمہاری ٹریننگ کے بعد مطمئن ہوجاؤں تو تمہاری تمام ضرورتیں پوری کرتا رہوں۔

''تم کل کی فلائٹ سے دہلی جاؤ گے۔ کاغذات کے مطابق تم وہاں پہاڑ گنج کے علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس علاقے کا ایم این اے دھرم داس تمہیں ضروری معلومات فراہم کرے گا تاکہ تم اس شہر کو اچھی طرح دیکھ لو اور سمجھ لو۔

''تمہارے پاس اپنا رہائشی بنگلا' اپنا بنک بیلنس اور اپنی گاڑی ہوگی۔ تم اس ملک کے جس حصے میں جاؤ گے' تمہیں ضرورت کی تمام چیزیں ملتی رہیں گی۔ تمہیں فون کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ بولو' پہلے کسے کال کرنے والے ہو؟''

''ماسٹر کو بوبو نے ایک ماہ پہلے کہا تھا کہ وہ مجھ سے اس دن بات کرے گا جس دن میں ٹریننگ حاصل کرلوں گا اور مجھے ایک نیا فون ملے گا۔''

''یعنی ابھی تم ماسٹر سے باتیں کروگے؟''

''ماسٹر سے تھوڑی دیر بعد بھی باتیں ہوسکتی ہیں۔ پہلے میں اپنی ماروی کو خوش کروں گا۔''

جگ دیو اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو میں چلتا ہوں۔'' پھر وہ جاتے جاتے رک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب تو فون آگیا ہے۔ مرینہ سے بھی چھیڑ چھاڑ کروگے؟''

مراد نے کہا۔ ''اسے بتایا گیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ماسٹر کو بوبو کے لیے کام کررہی ہے اور میں انڈر ورلڈ کے سربراہ وینکٹ راؤ کے لیے خدمات انجام دے رہا ہوں۔ اس طرح ہم آج بھی ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ میں کسی وقت ضرور اسے کال کروں گا۔''

جگ دیو مسکراتا ہوا چلا گیا۔ مراد نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اس نے آرام سے صوفے پر بیٹھ کر نئے فون کو یوں دیکھا جیسے ماروی کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے بڑے پیار سے فون کو چوم لیا۔ پھر اس کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگا کر دھڑکتے ہوئے دل سے دوسری طرف کی رنگ ٹون سننے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔ ''ہیلو... آپ کون ہیں...؟''

وہ فون پر سانسیں چھوڑتا ہوا دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ''ماروی... میری جان!''

وہ یکلخت چیخ پڑی۔ ''مراد...! تم مراد بول رہے ہو نا؟ یا اللہ پھر بولو۔''

اس نے پوچھا۔ ''میری جان...! کیا تمہیں امید تھی کہ پھر میری آواز سن سکوگی؟''

''ہاں۔ تم نے مجھے حوصلہ دیا تھا۔ مجھ سے کہا تھا' میں آنسو نہ بہاؤں انتظار کروں۔ تم واپس آؤ گے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''وہی کہہ رہی ہوں جو تم نے ایک ماہ پہلے فون پر کہا تھا۔ تم زخمی تھے اور بیمار بھی تھے۔ جانے کیسے انڈیا پہنچ گئے تھے؟ اب تو تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے' طبیعت سنبھل گئی ہے۔ کیا اب بھی دشمنوں سے چھپ رہے ہو؟''

وہ بول رہی تھی۔ مراد حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے اس نے فون نہیں کیا تھا۔ پھر کس فرشتے نے اسے رونے نہیں دیا تھا؟ وہ کون تھا جس نے اسے حوصلہ اور تسلیاں دی تھیں؟

اور کون ہوسکتا تھا؟ فرشتے کی بات ہو تو ایک ہی نام دماغ میں آتا تھا۔ اس نے فوراً ہی یہ رائے قائم کی کہ محبوب نے ہی اس کے آنسو پونچھنے کے لیے اس کے نام سے فون کیا ہوگا۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''چپ کیوں ہو؟ جواب دو۔''

وہ بولا۔ ''کیا جواب دوں۔ تمہاری میٹھی مترنم آواز کے سحر میں کھو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے صدیاں گزر جانے کے بعد تم میرے کانوں میں رس گھول رہی ہو۔''

''دیکھو پھر تمہارے فون میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ پچھلی بار بیٹری ڈاؤن ہوگئی تھی۔ اب بیلنس ختم ہوسکتا ہے۔ یا سگنل کا مسئلہ ہوسکتا ہے اس لیے پہلے کام کی بات کرو۔ یہ بتاؤ کب آرہے ہو؟''

''یہ بتانا مشکل ہے۔ میرے پاس نہ پاکستانی پاسپورٹ ہے اور نہ ہندوستانی۔ میں سرحد پار کرکے نہیں آسکوں گا۔''

''تو فوراً پاسپورٹ بنوالو۔''

''یہ آسان نہیں ہے۔ میری دشمن مرینہ قانون کے خلاف مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میں یہاں قانون کے محافظوں سے چھپ کر رہتا ہوں۔ اس دیس میں رہائش کے لیے مجھے قانونی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوگی۔

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ یہاں کے معاملات اور اپنی مشکلات سمجھاؤں گا تو صبح سے شام ہوجائے گی۔''

''تمہاری باتوں سے لگتا ہے' ابھی نہیں آسکو گے۔ تمہاری مشکلات کبھی ختم نہیں ہوں گی۔''

''ضرور ختم ہوں گی۔ جیسے ہی موقع ملتے ہی دشمنوں سے نجات حاصل کرتے ہی سرحد پار کرکے آجاؤں گا۔''

''میں آخری سانس تک تمہاری راہ تکتی رہوں گی۔''

''تمہارا یہ پیار میری خوش نصیبی ہے۔ لیکن میں ساری عمر تمہیں انتظار نہیں کراؤں گا۔ اگر حالات کبھی موافق نہ ہوئے اور میں نے سمجھ لیا کہ کبھی پاکستان نہیں آسکوں گا تو تم سے صاف کہہ دوں گا کہ میرے انتظار میں اپنی زندگی برباد نہ کرو۔''

''ایسی باتیں نہ کرو۔ اگر یہاں نہ آسکو تو مجھے بلا لو۔ وہاں جیسے بھی حالات ہوں گے ہم ساتھ رہیں گے۔''

''ماروی! تم اس دنیا کے شیطان صفت مجرموں کو اور ان کے خطرناک کھیل تماشوں کو نہیں جانتی ہو۔ میں ایسے بھیانک مجرموں کی دنیا میں سانسیں لے رہا ہوں۔ تمہیں ایسے ماحول سے دور رکھنے کے لیے ہی میں بے در اور بے گھر ہوگیا ہوں۔''

''کیا میں ہمیشہ دور رہوں گی؟ کیا تم خطرناک مجرموں کی دنیا سے نکل کر آسکو گے؟''

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ''یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب ابھی نہیں دے سکوں گا۔ میں نہیں جانتا' آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہ جاننے کے لیے مجھے اور تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔''

وہ خاصی دیر تک ایسی باتیں کرتے رہے۔ پھر مراد نے کہا۔ ''مجھے اجازت دو۔ میں پھر کسی وقت تمہاری آواز سنوں گا۔ روز تم سے باتیں کروں گا۔ یہ یاد رکھو کہ کبھی رابطہ نہ کرسکا' میری خبر نہ ملے تو پریشان نہ ہونا۔ میں حالات کی دلدل سے نکل کر تم سے رابطہ ضرور کروں گا۔''

وہ فون بند کرکے پریشانی سے سوچنے لگا۔ ''واقعی ماروی تک پہنچنے کے لیے آگے اندھیرا ہے۔ میں دور تک دیکھ رہا ہوں' کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا اور میں اس کے بغیر جی نہیں سکوں گا۔ ایک طویل تھکا دینے والے انتظار کے بعد ماروی نے کھل کر مجھ سے محبت کا اور گہری اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ سائیں بہت اچھے ہیں لیکن ناکام ہوچکے ہیں۔ میں پیار کی بازی جیت چکا ہوں۔ اب ہارنا نہیں چاہوں گا۔

''مگر آہ! تقدیر مجھے مات دینے کے لیے ترسانے اور تڑپانے کے لیے کتنی دور لے آئی ہے۔ گن، بارود، موت اور مجرموں کی بھیڑ میں واپسی کے راستے بند کررہی ہے۔

''او ماروی! تیرے معصوم بچپن کی قسم' تیری منہ زور جوانی کی قسم تجھے دلہن بنانے ہر حال میں آؤں گا۔''

رات کی تاریکی تھی۔ آسمان پر چاند ماروی کی طرح روشن تھا۔ وہ بالکونی میں ایک کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پہلے ذہن پر بچپن کی معصومیت حاوی رہتی تھی۔ جوانی میں ایک بار اس کا ہاتھ پکڑا تھا تو اس نے جلدی سے چھڑا لیا تھا۔ اسے پہلی بار نرم و نازک بدن کی لطافت اور کشش محسوس ہوئی تھی۔

دوسری بار وہ حوالات میں اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ اس نے چاند سے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیا تھا۔ لیکن اس رات تو اس دلربا کے بدن نے خوب جادو جگایا تھا' جب وہ مرینہ کی گرفت سے نکل کر ڈھلان میں گر کر لڑھکتی ہوئی ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوگئی تھی۔

اس وقت بھی وہ یاد آرہی تھی۔ وہ سحر زدہ سا ہوگیا

اچھی باتیں

☆ انسان پہاڑ کی چوٹی سے گر کر ٹھیک ہوسکتا ہے، مگر کسی کی نگاہوں سے گر کر دوبارہ وہ مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

☆ موت سے محبت کروگے تو زندگی عطا کی جائے گی۔

☆ اگر آسمان پر بھی مشہور ہونا چاہتے ہو تو اپنے وعدے کی پاسداری کرو۔

☆ دنیا میں کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔

☆ گالی کا جواب نہ دو کہ کبوتر کوے کی بولی نہیں بول سکتا۔

☆ عمل دل کو ایسے زندہ رکھتا ہے جیسے بارش زمین کو۔

☆ دو گھونٹ اللہ کو بہت پسند ہیں ایک صبر کا، دوسرا غصے کا۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

تھا۔خدا کی قسم میری زندگی میں پہلی بار ایسا خاموش زلزلہ آیا تھا۔جس نے مجھے توڑ پھوڑ کر بھی تیری طلب میں سالم رکھا ہے۔

یہ دل مچلتا رہتا ہے کہ ایسا زلزلہ بار بار آتا رہے۔

اے بدنصیبی! ہمارے درمیان سرحدی کانٹے ہیں۔

اس نے سرد آہ بھری پھر اپنے فون کو دیکھ کر محبوب کے نمبر پنچ کیے۔رابطہ ہونے پر بولا۔"سائیں! السلام علیکم۔"

وہ ایک دم سے چونک گیا۔پھر خوش ہو کر سلام کا جواب دیتے ہوئے بولا۔"مراد...! خدا کا شکر ہے تم بول رہے ہو۔اپنی زندگی کا ثبوت دے کر ہمیں نئی زندگی دے رہے ہو۔ماروی تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔میرا خیال ہے تم اس سے باتیں کر چکے ہو؟"

"ہاں۔میں اس سے باتیں کر چکا ہوں۔"

"تم کہاں ہو؟ کب آ رہے ہو؟"

"کیا آپ نے مراد بن کر ماروی کو فون کیا تھا؟"

"ہاں مجبوری تھی۔اسے دھوکا دینا ضروری ہو گیا تھا۔اس کے آنسو اسی طرح پونچھ سکتا تھا۔"

"ہاں۔یہ تو ہے کہ ہم سمندر میں غوطے لگا سکتے ہیں لیکن وہ روئے تو ڈوب کے رہ جاتے ہیں۔میں مانتا ہوں۔میری طرح آپ بھی اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتے۔آپ نے بڑی دانشمندی سے اسے بہلایا ہے۔"

"میں نے ایک کال کے بعد پھر کوئی کال نہیں کی۔اسے یقین ہو گیا تھا کہ تم زندہ ہو اور کسی دن واپس آؤ گے۔تم بتاؤ مراد! کب آ رہے ہو؟"

وہ مایوسی سے بولا۔"کیا بولوں؟ میں نے پہلی بار مریلہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے بندوق پکڑی تو یہ میرے مقدر سے چپک کر رہ گئی ہے۔میرے خلاف ایسے حالات پیش آ رہے ہیں کہ یہاں سے سمندر پار تک دشمن پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

"قانون کی نظروں سے دیکھا جائے تو میں قاتل اور ایسا خطرناک مجرم بن گیا ہوں کہ بدنام زمانہ مجرموں کی غیر ملکی ایجنسیاں میری خدمات حاصل کر رہی ہیں۔آج میں ایسی ہی ایک ایجنسی کی سرپرستی میں ہوں۔اگر ان کا سہارا نہ لوں تو یہاں انڈیا میں مجھے پاکستانی جاسوس کہہ کر گولی ماردی جائے گی۔

"فی الحال مجھے ان مجرموں کا اعتماد حاصل کرنا ہے جو مجھے سکیورٹی دے رہے ہیں۔شاید مہینوں گزر جائیں گے میں یہاں سے نکل نہیں پاؤں گا۔مختصر یہ کہ میں جرائم کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہوں۔

"آپ نے پوچھا ہے۔ماروی بھی پوچھتی ہے کہ میں کب آ رہا ہوں۔میں نے اسے بھی سمجھایا ہے کہ فی الحال جرائم کی دلدل سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔آپ بتائیں، سائیں! میں کیا کروں؟"

محبوب نے کہا۔"واقعی تم جرائم کی بھول بھلیوں میں ہو۔نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔پھر بھی تم اپنے ملک کو اپنی ماروی کو چھوڑ کر نہیں رہ سکو گے۔میں تمہاری ضدی طبیعت کو سمجھتا ہوں تم آج نہیں تو کل ماروی کے پاس آنے کے لیے تمام خطرناک مجرموں کو اور سکیورٹی دینے والے مجرموں کو بھی اپنا دشمن بنا لو گے۔

"اچھی طرح ہر پہلو سے سوچو تو یہی نظر آتا ہے کہ کبھی امن و امان سے ازدواجی گھریلو زندگی نہیں گزار سکو گے۔

"ماروی کو اور اپنے بچوں کو تحفظ اور سلامتی نہیں دے سکو گے۔یہ سوچو کہ کبھی نہ کبھی تمہارے حصے کی گولیاں ماروی اور بچوں کی طرف آئیں گی اور وہ تم سے پوچھ کر نہیں آئیں گی۔پھر انہیں سلامتی کیسے دو گے؟"

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔"سائیں! بس کریں اور کچھ نہ بولیں۔میرا دل ڈوب رہا ہے۔ایک طویل مدت کے بعد میں نے ماروی کا دل جیتا ہے۔میں اسے ہارنا نہیں چاہوں گا۔حالات سازگار ہوتے ہی آؤں گا اور اسے اپنی دلہن ضرور بناؤں گا۔کوئی جیتی ہوئی بازی ہارنا نہیں چاہتا۔میں اسے شریک حیات بنانے کے لیے دشمن حالات سے لڑوں گا۔میں ابھی کہہ نہیں سکتا کہ اپنی ماروی کے لیے کیا کر گزروں گا۔

"میں بھی سوچوں گا آپ بھی سوچیں کہ ماروی میرے ساتھ ہی خوش رہ سکے گی۔آپ اس کی خوشی کے لیے کیا کر سکیں گے؟ میں کل کسی وقت بات کروں گا۔"

فون بند ہو گیا۔محبوب اپنے فون کو دیکھ کر سوچنے لگا۔"بے شک میں ماروی کی خوشیوں میں خوش ہوں میں اسے راضی خوشی مراد کی دلہن بنتے دیکھوں گا لیکن اس کی ازدواجی زندگی کا انجام کیا ہوگا؟ وہ اس کے ساتھ خوش تو رہے گی لیکن دن رات خطرات میں گھری رہے گی۔ان کی جو اولاد ہوگی وہ بھی جانے انجانے دشمنوں کے نشانے پر رہے گی۔میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ ماروی ایسی غلطی کرے۔"

پھر وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔"میں کیا کروں۔ماروی کے فیصلے کے خلاف اسے سمجھاؤں گا۔اس کی بہتری چاہوں گا تو یہی کہا جائے گا کہ

اب میں مراد کا رقیب بن کر بولنے لگا ہوں۔

"یہ میرا فرض ہے۔میں حقیقت بیان کروں گا جسے سب کا ذہن تسلیم کرے۔وہ حقائق بیان کروں گا کہ کس طرح مراد کی مجرمانہ زندگی ماروی کو برباد کر دے گی۔میں اس راستے پر اسے جانے نہیں دوں گا جہاں آگے کانٹوں بھری خندق ہے۔میں چاچی چاچا سے اور معروف صاحب سے کہوں گا۔وہ بھی اسے سمجھائیں گے۔شاید ہم سب کے سمجھانے سے وہ غلطی کرنے سے باز آ جائے۔

"اسے جلد ہی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ اس کی محبت تو ہے۔اس کا محافظ نہیں ہے۔وہ جسے مجازی خدا بنائے گی وہ ناخدا بن کر کسی دن اسے ڈبو دے گا۔"

وہ دیر تک سوچتا رہا پھر فون اٹھا کر چاچی سے اور معروف نجی سے رابطہ کرنے لگا۔

اُدھر مراد نے فون کو مضبوطی سے یوں تھام رکھا تھا جیسے ماروی ہاتھ سے چھوٹنے والی ہو۔محبوب نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ماروی کو دلہن بنا کر اس کی زندگی برباد کر دے گا اور اس نے درست کہا تھا۔وہ بھی دل ہی دل میں تسلیم کر رہا تھا کہ ماروی اس کی شریک حیات بن کر طرح طرح کے مصائب سے گزرتی رہے گی۔

لیکن اس وقت فون پر محبوب کی باتیں سن کر سوچ رہا تھا۔"شاید اب سائیں کے اندر رقابت پیدا ہو گئی ہے۔ماروی ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔وہ نہیں چاہتے کہ وہ میری ہو جائے۔"

اس نے فون کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ماروی کو چھوڑنے کی بات وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر یہ محبت تو نہیں ہوگی۔وہ عیش و آرام کی پرامن زندگی گزار رہی ہے۔ایسے میں اسے سلامتی سے نکال کر موت اور مصیبتوں کی دنیا میں لے آئے گا۔

اگرچہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے نہ چاہنے سے ہونی انہونی نہیں ہو سکتی تھی۔ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ آگ سے کھیلتا رہے اور ماروی اس میں نہ جلے۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔اس کے فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ابھی کسی کو نیا نمبر نہیں دیا تھا پھر کون اسے کال کر رہا تھا؟

اس نے ننھی سی اسکرین پر انجانے نمبر پڑھے پھر بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا۔دوسری طرف سے ماسٹر کو بو بو کی آواز سنائی دی۔"مبارک ہو تم پر سے تمام پابندیاں اٹھا لی گئی ہیں۔جگ دیو نے تمہارا یہ نمبر بتایا۔میں نے سوچا پہلے میں ہی تمہیں کال کر لوں۔"

وہ بولا۔"تھینک یو ماسٹر کو بو بو! ہم ایک ماہ کے بعد بول رہے ہیں۔میرے لائق کوئی خدمت ہے؟"

"تم شاید کل تک دہلی جاؤ گے وہاں تمہاری رہائش کا انتظام کیا گیا ہے۔تم اس شہر کو اچھی طرح دیکھو، سمجھو گے۔پھر تم سے ایک اہم کام لیا جائے گا۔"

"میں دو چار ماہ تک یہاں کے فرائض انجام دینے کے بعد پاکستان جانا چاہتا ہوں۔وہاں رہ کر آپ کا کام کرتا رہوں گا پھر وہاں سے جس ملک میں جانے کو کہا جائے گا جاتا رہوں گا لیکن اپنا مستقل قیام پاکستان میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم دنیا کے جس ملک میں رہو میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔میرا کام ہوتا رہنا چاہیے۔

"دو چار مہینے کی بات کیا کرتے ہو؟ ایک ہفتے کے اندر میرا ایک اہم کام کر دو پھر پاکستان چلے جاؤ۔اس کے بعد ضرورت کے وقت جس ملک میں جانا ہو وہاں جاتے رہو۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔"بہت بہت شکریہ ماسٹر کو بو بو۔پھر تو میں تمام عمر آپ کا کام کرتا رہوں گا۔" ماسٹر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔"کیا پاکستان میں شادی کرنے کا ارادہ ہے؟"

"یس ماسٹر...! میں جب سے یہاں آیا ہوں، تب سے یہ خوشیاں حاصل کرنے، اپنی ماروی کے پاس جانے اور اسے اپنی دلہن بنانے کے لیے بے تاب ہو رہا ہوں۔"

"جب پاکستان میں مستقل رہو گے تو گاڑی بنگلا یہاں نہیں، وہاں دیا جائے گا۔تمہارا ہوم سوئٹ ہوم پاکستان میں رہے گا۔"

"شکریہ ماسٹر! تھینکس اے لاٹ۔ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔کیا شادی کرنے کے بعد میری بیوی بچوں کو خطرات پیش آئیں گے؟ کیا دشمن انہیں بھی نشانہ بنائیں گے؟"

"ہاں۔دشمنوں کی یہ کم ظرفی ہوتی ہے وہ اپنی ناکامیوں سے جھنجلا کر بے قصور عورتوں اور بچوں کو مار ڈالتے ہیں۔"

وہ ذرا مایوس ہوا۔پھر بولا۔"آپ کے بیوی بچے ہیں؟"

"دو بیویاں ہیں۔ایک لندن میں ایک ساؤتھ افریقا میں ہے۔دونوں سے ہونے والے بچے جوان ہو چکے ہیں۔دو بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں، باقی دو کی بھی ہو جائیں گی۔تین بیٹے مختلف ملکوں میں میرا کام سنبھال رہے ہیں۔

"میں سمجھ گیا۔تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میرے دشمنوں کی چلائی ہوئی گولیاں میرے بچوں تک کیوں نہیں پہنچیں؟"

"جی ہاں۔میں یہی سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ اپنی

ماروی کو اور اپنے بچوں کو دشمنوں سے کیسے بچا کر رکھوں گا؟"

"یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ بالکل سیدھی سی بات ہے ان کے لیے مسلح گارڈز اور سیکیورٹی کے جدید آلات اپنی رہائش گاہوں میں اپنی گاڑیوں میں رکھا کرو گے۔ پرائیویٹ سراغرسانوں کی خدمات حاصل کرتے رہو گے۔ وہ دشمنوں کے خلاف مخبری کرتے رہیں گے اور تم ہمیشہ دشمنوں سے باخبر رہا کرو گے۔ اگرچہ ایسی پھیلی ہوئی سیکیورٹی میں اخراجات بہت ہیں۔ ہونے دو کوئی بات نہیں آخر ہم کماتے کس کے لیے ہیں۔ آئے دن خطرات سے کھیلتے کس کے لیے ہیں؟ صرف اپنی محبوب بیوی اور پیار کرنے والے بچوں کے لیے..."

وہ خوش ہو کر بولا۔ "آپ کی باتوں سے مجھے بہت حوصلہ مل رہا ہے۔ کیا میں ان کی سیکیورٹی کے لیے اتنی دولت کما سکوں گا؟"

"یہ تو تم اپنی صلاحیتوں کو، اپنی طاقت کو اپنے حوصلوں کو خود ہی تو لو اور سمجھو۔"

"میرا حوصلہ تو یہ ہے کہ اپنی ماروی کے لیے کروڑوں روپے حاصل کروں گا۔"

"یہ بات واضح کر دیں کہ آپ کے کام سے الگ میری جو کمائی ہوگی، وہ صرف میری ہوگی۔"

"تمہاری پرسنل انکم میں میرا فورٹی پرسنٹ ہوگا کیونکہ میں دنیا کے تمام ملکوں میں تمہارے جانے آنے، رہنے سہنے کے اور تمہاری سیکیورٹی کے انتظامات کرتا رہوں گا۔"

"یہ معقول بات ہے میں سکسٹی پرسنٹ کمانے کی خاطر اپنی ذاتی آمدنی کا یہ سلسلہ شروع کروں گا۔"

ماسٹر سے فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ ماروی کے ساتھ سلامتی سے ازدواجی زندگی گزارنے کی تدبیر اور حکمت عملی معلوم ہو گئی تھی۔ اب کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ وہ مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ ماسٹر کو بوبو نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر ایک اہم فرض کی ادائیگی کے بعد پاکستان جا سکتا ہے یعنی وہ ایک ہفتے بعد اپنی ماروی سے مل سکتا تھا۔ وہ راضی ہو جاتی تو چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو سکتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ہواؤں میں اُڑنے لگا۔ اپنی جانِ حیات کے لیے کیسی گردش میں تھا؟ کہاں کہاں بھٹک رہا تھا؟ کیا کیا کر رہا تھا۔

کبھی عرش پر کبھی فرش پر کبھی ان کا در کبھی در بدر
غم زندگی ترا شکریہ میں کہاں کہاں سے گزر گیا

ایسے وقت اسے مرینہ یاد آئی۔ اس نے ناگواری سے سوچا۔ "اگر وہ حرافہ مجھے یہاں نہ لاتی تو ابھی میں اپنی ماروی کے قریب رہتا۔ اسے تو میں چھوڑوں گا نہیں..."

ماسٹر کو بوبو اور جگ دیو نے کہا تھا کہ وہ مرینہ سے چاہے جیسی بھی دشمنی کرے لیکن اسے ہلاک نہ کرے۔ اس سے جان لینے والی دشمنی کبھی نہ کرے۔ ان کی مخالفانہ حرکتوں سے "دی ماسٹرز سنڈیکیٹ" کو کبھی نقصان نہ پہنچے۔

اب وہ مجبور تھا۔ اسے جہنم میں نہیں پہنچا سکتا تھا لیکن اس کی اچھی طرح مرمت کر سکتا تھا۔ وہاں اس کا جینا حرام کر سکتا تھا۔

اس نے کچھ سوچ کر اسے کال کی۔ مرینہ نے اپنے فون کی اسکرین پر انجانے نمبر پڑھے پھر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو...! کون ہو...؟"

وہ سرد لہجے میں بولا۔ "تمہاری موت...؟"

وہ اچانک اس کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ کچھ خوفزدہ ہوئی کچھ حیران ہو کر بولی۔ "تم...؟ مراد تم...؟ تم کہاں ہو مراد...؟"

وہ اپنے طور پر دلیری ظاہر کرنے کے لیے ہنستے ہوئے بولی۔ "میں روز تمہارا انتظار کرتی ہوں کہ آؤ گے۔ ضرور آؤ گے۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی طرح مجھ پھینکنے کے لیے ایک گولی میرے نام سے چلانے آؤ گے۔"

"یعنی تم اپنی موت کا انتظار کرتی رہتی ہو؟"

"موت کو تو ایک دن آنا ہی ہے۔ میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔ تم پر مرنے والی ہوں۔ تم میری محبت کو کب سمجھو گے؟ تمہارے ساتھ صرف ایک بار سونے کے بعد تمہارے ہاتھوں مر جانا چاہتی ہوں۔"

"تم یہ حسرت لے کر دنیا سے جاؤ گی۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف ایک ہی ہستی ہے جو میری دھڑکنوں سے لگے گی اور تم اسے اچھی طرح جانتی ہو۔"

"جانتی ہوں۔ میں تمہیں اس سے بہت دور لے آئی ہوں۔ میرا کمال دیکھنا چاہو تو پھر اس کے پاس پہنچا دوں گی۔ شرط یہ ہے کہ پہلے میری پیاس بجھا دو۔"

"میں اپنی ماروی تک پہنچنے کے راستے خود بنا سکتا ہوں۔ تم اپنی سانسیں گنتی رہو۔ تمہیں یہاں زندہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"دعویٰ نہ کرو۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ہم میں سے کون کس پر حاوی ہوگا۔ یہ تو بتاؤ تم پہلی بار انڈیا آئے ہو اور آتے ہی ہم سے بچھڑ کر کس کے ساتھ کام کرنے لگے ہو؟"

وہ بولا۔ "انڈر ورلڈ کے ایک باس وینکٹ راؤ سے معاملات طے کر چکا ہوں۔ اس کا ایک کام کرنے کے لیے دہلی آیا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "دہلی...؟ تم دہلی میں ہو۔"

وہ بولا۔ "یوں سمجھو۔ تمہارا پیچھا کرتا ہوا آیا ہوں۔ تم یقین نہیں کرو گی کہ میری نظروں میں ہو۔ میں تمہاری رہائش گاہ دیکھ چکا ہوں۔ جب چاہوں گا تمہاری شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے دھمکی دے کر فون بند کر دیا۔ مرینہ مقابلے پر آنے سے ڈرتی نہیں تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ پھر ایک بار سامنا ہو جائے اور وہ اپنے حسن و شباب کے ہتھیاروں سے اسے مات دینے کی ایک آخری کوشش کرے لیکن اس وقت یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی کہ مراد اس کے پیچھے دہلی آ گیا ہے۔ وہ اس کی نظروں میں رہتی ہے اور وہ خود اس کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

بڑے بڑے شہ زور بھی اس وقت ڈرتے ہیں جب مقابل موجود ہو کر بھی نظر نہیں آتا۔ مرینہ نے جگ دیو سے فون پر کہا۔ "وینکٹ راؤ کے آدمی تمہارے آدمیوں سے زیادہ ہوشیار اور باخبر رہتے ہیں۔ مراد کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں دہلی میں ہوں۔ وہ بھی یہاں پہنچا ہوا ہے۔"

جگ دیو نے کہا۔ "جس نے بھی تم سے کہا ہے کہ مراد دہلی میں ہے تو غلط کہا ہے۔ ہمارے آدمیوں کی رپورٹ کے مطابق وہ ابھی جے پور میں کہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "مجھے مراد نے خود کہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں دہلی کے کسی علاقے میں ہوں۔"

"میں ابھی معلوم کروں گا کہ وہ کہاں ہے؟"

جگ دیو نے اس سے رابطہ ختم کر کے مراد کو فون پر مخاطب کیا پھر کہا۔ "تم نے مرینہ کو یہ کہہ کر دہلا دیا ہے کہ دہلی میں ہو اور اس پر نظر رکھتے ہو۔ ویسے تم کل کی فلائٹ سے جانے والے تھے لیکن اب کچھ تبدیلی ہوئی ہے تم آج رات بائی روڈ دہلی جاؤ گے۔"

اس نے بتایا کہ اس کی نگرانی میں سرحد پار سے سونا اسمگل ہو کر آتا ہے۔ وہ اور اس کے آدمی سونا خریدنے والوں کو وہاں سے بحفاظت ان کے گھروں تک پہنچاتے ہیں۔

جگ دیو کی سیکیورٹی ایسی ہوتی ہے کہ راستے میں کوئی انہیں لوٹنے کی جرأت نہیں کرتا اور مال کو پہنچانے تک جتنی پولیس چوکیاں آتی ہیں، انہیں مقررہ رشوت ادا کر دی جاتی ہے کروڑوں کا مال روک ٹوک کے بغیر پہنچ جاتا ہے۔

سیٹھ گردھاری لال دہلی کا بہت ہی معروف جیولر تھا۔ بڑی رازداری سے اسمگل کیا ہوا سونا سرحد سے لاتا تھا۔ دہلی، ممبئی، کولکتہ اور مدراس کی مارکیٹ میں دگنی قیمت پر فروخت کرتا تھا اور ارب پتی جیولر کہلاتا تھا۔

اس بیچارے عیاش دولت مند کی کمزوری پشپا رانی تھی۔ تیس برس کی اچھی کھائی کھلائی ہوئی عورت تھی۔ گردھاری لال پچاس برس کا تھا۔ تیس برس والی پر دل آ گیا تھا۔

پشپا رانی ایسے دولت مندوں کو دیوانہ بنانا جانتی تھی۔ اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔ وہ اس کا ایسا دیوانہ ہو گیا تھا کہ اسے اپنے کاروباری راز میں شریک کرنے لگا تھا۔

پشپا رانی پچھلے دو برسوں میں کئی بار پاک بھارت... حد پر مال خریدنے آ چکی تھی۔ گردھاری لال کئی بار جگ دیو سے کہہ چکا تھا کہ پشپا رانی اس کی دھرم پتنی ہے۔ کبھی وہ مال لینے نہیں آئے گا تو اس کے دل کی رانی لین دین کے لیے آیا کرے گی۔

اس روز وہ اپنے پتی گردھاری لال کے ساتھ آئی تو اس کے ساتھ ایک جوان صحت مند شخص تھا۔ اس کا نام شہباز خان تھا۔ گردھاری لال نے بتایا کہ وہ ان کا باڈی گارڈ ہے آئندہ ان کے ساتھ وہاں آتا رہے گا۔

شہباز حقیقتاً پشپا رانی کا نیا یار تھا۔ وہ گردھاری لال سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے اسمگلنگ کا مال خریدنے... اور اسے مارکیٹ میں فروخت کرنے کے گر سیکھ لیے تھے۔ بارڈر پر جگ دیو جیسے دھندا کرنے والوں کا اعتماد بھی حاصل کر لیا تھا۔

اس نے جگ دیو سے تنہائی میں کہا۔ "ایک کروڑ اسی لاکھ کا سونا لے جا رہی ہوں۔ اگر راستے میں تمہارے آدمی رکاوٹ نہیں بنیں گے تو میرا یہ باڈی گارڈ گردھاری لال کو نرک میں پہنچا دے گا۔ میرا ساتھ دو گے تو میں ابھی دس لاکھ کا سونا تمہیں دے کر جا رہی ہوں۔ بولو مجھ سے ڈیل کرتے ہو؟"

جگ دیو نے ماسٹر کو بوبو کو فون پر پشپا رانی کے ارادے بتائے پھر کہا۔ "رانی بہت چالو عورت ہے آئندہ اسی سے ہمارا لین دین رہا کرے گا ابھی دس لاکھ کا سونا مل رہا ہے۔ کیا حکم ہے؟"

کو بو بو نے کہا۔ "پشپا رانی سے ڈن کر لو۔"

☆☆☆

پاک بھارت سرحد کے قریب وہ ایک چھوٹا سا گاؤں

تھا۔ وہاں مٹی کے کچے گھروں میں تقریباً ساٹھ ستر گھرانے آباد تھے۔ ان گھروں میں رہنے والے سب ہی مرد عورتیں اسمگلروں کے تابع دار تھے۔ وہیں ایک گیسٹ ہاؤس بنایا گیا تھا' جہاں اسمگلنگ کا مال خریدنے والے تاجر آ کر قیام کرتے تھے۔

پشپارانی اس گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں لباس بدل رہی تھی۔ کمرے کے باہر باڈی گارڈ شہباز گن لیے کھڑا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی رازدارانہ دستک ہوئی تو وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

اسی کمرے کے باہر کھلے آسمان کے نیچے سیٹھ گردھاری لال ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ دوسری کرسی پر اس کے پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ملازم اس کے پیچھے کھڑا سر کی مالش کر رہا تھا۔

ایسے وقت مراد گیسٹ ہاؤس کے پیچھے سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ایک جذباتی منظر دکھائی دیا۔ پشپا باڈی گارڈ کے بازوؤں میں تھی اور وہ ایک ہاتھ سے اس کے بلاؤز کی زپ چڑھا رہا تھا۔

ایسے دل دھڑکا دینے والے نظارے کا نظارہ کرنے کے لیے قدم رک جاتے ہیں۔ ایک کو مٹھائی کھاتے دیکھ کر دوسرا للچاتا ہے کہ ہم بھی کھائیں گے۔

اسی لیے نصیحت کی جاتی ہے کہ گناہ ہوتا رہے تو نہ دیکھو۔ منہ پھیر لو۔ گناہ ہوتے دیکھنا بھی گناہ ہے۔ بلکہ گناہ کرنے سے زیادہ دیکھنا گناہ ہے۔ کیونکہ دیکھنے ہی سے سوئی ہوئی ہوس جاگتی ہے۔ فوراً ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ دیکھنے سے اور اُس نظارے کو تصور میں محفوظ رکھنے سے غلیظ خواہشیں پرورش پاتی ہیں۔ اسے بے ہوش ماروی کا بدن یاد آ گیا تھا۔

وہ منہ پھیر کر وہاں سے چلا آیا۔ اس کی زندگی میں ماروی کے بعد مرینہ اس کے بہت قریب تھی لیکن اسے کبھی منہ نہیں لگاتا تھا۔

مگر اس کھڑکی سے ہٹتے ہی ماروی کے ساتھ مرینہ بھی اس کے خیالوں میں آ گئی۔ گناہ سے گناہ کا رابطہ ہوتا ہے۔ ایک عورت کے تسلسل سے دوسری عورتیں دماغ میں چلی آتیں۔ اس نے سر کو جھٹک کر مرینہ کو بھی اندر سے نکال دیا۔

جگ دیو نے اسے بتایا تھا کہ راستے میں کہیں گردھاری کی آخری سانسیں ختم کر دی جائیں گی۔ یہ کام پشپارانی کا باڈی گارڈ شہباز خود کرے گا۔ مراد اور اس کے آدمی مداخلت نہیں کریں گے۔ محض تماشائی بن کر رہیں گے۔

گردھاری لال رات کے آٹھ بجے اپنی زندگی کا آخری کھانا کھا کر کار کی پچھلی سیٹ پر اپنی پشپارانی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اگلی سیٹ پر شہباز گن لیے ہوئے تھا۔ مراد ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ ان کے پیچھے ایک جیپ میں مراد کے دو مسلح ساتھی تھے۔ وہ آگے پولیس چوکیوں میں دستور کے مطابق قانون کے محافظوں کو کھلاتے پلاتے جانے والے تھے۔

رات کے نو بجے وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔ مراد نے اس ایک ماہ میں کئی بار بلّے کو یاد کیا تھا۔ سوچا تھا' جب فون ہاتھ میں آئے گا تو اس سے رابطہ کرے گا' وہ بہت ہی ماہر شوٹر تھا۔ اس نے عمر کوٹ میں بڑی جواں مردی سے مراد کے دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا۔

کار ڈرائیو کرتے وقت اسے پھر بلّا یاد آیا' اس نے اسی وقت فون نکال کر اس کے نمبر پنچ کیے۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے شہباز نے کہا۔ ''گاڑی ڈرائیو کرتے وقت فون نہ کرو۔''

مراد نے کہا۔ ''آرام سے بیٹھے رہو' کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔''

وہ بولا۔ ''بحث نہ کرو۔ میں حکم دیتا ہوں۔ فون بند کرو۔''

پیچھے بیٹھی ہوئی پشپا نے کہا۔ ''تمہیں میرے باڈی گارڈ کا حکم ماننا چاہیے۔ میں بھی یہی حکم دے رہی ہوں۔''

شہباز نے گن کا رخ مراد کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''رانی صاحبہ کا حکم موت کی طرح اٹل ہوتا ہے۔''

مراد نے رفتار دھیمی کرتے ہوئے گاڑی روک دی۔ پیچھے جیپ بھی رک گئی۔ اس کے دونوں ساتھی دوڑتے ہوئے مراد کے پاس آئے۔ ایک نے پوچھا۔ ''گاڑی کیوں روک دی؟''

مراد نے کہا۔ ''اس باڈی گارڈ کے پاس جب تک گن رہے گی' گاڑی آگے نہیں بڑھے گی۔''

پھر اس نے پچھلی سیٹ کی طرف سر گھما کر کہا۔ ''سیٹھ صاحب! تمہارا کروڑوں کا سونا یہاں مٹی ہو جائے گا۔''

گردھاری نے پریشان ہو کر کہا۔ ''ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ شہباز تم اسے گن کیوں دکھا رہے ہو؟''

پشپا نے کہا۔ ''ہم ہمیشہ اپنی مرضی سے سفر کرتے ہیں۔ ہماری رکھشا کرنے والے ہمیں یہاں سے لے جانے والے ہمارے تابع دار بن کر رہتے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''میں کسی کا تابع دار نہیں ہوں۔ مال آگے لے جانا چاہتے ہو یا نہیں؟''

اس کے ساتھیوں نے شہباز کو اپنی بندوقوں کے نشانے پر رکھ لیا۔ ایک نے کہا۔ ''اے مسٹر باڈی گارڈ... ! اپنی گن ہمیں دو۔ ورنہ ابھی گولیاں چلیں گی۔''

دوسرے نے کہا۔ ''تم ڈرائیو کرنے والے کو مارو گے تو ہم تم تینوں کی لاشیں گرا دیں گے۔''

شہباز دو طرف سے نشانے پر تھا۔ مراد نے اس سے گن چھین لی۔ پشپا نے پریشان ہو کر کہا۔ ''شہباز کے پاس گن رہنے دو۔ جگ دیو نے تم لوگوں کو بتایا ہوگا۔''

ایک نے کہا۔ ''ہاں بتایا تھا۔ ہم جانتے ہیں' اس گن کو تمہارے باڈی گارڈ کے پاس کیوں رہنا چاہیے۔ یہاں سے اسّی کلومیٹر کے فاصلے پر وہ جگہ مناسب ہے۔ وہاں اسے گن واپس دے دی جائے گی۔''

مراد کار سے نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی جیپ تک گیا۔ ان سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ گردھاری نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پشپارانی سے کہا۔ ''میرے دل کی رانی! اپنی عقل سے کام لو۔ ہمارا کروڑوں کا مال ان کے آسرے پر ہے۔ ان کے منہ نہ لگو۔ انہوں نے ہمارے گارڈ سے گن لے لی ہے۔ کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارا مال تو حفاظت سے پہنچا دیں گے۔''

شہباز نے کہا۔ ''میرے پاس گن ہونی چاہیے۔ اگر ان کی نیت خراب ہوگی' ہمارا مال لینا چاہیں گے تو آپ دیکھیں گے' میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

گردھاری نے پوچھا۔ ''ابھی تمہارے پاس گن تھی تو تم نے کیا کر لیا؟ ابھی تم کچھ نہ کر سکے۔ وہ ہمیں مار ڈالیں گے' ہمارا مال لے جائیں گے تو تم کیا کر لو گے؟''

وہ جھینپ کر پشپارانی کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے شہباز! ان کے منہ نہ لگو۔ انہوں نے کہا ہے' آگے جا کر تمہاری گن واپس کر دیں گے۔''

مراد واپس آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ پورا چاند نکل آیا تھا۔ ان کے چاروں طرف کا ویران علاقہ چاندنی میں دور تک نظر آنے لگا۔

مراد نے موبائل فون نکال کر مسکراتے ہوئے شہباز سے پوچھا۔ ''اب کوئی حکم دو گے؟''

وہ ناگواری سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔ ''میری کھوپڑی میں اچھی طرح یہ بات آ گئی ہے کہ یہ دنیا بندوق کے زور سے چلتی ہے۔''

شہباز ایسے تھوک نگلنے لگا جیسے خون کے گھونٹ پی رہا ہو۔ بندوق کے بغیر اسے یوں لگ رہا تھا کہ اسے زبردستی چوڑیاں پہنا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ فون پر رابطہ قائم ہو گیا۔ مراد نے مخاطب کیا۔ ''ہیلو بلّے! میں بول رہا ہوں۔''

وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ''مراد... ! تم زندہ ہو؟ او گاڈ! میں تو تم پر فاتحہ پڑھ چکا تھا۔''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''قسمت ہمارے ساتھ ہو تو کوئی اپنے پاس گن رکھ کر بھی نہیں مار سکتا۔''

شہباز نے اسے گھور کر دیکھا۔ پشپا نے اسے صبر کرنے اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ فون پر بول رہا تھا۔ ''تم کہاں ہو؟ اور کس حال میں ہو؟''

''بہت بُرے حال میں ہوں۔ عالی جناب کے کتّوں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ اپنی للی سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں لیکن کراچی نہیں جا سکتا۔ کیا کروں؟ کہیں سے کوئی لمبا ہاتھ مارنے کا چانس نہیں مل رہا ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ میں کل تک تمہارے لیے کچھ کروں گا۔''

''تم کہاں ہو بتاؤ۔ میں ابھی تمہارے پاس آ جاؤں گا۔''

''میں ابھی نہیں بتا سکتا کہ کہاں ہوں۔ کل تک تمہیں کال کروں گا پھر اپنے حالات بتاؤں گا اور تمہارے لیے بھی ضرور کچھ کروں گا۔ ابھی زیادہ بول نہیں سکتا۔ کل تک انتظار کرو۔''

اس نے رابطہ ختم کر کے فون کو ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا۔ مرینہ کال کر رہی تھی۔

پچھلی سیٹ سے پشپا نے کہا۔ ''تم فون پر باتیں کرنے کے لیے کار دھیرے چلا رہے ہو۔ یہی رفتار رہی تو ہمیں کتنے دنوں میں دہلی پہنچاؤ گے؟''

وہ بولا۔ ''جب عورت بولتی ہے تو مرد کی رفتار بڑھ جاتی ہے' ابھی فون پر ایک عورت بول رہی ہے۔''

اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ''یہاں ایک عورت تکلیف میں ہے۔ خدا خیر کرے۔ تم بولو تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

پشپارانی اپنی سیٹ پر یوں پہلو بدلنے لگی' جیسے صبر کر رہی ہو۔ اُدھر مرینہ نے کہا۔ ''ہائے مراد... ! پورا چاند نکل آیا ہے۔ تم بھی کہیں سے نکل آؤ نا... جوانی بہت ستا رہی ہے۔''

مراد نے عقب نما آئینے میں پیچھے بیٹھی ہوئی پشپا کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو ایک ہاتھ سے عورت کو کلیجے سے لگاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے بلاؤز کی زپ کو اوپر نیچے کرتے رہتے ہیں۔''

پشپا چونک گئی۔ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلتے ہوئے چور نظروں سے شہباز کو دیکھنے لگی۔ شہباز گھور کر مراد کو دیکھ رہا تھا۔

مرینہ کہہ رہی تھی۔ ”تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ اتنا سمجھ گئی ہوں تمہیں زپ والا لباس پسند نہیں ہے۔ چلو ٹھیک ہے میں وہ نہیں پہنوں گی۔

”ہائے مراد! اس چاندرات کی قسم۔ تمہارے لیے پاگل رہتی ہوں۔ قسم کھاتی ہوں تم سے دشمنی نہیں کروں گی۔ مجھے ایک رات دے دو۔“

”وہ مرد کتنے الو کے پٹھے ہوتے ہیں جو عورت کو اپنی راتیں دینے یا اس کی راتیں لینے کے لیے خوامخواہ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔“

شہباز نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ پشپا پریشان ہوگئی۔ وہ ان پر طنز کر رہا تھا اور وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ذہانت سے اور چالاکی سے دولت کمانے والے بھی چالاکی بھول کر عورت کے پیچھے باؤلے ہو جاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں وہ عورت ان کی وفادار ہے۔ جب وہ بے وفائی کرتی ہے تو سنبھلنے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔“

پشپا نے غصے سے کہا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟“

گردھاری نے اسے اپنے قریب کھینچ کر کہا۔ ”وہ اپنی عورت سے بول رہا ہے بولنے دو۔ میری رانی تو وفا کی پکی ہے۔“

ادھر مرینہ نے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے تم جو بول رہے ہو اس سے میرا کیا تعلق ہے۔ یہ تمہارے پاس کچھ لوگ بول رہے ہیں۔ تم ابھی کہاں ہو؟“

”میں تو وہیں ہوتا ہوں جہاں گولیاں چلنے والی ہوتی ہیں۔ یہ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ میں اپنے فون کا سوئچ آف کر رہا ہوں۔ صبح تک کسی سے نہیں بولوں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے فون کا سوئچ آف کر کے اسے جیب میں رکھ لیا۔ پشپا نے پوچھا۔ ”کیا ہم شراتی میل دور نہیں آئے ہیں؟ اپنے آدمیوں سے بولو شہباز کی گن واپس کریں۔“

اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی ہے۔ وہ جگہ آتے ہی جیپ ہمارے آگے آئے گی میں کار روک دوں گا۔ آپ کے گارڈ کو گن دے دی جائے گی۔“

مراد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ گن نہیں تو پاور نہیں۔ وہ مجبور تھے۔ ان کے پاس یہ پاور نہیں تھی کہ وہیں گاڑیاں رکوا کر سیٹھ گردھاری لال کی چھٹی کر دیتے۔ وہ مجبوراً چپ رہے۔ مناسب جگہ پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔

ایک گھنٹے بعد جیپ ان کے آگے آئی تو مراد نے کار کو روکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک گیت یاد آرہا ہے۔“

وہ گنگنانے لگا۔ ”بلا سے جان جائے کی تماشا ہم بھی دیکھیں گے۔ مری جاں ہم بھی دیکھیں گے...“

شہباز کار سے باہر نکلا۔ جیپ سے اتر کر آنے والوں نے اس کی گن اسے دے کر کہا۔ ”یہاں نہیں سڑک سے دور لے جاؤ۔“

شہباز نے گردھاری کا نشانہ لے کر کہا۔ ”سیٹھ باہر آؤ۔“

وہ سہم کر بولا۔ ”تم مجھے بندوق کیوں دکھا رہے ہو؟“

پشپا رانی نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ ”نکل جا گردھاری! تیرا آخری وقت آگیا ہے۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو میرے دل کی رانی؟ میں نے تمہیں صرف دل ہی نہیں دیا ہے۔ تم پر اپنی دولت بھی لٹا رہا ہوں۔“

رانی کار کے ایک طرف سے گھومتی ہوئی ذرا مٹکتی ہوئی شہباز کے پاس آگئی۔ اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ ”دولت بوڑھے کے پاس ہو اور جوانی کے ہاتھ میں بندوق ہو تو عورت جوان مرد کا ساتھ دیتی ہے۔“

اپنی رانی کو گارڈ کے بازو سے لگتے دیکھ کر سمجھ میں آگیا کہ اس کی موت لازمی ہے۔ وہ خوف سے کانپتے ہوئے مراد اور اس کے ساتھیوں سے بولا۔ ”میں جگ دیو کا پرانا گاہک ہوں۔ اسے منہ مانگی رقم دیتا ہوں۔ تم لوگوں کو میری جان بچانی چاہیے۔“

مراد نے کہا۔ ”تمہاری رانی نے تم سے زیادہ مال دیا ہے۔ یہ عورت کا کمال ہے۔ یہ تمہارے ہی مال سے ہمیں دس لاکھ کا سونا دے چکی ہے۔ میں ابھی فون پر باتیں کرتے وقت کہہ رہا تھا۔ تمہارے جیسے مرد الو کے پٹھے ہوتے ہیں جب عورت بے وفائی کرتی ہے تو ان کے سمجھنے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔“

گردھاری نے پشپا کو رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے پریم کرتا رہا۔ تم پر دولت لٹاتا رہا اور تم مجھے مار ڈالنا چاہتی ہو؟“

پھر وہ مراد سے بولا۔ ”جگ دیو سے میری بات کراؤ۔ میں اسے بیس لاکھ کا سونا ابھی دوں گا۔“

شہباز نے اس کا نشانہ لے کر کہا۔ ”بکواس مت کرو۔ سڑک سے دور اُدھر چلو۔“

مراد نے کہا۔ ”شہباز! ذرا رک جاؤ۔ یہ پشپا رانی نے ڈیل دینا چاہتا ہے۔ تم اپنی رانی کو بھاؤ بڑھانے کا بولو۔“

شہباز نے کہا۔ ”کیا بکواس کررہے ہو؟ ایک بار سودا ہو چکا ہے۔ میں سیٹھ کو گولی مار کر رانی صاحبہ کے ساتھ مال لے جاؤں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”وہ سودا جگ دیو سے ہوا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ سیٹھ پشپا کے مقابلے میں ڈبل سونا دے گا۔ اب یہاں جگ دیو کا نہیں میرا فیصلہ مانا جائے گا۔“

شہباز نے اچانک ہی گن کا رخ مراد کی طرف کرتے ہوئے اس کے ساتھیوں کو للکارا۔ ”خبردار! کسی نے مجھ پر گولی چلائی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“

اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”چلو اسے گولی مارو پھر ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔ اس کے بعد رانی کس کی ہوگی۔ سیٹھ تو اب اس کے منہ پر نہیں تھوکے گا۔“

دوسرے ساتھی نے کہا۔ ”اور ہم اس کو زندہ رکھیں گے جو زیادہ مال دے گا۔“

پشپا نے پریشان ہوکر کہا۔ ”شہباز! میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا ان کے منہ نہ لگو۔ ان پر بھروسا کرو۔ یہ ہمیں مال کے ساتھ حفاظت سے لے جائیں گے۔“

پھر وہ مراد سے بولی۔ ”میں گردھاری سے دس لاکھ کا سونا زیادہ دوں گی۔“

گردھاری نے کہا۔ ”وہ میرا سونا ہے۔“

وہ بولی۔ ”تمہارا نہیں میرا سونا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نہیں مانتا کہ یہ مال ایک بے وفا اور دغاباز عورت کا ہے۔ سیٹھ کے ساتھ ہماری برسوں کی ڈیلنگ ہے۔ یہ سونا اسی کا ہے۔“

سیٹھ نے خوش ہوکر کہا۔ ”تم انصاف سے بول رہے ہو۔ میں تمہیں انعام دوں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”زندہ رہو گے تو انعام دو گے۔ میں تو یہاں اسی کو زندگی دوں گا جو مجھے پورے ایک کروڑ کا سونا دے گا اور چالیس لاکھ کا سونا جگ دیو کو دے گا۔ جسے یہ منظور ہوگا وہ باقی چالیس لاکھ کا مال لے جائے گا۔“

گردھاری نے کہا۔ ”ایک کروڑ تو بہت زیادہ ہیں۔ تم پچاس لاکھ کا سونا لے لو۔“

پشپا نے جلدی سے کہا۔ ”میں دوں گی ایک کروڑ کا سونا...“

مراد نے گردھاری سے کہا۔ ”اب بولو۔ نہ تم رہو گے نہ تمہارا سونا۔ تم جان سے جاؤ گے رانی چالیس لاکھ کے مال کے ساتھ جان بچا کر چلی جائے گی۔“

سیٹھ کو زندہ رہنا تھا۔ دہلی، ممبئی، کولکتہ اور مدراس کی مارکیٹوں میں اس کے پانچ سو کروڑ روپے گردش کررہے تھے۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ ”مجھے نہ مارو۔ جتنا سونا لینا ہے، لے جاؤ۔ اس بازاری عورت کو میرے سامنے گولیوں سے چھلنی کردو۔“

مراد نے فون نکال کر کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ میں ابھی جگ دیو سے تمہاری سلامتی کی بات کرتا ہوں۔“

”نہیں...“ پشپا نے چیخ کر کہا۔ ”شہباز! مجھے بچاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔“

شہباز نے فوراً ہی گن کی نال کو مراد کے سینے پر رکھ کر کہا۔ ”تم فون نہیں کرو گے۔ رانی کی بات مانو۔“

مراد نے ہنستے ہوئے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ ”بلا سے جان جائے گی تماشا ہم بھی دیکھیں گے۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”گولی چل جائے گی۔ میں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ فون بند کرو۔“

اس نے فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ اس نے ماسٹر کوبو کو کال کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مراد! کیا بات ہے؟ وہاں تو آدھی رات ہو چکی ہوگی۔ اس وقت کال کررہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”جگ دیو نے پشپا رانی سے ڈیل کی تھی اور آپ نے اسے ڈن کیا تھا۔“

مراد کے فون پر بولتے ہی شہباز نے گن کے ٹریگر کو دبایا۔ ایک بار، دو بار پھر تین بار کھٹ کھٹ کی آواز ابھر کر رہ گئی۔ ایک بھی گولی نہیں چلی۔

یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی گن خالی کردی گئی تھی۔ حیرانی اور پریشانی سے منہ کھل گیا۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ مراد کے ساتھیوں نے اسے اپنے نشانے پر رکھ لیا۔

وہ فون پر بولتا ہوا ان سے دور آگیا۔ کوبو نے کہا۔ ”ہاں۔ پشپا سے دس لاکھ کا سونا مل رہا ہے اس لیے میں نے ڈن کیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ مجھے پرسنل دھندا کرنے کی آزادی ہوگی۔ میں اپنی اس ذاتی آمدنی سے آپ کو چالیس پرسنٹ دیا کروں گا۔“

”ہاں یہ کہا تھا۔ کیا کسی سے پرسنل ڈیلنگ ہو رہی ہے؟“

”جی ہاں۔ آپ کو دس لاکھ کا مال مل چکا ہے۔ میں اور تیس لاکھ کا سونا دوں گا۔ اس کے علاوہ میں ذاتی طور پر ایک کروڑ کا سونا حاصل کررہا ہوں۔ اس میں سے آپ کو چالیس پرسنٹ ملے گا۔ بولیں یہ سودا کیسا رہے گا؟“

”یہ تو تم نے بڑی زبردست ڈیلنگ کی ہے۔“

وہ بولا۔ ”ماسٹر! سیٹھ گردھاری ہمارا برسوں پرانا کسٹمر ہے۔ آئندہ بھی ہمارے ساتھ ڈیلنگ رکھے گا۔ اسے ایک عورت کے مکروفریب سے نجات حاصل کر کے زندہ رہنا چاہیے۔“

”درست کہتے ہو۔ میں تمہارے سودے کو ڈن کرتا ہوں۔“

”آپ جگ دیو کو سمجھا دیں کہ وہ میری پرسنل ڈیلنگ پر اعتراض نہ کرے۔“

”وہ نہیں کرے گا۔ تم اپنا کام کرو۔“

مراد نے رابطہ ختم کرکے پشپا، گردھاری اور شہباز کو دیکھا۔ وہ تینوں اپنی زندگی یا موت کے فیصلے کا انتظار کررہے تھے۔ شہباز اپنی خالی گن کی طرح کھوکھلا ہو گیا تھا۔ ایک چیونٹی کو بھی نہیں مار سکتا تھا پھر اپنی پشپا رانی کے لیے گن والوں سے کیسے لڑتا؟

مراد نے ان کے قریب آتے ہوئے پشپا سے کہا۔ ”ابھی تم نے کہا تھا، بوڑھے کے پاس دولت ہو اور جوان کے پاس بندوق ہو تو عورت جوان کا ساتھ دیتی ہے۔ اب تمہارے یار کے پاس بندوق نہیں ہے۔ ہاں بوڑھے سیٹھ کے پاس دولت ہے۔“

وہ قریب آکر پشپا کو اپنا ریوالور دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو اور بولو، کسے گولی مارو گی؟ دولت مند بوڑھے کو یا کنگلے یار کو...؟“

پشپا نے ریوالور نہیں لیا۔ مراد کو دیکھ کر بڑے ہی قاتلانہ انداز میں مسکرائی۔ پھر بولی۔ ”کیا میں بھرپور جوان ہوں؟“

مراد نے کہا۔ ”ہاں۔ تمہیں دیکھ کر منہ میں پانی آجاتا ہے۔“

وہ فوراً ہی قریب آکر اس کے بازو سے لگ گئی۔ مراد نے شہباز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لو تمہاری رکھیل نے پٹری بدل لی ہے۔“

پھر وہ پشپا سے بولا۔ ”تمہارے دو یار ہو گئے۔ فوراً بولو تم کس کی زندگی چاہو گی؟“

وہ بولی۔ ”تمہاری۔“

”کس کی موت چاہو گی؟“

اس نے شہباز کی طرف انگلی اٹھائی۔ مراد نے اسی لمحے میں اسے گولی مار دی۔ اس نے گولی کھا کر ڈگمگاتے ہوئے گرتے ہوئے پشپا کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

”اے عورت...! بے وفائی تجھ سے شروع ہوتی ہے اور تجھ پر ہی ختم ہوتی ہے۔“

سیٹھ گردھاری لال سہمی ہوئی نظروں سے شہباز کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ مراد نے پشپا رانی کو اپنے بازو سے الگ کیا۔ پھر اس سے کہا۔ ”تم زیادہ سے زیادہ سونا حاصل کرنے کے لیے سیٹھ جی سے بے وفائی کررہی ہو۔ جبکہ مجھے ایک کروڑ چالیس لاکھ کا سونا مل رہا ہے۔ یہ دولت حاصل کرنے کے لیے سیٹھ جی کو زندہ رکھنا ہوگا۔

”تم بولو میں دولت حاصل کروں یا تمہیں کلیجے سے لگاؤں؟“

وہ بولی۔ ”عقل سے کام لو۔ اسے گولی مار دو گے تو سونا بھی ملے گا اور شباب بھی...“

وہ بولا۔ ”جس کا سونا ہے، اسے کیوں ماروں؟ جو بازاری فاحشہ ہے، اسے بازار سجائے رکھنے کے لیے زندہ کیوں رکھوں؟“

یہ کہتے ہی اس نے پشپا کا نشانہ لے کر ٹریگر کو دبا دیا۔ اس کے حلق سے آخری چیخ نکلی۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ وہ زمین پر گر کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی پڑ گئی۔

سیٹھ گردھاری لال بری طرح سہما ہوا تھا۔ اس نے پہلے شہباز کو پھر پشپا کو تڑپ تڑپ کر اپنے لہو میں بھیگتے ہوئے دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ پھر دوڑتا ہوا آکر مراد کے پیروں سے لپٹ گیا۔

وہ اپنے ایک کروڑ چالیس لاکھ کا نقصان بھول گیا تھا۔ مراد نے اسے پانچ سو کروڑ کے بزنس کے ساتھ زندہ رکھا تھا۔

☆☆☆

وہ دہلی پہنچنے کے بعد لمبی تان کر سوتا رہا۔ کچھ ہوش نہ رہا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ کالنگ ٹون کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نیند بھری آنکھوں سے فون کی ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ محبوب اسے کال کررہا تھا۔

اس نے جماہی لے کر فون کے بٹن کو دبایا پھر اسے کان سے لگا کر سلام کیا۔ محبوب نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ”کیا سو رہے تھے؟ میں بعد میں کال کروں گا۔“

”نہیں اب تو نیند پوری ہو گئی ہے۔ آپ بات کریں۔“

”بات کیا کروں؟ تم نے کہا تھا کہ ماروی کو اپنی دلہن بناؤ گے۔ مجھے اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں صرف اسے خوش رکھنے کے متعلق سوچنا چاہیے۔

”میری سوچ اب بھی یہی ہے اور کوئی بھی ذرا سی عقل رکھنے والا یہی کہے گا کہ ماروی ایک مجرمانہ زندگی گزارنے والے کے ساتھ نہ خوش رہے گی نہ محفوظ رہے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”میں ہمیشہ مجرمانہ زندگی نہیں

گزاروں گا۔ میں نے برنارڈ کو ہلاک کرنے کے بعد پاکستان میں نیک نامی حاصل کی ہے۔ یہ تو آپ مانتے ہیں؟"

"ہاں مانتا ہوں۔ مگر..."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "پلیز۔ پہلے آپ میری پوری بات سن لیں۔ میں آئندہ بھی وہاں رہ کر اپنے ملک اور قوم کی بہتری کے لیے کام کرتا رہوں گا تو میری نیک نامی میں اضافہ ہوگا اور میں مجرموں سے بھی نجات حاصل کرنے کی کوششیں کرتا رہوں گا۔ میرا دل کہتا ہے اور یہ میرا ایمان ہے۔ میرے ارادے نیک رہیں گے تو خدا مجھ سے میری ماروی سے اور میرے ہونے والے بچوں سے راضی رہے گا۔"

"عقل کہتی ہے جب تک مجرموں سے نجات حاصل نہیں کرو گے وہ پیچھے پڑے رہیں گے۔ تمہارے نیک ارادے جرائم کے کانٹوں میں الجھتے جائیں گے۔ اگر ماروی کی بہتری چاہتے ہو تو پہلے مجرموں کے حصار سے نکلو پھر اسے شریکِ حیات بناؤ۔ جذبات سے نہیں عقل سے سوچو۔ یہاں آکر شادی کرنے کی جلدی نہ کرو۔"

"میں اگلے دو تین ہفتوں میں آؤں گا اور خوب سوچ سمجھ کر اسے اپنی شریکِ حیات بناؤں گا۔"

"یعنی اپنی بے جا ضد سے باز نہیں آؤ گے؟"

"پلیز میں اپنی شادی اور ازدواجی زندگی کے معاملے میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔"

"مراد...! میں نے ماروی کو دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ اس کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گا۔"

"آپ کیا کریں گے؟"

"جب تک تم مجرموں سے نجات حاصل نہیں کرو گے میں شادی نہیں ہونے دوں گا۔"

"میری خوشیوں کو کوئی رقیب ہی روک سکتا ہے۔"

"تم کچھ بھی سمجھ لو۔ رقیب سمجھ لو، دشمن سمجھ لو لیکن اس سچ کو ایک دن تسلیم کرو گے کہ میں ماروی کو تباہی سے بچانے کے لیے تمہاری مخالفت کرتا رہا ہوں۔"

مراد نے اس سے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ دونوں دوست نہیں تھے۔ بھائی نہیں تھے۔ ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ محض ماروی کی خاطر ایک دوسرے سے دوستی اور محبت کرتے چلے آئے تھے۔

ان کے لیے دوستی کا لفظ مناسب نہیں ہے کیونکہ ایک رئیسِ اعظم تھا، دوسرا غریب اور محتاج تھا مگر اب محتاج نہیں رہا تھا۔

ایک احسانات کرتا آیا تھا۔ دوسرا احسانات اٹھاتا آیا تھا مگر اب وہ احسانات اُٹھانے والا نہیں تھا۔

وہ زمین اور آسمان کی طرح ایک دوسرے سے دور رہے تھے۔ اور دور بہت دور افق میں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ محض نظروں کا دھوکا تھا۔ زمین اور آسمان دور افق میں بھی نہیں ملتے۔ وہ دونوں محض ماروی کو جیتنے کے لیے یہ کہتے آئے تھے کہ ایک دوسرے کے رقیب نہیں ہیں۔ یہ تاثر دیتے آئے تھے کہ ماروی کو خوش رکھنے کے لیے ہمیشہ ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔ کچھ بھی ہو جائے، کبھی آپس میں عداوت نہیں رکھیں گے۔ لیکن دونوں کے ذہنوں میں یہ بات چھپی رہتی تھی کہ ماروی میری ہی شریکِ حیات بن کر خوش رہے گی اور اب وہ مقام آگیا تھا۔ جہاں فیصلہ ہونا تھا کہ وہ مراد کی منکوحہ بن کر شاد و آباد رہ سکے گی یا نہیں؟

دونوں اپنی جگہ درست تھے۔ محبوب چاہتا تھا، ماروی سلامتی سے شریفانہ پُرامن زندگی گزارے۔ ایسا چاہنے کے پیچھے یہ بات واضح تھی کہ پُرامن ہنستی کھیلتی زندگی محبوب ہی اسے دے سکتا ہے اور مراد کہہ رہا تھا حالات نے اسے مجرم بنایا ہے۔ وہ جلد ہی مجرموں کی دنیا سے نکل آئے گا اور یہ کہ اس کی طرح کئی مجرم اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سلامتی سے زندگی گزارتے ہیں۔ وہ بھی ماروی اور اپنے ہونے والے بچوں کو سلامتی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہے گا۔

ویسے یہ حقیقت کھل گئی تھی۔ لاشعور میں چھپی ہوئی رقابت ظاہر ہو گئی تھی۔ مراد ہاتھ میں فون لیے بیڈ پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔

سوچ یہ تھی کہ اب سائیں سے پہلی جیسی اپنایت نہیں رہے گی۔ وہ سائیں کی اب بھی عزت کرے گا۔ وہ اسے نقصان پہنچائیں گے۔ ماروی کو اس کی زندگی میں آنے نہیں دیں گے۔ تب بھی وہ انہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔

کوئی ایسا راستہ اختیار کرے گا کہ دونوں کے درمیان کبھی رقیبانہ ٹکراؤ نہ ہو۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ "میرے جانے انجانے دشمنوں کی کمی نہیں ہے۔ اب یہ نئی بات ہوگی کہ اگلے دو چار ہفتوں میں ماروی کو دلہن بنانے پاکستان جاؤں گا تو سائیں ایک نئے دشمن کی طرح سامنے آئیں گے۔

'مجھے سمجھنا چاہیے۔ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ میرے اور ماروی کے درمیان کیسی کیسی رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں؟'

اس نے اپنے ہاتھ میں فون کو دیکھا پھر ماروی کے نمبر پنچ کیے۔ اس کے نمبر کو چھو کر گویا دل کو چھو لیا۔ وہ خوش ہو کر

بولی۔ "کل سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے اپنے فون کو دیکھتی رہتی ہوں کہ اب بولنے ہی والے ہو۔ تم نے بڑا انتظار کرایا ہے۔"

وہ بولا۔ "میں نے دیر کی ہے مگر تمہیں خوش کر دینے والی بات کہہ رہا ہوں۔ میں اسی ایک ماہ کے اندر آرہا ہوں۔"

"سچ...؟" وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ "تم سچ کہہ رہے ہو نا... مراد؟ آجاؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے آجاؤ۔ یہاں میری پریشانیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔"

"کیسی پریشانیاں؟"

"یہاں سب ہی کہہ رہے ہیں کہ تم خطرات سے بھری زندگی گزار رہے ہو۔ مجھے تم سے دور رہنا چاہیے۔"

"تم کیا کہتی ہو؟"

"ایک ہی بات کہتی ہوں۔ تمہارے ساتھ جیوں گی تمہارے ساتھ مروں گی اور میں نے جب سے یہ فیصلہ کیا ہے تب سے یوں لگتا ہے کہ بچپن سے لے کر اب تک کی محبتیں جو بھولی ہوئی تھیں، وہ میرے اندر بیدار ہو رہی ہیں۔"

"تم ہی میرے اوّل اور آخر لگتے ہو اور دل سے کہتی ہوں کہ واقعی ہو اور رہو گے۔"

"میری جان! تمہاری یہ باتیں، یہ جذبے مجھے نئی زندگی اور نیا حوصلہ دے رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے، ابھی اُڑ کر آجاؤں، ویسے جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "مجھے ایسا لگتا ہے، محبوب صاحب مجھے تمہاری دلہن بننے نہیں دیں گے۔"

"کیا انہوں نے ایسی کوئی بات کی ہے؟"

"وہ صاف لفظوں میں تو نہیں کہتے لیکن میری سلامتی اور خوشحالی کی بات کرتے ہیں۔ کہتے تو ہماری بھلائی کے لیے ہیں کہ جب تک مجرموں کی دنیا سے نکل کر شریفوں کی طرح پرامن زندگی نہیں گزارو گے، وہ ہماری شادی نہیں ہونے دیں گے۔"

"معروف تجلّی صاحب بھی مجھے سمجھا رہے تھے کہ محبوب صاحب میری بہتری کے لیے مخالفت کر رہے ہیں۔ میں اس مخالفت کو دشمنی نہ سمجھوں۔"

مراد نے کہا۔ "دشمنی اور کیسی ہوتی ہے؟ تمہیں جیتنے کے لیے تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لیے اب تک نیکیوں اور مہربانیوں کی مٹھاس گھولتے رہے۔ یہ انتظار کرتے رہے کہ تم کسی دن ان کی طرف مائل ہو جاؤ گی۔ لیکن تم نے میرے حق میں فیصلہ سنا کر انہیں مایوس کر دیا ہے۔ تب وہ کھل کر ایک رقیب بن کر سامنے آگئے ہیں۔"

"مراد! وہ بہت دولت مند ہیں، بہت طاقتور ہیں۔"

"ہونے دو۔ اب میں بھی کچھ کم نہیں ہوں۔"

"میں ان کی کوٹھی میں اُن کے سائے میں رہتی ہوں۔"

"میں وہاں آتے ہی تمہارے لیے نئی کوٹھی خرید دوں گا۔ تمہارا وہاں بینک اکاؤنٹ ہے؟"

"محبوب صاحب نے اکاؤنٹ کھلوایا تھا۔ میرے پانچ لاکھ ہیں اور تم نے چاچی کے پاس بائیس لاکھ رکھوائے تھے۔ وہ رقم بھی اکاؤنٹ میں ہے۔"

"آج یا کل تک ساٹھ لاکھ روپے تمہارے اکاؤنٹ میں آجائیں گے۔ میں وہاں آتے ہی تمہارے ساتھ ایک نئی دنیا بساؤں گا۔ ابھی اپنا اکاؤنٹ نمبر Send کرو۔ میں پھر کسی وقت کال کروں گا۔ دن رات میرے فون کا انتظار نہ کیا کرو۔ مجھے جب بھی تنہائی اور سہولت حاصل ہوتی ہے میں پہلے تمہیں ہی یاد کرتا ہوں۔"

"میں کیا کروں؟ میرا اور کوئی کام نہیں ہے۔ انتظار... انتظار اور انتظار۔ سچ تو یہ ہے کہ انتظار مارے ڈالتا ہے پھر بھی سینے میں دھڑکتا رہتا ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے۔"

وہ کچھ دیر تک پیار بھری باتیں کرتے رہے پھر رخصت ہوتے وقت مراد نے فون کو چوم لیا۔ وہ ایک دم سے شرما گئی۔ اپنے آپ میں سمٹ کر بستر پر گر گئی۔ کیسی شرارت کی تھی اس نے؟ دل پاگل ہو کر سینے کی دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔

وہ ایک کرسی پر آرام سے نیم دراز ہو کر خیالی آنکھوں سے ماروی کو دیکھنے لگا۔ وہ دلہن بنی ہوئی پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مراد اس کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ آتش بازی اور پٹاخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی دلہن کا گھونگٹ اٹھا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت پٹاخوں کی آواز فائرنگ میں بدل گئی۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ خیالوں کی رنگین دنیا سے باہر آتے ہی محبوب کی بات یاد آئی۔ "تمہارے دشمنوں کی طرف سے آنے والی گولیاں ماروی کا مقدر بن سکتی ہیں۔"

اس نے محبوب کو دماغ سے جھٹک دیا۔ کچھ بھی ہو، گولی چلے یا گولے دھماکے کرتے رہیں، وہ دشمنوں سے خوفزدہ ہو کر ماروی کے حصول سے باز آنے والا نہیں تھا۔

اس نے ماسٹر کوبوبو سے رابطہ کیا۔ وہ بولا۔ "زبردست۔ کل رات تم نے بہت لمبا ہاتھ مارا ہے۔ ایک کروڑ چالیس لاکھ کا سونا ہماری تحویل میں آگیا ہے۔ یہ بتاؤ اپنے حصے کے ساتھ لاکھ روپے کب لینا چاہو گے اور کہاں لینا چاہو گے؟"

"پاکستان میں ایک بینک اکاؤنٹ کا نمبر

Send کر رہا ہوں۔ رقم وہاں جمع کرادیں۔''

''سمجھو رقم وہاں پہنچ گئی ہے۔ اب وہاں دہلی کے ایم این اے دھرم داس سے اس کے اہم سیاسی ساتھیوں اور ان کے کام آنے والے کرمنل لوگوں سے شناسائی رکھو۔ دو چار دنوں تک اپنی کار ڈرائیو کرتے ہوئے پورے دہلی کو اچھی طرح دیکھ لو۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں اس شہر کو اچھی طرح سمجھ لوں گا۔''

وہ رابطہ ختم کرکے ماروی کا اکاؤنٹ نمبر Send کرکے باتھ روم میں چلا گیا۔ اس نے فون کا سوئچ آف کردیا تھا تاکہ کسی کی مداخلت کے بغیر آرام سے فریش ہوجائے۔ جب وہ تازہ دم ہوکر لباس بدل کر ڈرائنگ روم میں آیا تو ایک ملازم نے کہا۔ ''دھرم داس جی کا آدمی آپ کو لینے آیا ہے۔''

اس نے اپنے فون کو آن کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں ابھی ان سے ملنے جاؤں گا۔''

فون پر جگ دیو کا میسج آیا ہوا تھا۔ مراد نے اس سے رابطہ کرنے کے بعد پوچھا۔ ''تم نے مجھے کال کی تھی۔ میں نے کچھ دیر کے لیے سوئچ آف رکھا تھا۔ خیریت تو ہے؟''

وہ بولا۔ ''کل رات میں نے جس ڈیلنگ کے ذریعے دس لاکھ کا منافع کمایا تھا' اسی ڈیلنگ سے تم نے ایک کروڑ چالیس لاکھ کما کر حیران کردیا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں سوچ رہا تھا' میں نے تمہارے سودے پر سودا کیا ہے۔ تمہیں برا لگے گا۔''

''ایسی بات کبھی نہ سوچا کرو۔ تم ماسٹر کا پہلا کام کرتے ہی مجھ سے آگے نکل گئے ہو۔ میں اس لیے بھی برا نہیں مانوں گا کہ تم آئندہ مجھ سے آگے نکلنے کے لیے یہاں نہیں رہو گے۔ ماسٹر نے بتایا ہے' تم دو چار ہفتوں میں پاکستان چلے جاؤ گے۔''

''ہاں جگ دیو! تم بھی کوشش کرو کہ کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہو اور میں یہاں سے چلا جاؤں۔''

''تم ضرور جاؤ گے۔ یہ بتاؤ' وہاں دہلی میں مرینہ ہے۔ کیا اسے ستاؤ گے؟ لائف انجوائے کرو یار...!''

''ہاں ایسا انجوائے کروں گا کہ وہ آگے آگے بھاگتی پھرے گی۔ مجھے اس کا پتا ٹھکانا بتاؤ۔ میں اس پر نظر رکھنا چاہتا ہوں۔''

جگ دیو نے اس کی رہائش گاہ کا پتا بتایا پھر اس سے رابطہ ختم ہوگیا۔ اسے ابھی دھرم داس کے پاس جانا تھا۔ لیکن بلّے سے بھی ضروری باتیں کرنی تھیں۔ اس نے فون پر اسے مخاطب کیا پھر کہا۔ ''میں بہت مصروف ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ' وہاں تمہاری ضرورتیں کیا ہیں؟ کیا کراچی جاکر رہ سکتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں تو کراچی جانے اور اپنی بلّی سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ اگر میرے پاس اتنی رقم ہو کہ میں وہاں چھپ کر رہوں اور دشمنوں کی گولیوں کا جواب گولیوں سے دیتا رہوں تو بلّی کی قسم ابھی وہاں جاؤں گا۔''

مراد نے کہا۔ ''کراچی میں میرا اور تمہارا ایک ہی دشمن عالی جناب ہے۔ اس نے میرے پیچھے تمہیں لگایا تھا پھر تم نے بھی میری خاطر اس سے دشمنی مول لی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے' اگر ہم اس ایک دشمن کو ختم کردیں گے تو شاید پھر کوئی ہم سے دشمنی نہیں کرے گا۔''

بلّے نے کہا۔ ''اسے ختم کرنا آسان نہیں ہے۔ اگر ہمارے پاس شوٹرز کو خریدنے اور ان سے کام لینے کے لیے کم از کم پانچ لاکھ روپے ہوں تو شاید ہم کچھ کرسکیں گے۔''

''تمہیں آج ہی پانچ لاکھ روپے مل جائیں گے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا واقعی؟''

''اگر تم عالی جناب تک پہنچنے کا راستہ نکالتے رہو گے۔ اگر تمہارے کرائے کے شوٹرز عالی جناب پر حملے کرتے رہیں گے تو میں لاکھوں روپے تمہیں دیتا رہوں گا۔''

''ارے کیا بولتے ہو مراد...! لاکھوں روپے ملیں گے تو میں عالی جناب کے پورے خاندان کو قبرستان پہنچادوں گا۔''

''تو پھر ابھی کراچی جاؤ اور وہاں میری ماروی سے ملو۔ وہ تمہیں پانچ لاکھ کا چیک دے گی۔ میں تمہیں اس کی کوٹھی کا پتا بتا رہا ہوں۔''

''تم کہاں ہو؟ مجھ سے کیوں نہیں مل رہے ہو؟''

''میں انڈیا میں ہوں۔ میرے آنے تک اگر تم نے عالی جناب کو ٹھکانے لگا دیا تو سمجھو' ہم دونوں کراچی میں امن وسکون سے رہ سکیں گے۔ تم اپنی بلّی سے شادی کروگے اور میں اپنے رقیب کی مخالفتوں کے باوجود ماروی کو اپنی دلہن بناسکوں گا۔''

مراد بہت سوچ سمجھ کر چالیں چل رہا تھا۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ برنارڈ کو ہلاک کرنے کے بعد ہی کئی ٹارگٹ کلرز اس کے پیچھے پڑ گئے تھے اور ان سب کو عالی جناب نے اس کے پیچھے لگایا تھا۔

اگر عالی جناب نہ رہتا' فنا ہوجاتا تو پھر کرائے کے قاتلوں کو خریدنے والا اور اس کے پیچھے لگانے والا

وہاں کوئی نہ رہتا۔

تب وہ محبوب سے کہہ سکتا تھا کہ وہ مجرموں کی دنیا سے نکل آیا ہے' اب نہ کوئی جانی دشمن ہے اور نہ ہی ماروی کی سلامتی کو خطرہ ہے۔

اس نے ماروی کو فون کرکے کہہ دیا کہ بلال احمد عرف بلّا نامی ایک شخص اس کے پاس آئے گا۔ جب وہ ملاقات کے لیے کوٹھی میں آئے گا تو مراد فون پر تصدیق کرے گا کہ وہی بلّا ہے۔ تب ماروی اسے پانچ لاکھ کا چیک دے گی۔

اس سے باتیں کرنے کے بعد وہ دھرم داس کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کے لیے اس کی کوٹھی میں آگیا۔ وہاں اور بھی اہم لوگوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ کھانے کی میز پر بہت سی ڈشوں کے ساتھ تڑکا لگانے کے لیے چند حسینائیں بھی تھیں۔

دھرم داس نے کھانے کے بعد کہا۔ ''تم دہلی شہر دیکھنا چاہتے ہو۔ ان میں سے جو حسینہ پسند ہے' اسے لے جاؤ۔ ان میں سے کوئی بھی تمہیں شہر کے ایک ایک حصے میں گھمائے گی۔''

مراد نے کہا۔ ''عورت کیسے گھما کر رکھ دیتی ہے' میں خوب جانتا ہوں۔ میں کسی مرد گائیڈ کو ساتھ لے جاؤں گا۔''

دھرم داس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے سنا ہے' تم عورتوں سے کتراتے رہتے ہو۔''

وہ بولا۔ ''دھرم داس جی...! عورتوں سے کترانے کا مطلب یہ ہے کہ موت سے کتراتا ہوں۔ عورت ماں ہے' بہن ہے' بیٹی ہے اور بیوی ہے۔ بیوی کی جگہ کسی دوسری کو دو گے تو گویا اپنی بیوی یا محبوبہ کو دھوکا دو گے۔ پھر اس عورت سے بھی دھوکا ملے گا۔ جب ہلاکت ہوتی ہے تب پتا چلتا ہے کہ وہ آستین کا خنجر تھی۔''

دھرم داس نے کہا۔ ''بے شک میں نے بھی ناگن جیسی سندر بلائیں دیکھی ہیں۔ میں تمہاری باتوں سے انکار نہیں کروں گا۔''

مراد نے کہا۔ ''میں دو پرائیویٹ جاسوسوں کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ایک جاسوس کو کال کرتا ہوں۔ کل دوسرا بھی آجائے گا۔''

اس نے رابطہ ہونے پر کہا۔ ''ہیلو بھنڈاری! تمہارے لیے ایک کام نکل آیا ہے۔ فوراً چلے آؤ۔''

وہ جواب سن کر فون بند کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ آرہا ہے۔ ویسے میں ایک بات سمجھا دوں' جرائم کی دنیا میں عورتیں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔ جہاں کرنسی اور ہتھیار کام نہیں آتے' وہاں ان کی جوانی کام دکھا دیتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں سے محتاط رہو مگر ان سے اپنا کام نکالنے کے لیے دوستی بھی رکھو۔''

''میں آپ کے مشورے پر غور کروں گا۔''

بھنڈاری آدھے گھنٹے میں آگیا۔ دھرم داس نے مراد سے تعارف کرایا۔ ''یہ نوشاد علی ہیں۔ کولکتہ سے آئے ہیں۔ جب تک یہاں رہیں گے تم ان کے لیے کام کرو گے۔''

بھنڈاری نے مراد سے کہا۔ ''ضرور کروں گا۔ آپ بتائیں کام کیا ہے؟''

مراد نے کہا۔ ''میرے ساتھ چلو۔ بتاؤں گا۔''

وہ اپنے گائیڈ اور بھنڈاری کے ساتھ اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ اسے اسٹارٹ کرکے مین روڈ پر آکر بولا۔ ''مجھے اپنے بنگلے سے یہاں تک کا راستہ معلوم ہے۔ اب میں کالی باڑی کے لکشمی نارائن مندر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ بولو کدھر چلوں؟''

گائیڈ نے راہنمائی کی۔ وہ ادھر چل پڑا۔ بھنڈاری پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مراد نے اس سے کہا۔ ''لکشمی نارائن مندر کے پیچھے ایک اسٹریٹ میں .... مکان نمبر بائیس ہے۔ تمہیں اس مکان کے فیملی ممبرز کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ وہاں کتنے افراد رہتے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں؟''

جگ دیو نے مراد کو بتایا تھا کہ مرینہ اس مکان میں رہتی ہے۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا... اسی اسٹریٹ میں آیا۔ بھنڈاری نے وہاں بائیس نمبر کے مکان کو دیکھ کر کہا۔ ''آپ مجھے یہاں ڈراپ کردیں۔ اپنا فون نمبر دیں۔ میں جلد ہی آپ کو کال کروں گا۔''

مراد اپنا نمبر دے کر اسے وہاں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا بنگلا تھا۔ باہر احاطے میں روشنی تھی لیکن بنگلے کے اندر تاریکی تھی۔ وہاں کے مکین یا تو سو رہے تھے یا باہر گئے ہوئے تھے۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے گائیڈ سے پوچھا۔ ''اب ہم کہاں سے گزر رہے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''یہ بابا کھڑک سنگھ روڈ ہے۔ آگے کناٹ پلیس کا سرکل ہے۔ میلوں دور تک پھیلے ہوئے اس سرکل کے اندر سینما' تھیٹر' مینا بازار' شاپنگ سینٹر اور نائٹ کلبس ہیں۔''

کناٹ پلیس کے سرکل میں جتنی سڑکیں مختلف سمتوں میں گئی ہیں' ان سڑکوں کو ریڈیئل Radial کہا جاتا ہے۔ ریڈیئل روڈ نمبر ون میں پالیکا بازار کی رونق لگی

تھی۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے گزرتا ہوا ریڈیکل روڈ نمبر 6 میں آیا تو کالنگ ٹون نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے انجانے نمبر پڑھ کر پوچھا۔ ''ہیلو۔ کون؟''

''سر! میں جھنڈا بری بول رہا ہوں۔ میں نے معلوم کیا ہے۔ اس بنگلے میں جوان پتی پتنی رہتے ہیں۔ یہ ایک ہفتہ پہلے ممبئی سے یہاں آئے ہیں۔''

مراد نے پوچھا۔ ''اس بنگلے میں اندھیرا کیوں ہے؟''

''میں نے چوکیدار سے کہا تھا کہ میں اخباری رپورٹر ہوں' وہاں رہنے والوں سے انٹرویو لینے آیا ہوں۔

'' اس نے کہا۔ وہ پتی پتنی کہیں باہر گئے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو کہاں گئے ہیں؟

'' وہ بولا ۔ صاحب لوگ نوکروں کو بتا کر نہیں جاتے۔ ویسے وہ صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنی پتنی سے کہہ رہا تھا۔ دی ہاٹ کلب چلتے ہیں۔ وہ تمہیں پسند نہیں آئے گا تو وہاں سے دوسرے کلب میں جائیں گے۔''

مراد نے گائڈ سے پوچھا۔ ''دی ہاٹ کلب کہاں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''آپ ریڈیکل روڈ نمبر چار اور پانچ کو کراس کرنے کے بعد چھ پر چلیں۔''

اس نے ادھر کا رخ کرتے ہوئے جھنڈاری سے کہا۔ ''مِنی مِنی تھینکس ۔ فی الحال کوئی کام نہیں ہے۔ اب آرام کرو پھر کسی ضرورت کے وقت کال کروں گا۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ جگ دیو نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کسی کرائے کے پتی کے ساتھ پتنی بن کر رہتی ہے۔ کلب جا کر اسے دیکھنا ضروری تھا کہ وہ مرینہ ہی ہے یا سچ مچ پتی پتنی اس بنگلے میں آ کر رہتے ہیں۔

دی ہاٹ کلب کے سامنے درجنوں قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہاں امیر کبیر لوگ ناچنے گانے اور پینے پلانے آتے تھے۔ اس نے ایک جگہ اپنی کار پارک کی۔ پھر گائڈ سے کہا۔ ''تم یہاں بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں آؤں گا۔''

وہ کلب کے ایک دفتری کمرے میں آیا پھر وہاں انٹری فیس ادا کر کے اندر پہنچا۔ ایک بڑے ہال میں حسیناؤں کا میلا لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ کھانے کی میزوں پر تھیں۔ ان میزوں کے درمیان ایک بڑے اسٹیج پر رقص بھی کر رہی تھیں اور ساقی بن کر شراب کے جام بھی پیش کر رہی تھیں۔

مراد نے دور سے مرینہ کو دیکھا۔ اسٹیج پر کئی خوبصورت جوڑے رقص کر رہے تھے۔ وہ بھی ایک قد آور باڈی بلڈر کے ساتھ تھرک رہی تھی۔

اس وقت وہ ایک ہندوستانی عورت کے روپ میں تھی۔ ماتھے پر بندیا، مانگ میں سندور تھا۔ بلاؤز اور ساڑی میں خوب کھل رہی تھی۔

پورے ہال میں کہیں دھیمی سے روشنی تھی کہیں تاریکی تھی۔ کھانے کی میزوں پر موم بتیاں روشن تھیں۔ اسٹیج پر اسپاٹ لائٹ میں مرینہ رقص کرنے والے جوڑوں کے درمیان تھرک رہی تھی۔ وہ اچانک ہی ٹھٹک گئی۔ رقص کرنے والے پاؤں تھم گئے۔

اسے دور ایک میز کے پاس مراد نظر آ رہا تھا۔ وہ نشے میں تھی۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ اس کے ساتھی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا رتنا؟ رک کیوں گئیں؟''

وہ جھومتی ہوئی ایک انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ۔ وہ ظالم اُدھر ہے۔''

''کون ہے؟ تم کسے دیکھ رہی ہو؟''

''وہ میری جان کا دشمن' میرا یار' میرا دلدار...''

''او ڈارلنگ! تم نے بہت پی لی ہے۔ جان کا دشمن بھی کہہ رہی ہو' یار اور دلدار بھی کہہ رہی ہو۔''

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''تم نہیں سمجھو گے یہ وہی ہے۔ جس کے ساتھ سونے کے لیے' تمہارے ساتھ سونے سے انکار کرتی ہوں۔ پہلے وہ' پھر کوئی اور میری تنہائی میں آئے گا۔''

وہ ڈگمگاتی ہوئی اسٹیج سے اترتی ہوئی بولی۔ ''جلدی آؤ۔ نہیں تو وہ بھاگ جائے گا۔''

اس کا ساتھی اسے سنبھالتا ہوا' اسے سہارا دیتا ہوا دور اس میز کے پاس آیا۔ مرینہ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھنے لگی پھر اپنے نام نہاد پتی سے بولی۔ ''کیشو! وہ ابھی یہاں تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ اس میز کے پاس کھڑا تھا۔''

کیشو نے کہا۔ ''یہاں کینڈل لائٹس کی روشنی ہے۔ روشنی کم ہے۔ اندھیرا زیادہ ہے' تم نے اسے دور سے کیسے دیکھ لیا؟''

''میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں؟ میں اسے اندھیرے میں بھی پہچان سکتی ہوں۔ وہ میرے اندر...''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ کیشو کے بازو کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''وہ دیکھو۔ وہ وہاں اسٹیج پر ہے۔''

وہ تیزی سے اسٹیج کی طرف جاتے ہوئے ڈگمگانے لگی۔ کیشو اسے سہارا دے رہا تھا۔ اسے گرنے سے بچا رہا تھا۔ وہ اسٹیج کے قریب آ کر رک گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

دیکھنے لگی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

اس بار کیشو نے تسلیم کیا۔ ''ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے یہاں اسٹیج پر ایک شخص کو دیکھا تھا۔ وہ ڈانس نہیں کر رہا تھا۔ تمہاری طرف دیکھ رہا تھا۔''

وہ ادھر ادھر دور تک نظریں دوڑا رہی تھی۔ بڑبڑا رہی تھی۔ ''وہ مجھے خوفزدہ کرنا چاہتا ہے۔ میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔ مرنا تو ہے ایک دن...

'' ارے آ... تا۔ چھپتا کیا ہے؟ آ۔ ایک رات کے لیے آ۔ اور قصہ تمام کر دے۔''

وہ نشے میں جھومتی ہوئی گرین روم میں آئی۔ وہاں عورتیں اپنا ہینڈ بیگ اور دوسرا سامان رکھتی تھیں۔ ایک ملازم سامان کی نگرانی کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک ٹوکن دکھا کر اپنا ہینڈ بیگ حاصل کیا پھر اس میں سے فون نکال کر مراد کے نمبر پنچ کرنے لگی۔

کیشو نے کہا۔ ''ہمیں گھر جانا چاہیے۔ بہت رات ہو گئی ہے اور تم کچھ اور ہو رہی ہو۔''

اس نے جواب نہیں دیا۔ رابطہ ہوتے ہی فون پر کہا۔ ''اے! تم عورتوں کی طرح چھپتے کیوں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ کیا مجھے خوف زدہ کرنا چاہتے ہو؟''

مراد نے کہا۔ ''کیسے آؤں؟ جب نیام میں ایک تلوار ہو تو دوسری تلوار کیسے آئے گی؟''

مرینہ نے کیشو کو دیکھا پھر فون پر کہا۔ ''ارے یہ تمہاری طرح کاٹنے والی تلوار نہیں ہے۔ یہ میرا نمائشی شوہر ہے۔ باسز کو بوبو نے کہا ہے۔ میں کسی کی دھرم پتنی بن کر رہوں گی تو یہاں کے جاسوس مجھ پر شبہ نہیں کریں گے۔

'' اے! میں جانتی ہوں تم ہمیشہ میرے بن کر نہیں رہو گے۔ پھر بھی... ہاں پھر بھی قسم کھا چکی ہوں ایک بار صرف ایک بار ضرور تمہیں حاصل کر کے رہوں گی اور جب تک حاصل نہیں کروں گی تب تک کسی بناوٹی شوہر کو کسی جیالے کو بھی اپنی تنہائی میں آنے نہیں دوں گی۔''

مراد نے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو اپنے اس پتی کو لات مارو۔ اکیلی اپنے بنگلے میں جاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔''

''ابھی یہاں آ جاؤ۔ ہم ساتھ چلیں گے۔''

''سوری۔ میں نہیں چاہتا' کوئی مجھے تمہارے ساتھ دیکھے۔''

''اچھی بات ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ بنگلے میں اکیلی رہوں گی۔ بالکل اکیلی... میں ڈرنے والی نہیں ہوں... آ جاؤ۔''

اس نے فون بند کر کے کیشو سے کہا۔ ''تم جاؤ اور کسی ہوٹل میں رات گزارو۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ہمیں پتی پتنی کی طرح ساتھ رہنا چاہیے۔ اگر میں ہوٹل میں رہوں گا اور کوئی تمہارے ساتھ بنگلے میں دیکھا جائے گا تو یہ تمہاری پلاننگ کے خلاف ہوگا' تم بھارتی جاسوسوں کی نظروں میں آ جاؤ گی۔''

وہ بولی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں اسی شرط پر تمہیں شوہر بن کر رہنے کی پیمنٹ کر رہی ہوں کہ میری نافرمانی بھی نہیں کرو گے۔ پلیز جاؤ۔ میرا وقت برباد نہ کرو۔''

وہ زر خرید تھا۔ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔ مرینہ نے کلب سے باہر اپنی کار کے پاس آ کر دور تک دیکھا۔ شاید وہ نظر آ جائے لیکن وہ گم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ گئی' اسے ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگی کیا واقعی وہ آئے گا؟ اگر آئے گا تو اس کی پلاننگ کیا ہوگی؟ ماروی کا جادو ایسا چل رہا ہے کہ اسے میری ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی اس کی بھوکی ہوں اور... اور لہو کی پیاسی بھی۔ وہ عاشق نہیں ہے۔ الو بننے کے لیے نہیں آ رہا ہے۔ آج تو میں رہوں گی یا وہ رہے گا۔

اس نے بنگلے کے احاطے میں پہنچ کر فون پر کہا۔ ''شاید تم دیکھ رہے ہو۔ میں اپنے بنگلے میں آ گئی ہوں اور تنہا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''مرینہ! ہم دونوں ایک دوسرے سے جان لینے والی دشمنی کرتے آ رہے ہیں۔ میں نے تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور تم مجھے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر میرے وطن سے میری ماروی سے دور لے آئی ہو۔ ایسی زہریلی دشمنی کے پیش نظر کیا ابھی ہمیں ملنا چاہیے؟''

''میں تو ملنا چاہتی ہوں۔ تمہارے بازوؤں میں آ کر دشمنی ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ آج میں نے خوب پی ہے اور تمہارے آنے تک اپنے بیڈ روم میں اور پیتی رہوں گی۔''

وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی تھی۔ فون آن تھا۔ اس نے ایک بھرے ہوئے پستول کو اپنی ساڑی میں چھپا لیا۔

مراد دوسری طرف فون کو کان سے لگائے سن رہا تھا۔ وہ ایک بوتل کھول کر گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بول رہی تھی۔ ''آواز سن رہے ہو۔ امپورٹڈ وسکی سے گلاس بھر رہی ہوں۔ آج تو میں مست ہو جاؤں گی۔ مجھے قتل کرو گے تو نشے میں پتا ہی نہیں چلے گا کہ یار کے ہاتھوں موت کیسے آئی تھی۔''

وہ بولا۔ ''میں نے کلب میں دیکھا ہے۔ تم نشے میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ تم ابھی اور پی رہی ہو تو اور اچھی لگو گی۔''

وہ بیڈ کے پاس آکر ایک بھرے ہوئے ریوالور کو تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے بولی۔ ”کب تک فون پر باتیں کرتے رہو گے۔ اب آ بھی جاؤ۔ میں نے چوکیدار سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں نہیں روکے گا۔ دروازے کھلے ہیں، سیدھے بیڈ روم میں چلے آؤ۔“

وہ اپنی چال چل رہی تھی۔ وہ اپنی چال کے مطابق اس سے پہلے ہی اس کے بنگلے میں پہنچ گیا تھا۔ مرینہ نے چوکیدار سے کہا تھا ابھی ایک صاحب آنے والے ہیں۔ انہیں نہ روکنا میں بنگلے کا دروازہ بھی کھلا رکھوں گی۔

مراد نیم تاریکی میں بنگلے کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ چوکیدار اپنی ڈیوٹی کے لیے مین گیٹ کی طرف جانے لگا تو وہ دروازہ کھول کر بنگلے کے اندر آ گیا تھا۔

مرینہ فون کو کان سے لگائے بولنے میں مصروف تھی۔ پیچھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ مراد نے اس سے اتنا فاصلہ رکھا تھا کہ اس کے پلٹ کر دیکھنے سے پہلے کہیں چھپ سکتا تھا۔

ویسے وہ شبہ نہیں کر سکتی تھی کہ مراد اتنی جلدی اس کے اتنے قریب آجائے گا۔ کیونکہ فون پر اس کی آواز سن رہی تھی۔

وہ بیڈ روم کے باہر ایک کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ مرینہ پستول اور ریوالور چھپا رہی تھی اور گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ وہ امپورٹڈ وسکی سے گلاس بھر رہی ہے۔

اس نے کہا۔ ”تم پیتی رہو۔ میں بنگلے سے کچھ دور ہوں۔ اپنی کار لاک کر کے پیدل آ رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ مرینہ نے وال کلاک کو دیکھا۔ پھر بڑبڑائی۔ ”اونہہ۔ بہت محتاط ہے اپنی گاڑی دور روک کر پیدل آ رہا ہے۔“

وہ ساڑی کے اندر سے پستول نکال کر بیڈ پر رکھتے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ ویسے نظر نہیں آرہی تھی۔

وہ دبے قدموں اندر آ گیا۔ اس نے بھرے ہوئے پستول کو خالی کر کے گولیاں جیب میں رکھ لیں۔ پستول کو اسی جگہ رکھ دیا۔ پھر تکیے کے نیچے رکھے ہوئے ریوالور کے ساتھ بھی یہی کیا۔ اس کے بعد دبے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ واش روم کے اندر گنگنا رہی تھی پھر تولیا سے منہ ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ پستول کو اٹھا کر آئینے کے سامنے آکر اپنے حسن کا جائزہ لینے لگی۔

وہ چاہتی تھی پستول سے اسے صرف دھمکی دے۔ پہلے حسن و شباب سے متاثر کرے۔ وہ ایک لپ اسٹک اٹھا کر ہونٹوں کو انگارے کی طرح دہکانے لگی۔ پھر ایک دم سے گھبرا گئی۔

وہ توقع کے خلاف اچانک وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ اس نے آئینے میں اپنے پیچھے اسے دیکھا تو ایک دم سے اچھل پڑی۔ خوف اندر چھپا ہوا تھا۔

اس نے لپ اسٹک کو پھینک کر بڑی پھرتی سے پستول کو اٹھا لیا۔ مراد نے سہمے ہوئے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”یہ کیا؟ میں تو سمجھا تھا، پیار کرو گی۔ آج میں بھی پیار کے موڈ میں ہوں۔ سچ کہتا ہوں، ساڑی میں بڑی بھرپور لگ رہی ہو۔“

وہ بانہیں پھیلا کر بولی۔ ”تو پھر آؤ میرے دلدار۔۔۔! مجھے بازوؤں میں لے کر پیار کرو۔“

وہ بولا۔ ”جانِ من! کیا آج تک کسی نے بندوق ہاتھ میں لے کر محبت کی ہے؟“

وہ بولی۔ ”تم وہ عاشق نہیں ہو کہ ہاتھ میں پھول لے کر آؤں گی۔ یہ پستول ہاتھ میں رہے گا اور تم پیار کرتے رہو گے۔“

”سوری۔ میں ایسا کھیل نہیں کھیلوں گا۔ ایک وقت میں ایک ہی بات ہوگی۔ یا تو ہم محبت کریں گے یا پھر عداوت۔۔۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”شاید ایسا کھیل کسی نے نہیں کھیلا ہوگا۔ میں عداوت کرتے کرتے تمہیں محبت کرتے رہنے پر مجبور کرتی رہوں گی۔“

”میں مجبور ہونا نہیں جانتا۔ پستول پھینک دو۔ میں دشمنی بھول چکا ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ۔ ورنہ چلا جاؤں گا۔“

”پلیز میری بات مان لو۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ میں سچ کہتی ہوں آج ہر حال میں تمہیں حاصل کروں گی۔ جو کہتی ہوں، وہ کرو۔ ورنہ تمہیں اپاہج بنا دوں گی۔“

وہ اس کے پیروں کی طرف نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ ”جیسے ہی منہ پھیر کر جانا چاہو گے۔ تمہاری ایک ٹانگ زخمی کر دوں گی۔ تمہیں جانے نہیں دوں گی۔“

وہ بولا۔ ”میں ہوا ہوں اور ہوا کو آنے جانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ لو جا رہا ہوں۔ تمہیں گولی چلانے کا بہت شوق ہے۔ چلو اپنا شوق پورا کرو۔“

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ اس نے فوراً ہی ٹریگر کو دبایا۔ کھٹ کی آواز آئی۔ گولی نہیں چلی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے دوسری تیسری بار گولی چلائی۔ پھر کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ حیرت سے بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بھرا ہوا تھا؟“

یہ کہتے ہی وہ چھلانگ لگا کر بیڈ پر آئی پھر کروٹ بدلتے ہوئے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریوالور کو نکال لیا۔ وہ حیرانی سے بولا۔ ”او گاڈ! تم نے ایک اور گن چھپا رکھی تھی؟“

وہ بولی۔ ”میں سمجھ گئی۔ جب میں واش روم میں تھی تب تم نے یہاں آکر پستول کو خالی کر دیا تھا۔ ”میں اناڑی نہیں ہوں۔ یہ دیکھو کس طرح ہاری ہوئی بازی جیتنا جانتی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”جس کی کھوپڑی عقل سے خالی ہو، اس کے ہتھیار بھی گولیوں سے خالی ہوتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹ کر جانے لگا۔ اس نے پھر ایک ٹانگ کا نشانہ لے کر ٹریگر کو دبایا تو مارے حیرت کے منہ کھل گیا۔ دیدے پھیل گئے۔ اس نے پلٹ کر کہا۔ ”تم واقعی اناڑی نہیں ہو اور کہیں ہتھیار چھپا کر رکھا ہے تو اسے بھی نکالو۔“

اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر ریوالور کو ایک طرف پھینک دیا۔ پھر کہا۔ ”ہائے مراد! میں تمہاری اسی مردانگی پر اور ایسی تیزی و طراری پر مرتی ہوں۔

”دیکھو تم نے کیسے منوا لیا کہ محبت کے دوران عداوت نہیں ہوگی۔ کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔“

”ہاں مگر ہتھیار کے بغیر تم محبت کیسے کرو گی؟ اور مجھے محبت کرنے پر مجبور کیسے کرو گی؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”ہتھیار نہیں پھول پیش کروں گی۔ تم آپ ہی آپ کھنچے چلے آؤ گے۔“

اس نے ساڑی کے آنچل کو اِدھر سے اُدھر لہراتے ہوئے سینے سے ہٹایا تو بند کتاب کا پہلا ورق اُلٹ گیا۔ یہ مرد کے دماغ کو اُلٹانے کی ابتدا ہوتی ہے۔

پھر اس نے گھوم کر ساڑی کے ایک پلیٹ کو کھولا تو دھار مک تاریخ کا ایک ورق کھل گیا۔

مرینہ نے کیبرے ڈانس کے مطابق خود کو مختلف زاویوں سے پیش کرتے ہوئے کچھ ایسی ہی کوشش کر ڈالی۔ وہ ایسا نظارہ تھا کہ شرابی کے ہاتھ سے جام چھوٹ جاتا ہے۔

اس نے سحر زدہ سا ہو کر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر کہا۔ ”واقعی تم بھری ہوئی بندوق سے زیادہ خطرناک ہو۔ میں ہار جانا چاہتا ہوں۔ مگر یہاں نہیں وہاں۔۔۔“

اس نے فاتحانہ انداز میں پوچھا۔ ”کہاں۔۔۔؟“

”میں دلہن کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ دستور بھی یہی ہے۔ وہاں رت جگا مناؤں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”جہاں چاہو لے چلو۔ میں تمہاری اسیر ہو چکی ہوں۔“

وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے کمرے سے نکل کر باہر جانے لگا۔ وہ شعلوں کی طرح لپٹ کر بولی۔ ”ہائے جانی۔۔۔! کیا اسی طرح لے جاؤ گے؟“

”تم میری دلہن ہو۔ جیسے بھی لے جاؤں۔ میری مرضی۔۔۔“

بنگلے کے باہر مرینہ کی کار تھی۔ وہ اُدھر جانے لگا۔ وہ بولی۔ ”لوگ دیکھیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”نو پرابلم۔ کار کے شیشے چڑھے رہیں گے۔ کوئی جھانکنے نہیں آئے گا۔“

وہ اپنی تعریف سن کر نہال ہو رہی تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھول کر اسے اگلی سیٹ پر ڈال دیا۔ پھر دوسری طرف سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”رات کے دو بج رہے ہیں۔ کار ویران سڑکوں پر چلتی رہے گی۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔“

وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی کہ مراد اس کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ اسے دھوکا نہ دے رہا ہو۔ اس نے کہا۔ ”یہ مناسب نہیں ہے۔ دیکھو میں تم پر پوری طرح اعتماد کر رہی ہوں۔ آج دوستی کر لو۔ دشمنی بھول جاؤ۔“

”اگر تمہیں شبہ ہے کہ دشمنی کر رہا ہوں تو یہ قصہ یہیں ختم کرو۔ میں جا رہا ہوں۔“

وہ جانے کے انداز میں کار سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ اچانک اس سے لپٹ گئی۔ اسے اپنی طرف کھینچ کر بولی۔ ”مجھے بھروسا کرنا ہوگا۔ تم نے پہلی بار مجھے ہاتھ لگایا ہے۔ پہلی بار بازوؤں میں اٹھا کر سینے سے لگایا ہے، تم دوست بن رہے ہو۔“

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ چوکیدار دور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مالکن ایک اجنبی کے بازوؤں میں بے ڈھنگے انداز میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کار اسٹارٹ ہو کر گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے گیٹ کو پوری طرح کھول دیا۔

کار چوکیدار کے سامنے سے گزری۔ اندر لائٹ آن نہیں تھی۔ دو سائے ایک دوسرے میں گڈ مڈ نظر

آئے۔ چوکیدار نے کہا۔ "ہے رام! ان پر دیا کرو۔ دونوں نے خوب پی ہے۔ آگے کہیں حادثہ ضرور ہوگا۔"

مراد کو گائڈ کرنے والا دور اپنی کار کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی وہی تماشا دیکھا پھر اس کار کے پیچھے فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔

مرینہ کی یہی کوشش تھی کہ وہ پہلی بار شکنجے میں آرہا ہے تو حسن و شباب کی جادوگری سے اسے اچھی طرح جکڑ لے اور وہ اپنے تجربات کے مطابق طرح طرح سے جادو جگا رہی تھی۔ یہ بھول گئی تھی کہ کہاں ہے اور کہاں جارہی ہے؟ جب کار آہستہ آہستہ جھٹکے کھا کر رکنے لگی تو اس نے دیکھا وہ ایک ایسے علاقے میں آگئی تھی جہاں رات بھر چہل پہل رہتی ہے۔ کھانے پینے کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کہیں روشنی تھی۔ کہیں اندھیرا تھا۔

کار نیم تاریکی میں آکر رکی تھی۔ مرینہ نے سیٹ کے نیچے چھپتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کہاں لے آئے ہو؟"

"ہم یہاں رکنے نہیں آئے ہیں۔ گاڑی میں کوئی خرابی ہوگئی ہے میں ابھی ٹھیک کرتا ہوں تم چھپی رہو۔ ابھی چند منٹوں میں ہم آگے نکل جائیں گے۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ وہ سیٹ کے نیچے دبکی ہوئی اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس کا انتظار کرنے لگی۔ دس منٹ' بیس منٹ گزر گئے۔ وہ واپس نہیں آرہا تھا۔ اس نے ایک ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دکھائی نہیں دیا۔ تب سمجھ میں آیا کہ وہ دھوکا کھا چکی ہے۔ وہ اسے بیچ بازار میں مادرزاد چھوڑ کر گیا ہے۔ اب وہاں سے نکلنا تو دور کی بات ہے' وہ سر اٹھا کر سیٹ پر بھی بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ ابھی تو خیریت تھی' کوئی ادھر نہیں آیا تھا۔ لیکن کوئی بھی آسکتا تھا۔ شیشے کے باہر سے اندر جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ کوئی ایک دیکھتا تو پھر دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ وہ صرف وہیں تماشا نہ بنتی۔ دوسرے دن اخباروں میں بھی اس کی شرمناک تصویریں شائع ہوتیں۔

ایسے وقت وہ کسی سے کیا کہتی؟ اخبار والوں کو کیا بیان دیتی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔

پھر فون کی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ اس کے پاس اپنا فون نہیں تھا۔ لباس کے ساتھ اسے بھی بیڈ روم میں چھوڑ آئی تھی۔

اس نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ مراد اس کے لیے ہی اسے چھوڑ گیا تھا۔ اس نے فون کو وہاں سے اٹھا کر ننھی سی اسکرین پر مراد کا نام پڑھا تو فوراً بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر بولی۔ "مراد! یہ تم ہو؟"

وہ بولا۔ "ہاں' میں بول رہا ہوں۔ تم نے مجھے لوہے کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی تھیں۔ میں کہیں بھاگ نہیں سکتا تھا پھر بھی تمہاری گرفت سے نکل گیا۔"

"اب تم بھاگو۔ میں نے لوہا نہیں پہنایا ہے' تمہارے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے ہیں۔ بولو میری ان دیکھی زنجیروں سے کیسے نکل سکو گی؟ میری طرح زنجیریں توڑو۔"

وہ التجا کرنے لگی۔ "پلیز ایسی سزا نہ دو۔ یہاں کسی نے دیکھ لیا تو تماشا بن جاؤں گی۔ بھارتی جاسوسوں کی نظروں میں آؤں گی تو شامت آجائے گی۔"

"میں نے پچھلی بار تمہیں مرنے نہیں دیا تھا۔ اسپتال جانے کا موقع دیا تھا۔ اس بار بھی بچا لوں گا۔ وعدہ کرو' آئندہ کبھی مجھ سے دشمنی نہیں کروگی۔ کبھی میرے راستے میں نہیں آؤ گی۔"

"میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ کبھی تم سے دشمنی کا خیال تک دل میں نہیں لاؤں گی۔"

"وعدہ کرو میرا نام تک بھول جاؤ گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں' تمہارا نام بھی بھول جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ فون تمہارے لیے ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔ اپنے بناسپتی پتی کو فون کرو' وہ ابھی آکر تمہیں کپڑے پہنا کر لے جائے گا۔ میرے گائڈ نے مجھے بتایا ہے کہ اس وقت تم شانتی نگر کے بازار میں ہو۔"

اس نے فوراً ہی کیشو سے فون پر رابطہ کرکے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ فوراً آؤ..."

اس نے پوچھا۔ "کہاں آؤں؟"

"شانتی نگر میں جہاں ایک برگد کا درخت ہے۔ اس کے سائے میں تاریکی ہے۔ وہاں میری کار کھڑی ہے۔ جلدی آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی آرہا ہوں۔"

"اور سنو! میرے لیے کوئی ساڑی یا کوئی سا بھی لباس لے آؤ۔ جلدی آؤ۔ ورنہ یہاں کوئی آجائے گا۔"

"میں نکل رہا ہوں۔ لیکن اتنی رات کو کوئی دکان کھلی نہیں رہتی۔ کہیں سے لباس خرید نہیں سکوں گا۔ تم جس لباس میں ہو' اسی میں گھر چل کر بدل لینا۔"

وہ غصے سے بولی۔ "میں لباس میں نہیں ہوں۔ جلدی آؤ۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ تم تو میرے ساتھ ساڑھی پہن کر نکلی تھیں؟"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "مجھ سے بحث نہ کرو۔ اپنا ہی کوئی

لباس لے کر آؤ۔"

کیشو رات گزارنے کے لیے وہیں قریب ہی کسی ہوٹل میں تھا۔ وہ اپنی ایک پینٹ اور شرٹ لے کر بیس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ کار کے اندر ہی لباس پہنتے ہوئے مراد کو گالیاں دینے لگی۔ دل ہی دل میں یہ عہد کرنے لگی کہ آئندہ کسی کو پھانسنے کے لیے کبھی بے لباس نہیں ہوگی۔

☆☆☆

معروف جگی اور حماد صدیقی پریشان تھے۔ محبوب پر پھر دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ وہ کاروبار سے پھر غافل رہنے لگا تھا۔ سمیرا اب ماروی کے خلاف بولنے لگی تھی۔ صاف کہتی تھی کہ محبوب کو پاگل بنانے والی اور اس کے بزنس کو تباہی کی طرف لے جانے والی وہی ایک خوبصورت بلا ہے۔

وہ بلا نہیں رہے گی۔ مر جائے گی تو مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ محبوب صاحب بھی اس کی ابدی جدائی کا صدمہ برداشت کرلیں گے پھر وہ پہلے کی طرح اپنے بزنس کی طرف دھیان دینے لگیں گے اور یہ یقین تھا کہ وہ اپنی قربت سے اسے متاثر کرتی رہے گی۔

وہ تینوں محبوب سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اس کی بہتری کے لیے فیصلہ کیا کہ اب آر یا پار کسی ایک نتیجے پر پہنچنا چاہیے۔ مراد یا ماروی میں سے کسی کو ختم ہوجانا چاہیے۔ اگر مراد کی آخری سانسیں پوری ہوجائیں گی تو ماروی ایک نہ ایک دن ضرور محبوب کی ہوجائے گی۔ صرف ایک کی موت سے کئی مسائل حل ہوجائیں گے۔

سمیرا چاہتی تھی' ماروی کا قصہ تمام ہوجائے۔ معروف اور حماد چاہتے تھے' مراد کی دیوار گر جائے۔ محبوب کی زندگی میں ماروی آجائے گی تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا' وہ مسرتوں سے مالا مال رہے گا تو بزنس بھی خوب پھلتا پھولتا رہے گا۔

ان تینوں نے محبوب کی کوٹھی میں آکر اس سے ملاقات کی۔ اس نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ معروف نے کہا۔ "یہ تم کیسی زندگی گزار رہے ہو؟ اس طرح حالات کی مار کھا کر گوشہ نشین ہوجاؤ گے تو کیا ماروی تمہیں حاصل ہو جائے گی؟"

محبوب نے کہا۔ "وہ میرے مقدر میں نہیں ہے۔ مراد کے حق میں فیصلہ کرچکی ہے۔"

"بڑے بڑے فیصلے تبدیل ہوجاتے ہیں۔ ماروی نادان ہے۔ ہم اپنی حکمت عملی سے اس کا فیصلہ بدل دیں گے۔"

"آپ اس کی گردن پر چھری رکھ دیں تب بھی وہ مراد کا ہی کلمہ پڑھتی رہے گی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ فیصلہ تبدیل کرانے کے لیے گردن پر چھری رکھی جائے۔ ہم اپنی ذہانت سے اور چالاکی سے اسے تمہاری زندگی میں لے آئیں گے۔"

محبوب نے ان تینوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "بڑے یقین سے بول رہے ہیں۔ معلوم تو ہو آپ لوگ کیا سوچ کر آئے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

سمیرا نے کہا۔ "ہم نے بہت کچھ سوچا ہے۔ پہلے آپ یہ تسلیم کرلیں کہ آپ کی نیکیوں نے اور شرافت نے ماروی کو متاثر نہیں کیا ہے۔ آپ کی نیکیاں رائگاں گئی ہیں۔"

"آپ یہ تسلیم کرلیں کہ وہ احسان فراموش ہے۔ یہ لفظ 'ٹھکرانا' آپ کی شان کے خلاف ہے لیکن مجبوراً کہتی ہوں کہ اس نے مراد کی دلہن بننے کے لیے آپ کو ٹھکرا دیا ہے۔ یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ خدا کے لیے آپ کچھ تو اپنی توہین محسوس کریں۔"

محبوب نے کہا۔ "تم کیا سمجھتی ہو' میرے توہین محسوس کرنے سے وہ میری زندگی میں آجائے گی؟"

"آپ نیکی اور شرافت سے باز آجائیں گے تو اپنی توہین کا انتقام لے سکیں گے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ کیا میں ماروی سے انتقام لوں گا...؟ ہرگز نہیں... آئندہ ایسا خیال اپنے دماغ میں نہ لانا۔"

معروف نے کہا۔ "مراد...! انتقام اس طرح لو گے کہ ماروی کو ایک ذرا نقصان نہیں پہنچے گا۔"

اس نے معروف کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "دراصل مراد کے خلاف ایسی کارروائی کی جائے گی کہ وہ ماروی کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔"

"ایسی کیا کارروائی کی جائے گی؟"

سمیرا اور معروف نے حماد کو دیکھا۔ حماد نے کہا۔ "سر! یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وہ ایک خطرناک مجرم بن چکا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ عالی جناب جیسا قصائی سیاستداں اسے قتل کرانے کے لیے اپنے کئی شوٹرز کو اس کے پیچھے لگا چکا ہے۔"

"مراد کسی حال میں بچے گا نہیں۔ وہ انڈیا سے یہاں آئے گا تو اس بار اس کے شوٹرز اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

محبوب نے کہا۔ "کتنے ہی شوٹرز مارے جاچکے ہیں۔ لیکن کوئی اسے ایک گولی بھی نہ مار سکا۔"

حماد نے کہا۔ "اس بار اسے گولی لگے گی۔ وہ ہمیں اپنا سمجھتا ہے۔ میں اور میرے آدمی اسے گولی ماریں گے تو وہ

مقابلے کے بغیر دھوکے میں مارا جائے گا۔“

محبوب فوراً ہی کچھ نہ بول سکا۔ حماد کا اور معروف کا منہ تکنے لگا۔ معروف نے کہا۔ ”میں تمہارے مزاج کو سمجھتا ہوں، تم مراد کی ہلاکت نہیں چاہو گے۔ جب مراد کا مقدمہ کمزور ہوسکتا تھا، تم رقیب بن کر اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتے تھے۔ تب تم نے اس پر احسان کیا اور دیانت داری سے اس کا مقدمہ لڑتے رہے۔

”بولو، اس کا صلہ تمہیں کیا مل رہا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے، اب وہی مراد تمہیں اپنا رقیب کہہ رہا ہے۔

”وہ ایسا کہہ رہا ہے تو پھر رقیب بن کر دکھاؤ۔ تم ماروی کی خوشیاں چاہتے ہو۔ اسے اس کی دلہن بننے اور اسے تباہی سے بچانے سے روکنا کیا تمہارا فرض نہیں ہے؟“

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں، میں اسے ایک مجرم کی شریکِ حیات بننے نہیں دوں گا۔ وہ اس کی منکوحہ بننے کی غلطی کرنے والی ہے۔ میں اس کی بہتری چاہتا ہوں۔ آپ سب میری بہتری چاہتے ہیں تو کسی طرح مراد کو اس سے دور کر دینے کی تدبیر کریں۔ لیکن میں اس کی ہلاکت نہیں چاہوں گا۔“

معروف کچھ کہنا چاہتا تھا۔ محبوب نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا پھر کہا۔ ”میں اس حد تک راضی ہوں کہ مراد کا وجود ہمارے ملک میں ہمارے شہر میں نہ رہے۔ حماد۔۔۔! کوئی تدبیر کرو۔ اسے کسی طرح یہاں آنے سے روک دو مگر اسے ہلاک کرنے کی بات نہ کرو۔

”جب وہ مجھے رقیب کہتا ہے تو میں رقیب بن کر دکھاؤں گا۔ ماروی کو اس کی منکوحہ بننے نہیں دوں گا۔ بس یہ یاد رکھو کہ اس کی ہلاکت نہیں چاہوں گا۔“

ان تینوں نے ایک دوسرے کو کچھ بولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر معروف نے کہا۔ ”یہ ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ تم اس کی ہلاکت کبھی پسند نہیں کرو گے۔ تمہارے لیے بہت دور تک سوچنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم ایک اور تدبیر سوچ کر آئے ہیں۔“

محبوب کی خاموش نظروں نے پوچھا۔ ”وہ تدبیر کیا ہے؟“

حماد نے کہا۔ ”ہم ماروی کو مراد سے دور کر دیں گے۔ اسے رازداری سے ایسی جگہ پہنچا دیں گے جہاں صرف آپ ہی جا سکیں گے۔ مراد اسے زندگی بھر ڈھونڈتا رہ جائے گا۔“

محبوب نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”ماروی کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے اسے اغوا کرایا ہے تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔“

معروف نے کہا۔ ”ماروی کو کبھی معلوم نہیں ہوگا۔ ہم ایسا ڈراما پلے کریں گے کہ وہ تمہاری اور احسان مند ہوگی۔ اس کی سمجھ میں یہی آئے گا کہ تم اسے اغوا کرنے والوں کے شکنجے سے نکالنے کے لیے جان کی بازی لگا رہے ہو۔“

حماد نے کہا۔ ”ہمارے ذہن میں ایسی ٹھوس پلاننگ ہے کہ جس پر عمل کرتے رہنے سے وہ آپ کی منکوحہ بن جائے گی۔“

وہ بولا۔ ”ایسا ہو جائے تو میں آپ لوگوں کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں یہی چاہوں گا کہ مراد کے یہاں آنے سے پہلے ماروی اس سے دور ہو جائے لیکن یہ بتاؤ، وہ میری منکوحہ بننے کے لیے کیسے راضی ہوگی؟“

معروف نے کہا۔ ”ماروی کو معلوم ہوگا کہ تم اس کی رہائی کے لیے جان کی بازی لگا رہے ہو۔ پھر وہ دیکھے گی کہ دشمنوں نے تمہیں بھی پکڑ لیا ہے۔ تم بھی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہو اور تمہیں بھی اسی کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے جہاں وہ قیدی بنی ہوئی ہے۔“

حماد نے کہا۔ ”اس طرح آپ دن رات ماروی کے ساتھ ایک کمرے میں قیدی بن کر رہا کریں گے۔ وہ سمجھے گی کہ دشمنوں سے طویل مذاکرات ہو رہے ہیں۔ رہائی کی کوئی بات نہیں بن رہی ہے۔ اس ایک کمرے کے اندر ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے کہ وہ آپ کی ہو کر رہ جائے گی۔“

محبوب چشمِ تصور سے دیکھ رہا تھا کہ ماروی اس کی آغوش میں آ کر خود کو ہار رہی ہے۔ معروف نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

وہ خیالات سے چونک کر بولا۔ ”آں۔ ہاں، مجھے منظور ہے۔ اسی تدبیر پر عمل کیا جائے۔“

سمیرا محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کو دماغ کو چوٹ پہنچ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، اگر معروف اور حماد اس تدبیر پر کامیابی سے عمل کرتے رہیں گے تو محبوب نہ جانے کتنے دنوں کتنے ہفتوں اور کتنے مہینوں تک ماروی کے ساتھ بند کمرے میں رہے گا؟

سمیرا کے سینے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر تلملا رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ ’ماروی کو اغوا نہیں ہونا چاہیے۔ اغوا ہونے سے پہلے ہی اسے دوسری دنیا میں پہنچ جانا چاہیے۔‘

اس کے سوچنے سے ماروی دوسری دنیا میں نہ جاتی۔ کسی تدبیر پر عمل کرنے سے ہی بات بن سکتی تھی اور

اس کے ذہن میں ابھی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ فی الحال ایک عورت کی ضد تھی، حتمی فیصلہ تھا کہ کسی عورت کو اپنے مرد کے ساتھ بند کمرے میں رہنے نہیں دے گی اور ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جب عورت ضد پر آجاتی ہے تو بہت کچھ کر گزرتی ہے۔ وہ بھی کچھ کرنے والی تھی۔

حالات کے بدلنے میں اور بازی کے پلٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہاں بازی ایسی پلٹی تھی کہ جو دوست تھے، وہ دشمن ہوگئے تھے۔ سمیرا، ماروی کی دشمن ہوگئی تھی اور محبوب کسی حد تک مراد سے دشمنی پر آمادہ ہوگیا تھا۔ معروف اور حماد طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہے تھے اور کسی تدبیر پر عمل کرنے والے تھے۔

ایک سوچ یہ تھی کہ مراد کو قتل کردیا جائے۔

دوسری سوچ یہ تھی کہ ماروی کو اغوا کیا جائے۔

اور تیسری سوچ سمیرا کی تھی کہ ماروی کو ہی ختم کر دے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی محبت کی بانسری۔

لیکن یہ سب کیا تھا؟ محض تدبیریں ہی تدبیریں تھیں۔ ان کے پاس دولت تھی، طاقت تھی، مضبوط ذرائع تھے، وہ اپنی ہر تدبیر پر عمل کر سکتے تھے۔

لیکن تقدیر کیا چاہتی تھی؟

☆☆☆

مراد کے دن رات مختلف علاقوں کی سڑکوں اور گلیوں میں گزر رہے تھے۔ وہ پرانی دہلی اور نئی دہلی کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ طرح طرح کے لوگوں سے مل رہا تھا۔ ہندی زبان بول کر ان کے ساتھ گھل مل رہا تھا۔

ماسٹر کو بوبو تک رپورٹ پہنچ رہی تھی کہ وہ بڑی کامیابی سے ہندوستانی شہری بنتا جا رہا ہے۔ اب بھارتی جاسوس اس پر شبہ نہیں کریں گے اور نہ ہی یہ سمجھ سکیں گے کہ وہ پاکستانی ہے اور سنڈیکیٹ دی ماسٹرز کا ایک سیکرٹ ایجنٹ ہے۔

ماسٹر نے مراد سے کہا۔ ”تم بڑی توجہ اور بڑی لگن سے وہاں کے ماحول میں ڈھل رہے ہو۔ میں نے کہا تھا کہ تمہیں ایک بہت اہم پروجیکٹ میں آزمایا جائے گا۔ تم کامیاب رہو گے تو واپس پاکستان جاسکو گے۔“

”مجھے پاکستان جانا ہے۔ میں جی جان سے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ پروجیکٹ کیا ہے؟“

”جگ دیو دہلی پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہیں تمام تفصیل بتائے گا۔“

اسی شام جگ دیو نے دہلی آکر مراد سے ملاقات کی۔ اسے بتایا کہ ہمارے ماسٹر کو بوبو کا دشمن، سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ، کا سربراہ میکی البرٹ یہاں آیا ہوا ہے۔ ہمارا ماسٹر چاہتا ہے وہ اپنے مشن میں ناکام رہے۔ جو حاصل کرنے آیا ہے، وہ حاصل نہ کر سکے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”گیم کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”بھارت اور اسرائیل کے تعلقات مستحکم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی اس خفیہ معاہدے سے ہے جو ان دو ملکوں کے درمیان ہوا ہے۔

”ریڈ الرٹ کا میکی البرٹ اس خفیہ معاہدے کی سیکرٹ فائل حاصل کرنے آیا ہے اور ہم وہ فائل ان کے ہاتھوں میں پہنچنے نہیں دیں گے۔ اسے ہم حاصل کریں گے۔“

”اسے حاصل کرنے کا راستہ کہاں سے ملے گا؟ میں میکی البرٹ اور اس کے آدمیوں کو کیسے پہچانوں گا؟“

”مرینہ میکی البرٹ کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ وہ میکی سے اور اس کے آدمیوں سے ٹکرائے گی۔ تم دور سے اس کی نگرانی کرو گے اور دشمنوں کو ٹھکانے لگاؤ گے۔“

”میکی البرٹ وہ سیکرٹ فائل کیسے حاصل کرے گا؟“

”وہ اس فائل کی مائیکرو فلم حاصل کرے گا۔ آج رات ریکارڈ روم کا ایک انچارج، پرانا مندر، میں آکر میکی البرٹ کو وہ فلم دے گا۔ مرینہ وہیں ان پر حملہ کرے گی۔“

مراد پرانی دہلی کے ایک علاقے میں اس پرانے مندر کو دیکھ چکا تھا۔ دہلی شہر سے بیس میل دور ایک چھوٹی سی بستی میں وہ صدیوں پرانا مندر تھا۔

ماسٹر کو بوبو نے مراد کو یہ حقیقت بتائی تھی کہ پاکستان میں اس پر جو جان لیوا حملے ہوتے رہے ہیں، وہ دراصل میکی البرٹ کے حکم سے ہی ہوتے رہے ہیں۔

اس طرح مراد کو معلوم ہوا کہ اس کا اصل دشمن میکی البرٹ ہے اور عالی جناب پاکستان میں اس کا ایک ایجنٹ ہے۔ مراد نے بلے کو عالی جناب کے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس نے کراچی پہنچ کر ماروی سے ملاقات کی تھی۔ اس سے پانچ لاکھ روپے لیے تھے اور کرائے کے دو شوٹرز کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ بڑی تندہی سے کام کر رہا تھا۔ کسی ایسے موقع کا انتظار کر رہا تھا کہ عالی جناب کبھی چار دیواری کے باہر کمزور سیکیورٹی کے سائے میں نظر آجائے پھر اسے زندہ نہیں جانے دے گا۔

ادھر مراد اس رات اپنے اصل دشمن میکی سے ٹکرانے والا تھا اور وہ ایک ہی دشمن نہیں ہوگا۔ وہاں دوسری دشمن مرینہ ہوگی۔ مراد اسے برہنہ کرکے بیچ بازار میں لے گیا تھا۔ وہ اپنی انسلٹ پر غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ ایسی جھنجلائی ہوئی تھی کہ اسے دیکھتے ہی اس پر گولیاں برسانا شروع کردیتی۔

ایک جان تھی اور جان سے کھیلنے والے کئی تھے۔ کیا نصیب تھے۔ وہ یہاں سے بچ کر ماروی کے پاس جاتا تو وہاں بھی موت اسے خوش آمدید کہنے والی تھی۔ معروف تجلی اور حماد صدیقی نے بڑی رازداری سے یہ طے کیا تھا کہ ماروی کو اغوا نہیں کیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہی مراد کو اوپر پہنچا دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ عالی جناب کے شوٹرز نے اسے ہلاک کیا ہے۔ اس طرح ماروی، مراد اور محبوب کا جھگڑا ایک ہی دن میں ختم ہو جاتا۔ ان تینوں کے تمام مسائل ایک ہی گولی سے حل ہو جاتے۔

مراد بڑی ذہانت اور حاضر دماغی سے جانی انجانی عداوتوں کو جھیل رہا تھا۔ اس کے باوجود اپنوں کی سازشوں سے بے خبر تھا اور بے خبری میں ہی اس کی شامت آنے والی تھی۔ حالات ایسے تھے کہ وہ ذہنی طور پر الجھا رہتا تھا۔ اس رات میکی البرٹ اور مرینہ سے نمٹنا تھا اور وہ خوش بھی تھا، ان سے نمٹنے کے بعد ایک دو روز میں پاکستان جاسکتا تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے ماروی مسکرا رہی تھی۔ وہ اسے خوش خبری سنانا چاہتا تھا کہ دو چار دنوں میں ہی اس کے پاس آنے والا ہے۔ دل کہہ رہا تھا اس سے خوب باتیں کی جائیں لیکن اس نے دل کو سمجھایا کہ آج رات جن خطرات سے نمٹنا ہے، ان پر پہلے توجہ دی جائے۔

اس نے اپنے جاسوس بھنڈاری کو بلایا۔ جب وہ آیا تو اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر پرانا مندر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”وہاں آج رات مجھے دشمنوں سے نمٹنا ہے۔“

بھنڈاری نے پوچھا۔ ”دشمن کتنے ہوں گے؟“

”ایک اندازہ ہے کہ دو، چار یا چھ ہوں گے۔ وہ ایک خفیہ معاملے میں ایک دوسرے سے ملنے والے ہیں۔ چونکہ معاملہ بہت ہی خفیہ ہے اس لیے ان کی تعداد کم ہوگی، صرف رازداری برتنے والے وہاں ہوں گے۔“

بھنڈاری نے پوچھا۔ ”دشمن کس سطح کے لوگ ہیں؟ کیا وہ بھاری اسلحہ استعمال کریں گے؟“

”وہ عالمی سطح کے مجرم ہیں۔ رات کے سائے میں شور مچانے والے ہتھیار استعمال نہیں کریں گے۔ ان کے پاس سائلنسر لگا ہوا اسلحہ ہوگا۔“

”کیا آپ کو ان کے معاملات کا پتا ہے؟“

”معاملات کچھ بھی ہوں۔ وہ دونوں میرے دشمن ہیں اور میں انہیں وہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔“

اس نے پرانا مندر کے سامنے پہنچ کر کار روک دی۔ شام کا وقت تھا۔ ابھی دن کی روشنی تھی۔ وہاں ایک گاڑی رکتے دیکھ کر ایک پجاری اس کھنڈر کے کسی حصے سے نکل کر آیا۔

وہاں سے گزرنے والے اسے نقدی کی صورت میں دان دکشنا دے کر جاتے تھے۔ مراد نے اسے سو سو کے پانچ نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پانچ ہزار بھی مل سکتے ہیں۔ ہمیں اس مندر کے اندر چھپنے اور بھاگنے کے راستے دکھاؤ۔“

پجاری نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ آپ پولیس والے ہیں یا پھر پولیس سے بھاگنے والوں میں سے ہیں۔“

بھنڈاری نے کہا۔ ”ہم پولیس سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے تمہیں پانچ ہزار دیں گے۔“

”تو پھر میرے پیچھے آئیں اور مندر کو اندر سے دیکھیں۔“

وہ اس کے پیچھے چلنے لگے۔ اندر تاریکی تھی۔ دن کا اجالا وہاں تک نہیں پہنچتا تھا۔ پجاری نے چارجر لائٹ آن کرلی پھر ایک گائیڈ کی طرح بولتے ہوئے ان کے آگے آگے جانے لگا۔ ”اس مندر کے پیچھے اور دائیں بائیں تین دروازے ہیں۔ پولیس ایک طرف سے آئے تو آپ دوسرے تیسرے دروازے سے نکل سکتے ہیں۔“

مندر کے اندر کئی کمرے اور راہداریاں تھیں۔ راہداریاں بھول بھلیوں کی طرح گھومتی ہوئی اور ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی گزرتی تھیں، جو ایک ایک راہداری کو یاد رکھتے ہوئے نہ گزرتا، وہ اس مندر کے اندر بھٹکتا رہ جاتا۔ یوں بھاگنے والا کوئی دشمن گھوم پھر کر پھر دوسرے دشمنوں کے سامنے پہنچ جاتا۔

پجاری نے کہا۔ ”چوری کرنے اور ڈاکا ڈالنے والے یہاں مال چھپانے اور خود چھپنے آتے ہیں۔ کچھ چھپنے میں اور فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ راہداری کی بھول بھلیوں میں مارے جاتے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ایسے وقت تم کہاں ہوتے ہو؟“

”میں تو رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ قریب ہی دو کوس پر میرا مکان ہے۔ وہاں بستر پر پڑا گولیاں چلنے کی آوازیں سنتا رہتا ہوں۔“

وہ مندر سے باہر آگئے۔ باہر پوجا گھر میں بھگوان شری کرشن کی بڑی سی مورتی تھی۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا آج یا کل یہاں کوئی آیا تھا؟“

”روز کتنے ہی آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”کوئی انگریز آیا تھا؟“

”ہاں ایک انگریز آیا تھا۔اس نے مجھے دو سو ڈالرز دیے تھے۔اس نے بھی مندر کے اندر آ کر خوب گھوم پھر کر دیکھا تھا۔کئی جگہ کی تصویریں اتار کر لے گیا تھا۔“

مراد نے اسے پانچ ہزار دیتے ہوئے کہا۔”میں ایک عورت کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔وہ خوبصورت ہے اور اس کا قد لمبا ہے۔اس کے ماتھے پر زخم کا نشان ہے کیا ایسی کوئی عورت آئی تھی؟“

”ہاں آج صبح آئی تھی۔اس نے بھی مندر کو اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا تھا۔اس عورت نے اور اس انگریز نے یہ پوچھا تھا کہ میں الجھی ہوئی راہداریوں کو کیسے یاد رکھتا ہوں؟“

مراد نے کہا۔”ہاں، میں بھی یہی پوچھتا ہوں۔تم نے یاد رکھنے کے لیے ہر راہداری کے موڑ پر کوئی نشانی رکھی ہوگی؟“

وہ بولا۔”کوئی نشانی نہیں رکھی ہے۔آپ پھر وہاں چل کر دیکھ لیں۔میں یہاں پچیس برس سے ہوں۔مجھے آپ ہی آپ ان راہداریوں سے گزرنا آ گیا ہے۔“

بھنڈاری نے کہا۔”کوئی خفیہ نشانی ہوگی تو ہماری سمجھ میں نہیں آئے گی۔اگر ہے تو ہمیں بتا دو۔تمہیں اور زیادہ نوٹ دیں گے۔ہم یہاں بھٹکنا نہیں چاہتے۔“

وہ بولا۔”نوٹ ملتے رہیں تو لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔میں سچ کہتا ہوں۔راہداریوں کو یاد رکھنے کی کوئی خاص نشانی نہیں ہے۔جس کی یادداشت غیر معمولی ہوتی ہے، وہی بھول بھلیوں سے گزر جاتا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ۔کیا اس عورت نے اور انگریز نے کہا تھا کہ پھر یہاں آئیں گے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی مگر میں لوگوں کے ارادوں کو ان کی باتوں سے سمجھ لیتا ہوں، وہ آج یا کل پھر ادھر آئیں گے۔میں نہیں جانتا، آپ بھی یہاں کس لیے آئے ہیں۔میں جان کر کروں گا بھی کیا۔مجھے نقد نارائن (رقم) مل جاتا ہے۔یہی بہت ہے۔اب میں جا رہا ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہہ کر چلا گیا۔مراد نے بھنڈاری سے کہا۔”اندھیرا ہو چکا ہے۔پتا نہیں میکی اور مرینہ یہاں کب آئیں گے۔میں یہاں چھپا رہوں گا۔تم میری کار لے کر جاؤ اور کرائے کے دو شوٹرز کو مندر کے پیچھے لے آؤ۔پیچھے اور دائیں بائیں تین دروازے فرار ہونے کے لیے ہیں۔آج رات ان دروازوں سے جو بھی نکلے اسے گولی مارنا ہے۔“

”آپ کو بھی وہاں سے فرار ہونا پڑا تو...؟“

”مجھے ان دروازوں سے نکلنا پڑا تو میں نکلنے سے پہلے فون پر تمہیں اطلاع دوں گا۔“

بھنڈاری کار کی چابی لے کر چلا گیا۔مراد نے اپنے فون کو سائلنٹ کر دیا تاکہ رنگ ٹون یا میسج کی ٹون سنائی نہ دے۔پھر فون کی ٹارچ روشن کر کے شری کرشن جی کی بڑی سی مورتی کے پاس آ گیا۔اس کے پیچھے چھپنے کی جگہ تھی۔اوپر چھت کے نیچے مچان بھی تھا۔وہ اس مچان پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

یہ تو میکی البرٹ اور ریکارڈ روم کے انچارج کو بھی معلوم تھا کہ وہ کب وہاں آئیں گے۔ان کے پیچھے مرینہ آنے والی تھی۔وہ ان تینوں کا انتظار کرنے لگا۔

ایک گھنٹا گزر گیا پھر دو گھنٹے گزر گئے۔وہ بیزار ہو رہا تھا۔بھنڈاری نے فون پر میسج کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ شوٹرز کے ساتھ مندر کے پیچھے پہنچ گیا ہے۔ادھر کے تینوں دروازے ان کی نظروں میں ہیں۔کوئی وہاں سے فرار نہیں ہوگا۔پھر اس نے آدھے گھنٹے بعد اطلاع دی کہ ایک کار مندر سے کچھ فاصلے پر آ کر رُکی ہے اور ایک شخص کار سے نکل کر بڑے محتاط انداز میں مندر کی طرف جا رہا ہے۔

مراد نے مچان سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ایک شخص ٹارچ کی روشنی میں چلتا ہوا مورتی کے پاس آ کر رک گیا تھا۔ادھر ادھر روشنی پھینکتے ہوئے اطمینان کر رہا تھا کہ وہاں اور کوئی نہیں ہے۔

پھر اس نے فون پر کہا۔”ہیلو میکی صاحب! میں واسو دیو بول رہا ہوں، مندر میں آ گیا ہوں ادھر کوئی نہیں ہے آپ کتنی دیر میں آ رہے ہیں؟“

دوسری طرف سے میکی البرٹ نے کہا۔”میں قریب ہی ہوں، دس منٹ میں آ رہا ہوں۔“

دس منٹ بعد بھنڈاری نے مراد کو اطلاع دی۔”ایک اور گاڑی پہلی والی کار کے قریب آ کر رُکی ہے۔اس میں سے دو شخص نکل کر مندر کی طرف گئے ہیں۔“

مراد مچان سے دیکھ رہا تھا۔ایک ادھیڑ عمر کا انگریز ایک ہندوستانی گن مین کے ساتھ آیا تھا۔مراد نے اندازہ لگایا کہ وہ انگریز میکی البرٹ ہے۔اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔

پھر واسو دیو نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کا نام لیا۔”ویل مسٹر میکی! میں اس فائل کی مائیکرو فلم لے آیا

ہوں۔آپ بھی وعدے کے مطابق پوری رقم لے آئے ہوں گے؟“

ایک بڑے سے چبوترے پر شری کرشن جی کی مورتی کھڑی تھی۔میکی نے اس چبوترے پر بریف کیس کو رکھ کر کھولا۔اس میں امریکی ڈالرز کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔

میکی نے کہا۔”یہ تمہاری انڈین کرنسی کے مطابق پورے دو کروڑ روپے ہیں۔“

واسو دیو نے اپنے کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر صدری کی جیب سے ایک مائیکرو فلم نکالی پھر اس کی طرف بڑھائی۔میکی نے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ایسے ہی وقت ایک فائر کی آواز گونجی۔گولی میکی کے ہاتھ میں لگی۔مائیکرو فلم ہاتھ سے نکل کر چبوترے پر لڑھکتی ہوئی کرشن جی کے چرنوں میں آ کر رُک گئی۔

ان کے سنبھلنے سے پہلے دوسری گولی نے میکی کے گن مین کو پھرتی دکھانے کا موقع نہیں دیا۔اسے ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔وہ دونوں ٹارچ بجھا کر چھپنے کے لیے ادھر ادھر ہو گئے۔

پتا نہیں مرینہ کیسے وہاں پہنچی تھی۔بھنڈاری اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔وہ بہت دور سے پیدل چلتی ہوئی چھپتی ہوئی آئی ہوگی۔مندر کی تاریکی میں اس کی آواز ابھری۔”میکی البرٹ! مجھے آواز سے پہچانو۔میں نے مراد کو تمہارے ہتھے چڑھنے نہیں دیا۔اسے پاکستان سے یہاں لے آئی ہوں۔یہ مائیکرو فلم بھی یہاں سے لے جاؤں گی۔“

تاریکی سے میکی کی آواز ابھری۔”مرینہ! میں نے تمہاری خدمات حاصل کرنے سے انکار کر کے غلطی کی تھی۔میں مانتا ہوں تم جرائم کی دنیا کی زبردست کھلاڑی ہو۔آؤ سمجھوتا کرو۔دوستی کرو۔میں تمہاری تمام شرائط مان لوں گا۔یہاں میرے معاملے میں مداخلت نہ کرو۔پلیز مجھے نقصان نہ پہنچاؤ۔میں تمہیں منہ مانگی پیمنٹ کروں گا۔“

”یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں تمہارے جانی دشمن ماسٹر کو بو بو کے لیے کام کر رہی ہوں۔جب تک اس سے کوئی شکایت نہیں ہوگی تب تک اسے چھوڑ کر تمہاری طرف نہیں آؤں گی۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی مرینہ کے قریب سے گزری۔میکی نے آواز کی سمت فائر کیا تھا۔وہ فرش پر گھٹنوں کے بل جھک گئی۔

پھر میکی کی آواز ابھری۔”مرینہ! میں یہاں ہوں۔“

وہ بڑی منجھی ہوئی کھلاڑی تھی۔سمجھ گئی تھی کہ اپنی آواز سناتے ہی وہ دائیں یا بائیں چھپنے کے لیے جائے گا۔اس نے اسی اندازے سے آواز کی سمت سے بائیں طرف گولی چلائی تو میکی کے حلق سے کراہ نکلی۔دھپ سے فرش پر گرنے کی آواز آئی۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مر گیا یا زخمی ہوا تھا۔مرینہ فرش پر اوندھی لیٹ گئی تھی اور بڑے محتاط انداز میں رینگتی ہوئی ادھر جا رہی تھی جدھر سے اس کے گرنے کی آواز آئی تھی۔

مراد بڑی آہستگی سے آواز پیدا کیے بغیر مچان سے اتر گیا۔ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا مورتی کے پاس آ گیا۔

میکی اور واسو دیو نے ٹارچ روشن کی تھی تب اس نے اندھیرا ہونے سے پہلے مائیکرو فلم کو لڑھکتے ہوئے کرشن جی کے چرنوں کی طرف آتے دیکھا تھا۔

وہ اسے حاصل کرنے کے لیے مورتی کے پیچھے آ گیا۔وہاں سے ہاتھ بڑھا کر مورتی کے قدموں کے پاس اندھے کی طرح ٹٹولنے لگا۔اسے تلاش کرنے لگا۔

ایسے ہی وقت اس کا ہاتھ ایک زنانہ ہاتھ سے ٹکرایا۔

وہ ہاتھ اور کس کا ہو سکتا تھا؟

وہ سمجھ گیا۔مرینہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پھر ایک بار سنگدل یار، ظالم دلدار سے ٹکرا رہی ہے۔اس نے سوچا ”یہ کون ہے؟ کہاں سے آ گیا ہے؟ ٹکرانے سے پتا چل رہا ہے، ہاتھ پتھر کی طرح مضبوط ہے۔میں اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ نہیں سکوں گی۔میرے ایک ہاتھ میں ریوالور ہے۔“

مراد نے ایک ہاتھ سے اسے پکڑ لیا۔دوسرے ہاتھ سے مائیکرو فلم کو تلاش کرنے لگا۔آخر وہ مل گئی۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔وہ گولی چلانا نہیں چاہتی تھی، یہ اندیشہ تھا کہ میکی زندہ ہوگا تو اس پر فائر کرے گا۔

وہ منہ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔تاریکی میں گولیاں آواز کی سمت ہی آتی ہیں۔ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ ہاتھ پکڑنے والے پر گولی چلا کر فوراً فرش پر لیٹ جائے۔

ایسا کرنے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔مطلوبہ چیز ہاتھ آ گئی تھی۔پھر اسے پکڑ کر کیوں رکھتا؟

اس نے اندازے سے سامنے دو فائر کیے پھر فرش پر لیٹ گئی لیکن کسی کی کراہ سنائی نہیں دی۔دو گولیوں نے کسی طرح کی ہلچل پیدا نہیں کی تھی۔

اس کا اندیشہ درست تھا کہ میکی زندہ ہوگا کیونکہ اس

کی فائرنگ کے جواب میں دور تاریکی سے ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کی طرف آئی تھی۔

اب وہ مائیکروفلم کو ڈھونڈنے کے لیے وہاں ٹھہر نہیں سکتی تھی۔فرش پر اوندھے منہ لیٹ کر رینگتی ہوئی مورتی اور چبوترے سے دور جانے لگی۔

واسو دیو کو دو کروڑ روپے کی فکر تھی۔بریف کیس چبوترے پر کہیں پڑا تھا۔وہ بھی اوندھے منہ فرش پر رینگتا ہوا آرہا تھا۔پھر اس نے چبوترے کے پاس پہنچ کر گھٹنے کے بل اٹھ کر ادھر ادھر ٹٹولا تو وہ ہاتھ میں آگیا لیکن اسے اپنی طرف کھینچتے وقت آواز پیدا ہوگئی۔مرینہ اوندھے منہ تھی اس نے پلٹ کر آواز کی سمت گولی چلائی۔کہیں میکی کی طرف سے بھی گولی چلی کسی کی گولی تو لگنی ہی تھی۔وہ حلق پھاڑ کر چیختا ہوا ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

مرینہ کی گولی میکی کے ایک بازو میں لگی تھی۔زخم گہرا نہیں تھا۔وہ مردانہ وار تکلیف برداشت کر رہا تھا۔اس کے لیے اور مرینہ کے لیے مائیکروفلم زیادہ اہم تھی۔

ان کا خیال تھا کہ وہ ابھی تک بھگوان کے چرنوں میں پڑی ہوئی ہے۔اسی لیے وہ دونوں اس مورتی اور چبوترے سے دور نہیں جا رہے تھے۔اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اُدھر کسی کے لیے بھی موت ہے۔مرینہ نے اندازہ لگایا کہ اس نے ابھی واسو دیو کو ہلاک کرنے کے لیے کس جگہ سے گولی چلائی تھی۔وہ اس سمت تڑاتڑ چار گولیاں چلاتی ہوئی فرش پر لڑھکتی ہوئی دور چلی آئی۔اس کا اندازہ درست تھا۔گولیاں میکی کی سمت گئی تھیں۔وہ اندھیرے میں اچھل کر ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔گولیوں سے بچ گیا لیکن سخت چوٹیں آئیں۔ہڈیاں دُکھنے لگیں۔وہ چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلتا ہوا مندر کے اندرونی کمروں اور راہداریوں کی طرف چلا آیا۔تاریکی میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں سے کہاں آگیا ہے۔وہ دن کے اجالے میں وہاں کی بھول بھلیوں کو دیکھ چکا تھا۔عقل نے سمجھایا کہ اندھیرے میں اندھوں کی طرح آگے جائے گا تو راہداریوں کے جال سے نکل نہیں پائے گا۔

وہ ایک طرف گھوم کر جانے لگا۔یہ اندازہ تھا کہ واپس آرہا ہے لیکن وہ ایک راہداری سے نکل کر دوسری راہداری میں چلا گیا تھا۔جب تک ٹارچ روشن نہ کرتا گمراہی کا علم نہ ہوتا اور وہ ٹارچ روشن کر کے موت کو بلانا نہیں چاہتا تھا۔

وہاں سب مجبور تھے۔کوئی اپنی ٹارچ روشن نہیں کر سکتا تھا۔مرینہ فرش پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی انتظار کر رہی تھی کہ میکی کی طرف سے کوئی آہٹ ملے گی اور یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ چبوترے کے پاس مورتی کے پیچھے کون تھا؟ گولیاں چلانے والے سب ہی مورتی کے آگے تھے۔پیچھے بہت کم جگہ تھی۔وہاں ضرور کوئی پہلے سے چھپا ہوا تھا۔

پھر اس نے سوچا کوئی بھی چھپا ہو' سب نے دو گولیاں چلائی تھیں۔اب وہ وہاں رہنے کی جرأت نہیں کرے گا۔وہاں سے بھاگ گیا ہوگا۔

اس نے حوصلے سے سوچا۔"مجھے ہر حال میں وہ مائیکروفلم وہاں سے اٹھانی ہے پھر اس چبوترے کی طرف جانا ہی ہوگا۔"

وہ سر اٹھا کر تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ابھی بڑی دور تک فرش پر رینگتی اور لڑھکتی آئی تھی۔اب اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ چبوترہ کدھر ہے؟ کسی سمت تو جانا ہی تھا۔تاریکی میں بھٹکتے رہنے کے بعد ہی چبوترے تک پہنچ سکتی تھی۔وہ اندازے کے مطابق ایک سمت آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر رینگنے لگی۔

مراد بھی بھٹک گیا تھا۔مائیکروفلم تو حاصل ہوگئی تھی لیکن دو کروڑ کا بریف کیس حاصل کرنے سے پہلے مرینہ نے گولی چلائی تھی۔اسے فرش پر گر کر وہاں سے رینگتے ہوئے دور جانا پڑا تھا۔اب وہ ایک جگہ رک کر سوچ رہا تھا کہ کہاں پہنچا ہوا ہے؟

کہیں سے گولی چلے' کسی کی آہٹ ہو تو معلوم ہو کہ کون کہاں ہے؟ سب ہی کے لیے وہ چبوترہ اہم تھا۔سب ہی وہاں جانا چاہتے تھے لیکن کوئی اُدھر نہیں پہنچ رہا تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور دور تک ایسی خاموشی تھی جیسے وہاں سے سب جا چکے ہوں لیکن ان میں سے کوئی خود کو وہاں تنہا سمجھ کر دھوکا کھانے والا نہیں تھا۔اس لیے سب ہی موت کی طرح خاموش تھے لیکن آہستہ آہستہ متحرک تھے۔مراد بھی اندازے سے ایک سمت بڑھتا جا رہا تھا۔فرش پر چاروں ہاتھ پاؤں ٹیک کر گھوڑے کی طرح رک رک کر کسی کی آہٹ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ایسے ہی وقت بالکل قریب ہی سانسوں کا بھپکا سا آیا تو وہ ٹھٹک گیا۔کوئی اچانک ہی بالکل قریب آگیا تھا۔

وہ بھی گھوڑی بن کر چلی آرہی تھی۔اسی کی سانسوں کا بھپکا اس کے منہ پر لگا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ اپنا ریوالور استعمال کرتی' مراد نے اسے دبوچ لیا۔وہ چاروں شانے چت ہوگئی تھی۔چند ساعتوں کے لیے بوکھلا گئی تھی۔کیونکہ

اس پر ایک پہاڑ آن پڑا تھا۔

وہ ایسا ہی بھاری بھرکم تھا۔پتا نہیں کون تھا؟

ان لمحات میں اسے مراد یاد آیا۔وہ سنگدل یار کو محسوس کر رہی تھی لیکن یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مراد کو اس خفیہ معاملے کی خبر ہوگی۔اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس مندر میں آسکتا ہے۔

ابھی تو وہ اس حاوی ہونے والے سے نجات پانا چاہتی تھی۔وہ ایسے سوار ہوگیا تھا جیسے باپ کا مال ہو۔ایک ذرا ہٹائے نہیں ہٹ رہا تھا۔اتنی پریشانی میں بھی اسے کچھ ہونے لگا تھا۔

مراد کا ایک ہاتھ اس کی تھوڑی کے نیچے حلق پر تھا۔سانس لینا دوبھر ہوگیا تھا۔اسے یوں کمزور بنا کر اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ریوالور چھین لیا۔

ایسی چھینا جھپٹی کے دوران آوازیں ابھر رہی تھیں۔وہ ہانپ رہی تھی۔اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے کراہ رہی تھی۔اس طرح یہ بات سمجھ میں آئی کہ میکی آس پاس نہیں ہے۔اگر ہوتا تو گولی ضرور چلتی۔شاید فرار ہوگیا ہے۔

مرینہ نے سوچا۔"کیا وہ مائیکروفلم لے گیا ہے؟"

وہ آزادی کے لیے تڑپتی ہوئی بولی۔"کون ہو تم؟ مجھے جانے دو۔میکی وہ فلم لے جائے گا۔"

سچ تو یہ ہے کہ اسے بھی کچھ ہو رہا تھا۔وہ اسے جھلکوں کے بغیر دیکھ چکا تھا۔ان شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔وہ دشمنی کے باوجود تاریکی میں اچھی لگ رہی تھی۔جو کچھ روشنی میں دیکھ چکا تھا' وہ تاریکی میں روشن ہو رہا تھا اور اسے بہکا رہا تھا۔

وہ ڈھیلی پڑ گئی۔اس نے رہائی کی کوشش ترک کر دی۔شکست خوردہ سی ہو کر ہانپتی کانپتی ہوئی بولی۔"یہ...یہ تم ہو...مراد...!تم ہونا...؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔جذبات اسے بھی جھنجوڑ رہے تھے۔وہ پھسلنے سے پہلے سنبھل گیا۔اسے چھوڑ کر چاروں ہاتھوں پاؤں سے رینگتا ہوا دور جانے لگا۔مرینہ نے اپنی ایک جانگھ کے ساتھ ایک پستول باندھ رکھا تھا۔اس نے ریوالور سے محروم ہونے کے بعد پستول نکال لیا۔

اس نے فائرنگ کرنے کی غلطی نہیں کی۔اتنی عقل تھی کہ وہ ٹکرانے والا اجنبی اس کے ریوالور سے اسی پر گولیاں چلائے گا۔

وہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس وقت تاریکی میں کہاں ہے؟ وہ چبوترے کی طرف پھر اندازے سے کروٹیں لیتی ہوئی بڑھنے لگی۔ایسے وقت وہ ایک دیوار سے ٹکرائی پھر وہاں سے ہٹ کر دائیں طرف چند قدم چل کر آئی تو دوسری دیوار سے ٹکرا گئی۔تب پتا چلا کہ وہ ایک راہداری میں آگئی ہے۔اسے واپس جانا چاہیے۔

وہ واپس بھی نہ جا سکی' مراد نے کہیں سے چھپ کر دو فائر کیے تو وہ دیوار کے سہارے تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی دوسری راہداری میں پہنچ گئی۔اب اسے آگے بھٹکتے ہی رہنا تھا۔شاید صبح تک بھٹکتے رہنے کے بعد وہ کسی دوسرے تیسرے دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔

مراد وہاں آدھے گھنٹے تک ایک ستون کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔پھر اس نے ٹارچ روشن کی تو پتا چلا کہ وہ ایک راہداری کے قریب کھڑا ہے۔اگر آگے بڑھتا جاتا تو میکی اور مرینہ کی طرح راہداریوں کے جال میں پھنس کر رہ جاتا۔

اس کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ مرینہ اور میکی اس جال میں پھنس گئے ہیں۔وہ نہ تو ٹارچ روشن کر سکیں گے اور نہ ہی فون پر کسی کو مدد کے لیے کال کر سکیں گے'یہی دھڑکا رہے گا کہ ان کی آواز پر کہیں سے کوئی گولی آجائے گی۔

مراد نے اور پندرہ منٹ تک انتظار کیا۔پھر ٹارچ کی روشنی میں چبوترے کے پاس آیا۔وہاں بریف کیس رکھا ہوا تھا اور قریب ہی واسو دیو کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

لاش کی جیب سے موبائل فون جھانک رہا تھا۔اس نے فون کو وہاں سے نکالا۔اسے یاد آیا کہ واسو دیو نے مندر میں آکر میکی البرٹ کو کال کی تھی۔

اس نے وہ نمبر دیکھے پھر انہیں پنچ کیا۔تھوڑی دیر بعد میکی کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔"میں فون پر بات نہیں کر سکوں گا۔"

مراد نے کہا۔"گھبراؤ نہیں'مرینہ اتنی جلدی تمہاری راہداری تک نہیں پہنچے گی۔"

اس نے پوچھا۔"تم کون ہو؟"

"میں وہی مراد ہوں جسے قتل کرانے کے سلسلے میں تم نامراد رہے ہو۔اب میں تمہاری موت بن گیا ہوں۔ذرا اس مندر سے باہر آکر تو دیکھو کہ موت کیسے آتی ہے؟"

اس نے فون کو بند کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا پھر اپنے فون پر بھنڈاری سے کہا۔"یہاں ابھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔اپنے دونوں شوٹرز کو وہیں چھوڑ کر میری کار لے آؤ۔"

وہ دس منٹ میں مندر کے سامنے آگیا۔مراد نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔"ابھی ہم مندر کے پیچھے رہیں گے۔میرے دو شکار بھول بھلیوں میں ہیں۔وہ کسی وقت بھی

کسی دروازے سے باہر آسکتے ہیں۔ انہیں ہلاک نہیں کرنا ہے صرف اپنے سامنے انہیں بے بس کرنا ہے۔ اس کے بعد میں ان سے نمٹ لوں گا۔''

وہ مندر کے پیچھے آگئے۔ مراد نے مرینہ کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ ''مراد! یہ تم ہو؟''

''ہاں بولو، راہداریاں کیسی لگ رہی ہیں؟''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''او گاڈ... ! تم کیسے جانتے ہو کہ میں کسی راہداری میں ہوں؟''

''میں نے ہی تمہیں بھٹکنے کے لیے راہداری میں پہنچایا ہے۔ تمہارا ریوالور میرے پاس ہے۔''

''مائی گاڈ! تو وہ تم تھے؟''

''تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے ہندوستان میں لا کر اپنی موت کو ساتھ لے آئی ہو۔ یہ اور بات ہے کہ میں تمہیں ہلاک نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں سزائیں دے کر چھوڑ رہا ہوں۔

'' اس بار یہ سزا ہے کہ جو مائیکرو فلم تم حاصل کرنا چاہتی تھیں، اسے میں لے جا رہا ہوں۔ تمہارے لیے یہ خوش خبری ہے کہ کبھی تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ ایسی ہی ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچا کر زندہ چھوڑ دیا کروں گا۔ ابھی دیکھو، یہاں کتنی اچھی لائف انجوائے کر رہی ہو۔''

وہ دانت پیس کر بولی۔ ''مجھے بازار میں بے لباس چھوڑ کر گئے۔ بزدل کمینے... ! میں قسم کھا چکی ہوں کہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دوں گی۔ کہیں تو اچانک سامنا ہوگا۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوا تھا۔ تم نے کیا کرلیا؟''

''تم تاریکی سے فائدہ اٹھا کر گم ہوگئے۔ ورنہ میرے پاس وہی ایک ریوالور نہیں تھا۔ ابھی سامنے آؤ تو میرے ہاتھ میں تمہیں اپنی موت نظر آئے گی۔''

''تمہیں زندہ رکھنے کے لیے کہتا ہوں مندر کے جس دراوزے سے باہر نکلو تو دونوں ہاتھ اٹھا کر نکلنا اور میرے شوٹرز کو اپنا ہتھیار دکھا کر پھینک دینا۔ ورنہ بے موت ماری جاؤ گی۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ واسو دیو اور میکی البرٹ کی گاڑیاں وہاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بھنڈاری کے دو شوٹر انہیں دھکا لگا کر مندر کے دائیں بائیں والے دروازے کی طرف لے آئے۔ پچھلے دروازے کے سامنے مراد کی کار کھڑی ہوئی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد میکی ایک دروازے سے باہر آیا تو گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہوگئیں۔ وہ روشنی میں نہا گیا۔ ایک دم سے بوکھلا گیا۔ مراد نے کہا۔ ''اپنی گن پھینک دو۔''

وہ سہم کر بولا۔ ''پلیز، گولی نہ چلانا۔ ہم دوست بن سکتے ہیں۔ ابھی تمہیں لاکھوں ڈالرز مل سکتے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''تمہارا لاکھوں ڈالرز سے بھرا ہوا بریف کیس میرے پاس ہے۔ میری آواز پہچانو، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم راہداری میں تھے۔ میں نے فون کیا تھا۔''

وہ گھبرا کر بولا۔ ''مراد...؟... تم مراد ہو...؟''

''ہاں۔ تم پاکستان میں میری موت نہ بن سکے۔ میں ہندوستان میں تمہاری موت بن کر آگیا ہوں۔''

یہ کہتے ہی اس نے گولی چلائی تو گن میکی کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ مراد اس کے سامنے آکر بولا۔ ''جس کی تصویریں کرائے کے قاتلوں کو دکھاتے رہے تھے، اب اسے آنکھوں کے سامنے دیکھو اور فون نکال کر عالی جناب کو کال کرو۔ کم آن۔ ہری اپ۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔''

اس نے اس کے پیروں کے پاس ایک گولی ماری، وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ پھر فوراً ہی فون نکال کر اس نے عالی جناب کو مخاطب کیا۔ مراد نے کہا۔ ''اپنے حالات بتاؤ۔''

وہ بولنے لگا۔ ''عالی جناب! میں مصیبت میں ہوں۔ شاید میرا یہ آخری وقت ہے۔ مراد مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

مراد نے اس سے فون چھین کر کہا۔ ''سن لیا تم نے؟ میں تمہارا باپ بول رہا ہوں۔ جس کی جی حضوری کرتے ہو اسے میں ایک مچھر کی طرح مسل رہا ہوں۔''

مراد نے فون کا رخ میکی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''اس پاکستانی غلام سے کچھ کہنا چاہو گے؟''

وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے کہتا ہوں، دشمنی کو دوستی میں بدل دو۔ مجھے نہ مارو۔''

وہ آگے اور کچھ کہنا چاہتا تھا، مراد نے اسے گولی مار دی۔ پھر فون پر کہا۔ ''بہت جلد ایسی ہی حرام موت تمہاری طرف بھی آرہی ہے۔ اپنی سانسیں گنتے رہو۔''

پھر وہ فون پھینک کر بھنڈاری سے بولا۔ ''اب جو عورت کسی دروازے سے نکلنے والی ہے، اس سے میں نمٹ چکا ہوں۔ یہاں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ میں اسے زندہ سلامت جانے دوں گا۔ چلو یہاں سے۔''

وہ ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

تقدیر

اویس علی

جب کوئی بڑے بڑے منصوبے بنا رہا ہوتا ہے اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے کچھ بھی سوچنے سے پہلے تقدیر نے بھی بہت کچھ سوچ لیا ہے... بے خبری کے اسی عالم میں زندگی کے کسی بھی مقام پر جب انسان اور تقدیر کے منصوبوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو احساس ہوتا ہے انسان کا سوچا کتنا ناپائیدار ہے... اسے بھی ان آخری لمحوں میں اس بات کا ادراک ہوا مگر بہت تاخیر ہو چکی تھی۔

بلند و بانگ دعوے کرنے والوں کے لیے تاریک لمحوں کا فسانہ
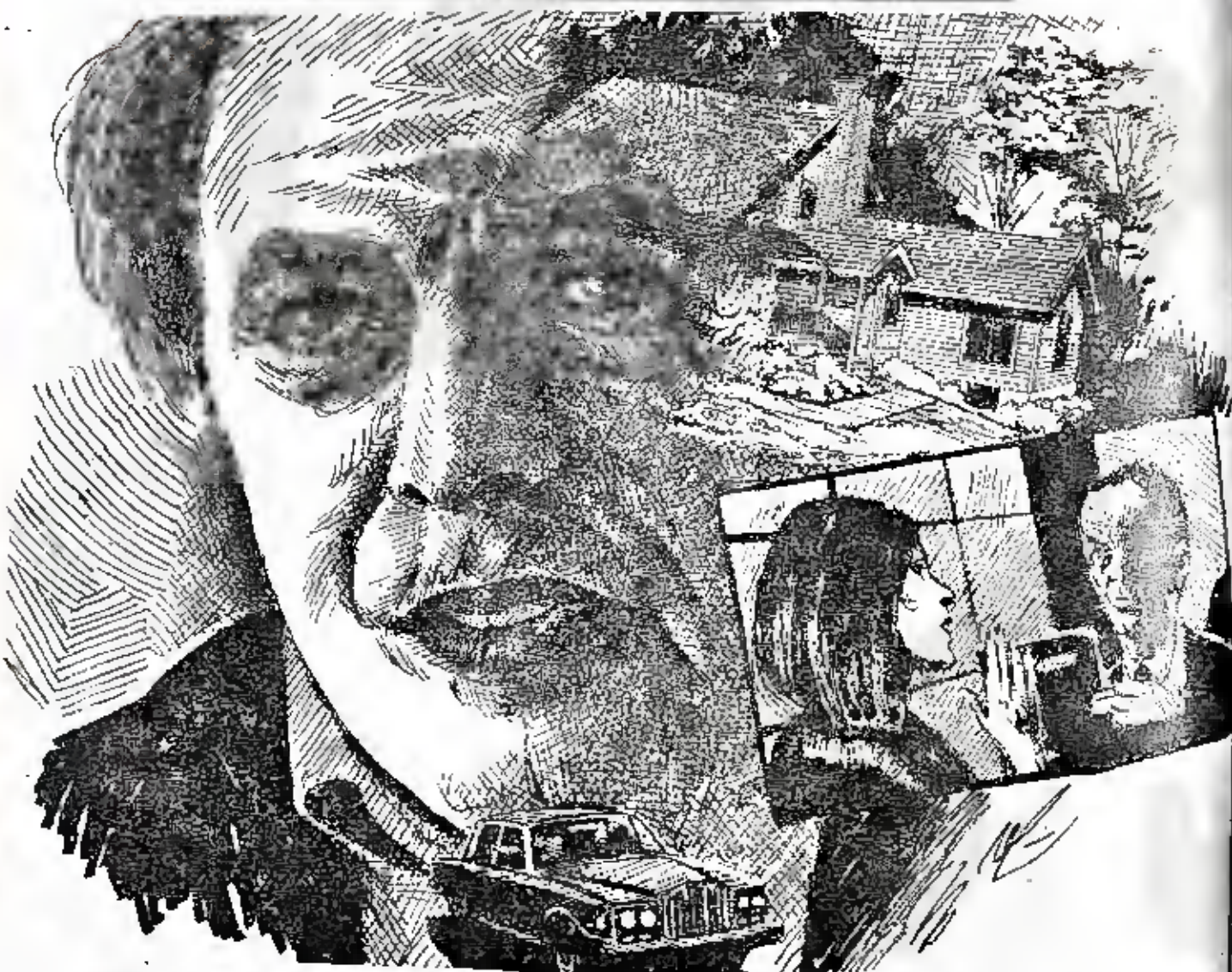
ارنسٹ پچھلے دس سال سے ایک بینک میں ملازم تھا اور وہاں کے ملازمین کے لیے ایک مثال تھا۔ وہ اپنے قصبے کے لوگوں کے گھر گھر جا کر بینک سے لیے ہوئے قرضوں کی قسط وار ادائیگی وصول کر کے شام کو بینک میں جمع کروا دیا کرتا تھا۔ اس کام پر اسے تنخواہ کے علاوہ کمیشن بھی ملتا تھا جس سے اس کا گزارہ اچھی طرح ہو جاتا تھا، تاہم یہ سب اتنا زیادہ نہ تھا کہ وہ شاہانہ انداز سے زندگی بسر کرنے کا سوچ سکتا۔

اس کے مثالی ملازم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک ایماندار شخص تھا۔ بینک منیجر اس سے بہت خوش تھا اور اس کی سفارش کی بدولت بینک کی جانب سے ارنسٹ کو اعلیٰ کامیابی اور دیانت داری پر ایک ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی اس کے بنائے ہوئے کھاتوں اور

حساب کتاب کے اندراجات میں نقص نہیں نکال سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے بنائے ہوئے کھاتوں کو کئی مرتبہ چیک کرنے کے بعد اعلیٰ افسران کے حوالے کرتا تھا۔

عشق ومحبت اور شراب خانوں کے چکروں سے وور وہ تنہا اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ شادی کے بارے میں اس کا فلسفہ خاصا عجیب تھا۔ وہ عورت ذات سے خاصا بدظن تھا کیونکہ بچپن میں ہی میں اس کی ماں اسے باپ کے پاس چھوڑ کر چلی گئی تھی، پھر باپ کے مرنے کے بعد وہ یتیم خانوں کی آیاؤں کے ہاتھوں میں پلا جنہیں بچے سنبھالنے سے زیادہ تنخواہ پانے کا لالچ وہاں لے آیا تھا۔ جس علاقے میں وہ رہتا تھا، وہاں کے لوگ اسے ایک بے مروت اور اپنی دنیا میں مگن شخص کے طور پر جانتے تھے، خود اس نے بھی کبھی کسی کے سامنے بہت اچھا بننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اکثر لوگ اس سے پوچھتے کہ حساب کتاب کرنا تو یقیناً تمہارے لیے اعصاب شکن ہوتا ہوگا اور بڑے نوٹ دیکھ کر تمہاری طبیعت بھی للچاتی ہوگی تو وہ سختی سے جواب دیتا۔

”رقم کے نوٹ جو میرے نہیں ہیں، میں انہیں کاغذ کے ٹکڑے خیال کرتا ہوں۔“

اس کی روزانہ کی روٹین بہت تھکا دینے والی تھی۔ درحقیقت اسے یہ کام پسند ہی نہ تھا، تاہم وہ اس بات کا قائل تھا کہ ملازمت میں اپنی پسند ناپسند کو پس پشت ڈال کر ہی اگر کوئی کام کیا جائے تو وہ کام انتہائی احسن طریقے سے ہوجاتا ہے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ کر کرنے والے کام کو پسند کرتا تھا مگر اس کی تعلیم اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ بہت کم پڑھا لکھا تھا۔

اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ اس کے پاس اتنی رقم جمع ہوجائے کہ وہ کوئی اسٹور یا دکان خرید لے اور مزے سے اپنی باقی زندگی ایک جگہ بیٹھ کر گزارے۔ مگر اس کی محدود آمدنی اور ضرورت کی اشیا مہنگی ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔

وہ صبح سات بجے اٹھتا، ناشتے کے بعد کپڑے تبدیل کرتا اور بینک جاکر اپنی حاضری لگاتا، پھر اپنا شیڈول دیکھ کر اپنا راستہ طے کرتے ہوئے پہلے مقروض کے پاس چلا جاتا، رقم کی وصولی کے بعد دوسرے اور تیسرے مقروض کے گھر کا چکر لگاتا۔ یوں سارا دن گھوم پھر کر شام کو کوئی چار بجے کے قریب وہ گھر چلا جاتا۔ وہاں تازہ دم ہونے کے بعد دن بھر کی رقوم کی وصولی کا کھاتا بناتا، پھر پیسے گن کر بینک چلا جاتا۔ پہلے پہل وہ رقم وصول کرکے سیدھا بینک جاتا تھا مگر اب جگہ کی کمی اور اس کی دیانت داری کی بدولت اسے اس بات کی اجازت تھی کہ وہ گھر جاکر حساب کتاب کی تفصیل تیار کرلے۔

ایک تھکا دینے والے دن کی شام کو وہ جب رقم لے کر آرہا تھا تو دل ہی دل میں اپنے مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا، اس بات کا ادراک ہونے کے بعد کہ وہ نوکری کرتے کرتے بوڑھا ہوجائے گا اور مطلوبہ رقم جمع نہ کرسکے گا، اس کی سوچ ہی بدل گئی۔ بددیانتی کا خیال نہ پہلے کبھی اسے آیا تھا اور نہ ہی کسی کو اس سے ایسی بات کی توقع تھی۔ آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ اس لیے آج اس کے پاس معمول سے خاصی بڑی رقم تھی۔ اس کے پاس کوئی دو لاکھ ڈالرز تھے اور اس رقم سے اچھی زندگی گزارنے کا خیال اچانک ہی اس کے دل میں در آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکا۔ اسے اپنے خیال پر خاصی حیرت بھی ہوئی کیونکہ اپنی دس سالہ پیشہ وارانہ زندگی میں بڑی بڑی رقمیں گنتے ہوئے اس کے دل میں ایسا کوئی خیال نہ آیا تھا مگر جب اسے دو لاکھ ڈالرز سے ملنے والے ثمرات کا اندازہ ہوا تو اس نے سوچا۔

”خیال تو زبردست ہے۔ میں دس سال سے ایڑیاں گھس گھس کر تھک گیا ہوں لیکن میری تنخواہ اور کمیشن اتنا کا اتنا ہی ہے۔ یقیناً یہ رقم میری آئندہ کی خوش حال زندگی کی ضامن ہوگی۔“

آج وہ معمول سے جلدی فارغ ہوگیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے جو قدم گھر کی جانب حساب کتاب کرنے کے لیے اٹھ رہے تھے ان کا رخ تبدیل ہوکر مخالف سمت ہوگیا۔ وہ ایک ویران جگہ پہنچا اور اپنا حلیہ بدلنے کی ٹھانی۔ اس نے اپنے تھیلے سے دھوپ کا چشمہ نکال کر لگایا، پھر جیکٹ اتار کر اندر رکھی۔ پھر تھیلے میں سے ایک ہیٹ نکالا جو کوئی چار سال سے اس کے تھیلے میں اس کے ساتھ تھا مگر کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔ ہیٹ پہن کر ایک کالا مارکر جیب سے نکال کر اس نے تل بنایا۔ یہ مارکر حساب کتاب نوٹ کرنے کے کام آتا تھا۔ اب اس کا حلیہ خاصا تبدیل ہوچکا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی، سات بجنے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا، وہ سات بجے بینک رقم جمع کروانے جایا کرتا تھا۔ اب اس کے قدم ایک ہوٹل کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک قریبی قصبے میں تھا جہاں ایک آدمی رہا کرتا تھا جسے ادائیگی کرنا تھی۔

⁂

ہوٹل میں وہ ایک بے فکر آدمی کے روپ میں داخل ہوا۔ آج اس کے چہرے سے سنجیدگی کی مہر ہٹ چکی تھی اور وہ سیٹی بجاتے ہوئے ایک کونے کی میز پر جا بیٹھا۔ اس کا رخ دیوار کی جانب تھا۔ ایک ویٹر اسے دیکھتے ہی آگے بڑھا اور اس کے قریب آکر مینو کارڈ اسے دے دیا۔ ارنسٹ نے بھویں سکیڑ کر کارڈ پکڑا، کچھ دیر اس پر نظر دوڑاتا رہا پھر کچھ سوچ کر سینڈوچ اور کافی کا آرڈر دے دیا۔ ویٹر نے مطلوبہ چیزیں اس کے سامنے لاکر رکھ دیں۔ ارنسٹ نے سوچنا شروع کردیا کہ آئندہ کے لیے کیا حکمتِ عملی طے کرے۔ بہت دیر دماغ لڑا کر ایک ترکیب اچانک اس کے ذہن سے ٹکرائی، اس ترکیب میں کچھ مشقت ضرور تھی مگر اس کی بے گناہی کی سو فیصد یقین دہانی بھی تھی۔

ہوٹل سے نکل کر اس نے بازار کا رخ کیا اور کچھ ضروری چیزیں خریدیں۔ پھر گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ اب اس کی گھڑی سات بجا رہی تھی یعنی اب اسے جو کچھ کرنا تھا فوراً کرنا تھا۔ اس نے رقم کو ایک تھیلے میں ڈالا۔ پھر اسے اچھی طرح سی لیا۔ اس کے بعد اس نے اس تھیلے کو مختلف کاغذوں میں لپیٹا پھر ایک لوہے کے مضبوط ڈبے میں بند کردیا۔ یہ اچھا خاصا بھاری ڈبا تھا جو وہ بازار سے خرید کر لایا تھا۔ چابیاں سنبھالنے کی کوفت سے بچنے کے لیے اس نے ڈبے کو تالا نہیں لگایا۔

اب وہ رابرٹ کے دفتر کی جانب جارہا تھا جو ایک دیانت دار وکیل کے طور پر مشہور تھا۔ ارنسٹ نے اپنا حلیہ خاصا تبدیل کرلیا تھا۔ رابرٹ کیسوں کی پیروی کے علاوہ لوگوں کی ضروری اور اہم اشیا امانت کے طور پر بھی سنبھالتا تھا۔ چنانچہ ارنسٹ اس کے دفتر میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔

”محترم میں پندرہ سال سے مسلسل کما رہا ہوں اور اب تک خاصی بڑی رقم جمع کرچکا ہوں۔ اب میں دنیا کی سیاحت پر جانا چاہتا ہوں لیکن میرے پیچھے کوئی وارث نہیں ہے۔ اس لیے اپنے اہم کاغذات آپ کے حوالے کررہا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو لے جاؤں گا۔ میں نے آپ کی ایمانداری کی خاصی شہرت سنی ہے اور آپ کا یہی وصف مجھے شہر سے اس قصبے میں لے آیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں ایک رسید بنا دیتا ہوں، آپ اسے دکھا کر جب چاہیں مجھ سے اپنے کاغذات لے کر جاسکتے ہیں۔“ وکیل نے سنجیدگی سے کہا۔

ارنسٹ نے اپنے دل میں سوچا۔ ”رسید! ارے نہیں نہیں۔ ایسے تو میں پکڑا جاؤں گا۔“

اس کے منصوبے میں رقم لے کر بھاگنا نہیں تھا بلکہ اس نے پولیس کو سنانے کے لیے ایک من گھڑت کہانی سوچ رکھی تھی اور یہ رسید اس کی کہانی میں رخنہ ڈال سکتی تھی، وہ جانتا تھا کہ پولیس اس کے گھر کا کونہ کونہ چھان مارے گی ایسے میں وہاں رسید کا چھپانا دانش مندانہ فیصلہ نہ ہوگا۔ اس کی زیادہ لوگوں سے بے تکلفی بھی نہ تھی اور جن سے تھی ان پر اسے اعتماد نہ تھا۔

اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر رابرٹ نے پوچھا۔ ”آپ کہاں کھو گئے ہیں؟ رسید بناؤں؟“

”ارے نہیں نہیں، آپ رہنے دیجیے رسید کے جھنجٹ کو۔ مجھ سے گم ہوجائے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ رسید نہ دیں۔ ویسے بھی یہ زیادہ اہم کاغذات نہیں ہیں۔ اگر گم بھی ہوگئے تو میرا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ اپنا نام تو بتاتے جائیں۔“ رابرٹ نے حیران ہوکر کہا۔

”ہاں۔ مجھے یاد ہی نہ رہا۔ میرا نام مارکس فلپ ہے۔“ یہ نام اس نے خاصی دیر لگا کر سوچا تھا۔

جب وہ وکیل کے دفتر سے نکلا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ اس کے منصوبے کا پہلا حصہ کامیابی سے مکمل ہوچکا تھا۔

اب اس نے اپنا حلیہ درست کیا اور پہلے والا ارنسٹ بن کر گھر چلا گیا۔ ایک نام جو وہ بار بار دہرا رہا تھا، وہ تھا۔

ماں

ابا مجھے مارتے تھے تو امی بچا لیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ امی پٹائی کریں گی تو ابا کیا کریں گے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے میں نے امی کا کہا نہ مانا۔ انہوں نے کہا کہ بازار سے دہی لا دو۔ میں نہ لایا۔ انہوں نے سالن کم دیا۔ میں نے زیادہ پر اصرار کیا۔ انہوں نے کہا پیڑھی کے اوپر بیٹھ کر روٹی کھاؤ میں نے زمین پر دری بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا۔ کپڑے میلے کرلیے۔ میرا لہجہ بھی گستاخانہ تھا، مجھے پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی مگر انہوں نے یہ کیا...... کہ مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ ”کیوں دلاور پتر! میں صدقے بیمار تو نہیں ہے تو......؟“ اس وقت میرے آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے۔

مرزا ادیب کی کتاب ”مٹی کا دیا“ سے اقتباس

مرسلہ۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

"مارکس فلپ!"

"ہاہاہا! ایک خیالی آدمی...... مارکس فلپ۔" اس نے قہقہہ لگا کر سوچا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

اسی رات وہ زخمی حالت میں پولیس کو اپنے ہی گھر میں ہانپتے ہوئے ملا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں خون جذب ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے غنودگی کا انجکشن لگایا ہوا تھا تاکہ پولیس کو اس کی حالت قابلِ رحم معلوم ہو، اس کا بینک منیجر پہلے تو اس کا انتظار کرتا رہا مگر کافی دیر بعد اس نے پولیس میں رپورٹ درج کروا دی۔ پولیس کو بتاتے ہوئے اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ اسے ارنسٹ پر بالکل بھی شک نہیں ہے۔ یقیناً اسے کسی نے لوٹ کر مار دیا ہوگا یا زخمی کر دیا ہوگا۔ مگر قصبے کا پولیس انسپکٹر جانسن خاصا کائیاں اور ہٹ دھرم شخص تھا اور منیجر کے صفائی پیش کرنے کے باوجود وہ بے چارے ارنسٹ کو غنودگی کی حالت ہی میں پولیس اسٹیشن اٹھا لایا۔

اس کی صحت یابی کے بعد انسپکٹر جانسن نے اس سے مختلف زاویوں سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ اس کے پوچھنے پر ارنسٹ نے اپنی تخلیق کردہ کہانی سنا دی کہ جب وہ رقم لیے بینک کی جانب جا رہا تھا تو دو انجان آدمیوں نے ایک سنسان جگہ پر اسے گھیر لیا اور گن پوائنٹ پر ساری رقم ہتھیا لی۔ پھر اس کے سر پر پستول کا آہنی دستہ مارا اور فرار ہو گئے۔

"تمہیں کسی پر شک ہے؟" انسپکٹر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جناب! لیکن میرا خیال ہے کہ وہ یقیناً ان لوگوں میں سے ہوں گے جن سے میں قسط وار ادائیگی وصول کرتا ہوں۔" اس نے رسانیت سے کہا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" انسپکٹر نے گھورتے ہوئے اگلا سوال داغا۔

"جناب! ان کے علاوہ اور کسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں اپنے بدنما تھیلے میں رقم لے کر جاتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"بہرحال! اگر تم چور ثابت ہو گئے تو عدالت تمہیں کڑی سے کڑی سزا دے گی۔"

"مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ میرا دل صاف ہے۔" اس نے یقین دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

پولیس کی خاصی دوڑ دھوپ کے باوجود ارنسٹ کے بتائے ہوئے حلیے کے لوگ نہ مل سکے اور دو ماہ میں یہ کیس سرد خانے میں چلا گیا تاہم گواہوں کی عدم دستیابی کی بدولت رقم کا ذمے دار ارنسٹ کو تو نہ ٹھہرایا گیا مگر انسپکٹر جانسن کے ترش بیانات کی وجہ سے ارنسٹ کو غفلت برتنے پر چھ ماہ کی قید ہو گئی۔ وہ اس کے لیے بلکہ اس سے بھی بڑی قید کے لیے تیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس جسمانی مشقت کے بعد وہ لوگوں کے سامنے بے گناہ ثابت ہو جائے گا۔

جیل میں سزا کے دوران میں ارنسٹ نے سب سے اچھے تعلقات رکھے۔ جیلر کو اپنا گرویدہ بنایا، اپنی صحت کا خاصا خیال رکھا اور بہت سے دوسرے قیدیوں کو اچھائی کا درس دیا۔ سب ہی اس سے بہت متاثر تھے اور افسوس کرتے تھے کہ وہ بے گناہ قید میں کیوں گیا ہے۔ ٹھیک چھ ماہ بعد اسے رہائی مل گئی۔ جیل ہی میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا پرانا منیجر وہاں سے چلا گیا ہے اور اس کی جگہ نیا آ گیا ہے۔ نئے منیجر کے دل میں ارنسٹ کے لیے کوئی نرم گوشہ نہ تھا۔ ارنسٹ کو یہ بات معلوم تھی لیکن وہ دل برداشتہ نہ تھا۔ محض چھ ماہ کی تکلیف کے بعد وہ اپنے حساب سے ایک بڑی رقم کا مالک بن چکا تھا۔ اس نے جیل سے نکلتے ہوئے اپنے منصوبے کے اگلے مرحلے کے بارے میں یہ سوچا تھا کہ وہ ہر ملنے والے سے ایسی باتیں کرے گا جس سے انہیں معلوم ہو کہ وہ اس قصبے سے دل برداشتہ ہو گیا ہے اور اسے چھوڑ کر کہیں اور جانا چاہتا ہے۔ ایک اور اہم بات جو اس کے منصوبے کا حصہ تھی، وہ یہ تھی کہ وہ نئے منیجر سے ایک بار ضرور مل کر اپنی ملازمت کے بارے میں دریافت کرے گا۔ اسے پکا یقین تھا کہ وہ اسے ملازمت سے فارغ کر چکا ہوگا اور یہ بھی کہ ایک سزا یافتہ کے لیے کوئی نوکری ملنا خاصا مشکل ہے مگر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا یہ انداز بھی خاصا اہم تھا تاکہ کسی کو بھنک بھی نہ پڑے کہ وہ لوٹی ہوئی رقم کے بل پر آئندہ زندگی گزارے گا۔

اس نے جیل ہی میں منصوبہ بندی کر لی تھی کہ وہ رقم لے کر کہاں جائے گا۔ انگلینڈ......؟ نہیں۔ وہاں کا موسم اسے راس نہیں آئے گا۔ اسی طرح اس نے کچھ اور ممالک کے بارے میں بھی سوچا تھا مگر پھر خود ہی کوئی وجہ بنا کر مسترد کر دیتا۔ فرانس کا خیال آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہاں، وہ فرانس جانا چاہتا تھا۔

لہٰذا اس سلسلے میں ملنے ملانے والوں سے گلے شکوے کر کے اور قصبے کی پولیس کی بے مروتی کا رونا روتے ہوئے اس نے اس بات کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا کہ وہ بہت جلد یہ قصبہ چھوڑ جائے گا۔ کچھ لوگوں کو اس کے جانے کے خیال سے افسوس ہوا، کچھ حاسدوں کو خوشی بھی ہوئی۔ بینک کے منیجر نے اسے نوکری دینے سے انکار کر دیا۔ عملے میں اس کے گرویدہ لوگوں نے خاصا شور مچایا مگر حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق وہ زیادہ سر نہ اٹھا سکے اور یہ معاملہ وہیں دب گیا۔

اب ذرا حلیہ تبدیل ہوا اور ارنسٹ کے قدم رابرٹ کے ہاں چل پڑے جہاں دو لاکھ ڈالرز اس کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ وکیل کے دفتر میں داخل ہوا اور مدعا بیان کیا۔ رابرٹ نے کہا۔ "رسید کہاں ہے؟"

اس پر وہ فوراً بولا۔ "جناب! ہم نے کوئی رسید نہیں بنائی تھی۔ آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ میں صرف نام بتا کر وہ ڈبا لینے کا مجاز تھا۔"

"ہاں ہاں! یاد آیا۔ آپ کا نام کیا تھا؟ میرے ذہن میں ہے لیکن میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ کہیں کوئی اور شخص تو نہیں جو یہ امانت لے کر جا رہا ہو۔" بوڑھے وکیل نے رسانیت سے کہا۔

ارنسٹ سوچنے لگا۔ "نام؟ ہاں ایک فرضی نام تو بتایا تھا میں نے مگر......" اچانک ارنسٹ کو محسوس ہوا کہ وہ نام تو وہ بھول چکا ہے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیسی عجیب بات ہے کہ میں وہ نام بھول رہا ہوں ابتدا میں جس کا ورد میں روزانہ کرتا تھا۔ کیا نام تھا وہ......؟" اس نے سوچا۔ اس نے اپنا دماغ ٹٹولا مگر اسے خالی پایا۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور خود کلامی کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں...... ارنسٹ یاد کرو وہ کیا نام تھا......" وہ سوچتا رہا۔ دوسری طرف وکیل اس کی کیفیت دیکھ کر کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس نے ارنسٹ کی پریشانی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ فی الحال اسے کاغذات کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، وہ پھر آ کر لے لے گا۔

وکیل نے اسے تعجب سے دیکھا لیکن وہ اٹھ کر باہر چلا گیا اور ایک پارک میں جا بیٹھا۔ وہ جانے کتنے گھنٹے اپنے گرد و پیش سے بے نیاز اپنے دماغ پر زور دے رہا تھا کہ شاید کوئی سرا مل جائے، وہ حرف ہی یاد آ جائے جس سے وہ نام شروع ہوتا تھا مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ نام اس کے سامنے اسے ناچتا ہوا محسوس ہوا، یوں لگتا تھا کہ وہ الفاظ اس کے گرد گھوم رہے ہوں مگر ارنسٹ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اچانک کوئی نام اس کے ذہن سے ٹکراتا، وہ اچھل کر کھڑا ہو جاتا۔ مگر جب اسے اونچی آواز میں دہراتا تو سب کچھ الٹ لگتا۔ پہلے تو صرف اس کا دماغ چکراتا رہا مگر اب اسے اپنا جسم لرزتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب و غریب سوچوں کی گرم لہریں اس کے دماغ سے ٹکراتی رہیں۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی بے بسی پر روئے یا

لمحہ فکریہ

ایک شخص شادی کے متعلق مشورہ دینے کے دفتر میں گیا۔ دفتر بند تھا، باہر یہ نوٹس آویزاں تھا۔

"دفتر ایک بجے سے تین بجے تک بند رہتا ہے۔ آپ پھر سوچ لیں۔"

بے خیالی

جج ملزم سے۔ "تم نے ٹریفک پولیس کے ایک ذمے دار افسر سے طنزیہ لہجے میں گفتگو کیوں کی؟"

ملزم۔ "ہرگز نہیں جناب عالی، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ دراصل یہ مجھے اس طرح ہدایات دے رہے تھے جیسے میری بیوی دیتی ہے۔ حسب عادت بے خیالی میں منہ سے نکل گیا۔ "ٹھیک ہے۔"

مادری زبان

استاد شاگرد سے۔ "بتاؤ ہم اردو کو اپنی مادری زبان کیوں کہتے ہیں؟"

شاگرد جس کے گھر میں اردو بولی جاتی تھی اس نے جواب دیا۔ "اس لیے سر کہ جب امی بولتی ہیں تو کوئی بھی نہیں بول سکتا۔"

سیاسی محاورے

دکھتی رگ چھیڑنا...... کسی وزیر کی کرپشن کے متعلق بات کرنا۔

رسی دراز کرنا...... ملازمت میں توسیع دینا۔

منہ شکر سے بھر دینا...... شوگر مل کی بجلی فری کرنا۔

لانگ مارچ کرنا، پکنک پارٹی پر اسلام آباد آنا۔

نہلے پر دہلا

☆ محبت کی جنگ کیسے جیتی جا سکتی ہے؟
رقیب کو رشوت دے کر۔

☆ شاپنگ بیگ کیوں ایجاد ہوئے؟
کپڑا مہنگا ہونے کی وجہ سے۔

☆ رائی کا پہاڑ کب بنتا ہے؟
بیوی کے سامنے کسی اور عورت کی تعریف کرنے سے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ہنسے مگر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا دماغ خاصا کام کر رہا تھا۔ وہ بار بار ان لمحات کو یاد کر رہا تھا جب وہ وکیل کے سامنے بیٹھا تھا اور پھر وہ اسے فرضی نام بتا رہا تھا مگر کوئی بھی سوچ اسے مطمئن نہ کر سکی۔

اچانک وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہ کون سی بڑی بات ہے، یہ تو وقتی پریشانی ہے، اگر میں اس بارے میں سوچنا چھوڑ دوں کہ وہ نام کیا تھا تو شاید خود ہی چند گھنٹوں بعد میرے ذہن میں آجائے گا۔“ اپنے آپ کو تسلیاں دیتے ہوئے وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ کر سکا۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنا دھیان پارک میں سیر کرتے لوگوں میں لگانا چاہا اور ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سننے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا، اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا اور تھک ہار کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

پھر وہ بار بار کئی ناموں کی تکرار کرنے لگا۔ رات گہری سے گہری ہوتی گئی۔ پارک صحرا کا منظر پیش کرنے لگا۔ وہاں اس کے سوا اور کوئی نہ رہا۔ اس نے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک اور خیال اچانک اس کے ذہن میں آنے لگا۔ اس خیال نے اس کے ہوش و حواس اڑا دیے۔ کہیں یہ نام اسے عمر بھر ہی نہ یاد آئے۔ مگر اس کے لیے تو اس نے ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ اس کو سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے نوکری ملنی مشکل تھی اور اس پر ایک اور ذہنی دباؤ طاری رہتا کہ وہ اتنی بڑی رقم کا مالک ہونے کے باوجود تہی دست ہے۔

رات گزر گئی۔ اگلا دن گلیوں میں دیوانہ وار چکر لگاتے گزرا۔ پھر رات آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑا اور کہا۔ اس طرح تو میں مرجاؤں گا یا بالکل ہی پاگل ہوجاؤں گا۔

اس نئے خیال نے اس کی رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ دو لاکھ ڈالرز حاصل کرنے کے لیے اس نے کتنے پاپڑ بیلے تھے۔ سب سے پہلے اپنی ایمانداری پر داغ لگایا، پھر چھ ماہ کی قید کاٹی، اب وہ شخص ایک سوچنے والی مشین بن کر رہ گیا تھا۔ جس رقم کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اتنی مشقت کی، آج اسے وہ ہاتھ لگانے کے بھی قابل نہیں ہے۔ وکیل کی تجوری میں رقم اس کا انتظار کر رہی ہے مگر وہ صرف ایک نام بھول جانے کی وجہ سے اس رقم کو حاصل کرنے سے معذور تھا۔ یہ قدرت کی کیسی ستم ظریفی تھی۔

اس کا سر چکرانے لگا مگر قابو میں رہنے کے لیے اس نے سر پر بار بار ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ اب اس کو یقین ہونے لگا کہ وہ نام اسے کبھی یاد نہ آئے گا۔ اس کے ساتھ تقدیر نے عجیب کھیل کھیلا تھا مگر یہ حقیقت تھی۔ ہاں، وہ نام اگر اسے زندگی میں کبھی یاد آبھی آگیا تو بوڑھا وکیل اس وقت تک مر گیا ہوگا یا وہ خود خاصا بوڑھا ہو چکا ہوگا۔

وہ جہاں کھڑا تھا، وہیں سے سیدھا چلنے لگا۔ اس کا رخ قریبی دریا کی جانب تھا۔ ایسی زندگی سے کیا فائدہ جس میں تقدیر انسان کے ساتھ عمر بھر کے لیے بھیانک کھیل کھیلے ایسی دولت کا کیا فائدہ جو سب کچھ لٹانے کے باوجود اس کو نہ مل سکے۔ اس نے خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

جب اس نے طغیانی میں دریا کو دیکھا تو اسے ذرہ برابر بھی خوف محسوس نہ ہوا۔ یہ قسمت کا کھیل تھا کہ اسے دو لاکھ ڈالر کے بجائے موت کو گلے لگانا پڑ رہا تھا۔ اس نے دل سے دنیا کو خدا حافظ کہا پھر ایک اونچی جگہ سے چھلانگ لگانے کے لیے اس نے قدم اٹھائے اور بھاگنے لگا۔ جونہی چھلانگ لگاتے ہوئے وہ ہوا میں بلند ہوا، ایک نام اچانک اس کے ذہن کی سطح پر دستک دینے لگا۔

”مارکس فلپ!“

”بچاؤ، بچاؤ۔“ اس کے ذہن میں جونہی یہ نام آیا اس نے چلانا شروع کر دیا۔ اس نے زور زور سے چیخیں ماریں مگر اس وقت وہ عین دریا کے اوپر تھا۔ بہت سے لوگ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی جانب بڑھے مگر وہ دریا میں گر چکا تھا۔ ان لوگوں میں کوئی بھی ماہر تیراک نہ تھا۔ دریا کی تند و تیز لہروں نے اسے ایک دفعہ پھر ہوا میں بلند کیا اور اس نے حتی الامکان پوری قوت سے لوگوں سے جان بچانے کی درخواست کی اور چیخیں بھی ماریں مگر وہ سب آوازیں پانی کے شور میں دب کر رہ گئیں۔ پھر وہ زور زور سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ وہ اچھا تیراک بھی نہ تھا۔ ٹھنڈا پانی اس کے جسم میں سرایت کرنے لگا۔ اس کی بے پناہ کوشش پانی کے زور کے آگے دب کر رہ گئی۔ اس میں خاصا جوش تھا مگر سرکش اور بے رحم موجیں اسے بہا کر گہرے پانی میں لے گئیں۔ وقت تھم گیا، سب کچھ رک گیا، ارنسٹ جینے کی کوشش میں زندگی ہار گیا۔

دریا پر کھڑے ہوئے لوگ آپس میں اس کی ہلاکت پر افسوس کرنے لگے مگر انہیں معلوم نہ ہوا کہ یہاں ایک نہیں دو حادثے ہوئے ہیں۔ تقدیر! آہ ظالم تقدیر...... اس نے ارنسٹ کے ساتھ یہ بھیانک کھیل کھیلا تھا کہ موت کی چوکھٹ پر اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا مگر وہ زندگی نہ پا سکا۔

دیدۂ تر

امجد رئیس

یہ دنیا جب سے وجود میں آئی ہے تب سے قتل و غارت گری کے میدان میں کیا کچھ رونما نہیں ہو چکا لیکن... یادداشت کا نظام انسان کے پاس زندہ رہنے کا بہت بڑا سہارا ہے، جس میں یادوں کی مخصوص گنجائش بہت سی غیر اہم باتوں کو مٹا دینے کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر یہ خونی یادیں ذہن میں محفوظ رہ جائیں تو جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ان خونی لمحات کو بھلا دینا چاہتا تھا۔

آنسوؤں کی لہروں میں ڈوبنے، ابھرنے والے دلوں کا عبرت اثر منظر

لڑائی عروج پر تھی۔ شدید اور متواتر۔ مارو یا مرجاؤ۔ فضا کی آلودگی اور ذائقہ رقصِ اجل کا گواہ تھا۔ ماحول بہ زبانِ خاموشی صورتِ حال کی عکاسی کر رہا تھا۔ انسان بہ مقابلہ انسان۔ یہ خونریز لڑائی ازل سے جاری تھی۔ مقام اور جواز تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ جنگ چھوٹی ہو یا بڑی، بالآخر اس کی خونی پیاس بجھ جاتی ہے۔ لڑائی ختم ہوجاتی ہے، وہ لڑائی بھی ختم ہوگئی۔ زخمیوں کو اٹھایا جا رہا تھا۔ جو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے

انہیں دفنایا جارہا تھا۔

یہ اجتماعی قسم کی تدفین تھی...... اس لہورنگ فضا میں بھی کسی دل جلے کی حسِ مزاح ابھی تک سانس لے رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”ذرا سلیقے سے۔ کام میں نفاست کی ضرورت ہے۔“

لاشوں کو خندقوں میں پہلو بہ پہلو لٹایا جارہا تھا۔ ہر گروپ میں بارہ لاشیں تھیں۔

جنگل میں لاشیں، زخمی اور گھوڑے اِدھراُدھر بکھرے پڑے تھے۔ ان کے درمیان کچھ سپاہی اسٹریچرز لیے گھوم رہے تھے، وہ ان زخمیوں کو تلاش کررہے تھے جن میں زندگی کے آثار باقی تھے۔

بیشتر زخمیوں نے دورانِ جنگ ہی انتظار کی حالت میں دم توڑ دیا تھا۔ آرمی ریگولیشن کے مطابق انہیں انتظار کرنا تھا۔ ان کا بہترین علاج یہی تھا کہ جنگ جیت لی جائے...... فتح ایک بعید تر حقیقت ہے جس کے ثمرات سمیٹنے کے لیے کم ہی جنگجو زندہ بچتے تھے۔

جس مقام پر تدفین کے لیے خندقیں کھودی گئی تھیں، بعض زخمی وہاں سے بہت دور تھے، لہٰذا ان کو اسی جگہ دفنایا جارہا تھا۔ یہی حالت زخمیوں کی تھی، لڑتے لڑتے وہ بہت دور نکل گئے تھے، بعض کا اتا پتا ہی نہیں تھا۔ بہرحال اسٹریچر بدست سپاہیوں کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔

فاتح گروپ تدفینی پارٹی شناخت اور ناموں میں دلچسپی لے رہی تھی تاکہ فتح کی خاطر جان دینے والوں کی فہرست مرتب کی جاسکے جبکہ شکست خوردہ غنیم بے دلی سے محض تدفینی عمل نمٹانے میں لگا تھا۔ ان کی دلچسپی لاشوں کی گنتی تک محدود تھی۔

☆☆☆

تدفینی پارٹیوں سے کچھ فاصلے پر ایک سپاہی درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وردی سے وہ فیڈرل آفیسر معلوم ہوتا تھا۔ پیروں سے سر تک اضمحلال ٹپک رہا تھا۔ وہ نیم کربناک انداز میں سر کو دائیں بائیں ہلا رہا تھا گویا اس کا دماغ آرام کی حالت میں نہیں تھا۔ یوں معلوم ہورہا تھا کہ وہ وہاں رکنا نہیں چاہتا۔ بہ ظاہر اس کی نظر جہاں تھی، درحقیقت وہ کہیں بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے وہاں سے ہٹنا تھا۔ تاہم ذہن فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ کس سمت میں جائے، وہ تادیر وہاں رکنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ درختوں سے جھانکتی سورج کی کرنیں اشارہ کررہی تھیں کہ آفتاب لڑائی کا لہولہان نظارہ کرنے کے بعد مغرب کی سمت جھکتا جارہا ہے۔ اس لہورنگ زمین پر وہ رات بھی نہیں گزار سکتا تھا جہاں چند فٹ نیچے اس کے ساتھی دفن تھے۔ دس میں سے نو سے وہ ایک ہی نوعیت کا سوال کرچکا تھا۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کھو گیا ہے یا اس کا کوئی غائب ہے۔ کام تیزی سے نمٹ رہا تھا اور رزم گاہ خالی ہوتی جارہی تھی۔

بہرحال آفیسر نے ایک سمت اختیار کرلی۔ اس وقت وہاں سناٹا چھا چکا تھا۔ وہ سیدھا مغرب کی سرخی کی جانب جنگل میں داخل ہوگیا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، اس کا اعتماد بحال ہوتا جارہا تھا۔ جیسے وہ راستے اور ماحول کو پہچانتا جارہا ہے۔

اس کے ہتھیار اس کے پاس تھے، وردی پر خون کے دھبے تھے، تاہم اس کی چال بتارہی تھی کہ اسے کوئی گہرا زخم نہیں لگا ہے۔ جنگل سائیں سائیں کررہا تھا۔ آفیسر کو یوں لگا جیسے اشجار ماتم کناں تھے جیسے سسکیاں لے رہے تھے۔ ان کے اردگرد لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ کبھی کسی نیم مردہ سپاہی کی مدھم کراہ سنائی دے جاتی۔ یہ وہ زخمی تھے جن تک امدادی پارٹیاں پہنچ نہیں سکی تھیں۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ وہ بتدریج اذیت ناک موت کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اس معاملے میں آفیسر بے دست و پا تھا۔ نہ وہ ڈاکٹر تھا، نہ اس کے پاس پانی تھا کہ وہ ذرا سی تسکین کے لیے کسی زخمی کے حلق میں چند قطرے ٹپکا دیتا۔

اس کے سینے میں ٹیس سی اٹھی۔ اس کی متلاشی آنکھیں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ دفعتاً اس نے سامنے کی جانب ایک ڈھلوان نما خندق دیکھی جو کچھ آگے جاکر پھر سطحِ زمین کے مانند ہوگئی تھی۔ کنارے پر اسے کچھ اجسام دکھائی دیے۔ وہ ٹھٹکا، پھر یکدم تیزی سے آگے بڑھا۔

وہ عجلت اور بے قراری کے ساتھ باری باری سب کا جائزہ لے رہا تھا۔ آخر وہ ایک بے حس و حرکت سپاہی کے قریب رک گیا جو دوسروں سے قدرے ہٹ کر پڑا تھا۔ آفیسر نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ دفعتاً بہ ظاہر مردہ سپاہی کے جسم نے حرکت کی۔ آفیسر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ اس کے مٹی اور خون سے آلودہ چہرے پر رکھ دیا۔ سپاہی کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی، آفیسر اپنے دوست تک پہنچ گیا تھا۔

آفیسر کوئی اور نہیں بلکہ کیپٹن ڈیرک میڈول تھا۔ وہ جس زخمی کے پاس بیٹھا تھا وہ سارجنٹ ”کوڈی ہالکرڈ“ تھا۔ کیپٹن کا گہرا دوست۔ دونوں کا تعلق رجمنٹ کی ایک ہی کمپنی سے تھا۔

☆☆☆

رجمنٹ میں دو بھائی تھے۔ کوڈی ہالکرو اور کریڈ ہالکرو...... رینک کے فرق کے باوجود کوڈی کیپٹن ڈیرک کا

پرانا دوست تھا۔ دونوں ساتھ پلے بڑھے تھے، ایک ہی ادارے سے تعلیم حاصل کی تھی...... کوڈی کو ملٹری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم دل کے رشتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ ڈیرک سے جدائی برداشت نہیں تھی...... لہٰذا کوڈی نے بھی ملٹری میں اپلائی کردیا۔ دونوں نے ترقی کی لیکن دو رینک کا فرق قائم رہا۔ تاہم ان کی دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔

کوڈی کا بھائی کریڈ ہالکرو میجر تھا، دونوں بھائیوں کی افتادِ طبع میں بہت فرق پایا جاتا تھا۔ کریڈ دونوں کی دوستی کے ہمیشہ خلاف ہی رہا۔ صبح جنگ کے آغاز پر رجمنٹ کی ڈیوٹی آرمی سے ایک میل دور تھی۔ ان پر حملہ ایسی جگہ ہوا جو درختوں سے گھری تھی لیکن رجمنٹ ڈٹ گئی۔ عین دورانِ جھڑپ میجر کریڈ، کیپٹن ڈیرک کے پاس آیا۔ کیپٹن نے رسمی انداز میں سلیوٹ کیا۔ میجر نے رسمی جواب دیا اور بولا۔

”کرنل کا حکم ہے کہ تم اپنی کمپنی کو لے کر جنگل میں قدرتی خندق نما مقام پر رہو، جب تک کرنل دوسرا حکم جاری نہیں کرتے۔ وہاں خطرہ زیادہ ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ تم سنبھال پاؤ گے۔ اگر تم چاہو تو یہ ڈیوٹی کسی اور کے حوالے کرسکتے ہو۔ چونکہ میں اس تبدیلی کا مجاز نہیں ہوں۔ اس لیے اسے محض ایک مشورہ سمجھو۔ غیر رسمی مشورہ۔“

اس کھلی بے عزتی پر کیپٹن نے جواب دیا۔

”سر! اس موومنٹ کے لیے میں آپ کو دعوت دیتا ہوں۔ آپ کی موجودگی نہ صرف کمپنی کا مورال بلند کرے گی بلکہ بہادری سے لڑتے ہوئے اگر آپ مارے گئے تو آپ کی فیملی کے لیے یہ اعزاز کی بات بھی ہوگی۔“

میجر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند سیکنڈ کیپٹن کو گھورتا رہا پھر واپس روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

نصف گھنٹے بعد کیپٹن کی کمپنی اتھلی کھائی پر تھی۔ گھمسان کا رن پڑا اور کمپنی کے ایک تہائی سپاہی کام آگئے...... گرنے والوں میں کیپٹن کا دوست سارجنٹ کوڈی بھی تھا...... کوڈی ہالکرو۔

اس وقت کمپنی کو ہی نہیں بلکہ رجمنٹ کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ لڑائی مرکزی میدانِ جنگ سے دور ہوتی گئی لیکن رجمنٹ نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کی جوابی حکمتِ عملی اپناتے ہوئے کرنل نے مارو یا مرو کے تحت کارروائی ڈالی۔ غنیم کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ توپوں کے دھماکے، بندوقوں اور ہینڈ گن کی آوازیں، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور سپاہ کے نعرہ ہائے ہو۔ لڑائی فیصلہ کن مراحل میں داخل ہوتی ہوئی پھر جنگل سے قریب تر ہوگئی۔ رجمنٹ کی فتح پر لڑائی اختتام پذیر ہوئی۔

☆☆☆

سارجنٹ کوڈی بری طرح زخمی ہوا تھا۔ کیپٹن اپنے دوست کے پاس موجود تھا۔ کوڈی کے خون آلود کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جیکٹ کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ جسم سے الگ پڑی تھی۔ چمڑے کی بیلٹ بھی کھلی ہوئی تھی۔ غالباً کوڈی خود کو غیر ضروری کپڑوں کی قید سے آزاد کرنا چاہتا تھا۔ وہ جہاں زمیں بوس ہوا تھا، وہاں سے گھسٹنے کا نشان تھا۔ تاہم یہ نشان زیادہ طویل نہیں تھا۔

اگرچہ کیپٹن کو اخراجِ خون کی زیادتی نظر نہیں آئی لیکن پیٹ کا خطرناک زخم نہایت واضح تھا۔ زخم کی چوڑائی ہلاکت خیز تھی۔ وہاں مٹی کے ساتھ پتے چپکے رہے تھے اور ایک آنت پیٹ سے باہر آگئی تھی۔ کیپٹن نے اپنے پورے کیریئر میں ایسا زخم نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔ اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر درد اور مایوسی کے عالم میں اِدھراُدھر دیکھا۔ وہ حیران تھا کہ کوڈی اب تک زندہ تھا۔ اس کے کپڑے، بیلٹ کس نے الگ کیے؟ کیا وہ خود جان بچانے کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہا تھا چیختا رہا تھا؟

لطائف

ایک سردار اے ٹی ایم مشین سے رقم نکال رہا تھا پیچھے کھڑے دوسرے سردار نے کہا۔ ”میں نے تیرا پن کوڈ دیکھ لیا ہے۔“

پہلا بولا۔ ”ذرا بتا تو کیا ہے میرا پن کوڈ؟“

دوسرا بولا۔ ”5 ستارے“

پہلا۔ ”ہاہاہا یہ نہیں 5129 ہے۔“

❋❋❋

پانچ سردار بھینس کو چھت پر چڑھانے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک آدمی جو کھڑا دیکھ رہا تھا پوچھا۔ ”یہ کیا کررہے ہو؟“

سردار۔ ”اوپر لے جاکر ذبح کرنی ہے۔“

آدمی۔ ”نیچے ہی کرلیتے۔“

سردار۔ ”یار کر تو لیتے لیکن کیا کریں چھری اوپر پڑی ہے۔“

❋❋❋

کیپٹن نے ایک بار پھر نگاہ دوڑائی۔ پچاس گز کے فاصلے پر لاشوں کے آس پاس اسے چند ہیولے حرکت کرتے نظر آئے۔ وہ جنگلی خنزیر تھے۔ کیپٹن نے اپنے جاں بہ لب دوست کو آواز دی لیکن وہ محض کسمسا کر رہ گیا۔

کیپٹن کھڑا ہو گیا۔ اس نے جنگلی جانوروں کی طرف دیکھا۔ ایک خنزیر لاش کے سینے پر دونوں اگلے پنجے رکھے کھڑا تھا۔ اس کا سر لاش کے پیٹ میں گھسا ہوا تھا۔

کیپٹن نے نگاہ پھیر لی اور زمین پر اپنے دوست کو دیکھا۔ کوڈی کی آنکھیں کھلی تھیں، وہ خالی خالی نظروں سے کیپٹن کو دیکھ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ بدن کو حرکت دیتا رہا۔ ہر سانس کے ساتھ اس کی کراہیں کرب و اذیت کی غمازی تھیں۔

کیپٹن بے بسی سے پھر دوست کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ردِعمل کے طور پر کوڈی کی چیخ نکل گئی۔ ہولناک اذیت سے تڑپ کر اس کا اوپری دھڑ تھوڑا سا اٹھا، پھر نیچے گر گیا۔ اس کی انگلیاں زمین کھودنے کی کوشش میں زخمی ہوئی تھیں مگر اسے احساس نہیں تھا۔ وہ اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلتے ضرور تھے لیکن بے آواز...... اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک چیختی ہوئی دُہائی چھپی تھی۔ آنکھیں سراپا دعا تھیں۔ کیپٹن کے سینے میں گاڑھا دھواں بھر گیا۔ چہرے کے چیختے ہوئے تاثرات اور آنکھوں کی دعا میں کتنی شدت تھی...... کس قدر گہرا تاثر تھا۔ یہ سب کچھ کوئی احمق بھی بہ آسانی پڑھ سکتا تھا۔ لبوں کی حرکت، آنکھوں کی دعا، چہرے کا تاثر سب ایک ہی چیز طلب کر رہے تھے...... موت!

کیپٹن کو اپنے دوست کی طلب کا فوراً احساس ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھرنے والا پانی چھلک پڑا...... آنسوؤں کے قطرے رخساروں پر رینگ رہے تھے۔

کیپٹن بھیگی آنکھوں کے ساتھ کوڈی کا نام پکار رہا تھا۔ ایک بار، دو بار...... بار بار۔ اس کی نظر دھندلا گئی تھی۔ اس نے اپنی بند مٹھی پیشانی پر ماری اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا بدن غیر محسوس انداز میں لرز رہا تھا۔

کیپٹن اس کی جگہ سے ہٹ گیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ جنگلی جانور اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ چلا رہا۔ جانور کریہہ آواز میں چلائے پھر وہاں سے بھاگ نکلے۔ کیپٹن کو دیکھ کر ایک قریب المرگ گھوڑے نے کمزور سی آواز نکالی۔ اس کی اگلی دونوں ٹانگیں توپ کے گولے نے اڑا دی تھیں۔ اسے گھوڑے کی آنکھوں میں کوڈی جیسی التجا کا عکس نظر آیا......

انسان بھی عجیب ہے، انسان کی انسان سے لڑائی ختم ہی نہیں ہوتی۔ خود کو بھی موت مانگنے پر مجبور کر دیتا ہے اور جانور کو بھی۔

کیپٹن نے ریوالور نکال کر گھوڑے کی دونوں آنکھوں کے درمیان گولی ماری اور اسے زندگی و موت کی کشمکش سے آزاد کر دیا۔

سورج تقریباً ڈوب چکا تھا۔ یہاں سے کیمپ میلوں دور تھا۔ وہ ڈھیلے انداز میں گھوڑے کی لاش کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا ذہن خالی تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور واپس اپنے گہرے دوست سارجنٹ کوڈی کی جانب چل پڑا۔

وہ ایک گھٹنے کے بل پر بیٹھ گیا، اس کا دل بہت زور سے دھڑکا اور پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اس نے ریوالور مرتے ہوئے دوست کی پیشانی پر رکھ کر منہ پھیر لیا۔ ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

گھوڑے پر چلائی گئی گولی آخری تھی۔ ریوالور خالی تھا۔ کوڈی نے درد بھری سسکی لی۔ اس کے ہونٹ عجیب انداز میں ہل کھا رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

کیپٹن ڈیرک کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی تلوار نکالی۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں نے تلوار کی دھار کو جانچا۔ اس نے تلوار کو زمین کے متوازی اپنے سامنے مضبوطی سے بالکل سیدھا پکڑا جیسے اپنے اعصاب کے بارے میں اندازہ لگا رہا ہو...... تیز دھار بلیڈ میں کہیں لرزش نہیں تھی۔ وہ جھکا اور تلوار کی نوک کوڈی کے عین دل کے مقام پر رکھ دی۔ اس مرتبہ اس نے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ دستہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے پوری طاقت لگاتے ہوئے، جسم کا وزن بھی استعمال کیا۔

تلوار کا قاتل بلیڈ نیم جان کوڈی کے بدن سے گزر کر زمین تک چلا گیا۔ وہ خود گرتے گرتے بچا۔ کوڈی کا بالائی بدن ایک جھٹکے سے بلند ہوا اور کیپٹن کے گھٹنوں تک آ گیا۔ ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ اٹھا اور اتنی سختی سے فولادی بلیڈ کو پکڑا کہ انگلیوں کے جوڑ سفید پڑ گئے۔ آخری سانس لیتے ہوئے عالمِ دیوانگی میں جیسے اس نے تلوار کو باہر نکالنا چاہا لیکن یہ ایک کمزور کوشش تھی۔

عین اسی لمحے درختوں کے جھنڈ کے عقب سے تین افراد برآمد ہوئے۔ دو میڈیکل ورکرز تھے جن کے ہاتھوں میں اسٹریچر تھا۔ دونوں بُری طرح ہانپ رہے تھے...... کیپٹن کی پشت ان کی جانب تھی تاہم آخری ساعت میں کوڈی نے ریسکیو ورکرز کو دیکھ لیا تھا۔ اور تیسرا شخص خود میجر کریڈ تھا...... کریڈ ہالکرو۔

ربِ کائنات کی منشا اور حکمتِ عملی کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ قدرت کا قانون ہے کہ جب اندھیرا حد سے بڑھ جائے تو کہیں قریب ہی اجالا چھپا ہوتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے ظلمت کی یہ چادر سمٹتی چلی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب مخلوق اپنے خالق سے غافل ہو کر بت پرستی میں مشغول تھی اور صنم خانے آباد تھے ایسے میں اللہ تعالیٰ کو معجزہ دکھانا مقصود ہوا اور جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زمین پر اتارا جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ذات کے ہونے کی وجہ تلاش کرنے... اپنے خالق کی جستجو اور تسلیم و رضا کے سانچے میں ڈھلنے میں گزرا... اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے خداؤں کو زمیں بوس کر کے آپ علیہ السلام نے کسی معبود کے ہونے کا یقین دلایا اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا... حتیٰ کہ انہی کوششوں میں حج بیت اللہ کے مناسک بھی رقم ہو گئے جن پر رہتی دنیا تک تمام مسلمانانِ عالم کو عمل کرنا ہے۔

نمرود سے ٹکرانے اور اللہ کی آزمائشوں پر پورا اترنے والے جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام

رضوانہ ساجد

دوسرا حصہ

وحی بھی نازل ہو گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وحی کے الفاظ آپ تک پہنچا دیے۔

”اللہ تعالیٰ نے تمہیں نبی مقرر کیا ہے۔ تم پر لازم ہے کہ تم اپنی قوم کی طرف جاؤ جو سدوم میں رہتی ہے اور دینِ حنیف کی تبلیغ کرو۔“

ایک ہجرت اور ہوئی لیکن یہ ہجرت پہلی ہجرت سے مختلف تھی۔

"حکم الٰہی یہ ہے کہ تم سدوم چلے جاؤ اور وہاں رہ کر دینِ حنیف کی تبلیغ کرو اور میری رسالت کا پیغامِ حق سناؤ اور میں واپس فلسطین چلا جاؤں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو سربلند کروں گا۔"

حضرت لوط علیہ السلام سدوم اور عامورہ کی طرف چلے گئے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے جدا ہو جانے کے بعد اللہ عزوجل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی آنکھ اٹھا اور جس جگہ تو ہے وہاں سے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کی طرف دیکھ کیونکہ یہ ملک جو تو دیکھ رہا ہے میں تجھ کو اور تیری نسل کو ہمیشہ کے لیے دوں گا اور میں تیری نسل کو خاک کے ذرّوں کے مانند بناؤں گا ایسا کہ اگر کوئی شخص خاک کے ذرّوں کو گن سکے تو تیری نسل بھی گن لی جائے گی۔ اٹھ اور اسی ملک کے طول و عرض میں سیر کر کیونکہ میں اسے تجھ کو دوں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم سے شام کی طرف لوٹ گئے اور بیت المقدس کو مغرب میں چھوڑ کر اسی جگہ ڈیرے لگا دیے جہاں مصر آتے ہوئے آپؑ نے قربان گاہ تعمیر کی تھی۔

وہ تھوڑے سے لوگ بھی آپؑ کے ساتھ آئے تھے جو آپؑ پر ایمان لے آئے تھے۔ انہوں نے بھی اِدھر اُدھر خیمے لگا لیے اور ایک چھوٹی سی بستی بن گئی۔ یہی لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے کھیتی باڑی کرنے اور ریوڑوں کو چرانے گھمانے لگے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اب دنیاوی مال و دولت کی کثرت تھی لیکن بڑھاپا سر سے ہو کر گزر رہا تھا اور دونوں بیویاں ابھی تک اولاد سے محروم تھیں۔

کہتے ہیں یہاں رہتے ہوئے آپؑ کو بیس سال ہو چکے تھے۔

خدا کا کلام آپ پر نازل ہوا۔ "اے ابراہیم تو مت ڈر، میں تیری سپر اور تیرا بہت بڑا اجر ہوں۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ "اے خدا تو مجھے کیا دے گا۔ میں تو بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار دمشقی الیعزر (غلام) ہے۔ تو نے مجھے کوئی اولاد نہیں دی۔ کیا میرا خانہ زاد میرا وارث ہوگا؟"

خدا کا کلام نازل ہوا۔ خدا نے فرمایا۔ "یہ تیرا وارث نہ ہوگا بلکہ وہ ہوگا جو تیرے صلب سے پیدا ہوگا۔ وہی تیرا وارث ہوگا۔ آسمان کی طرف نگاہ کر اور اگر تو ستاروں کو گن سکتا ہے تو گن۔ بس تیری اولاد ایسی ہی ہوگی۔"

"میرے مالک! یہ کیسے ہوگا۔ میری بیوی تو بانجھ ہے۔ بنجر زمین سے کھیتی کی امید کیا رکھوں۔"

"میں خدا ہوں۔ تجھے کسدیوں کے "اور" سے نکال لایا۔ یاد کر میری ہی قدرت تھی کہ تو آگ سے محفوظ رہا تھا۔ میں ہی تھا جو تجھے گمراہی سے راہِ راست کی طرف لایا۔ میں مُردوں کو زندہ اور زندوں کو مُردہ کرتا ہوں۔ میری شان بہت عظیم ہے۔ میں تجھ کو یہ ملک میراث میں دوں گا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ "میں کیونکر جانوں کہ میں اسی ملک کا وارث ہوں گا۔"

خدا نے کہا۔ "میرے لیے تین برس کی ایک بچھیا اور تین برس کی ایک بکری اور تین برس کا ایک مینڈھا۔ ایک قمری اور ایک کبوتر کا بچہ لے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور خدا کے حکم سے ان کو بیچ سے دو ٹکڑے کیا اور ہر ٹکڑے کو اس کے ساتھ کے دوسرے ٹکڑے کے مقابل رکھا مگر پرندوں کے ٹکڑے نہ کیے۔

سورج ڈوبتے وقت آپؑ پر تھوڑی نیند غالب ہوئی اور ہولناک تاریکی چھا گئی۔ تب خدا عالمِ رویا میں آپؑ سے مخاطب ہوا۔ "یقین جان کہ تیری نسل کے لوگ ایسے ملک میں جو ان کا نہیں پردیسی ہوں گے اور وہاں کے لوگوں کی غلامی کریں گے اور وہ چار سو برس تک انہیں دکھ دیں گے لیکن میں اس قوم کی عدالت کروں گا جس کی وہ غلامی کریں گے اور بعد میں وہ بڑی دولت لے کر وہاں سے نکل آئیں گے اور تو صحیح سلامت اپنے باپ دادا سے جا ملے گا اور نہایت پیری میں دفن ہوگا اور وہ چوتھی پشت میں یہاں لوٹ آئیں گے کیونکہ اموریوں کے گناہ اب تک پورے نہیں ہوئے۔

اس کے بعد ایک تنور جس میں سے دھواں اٹھتا تھا دکھائی دیا اور ایک جلتی مشعل ان ٹکڑوں کے بیچ سے ہو کر گزری۔ اسی وقت خدا نے ابراہیم علیہ السلام سے عہد کیا اور فرمایا کہ یہ ملک دریائے مصر سے لے کر اس بڑے دریا یعنی دریائے فرات تک، ان میں آباد تمام قوموں سمیت میں نے تیری اولاد کو دیا ہے۔

آنکھ کھلی تو اطمینانِ قلب نے اپنے حصار میں لے لیا۔ اپنے آپ پر یقین تھا۔ سمجھ گئے کہ کوئی معجزہ ہونے والا ہے۔ ان

بڑھاپے میں مجھے اولاد ملے گی اور میری نسل اس کثرت سے ہوگی جیسے آسمان پر ستارے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملنے والی اس بشارتِ عظمیٰ میں یہ امتِ محمدیہ بھی داخل ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد میں یہ زیادہ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بشارت اس امت کے بغیر کامل نہیں ہو سکتی۔ اس بات کی تائید حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے۔

"بے شک! اللہ نے میرے لیے زمین کو سمیٹ دیا پھر میں نے اس کے مشرق و مغرب کو دیکھا اور عنقریب میری امت کی سلطنت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک اس کو میرے لیے سمیٹا گیا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ خوش خبری حضرت سارہ کے گوش گزار کی تو متعجب ہوئیں اور اپنے بڑھاپے پر نظر ڈال کر خاموش ہو گئیں۔

"سارہ تم خاموش کیوں ہو گئیں ہو کیا تمہیں میرے رب کی باتوں پر یقین نہیں ہے؟"

"یقین نہ ہوتا تو ایمان کیوں لاتی۔ بس اپنے بڑھاپے کا خیال آ گیا تھا۔ پھر یہ بھی سوچتی ہوں کہ میں تو سدا کی بانجھ ہوں۔ میرے اولاد کیسے ہوگی۔"

"تم بانجھ کب ہو۔ یہ تو خدا کی مصلحت تھی کہ تمہارا دامن اولاد سے خالی رہا۔ اب اسی کی مصلحت ہے کہ ہمیں وارث ملنے والا ہے۔"

حضرت سارہ کو اس وقت یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ حضرت ہاجرہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ ہیں۔ یہ خوش خبری ان کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ انہیں تو یہ اس وقت یاد آیا جب اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔ حضرت ہاجرہ نے یہ خوش خبری خود انہیں سنائی کہ وہ امید سے ہیں۔

حضرت سارہ نے اس خبر کو تحمل اور خوشی سے سنا۔ ایک احساس یہ ضرور ہوا کہ یہ وعدہ اگر میرے ذریعے ہوتا تو میں کتنی خوش قسمت ہوتی۔ اس روز حضرت ہاجرہ ان کے پاس آ کر بیٹھیں تو نہ جانے کیوں یہ احساس ہونے لگا کہ اس گھر میں میرا وجود تو محض وجود ہے، گھر کی اصل مالکن تو یہ ہے۔

اس زمانے کے رواج کے مطابق چھوٹی بیوی بڑی کی خدمت گار ہوا کرتی تھی۔ اب تک حضرت سارہ انہیں اس نظر سے دیکھتی رہی تھیں لیکن اب اچانک وہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ حضرت ہاجرہ سے اب کوئی خدمت نہیں لی جا سکتی۔ کچھ دن نہیں گزریں گے کہ ہاجرہ کا مرتبہ مجھ سے بڑھ جائے گا۔ اگر بیٹا جنا تو اردگرد کی عورتوں کی نظروں میں بھی اس کا مقام و مرتبہ مجھ سے بڑھ جائے گا۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام مجھ سے زیادہ اس سے محبت کرنے لگیں گے۔

آپ ان جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن یہ بشری تقاضے تھے، وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی چلے گئے۔ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام گھر میں داخل ہوئے تو ان جذبوں کو زبان مل گئی۔

"اب کیا ہاجرہ مجھ سے زیادہ باعزت ہو جائے گی؟"

"عزت تو اسے ملے گی جسے میں دوں گا۔"

"کیا وہ آپ کے بیٹے کی ماں بننے کے سبب مجھ پر سبقت نہیں لے جائے گی؟"

"کیا میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم مجھ پر اس وقت ایمان لائی تھیں جب کوئی میرے ساتھ نہیں تھا۔"

"یہ تو آپ کی بات ہوئی ورنہ میں دیکھ رہی ہوں وہ اب بھی میری برابری کر رہی ہے۔ اب وہ میری خدمت گار نہیں رہی۔"

"وہ اب بھی تمہاری خدمت گار ہے۔ تم اس کے ساتھ جو جی چاہے کرو۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بات کو رفع دفع کرنے کے لیے کہا۔

حضرت ہاجرہ ایک پردے سے لگی یہ سب باتیں سن رہی تھیں۔ آپ نے اس وقت یہ دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان کی طرف سے بدل گئے ہیں۔ حضرت سارہ کے تیور بدلنے لگے ہیں اب وہ میرے ساتھ نہ جانے کیا کریں۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ ممکن ہے یہ خیال بھی آیا ہو کہ یہاں رہ کر کہیں ان کے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

انہیں کہاں جانا ہے یہ ابھی سوچا نہیں تھا بس ویرانے میں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ کچھ دور جا کر ایک چشمے پر نظر پڑی، پیاس کی شدت نے آگے نہیں بڑھنے دیا اور آپ وہاں ٹھہر گئیں۔ ابھی آپ نے پانی سے ہونٹ تر کیے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی آتا

نظر آیا۔ آپ کو ڈر ہوا کہ کہیں یہ آدمی نقصان نہ پہنچائے۔ وہ چاہتی تھیں کہ بھاگ کھڑی ہوں لیکن اتنی مہلت ہی نہ مل سکی۔ اس آدمی نے ان کا نام لے کر پکارا تھا۔

''ہاجرہ تو کیوں بھاگی اور کدھر کو جاتی ہے۔''

''تو کون ہے اور مجھے نام سے کیسے پہچانتا ہے؟''

''میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا فرشتہ ہوں۔''

''کیا تو نہیں جانتا کہ ابراہیمؑ کی پہلی بیوی کو مجھ پر شک ہوا ہے اور میں اس کی طرف سے پہنچنے والے نقصان سے بچ کر بھاگ آئی ہوں۔''

''اسی لیے تو مجھے بھیجا گیا ہے۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ تو بی بی سارہ کے پاس لوٹ جا اور اپنے کو اس کے قبضے میں دے دے۔ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔''

آپ واپس آئیں اور حضرت سارہ سے معافی کی خواستگار ہوئیں۔

انہوں نے حضرت سارہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے پورا واقعہ سنا دیا کہ کس طرح وہ فرشتہ ملا اور اس نے بیٹے کی بشارت دے کر کہا، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔

وقت اور آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

بچے کا نام طے شدہ تھا لہٰذا ''اسمٰعیل'' رکھ دیا گیا۔

وحی پھر نازل ہوئی۔ ''میں نے اسمٰعیل کے حق میں تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس کے گیارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔''

اس پیغام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نظروں میں حضرت ہاجرہ کی وقعت بڑھ گئی۔ آپؑ ہر طرح سے ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنے لگے آپؑ ان کے پاس بیٹھ کر شیر خوار سے کھیلتے اور حضرت ہاجرہ کی تعریفیں کرتے تو حضرت سارہ کی اداسی دراز ہو جاتی۔ آپ سوچنے لگتیں کاش! میں نے بیٹا جنا ہوتا۔ شوہر کی نظروں میں سرخرو ہو گئی ہوتی۔

آپ برگزیدہ پیغمبر کی بیوی تھیں۔ صاحبِ ایمان تھیں۔ اللہ کی مشیت کی قائل تھیں لیکن بشری تقاضے تھے جو ان کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے تھے۔ یہ حسد اتنا بڑھا کہ اپنے گھر میں حضرت ہاجرہ کے بچے کا وجود کانٹا بن کر کھٹکنے لگا وہ عجیب نہج پر سوچنے لگیں اور اس کا اظہار انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کر بھی دیا۔

''اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ میں بانجھ ہوں اور ہاجرہ اپنے بچے سے کھیلتی ہے۔''

''یہ تو خدا کی مصلحت ہے۔ کیا تجھے یہ پسند نہیں کہ میرا وارث میرے آنگن میں کھیلے؟''

''یہ وارث میرے پیٹ سے ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔''

''خدا کی قدرت سے کیا بعید ہے۔ کیا خبر وہ تمہیں بھی صاحبِ اولاد کر دے۔''

''پھر بھی میں یہ نہیں چاہوں گی کہ ہاجرہ کا بچہ میرے بچے کے ساتھ کھیلے۔''

''پھر تم کیا چاہتی ہو؟''

''ان کو میری آنکھوں سے دور لے جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ میری آنکھوں کے سامنے رہیں۔''

آپؑ حضرت سارہ سے بے حد محبت کرتے تھے لیکن حضرت ہاجرہ بھی پرائی نہیں تھیں اور جس بیٹے کو نکالنے کے لیے کہا جا رہا تھا وہ ان کا اپنا بیٹا تھا اور ابھی تو گود ہی میں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اپنی ماں کا سہارا بن سکے۔

حضرت ہاجرہ کو کسی اجنبی مقام پر چھوڑ آنا آپؑ کے نزدیک ظالمانہ فیصلہ تھا۔ دوسری طرف حضرت سارہ کے تقاضے تھے کہ بڑھتے جا رہے تھے۔ آپؑ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہے تھے کہ وحیِ الٰہی نے مدد کی۔

آپ سے فرما دیا گیا۔ ''سارہ نے جو کچھ کہا ہے اس پر کان رکھ۔''

حضرت ہاجرہ کو کہیں لے جا کر چھوڑ دینا چونکہ مشیتِ ایزدی کا حصہ تھا اس لیے آپؑ کو اس مقام سے بھی باخبر کر دیا گیا جہاں اس شیر خوار اور حضرت ہاجرہ کو چھوڑنا مقرر ٹھہرایا گیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت نرم دل تھے۔ اتنی گواہی تو قرآن نے بھی دی ہے:

''بے شک! ابراہیم بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔''

انہیں یہ فیصلہ ہرگز قابلِ قبول نہ ہوتا کہ زوجہ اور بڑی دعاؤں کے بعد ملنے والے بیٹے کو عالمِ شیر خوارگی میں خود سے الگ کر دیں اور ایک اجنبی مقام پر بے سہارا چھوڑ آئیں۔ یہ فیصلہ ناخوشگوار تھا لیکن حکمِ الٰہی سے سرتابی ممکن بھی نہیں تھی۔ وحی کے ذریعے انہیں بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ حضرت سارہ کی بات مان کر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بیابان میں چھوڑ آئیں۔ ایک صبح آپؑ نے ایک مشکیزہ پانی کا ساتھ لیا اور ایک تھیلی میں کھجوریں بھر لیں۔ حضرت ہاجرہ سے فرمایا کہ وہ ان کے ساتھ چلیں۔ اس فرماں بردار بیوی نے یہ تک نہ پوچھا کہ وہ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ بچے کو گود میں اٹھایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ چل دیں۔

جب بستی پیچھے رہ گئی اور ویرانہ سامنے آ گیا۔ گرمی نے آنکھیں دکھانی شروع کر دیں تو حضرت ہاجرہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ تپتے ہوئے صحرا کا سفر شروع ہوا تو پریشانی مزید بڑھ گئی۔

''یہ آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ یہاں تو صحرا ہی صحرا ہے۔''

''میں ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔''

''مجھے فخر ہے کہ آپؑ نے سارہ کو ساتھ نہیں لیا مجھے ساتھ رکھا لیکن بستی تو پیچھے رہ گئی۔ کیا آپ کا دوست اس لق و دق صحرا میں رہتا ہے؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس چلتی رہو۔ جب دوست کا گھر آ جائے گا تو وہ خود مجھے آواز دے لے گا۔ ہم وہیں رک جائیں گے۔ تم خود دیکھ لینا۔''

اس کے بعد کچھ اور پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

''اے ابراہیم، تجھے بس اسی مقام پر رک جانا ہے۔''

ایک آواز نے انہیں رک جانے کو کہا اور آپؑ رک گئے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں آج کعبہ ہے اور زم زم کا کنواں ہے۔ اس وقت نہ کعبہ تھا نہ زمزم، بس ایک قدرے ابھری ہوئی زمین تھی اور ایک درخت کھڑا تھا۔ دور دور تک نہ کسی آبادی کے آثار تھے نہ کوئی بھولا بھٹکا انسان نظر آ رہا تھا۔ تین نفوس کے سوا جو تھا کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک کوئی پرندہ بھی اڑتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں قریب میں کہیں پانی بھی نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ کو درخت کے نیچے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ یہ درخت گھنا نہیں تھا۔ چند پتے تھے جو دھوپ کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے لیکن پھر بھی صحرا میں یہ جنگلی درخت غنیمت تھا۔

حضرت ہاجرہ اس درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ وہ یہی سمجھی ہوں گی کہ دوست کا گھر تو کہیں آگے ہے۔ یہاں تھکن اتارنے کے لیے کچھ دیر کے لیے انہیں بٹھا دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پانی کا مشکیزہ اور کھجوروں کا تھیلا ان کے پاس رکھ دیا۔ کچھ دیر کھڑے انہیں دیکھتے رہے پھر منہ موڑ کے چل دیے۔

حضرت ہاجرہ نے جب دیکھا کہ وہ انہیں چھوڑ کر واپس اسی راستے پر جا رہے ہیں جس طرف سے آئے تھے تو ان کے دل میں اندیشے نے سر اٹھایا۔ آپ نے بچے کو زمین پر رکھا اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دامن پکڑ کر جھول گئیں۔

''اے ابراہیمؑ! آپ تو واپس جا رہے ہیں۔''

''ہاں یہی وہ مقام ہے جہاں دوست سے ملاقات ہوگی۔''

''پھر آپ کیوں جا رہے ہیں؟''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس شاید اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا یا آپؑ جواب دینا نہیں چاہتے تھے۔ آپؑ آگے بڑھتے جا رہے تھے، حضرت ہاجرہ حالتِ اضطراب میں دوڑتی جا رہی تھیں اور سوال کرتی جا رہی تھیں۔ ''آپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟''

جب آپ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی سوال کا جواب نہیں دے رہے ہیں اور رکنے کو بھی تیار نہیں تو آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں سے لپٹ گئیں۔

"کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم فرمایا ہے؟"

"ہاں ایسا ہی ہے۔"

"اگر اللہ نے فرمایا ہے تو وہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔" حضرت ہاجرہ نے فرمایا اور مطمئن ہو کر واپس اسی مقام پر تشریف لے آئیں جہاں وہ اپنے بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو لٹا کر گئی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مڑ کر چل پڑے حتیٰ کہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں پہنچ گئے جہاں سے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ان کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ آپؑ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"اے ہم سب کے پروردگار۔ ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام ونشان نہیں، میں نے اپنی اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں۔ پس تو اپنے فضل وکرم سے ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق مہیا کر دے تاکہ تیرے شکر گزار ہوں۔"

اس دعا کے مؤثر ہونے تک بہت سے مرحلے تھے جن سے حضرت ہاجرہ کو گزرنا تھا۔

مشکیزے میں پانی اور تھیلے میں کھجوریں کتنے دن کی مقدار تھی؟ یہ بات پریشانی کی ضرور تھی لیکن آپ کہہ چکی تھیں کہ اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ اس لیے دل کو اطمینان تھا کہ کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکلے گی۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پہلے کھجوریں ختم ہوئیں پھر مشکیزے کا پانی ختم ہو گیا۔ دو وقت کے فاقے ہوئے۔ بچے کو دودھ پلانے بیٹھیں تو دودھ کہاں سے اترتا۔ یہ وہ صورت حال تھی جو آپ نے سوچی بھی نہیں تھی۔ صرف یہ سوچا تھا کہ اگر کھجوریں ختم ہو گئیں تو میں کیا کھاؤں گی۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ کچھ نہیں کھاؤں گی تو دودھ کیسے اترے گا۔ مقام ایسا تھا کہ تین دن گزرنے کے بعد کسی انسان کو اس طرف آتے نہیں دیکھا تھا۔ مدد کے لیے پکارتیں تو کس کو۔

گرمی اپنے جوبن پر تھی۔ سورج کی تمازت تھی کہ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ پیاس کی شدت سے بچہ تڑپ رہا تھا کئی مرتبہ دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن ایک قطرہ بھی نہ اترا۔ بچے کے ہونٹ ماں کی چھاتیوں کی طرح خشک تھے۔ اب شاید بچے میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ آنکھیں کھولتا۔ آپ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور دوڑتی ہوئی قریب کی پہاڑی "صفا" پر چڑھ گئیں کہ شاید بلندی سے انہیں کوئی انسان نظر آ جائے اور وہ اسے اپنی مدد کے لیے پکار لیں یا کہیں پانی کے آثار نظر آ جائیں۔ دیکھا ضرور لیکن ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ پھر خیال آیا "میرا بچہ۔" وہ وہاں اکیلا پڑا ہے۔ بچے کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آ گئیں۔ بچے کی حالت بہ دستور وہی تھی۔ انہوں نے اپنے کرتے کا دامن اٹھا لیا اور ایک ایسے انسان کی طرح دوڑیں جو پوری طاقت سے دوڑتا ہے۔ دوسری جانب "مروہ" کی پہاڑی تھی۔ وہ پوری رفتار سے پہاڑی پر چڑھتی چلی گئیں کہ شاید یہاں سے کسی انسان کو دیکھ لیں۔ یہاں سے بھی ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ پھر اتریں اور واپس آ کر بچے پر ایک نظر ڈالی۔ امید نے پھر آپ کو "صفا" کی جانب دوڑا دیا۔ پھر اتریں اور وادی کو پار کر کے "مروہ" پر چڑھ گئیں۔ صفا اور مروہ کے درمیان آپ دیوانوں کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ ہر پھیرے میں بچے پر ایک نظر ڈال لیتیں اور پھر پہاڑیوں کی طرف دوڑ پڑتیں۔ اس طرح آپ نے سات مرتبہ چکر کاٹے (یہی وہ "سعی بین الصفا والمروہ" ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں)

آخری پھیرے میں جب وہ "مروہ" پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی۔ اس آواز پر آپ چونکیں اور کہنے لگیں کہ کوئی پکارتا ہے۔ کان لگایا تو پھر آواز آئی۔ آپ بے اختیار چیخ اٹھیں۔ "اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ۔ تمہاری آواز میں نے سن لی ہے۔"

آپ نے دیکھا بچے کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے، جو اپنے پاؤں کی ایڑی سے زمین کرید رہے تھے پھر آپ نے اپنا پیر زمین پر مارا تو زمین سے چشمہ ابل پڑا۔ حضرت ہاجرہ یہ دیکھ کر "مروہ" سے نیچے اتر آئیں اور ابلتے ہوئے پانی کے گرد باڑ بنانے لگیں تاکہ پانی بہہ نہ جائے اور کہنے لگیں۔ "زم زم" یعنی رک جا رک جا۔ اسی لیے اس پانی کو آج تک زم زم کہا جاتا ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ ام اسمٰعیل پر رحم کرے اگر وہ زم زم کو اس طرح نہ روکتیں اور اس کے چار جانب باڑ نہ لگاتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا۔"

حضرت ہاجرہ نے یہ پانی پیا اور پھر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو دودھ پلایا۔

سنہری باتیں

طب نبوی ﷺ سے صحت مند زندگی حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک

☆ کھانا ہاتھ دھو کر داہنے ہاتھ سے بسم اللہ پڑھ کر شروع کریں۔ ☆ نظام انہضام کی بہتری کے لیے ہفتے میں دو روزے رکھیں۔

☆ مریض کے پاس بیٹھ کر کھانا نہ کھائیں۔ ☆ کھڑے ہو کر کھانے سے بدہضمی ہوتی ہے۔

☆ کھانا ٹھنڈا کر کے کھاؤ گرم کھانے سے معدہ کمزور ہوتا ہے۔ ☆ اکیلے کھانا مت کھاؤ۔

☆ دسترخوان پر گری ہوئی چیز اٹھا کر کھانے سے رزق میں فراخی ہوتی ہے۔

☆ انجیر کھانے سے انسان مرض قولنج سے محفوظ رہتا ہے۔

☆ لوکی یعنی کدو کھایا کرو یہ دل ودماغ کو قوت بخشتا ہے۔

☆ تبخیر معدہ کے لیے کھیرا مولی گاجر شلجم کھایا کرو۔

☆ زیادہ عرصہ صحت مند رہنے کے لیے صبح اور رات کا کھانا باقاعدگی سے کھایا کرو۔

☆ کھانا کھانے کے بعد الحمدللہ کہو پانی کھانے سے پہلے اور درمیان میں پئیں۔

☆ کھانا کھانے کی ابتدا میں نمکین یا اختتام میں نمکین چیز کے استعمال سے ستر بیماریاں دور ہوتی ہیں۔

☆ دوپہر کے بعد نہانا جوڑوں میں درد پیدا کرتا ہے۔

☆ رات کو سفر کیا کرو کیونکہ رات کو زمین لپیٹ دی جاتی ہے۔

☆ اگر سورۃ قدر 21 مرتبہ پڑھ کر سواری (مثلاً جہاز بس کشتی ٹرین موٹر کار گھوڑا اسکوٹر وغیرہ) پر سوار ہوں گے تو سواری ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہے گی اور بخیر وعافیت منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

☆ مسلمان کا جھوٹا کھانا کھانے میں شفا ہے۔

مرسلہ: روشنی رشید دھمیال کیمپ راولپنڈی

فرشتے نے ہاجرہؓ سے کہا۔ "خوف اور غم نہ کر۔ اللہ تعالیٰ تجھ کو اور اس بچے کو ضائع نہیں کرے گا۔ یہ مقام "بیت اللہ" ہے جس کی تعمیر اس بچے (اسمٰعیل) اور اس کے باپ ابراہیمؑ کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا۔"

اسی دوران میں بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آ کر ٹھہرا۔ قافلے کے لوگوں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر پرندے اڑ رہے ہیں۔

"تو کیا قریب میں کہیں پانی ہے؟"

"ہم یہاں سے ہزاروں مرتبہ گزرے ہیں۔ دور دور تک پانی کا نام ونشان نہیں۔ اسی لیے تو اس صحرا کو مکہ کے نام سے پکارا جاتا ہے جس کے ایک معنی پانی کم ہونے کے ہیں۔"

"پھر یہ پرندے کیوں اڑتے دکھائی دے رہے ہیں؟"

"کچھ لوگ جائیں اور دیکھ کر آئیں کہ کیا ماجرا ہے۔"

یہ لوگ زم زم کے مقام تک آئے اور خبر لے کر واپس چلے گئے۔ انہوں نے اپنے سردار کو بتایا۔ "عجیب ماجرا ہے۔ ویرانے میں ایک عورت اپنے بچے کے پاس بیٹھی ہے اور ان کے قریب چشمہ جاری ہے۔"

قبیلے کے لوگ یہ خبر سنتے ہی اس معجزے کو دیکھنے کے لیے چشمے کی طرف چل دیے۔ دیکھا تو جو سنا تھا وہی تھا۔

"تم کون اور یہاں کیوں؟"

"میرے اللہ نے مجھے یہاں بٹھا دیا ہے۔"

"اور یہ پانی؟"

"یہ بھی اللہ کی دین ہے۔"

"اب یہ جگہ رہنے کے لائق ہو گئی ہے۔ تم کہو تو ہم بھی یہاں قیام کر لیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاجرہ خود بھی باہمی انس و رفاقت کے لیے یہ چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آکر مقیم ہو۔ اسی لیے انہوں نے مسرت کے ساتھ بنی جرہم کو قیام کی اجازت دے دی۔

جرہم نے آدمی بھیج کر اپنے باقی ماندہ اہلِ خاندان کو بھی بلالیا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے لگے۔ پانی میسر آگیا تھا لہٰذا کھیتی باڑی بھی کرنے لگے۔

ان ہی میں رہتے بستے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بھی پرورش ہونے لگی۔

☆☆☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام پچھلی تین راتوں سے ایک ہی خواب دیکھ رہے تھے۔ ایک گھنا تاریک جنگل ہے۔ وہ اس جنگل میں اپنے پیارے بیٹے اسمٰعیل کو لے جاتے ہیں اور اس کے گلے پر چھری پھیرتے ہیں۔

آپؑ نے یہ خواب پہلی مرتبہ دیکھا تو صدقے کے طور پر اونٹ قربان کر دیا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی کیا لیکن تیسری شب کسی نے پکار کر کہا۔ ''ابراہیم! تو ہماری راہ میں اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ آزمائش پہلی مرتبہ نہیں ہو رہی تھی۔ اب تک آپؑ کو مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا اور ہر مرتبہ کامل و مکمل ثابت ہوئے تھے۔

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو فاران کے بیابان میں چھوڑنے کا حکم ملا تو وہ کوئی معمولی امتحان نہیں تھا۔ بڑھاپے کی اکلوتی اولاد جسے یہ کہہ کر مانگا تھا کہ میں بے وارث جا تا ہوں۔ اسی وارث کو صرف حکمِ الٰہی کی تکمیل کے لیے بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ آئے اور اب کہا جا رہا تھا کہ اسی نورِ نظر کو ہماری راہ میں قربان کر دو۔

یہ امتحان سب امتحانوں سے کڑا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چشمِ تصور سے دیکھا۔ پچھلے دنوں جب آپؑ بیٹے کو دیکھنے کے لیے فاران کی طرف گئے تھے تو وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ دوڑنے لگا تھا۔ ان کے گلے میں جھول جاتا تھا۔ اس نے چھوٹی سی کمان دکھائی تھی جس سے وہ تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ اب کہا جا رہا تھا اس کے گلے پر چھری پھیر دو۔ یہ سوچتے ہی جھرجھری سی آگئی لیکن پھر استقامت نے آواز دی۔ حکمِ الٰہی سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ مجھے اس آزمائش سے بھی سلامت روی سے گزرنا ہے۔ آپؑ نے مکہ جانے کی تیاری شروع کر دی کہ وہ گلِ نوخیز وہیں تھا۔

یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہیں تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جز وہ بیٹا تھا جس کی قربانی کا حکم دیا جا رہا تھا۔ اس خواب سے اسے بھی آشنا کرنا ضروری تھا۔ ایک لمحے کو یہ بھی خیال آیا کہ بیٹے کو کچھ نہ بتایا جائے لیکن یہ تو دھوکا ہوتا۔ آپؑ نے سوچا یہ امتحان صرف میرا نہیں اسمٰعیل کا بھی ہے۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔

کہا جاتا ہے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر اس وقت سات سال تھی۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں پہنچ گئے۔ یہ خیال آتے ہی کہ کچھ دیر بعد اسے اللہ کی راہ میں قربانی کرنا ہے، آپ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بیٹے کی نظر باپ پر پڑی تو قدموں سے لپٹ گیا۔ آپؑ نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''آؤ اس پتھر پر بیٹھ جاؤ۔ ہم تم سے کچھ باتیں کریں گے۔''

''گھر کیوں نہیں چلتے۔ وہاں اماں بھی ہوں گی۔''

''یہ باتیں ان سے کرنے کی نہیں ہیں۔ صرف تم سن لو۔''

''کیا بات ہے ابا جان۔ بتایئے۔''

''بیٹا، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تیرے گلے پر چھری پھیر رہا ہوں۔ تیرا کیا خیال ہے، مجھے یہ کرنا چاہیے؟''

''جس کا آپ کو حکم ہوا ہے کر ڈالیے۔ انشاءاللہ آپ مجھ کو صابرین میں پائیں گے۔''

اس کم سنی میں بیٹے کی زبان سے ایسے سنجیدہ کلمات سنے تو ایک مرتبہ پھر آپؑ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اپنی ماں کو اس خواب کے بارے میں کچھ مت بتانا۔'' آپؑ نے فرمایا اور بچے کو لے کر گھر کی طرف چل دیے۔

وفاشعار بیوی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اچانک اپنے سامنے دیکھا تو کھل اٹھیں۔ ہاتھ تھام کر قریب بٹھالیا۔ کچھ دیر آپؑ کی خیریت دریافت کرتی رہیں۔ اپنی خیریت سے آگاہ کرتی رہیں، پھر آپؑ کی خاطر مدارات کے لیے اٹھنا چاہا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے روک لیا۔

''میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ایک جگہ جانا ہے۔ اسمٰعیل کو تیار کر دو۔ اسے بھی ساتھ لے جانا ہے۔''

حضرت ہاجرہ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو نیا کرتہ پہنا دیا۔ خوشبو لگائی اور اچھی طرح تیار کر کے والد کے حوالے کر دیا۔

''جلدی آجایئے گا۔ اسمٰعیل کے بغیر میرا دل نہیں لگتا ہے۔ اس کے سوا میرا یہاں اور ہے بھی کون۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس چھری اور رسی کو خوب اچھی طرح چھپا لیا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور بیٹے کو لے کر گھر سے باہر نکل آئے اور ایسے راستے پر چل کھڑے ہوئے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو کیونکہ اب یہاں بنی جرہم کے لوگ آباد ہو گئے تھے۔

آپؑ کے باہر نکلتے ہی ایک بزرگ نما شخص نے دروازے پر دستک دی۔ حضرت ہاجرہ اس آواز پر باہر آئیں تو ایک ایسے آدمی کو اپنے سامنے پایا جسے یہاں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

''جانتی ہے تیرا شوہر تیرے بیٹے کو کہاں لے گیا ہے؟''

''اپنے کسی دوست سے ملوانے۔''

''تجھے یاد ہے؟ ایک دن وہ تجھے بھی یہاں اسی بہانے سے لایا تھا اور پھر ویرانے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب وہ تیرے بیٹے کو قتل کرنے کے لیے لے گیا ہے۔ دوڑ کے جا اور اس کو روک لے۔''

''میں کیوں جاؤں۔ میرے خدا نے پہلے بھی میری مدد کی تھی، اب بھی کرے گا۔''

حضرت ہاجرہ اس سے باتیں کر رہی تھیں کہ یہ شخص کون ہے اور اتنی ہمدردی کیوں جتا رہا ہے۔ انہیں اچانک خیال آیا کہ یہ ضرور شیطان ہے۔

''مردود تو کہیں شیطان تو نہیں۔''

یہ سننا تھا کہ وہ شخص کھڑے کھڑے غائب ہو گیا۔

یہ شخص واقعی شیطان تھا جو انسان کا روپ بدل کر حضرت ہاجرہ کو بہکانے آیا تھا۔

جب اسے یہاں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعاقب کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسے پہچان لیا اور مٹی کے ڈھیلے اٹھا کر اس کی طرف پھینکنے شروع کر دیے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے بھی باپ کی پیروی کی۔

یہ ادا اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا شیوہ بنا دیا کہ وہ اسی مقام ''منیٰ'' پر شیطان کو کنکریاں ماریں۔

آج تک یہ رسم ادا کی جا رہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ آپؑ نے رسی نکالی اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ پھر اسمٰعیل علیہ السلام کو پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا۔ شاید اس لیے کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر رحم نہ آجائے۔ ایک پتھر پر چھری تیز کی اور آنکھیں بند کر کے بیٹے کی گردن پر چلا دی لیکن چھری نے خراش تک نہ لگائی۔

اسی وقت وحیِ الٰہی نازل ہوئی۔

''اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ بے شک! یہ بہت سخت آزمائش تھی۔ اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس جو یہ مینڈھا کھڑا ہے اس کو بیٹے کے بدلے ذبح کر۔ ہم نیکوکاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں۔''

آپؑ نے مینڈھا دیکھنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ببول کا ایک درخت تھا۔ اسی درخت کے ساتھ مینڈھا بندھا ہوا تھا۔ آپؑ نے اسے کھولا اور اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔

یہی وہ قربانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار ہمیشہ ملتِ ابراہیمی کا شعار قرار پائی۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔ ''ہم نے اس (ابراہیم) کو (بدلے میں) عظیم قربانی عطا کی یعنی ہم نے ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے کی قربانی کے بجائے ایک دوسرا جانور عطا کیا۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس مینڈھے نے جنت میں چالیس سال چرا تھا۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں اس کا سرخی مائل اون تھا اور وہ عمدہ آنکھوں اور سینگوں والا تھا۔

توریت کے مطابق بھی یہ مینڈھا ہی تھا۔

"اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا۔"

مینڈھے تک تو بات ٹھیک ہے لیکن توریت کے نزدیک قربانی دینے والے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے چنانچہ توریت میں ہے۔

"ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اسحٰق کو لیا اور سوختنی قربانی کے لیے لکڑیاں چیریں اور اٹھ کر اس جگہ کو جو خدا نے اسے بتائی تھی روانہ ہوا۔"

"ابرہام نے قربان گاہ بنائی اور اس پر لکڑیاں چنیں اور اپنے بیٹے اسحٰق کو باندھا اور اسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے اوپر رکھا۔"

توریت کی ہی ایک عبارت اس کی نفی کرتی ہے۔

"تب اس (خدا) نے کہا تو اپنے بیٹے اسحٰق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور اسے وہاں پہاڑوں میں سے جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے لیے چڑھا۔"

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکلوتے بیٹے کے ساتھ حضرت اسحٰق علیہ السلام کا نام بے محل جوڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جس وقت یہ قربانی ہوئی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی اکلوتے بیٹے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش کے تیرہ سال بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اگر بالفرض اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش ہو چکی ہوتی تو قرآن بھی اور توریت بھی یہ کہتے کہ بڑے کو قربان کر یا چھوٹے کو۔ دو بیٹوں کی موجودگی میں "اکلوتے بیٹے" کہہ کر کیوں مخاطب کیا جاتا؟

قرآن کی عبارت یہ ہے۔

"بشارت دی ہم نے ان کو بردبار لڑکے کی پھر جب وہ اس سن کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے تو ابراہیم نے کہا اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ پس تو دیکھ کیا سمجھتا ہے؟ کہا "اے میرے باپ! جس بات کا تجھے حکم کیا گیا ہے وہ اگر اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں پائے گا۔ پس جب ان دونوں نے رضا و تسلیم کو اختیار کر لیا اور پیشانی کے بل اس (بیٹے) کو پچھاڑ دیا۔ ہم نے اس کو پکارا۔ اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ بے شک! ہم اسی طرح نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے اور بدلہ دیا ہم نے اس کو بڑے ذبح (مینڈھے) کے ساتھ اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اس کے متعلق یہ باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو۔ اس طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے اور بشارت دی ہم نے اس کو اسحٰق علیہ السلام کی جو نبی ہوگا......"

اس عبارت کے مطابق حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دی جا رہی ہے۔ ابھی وہ پیدا نہیں ہوئے یعنی اکلوتے اسمٰعیل ہی ہیں جن کی قربانی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

دراصل توریت کے نسخوں میں تحریف کی گئی ہے اور اسحٰقؑ کا نام جوڑ دیا گیا ہے۔

اہل کتاب کو دراصل اس بات پر حسد نے ابھارا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عرب کے باپ ہیں اور انہی میں سے پیغمبر آخرالزماں ﷺ ہیں جبکہ حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب کے والد ہیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب حضرت اسرائیل تھا جس کی طرف بنی اسرائیل منسوب ہیں۔ اس وجہ سے بنی اسرائیل نے چاہا کہ یہ شرف و مرتبہ اپنی طرف کھینچ لیں۔ اس مذموم مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے توریت میں تحریف کر دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عالم سے جو مسلمان ہو گیا تھا پوچھا کہ ابراہیمؑ کے دو بیٹوں میں سے کس کے لیے ذبح کا حکم نازل ہوا تو اس نے کہا۔ "اے امیرالمومنینؓ وہ اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور یہود اس کو جانتے ہیں لیکن تم عربوں پر حسد کرتے ہیں کہ تم کو تمہارے باپ کی وجہ سے یہ شرف حاصل ہو۔"

(جاری ہے)

ماخذات قصص القرآن۔ قصص الانبیأ۔ توریت۔ حضرت ابراہیم از علامہ عباس محمود

طریقۂ کار

اثر نعمانی

طریقۂ واردات جو بھی ہو، اثر تو ارادوں میں ہوتا ہے... جیسی منشا ہوتی ہے ویسے رستے ملتے ہیں... یہی حال ان کا بھی تھا جو اپنے اصولوں پر کاروبارِ حیات چلانے کے عادی تھے۔ انہیں دوسروں کی نہ منطق سمجھ آتی تھی نہ منطقی لوگ انہیں اچھے لگتے تھے... البتہ وہ اپنا فلسفہ دوسروں پر تھوپنے کے ماہر تھے اور ان کی یہی مہارت ان کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ مختلف طریقۂ کار اختیار کرنے والے ایک ہی منزل کے مسافر نکلے۔

چہروں پر چہرے سجانے والے چور سپاہی کی دوستی کا سنگین احوال

پریسٹن کی پچاس سالہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے بہ چشم خود ایک آدمی کو قتل ہوتے دیکھا۔ وہ اپنے سروس کلب کے ہفتہ واری اجلاس میں شرکت کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اجلاس میں اخبار "دی نیوز" کے پُرجوش پبلشر اور ایڈیٹر مارٹن نے تقریر کرتے ہوئے پاک وصاف سیاست کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اجلاس ختم ہوا تو اس نے پیدل دفتر جانے کا فیصلہ کیا اور یوں محض اتفاقاً وہ بلچر اسٹریٹ سے گزر رہا تھا۔ بلچر اسٹریٹ ایک چھوٹی سی گلی تھی

جس میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک مکانات واقع تھے۔ پریسٹن نے ایسے ہی ایک مکان سے ایک عورت اور تین مردوں کو نکلتے دیکھا۔ ابھی یہ چاروں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ ایک قریبی موڑ پر بہت تیزی سے آتی ہوئی ایک پولیس کار نمودار ہوئی۔ کار سے ایک بار سائرن بجایا گیا جو اس بات کا انتباہ تھا کہ گلی میں چلنے والے اپنی جگہ رک جائیں لیکن سائرن سنتے ہی ان چاروں نے مختلف سمتوں میں بھاگنا شروع کردیا۔

کار رکتے ہی دو ڈیٹکٹیو دونوں اطراف سے نکل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ ایک مرد اور عورت واپس اس مکان کی طرف لپکے جہاں سے وہ نکلے تھے۔ باقی دو مرد جنوب کی طرف بھاگے۔ پریسٹن بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ عورت بڑے اضطراب کے عالم میں مکان کا مقفل دروازہ کھولنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کا ساتھی مکان کے عقبی آہنی زینے کی طرف بڑھا ڈیٹکٹیو نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عورت ایک چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ ڈیٹکٹیو نے کہنی مار کر عورت کو پیچھے دھکا دیا اور پھر بائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر ایک زبردست گھونسا مارا۔ گھونسا نشانے پر لگا۔ عورت تکلیف سے کراہتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ ڈیٹکٹیو نے پلٹ کر آدمی کی طرف جست لگا کر اسے پکڑ لیا اور جب اس نے اپنی جیب سے کوئی چیز نکالنے کی کوشش کی تو ریوالور کا دستہ اتنی زور سے اس کے سر پر مارا کہ وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

دوسرا ڈیٹکٹیو جو کہ باقی دو مردوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا، جلد ہی ان میں سے ایک کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ پولیس افسر کو اپنے سر پر دیکھتے ہی اس آدمی نے جلدی سے خود سپردگی کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ سر کے اوپر بلند کردیے۔ ڈیٹکٹیو نے ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر ایک بھرپور ضرب ماری۔ وہ آدمی ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ اس کے سر سے خون نکلنے لگا تھا۔ دوسرا آدمی جو آگے بھاگا جارہا تھا اب سڑک کے موڑ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ڈیٹکٹیو نے للکار کر اسے رکنے کا حکم دیا اور جب وہ نہیں رکا تو نشانہ لیتے ہوئے گولی چلا دی۔ پریسٹن نے فائر کا دھماکا سنا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گولی کس طرح اس بھاگنے والے آدمی کے لگی، کس طرح وہ اچھلا، گھٹنوں کے بل جھکا اور ایک لمحہ اس حالت میں رہنے کے بعد بے جان ہوکر زمین پر گر گیا۔

اس وقت تک گلی میں لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ پریسٹن نے موقع واردات پر جانے کے لیے سڑک پار کرنا چاہی تو ایک پولیس مین نے اس کا راستہ روک دیا۔ وہ دوسرے افراد کو بھی جانے سے روک رہا تھا۔

پریسٹن نے تیز نظروں سے پولیس مین کو گھورا۔ آج وہ ایک پولیس والے کو بالکل نئی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہ تیزی سے گھوما اور ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے قریبی ڈرگ اسٹور کی جانب بڑھنے لگا جہاں سے وہ اخبار ”دی نیوز“ کو فون کرنا چاہتا تھا۔

اگلے دن کیپٹن برانڈی سینٹرل پولیس اسٹیشن میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اخبار ”دی نیوز“ کی ایک کاپی پڑی تھی اور نظروں کے سامنے وہ صفحہ کھلا ہوا تھا جس پر اداریہ تحریر تھا۔ اخبار کی یہ کاپی اسے پولیس کمشنر کرنل اسٹیڈ نے دی تھی جو اس وقت کافی غصے اور جوش کے عالم میں کیپٹن کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

”کیپٹن۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”اداریہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ کہاں تک سچ ہے؟“

جو اداریہ اس وقت زیر بحث تھا، اس کا عنوان تھا۔ ”ہماری پولیس کی لاقانونیت؟“ یہ اداریہ اخبار کے پبلشر اور ایڈیٹر مارٹن نے بذات خود تحریر کیا تھا۔ اس میں اس حادثے کی لفظی تصویر کشی کی گئی تھی جو گزشتہ دن پریسٹن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اداریہ میں بڑے سخت الفاظ میں سارجنٹ ٹویڈ اور ڈیٹکٹیو میکلیگ کے طرز عمل کی مذمت کی گئی تھی۔ یہ دونوں آفیسر اس حادثے میں ملوث تھے۔ ایڈیٹر نے اس پر بس نہیں کیا تھا بلکہ ماضی کے کئی واقعات کی جانب بھی اشارہ کیا تھا۔ جن میں متعدد پولیس آفیسروں نے لاقانونیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے ایڈیٹر مارٹن نے ایک مثال دی تھی کہ کس طرح مشہور بدمعاش... انگر اخبار ”دی نیوز“ کی کوششوں کے باعث پکڑا گیا ہے اور کس طرح انگر کی محبوبہ اسٹیلا جو کہ اب اخبار کی پناہ میں تھی، اس بدمعاش کے خلاف گواہی دینے اور اس کا کچا چٹھا بیان کرنے پر آمادہ ہے۔ مارٹن نے لکھا تھا کہ یہ کامیابی اسے صاف ستھرے، قانون کے اندر رہتے ہوئے تحقیقات کے ذریعے حاصل ہوئی ہے نہ کہ پولیس کی طرح کسی سخت گیر یا غیر قانونی کارروائی کے نتیجے میں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اپنی موجودہ روش اختیار کرنے میں ہرگز حق بجانب نہیں کہا جاسکتا۔ اداریہ کے

آخر میں مارٹن نے نئے نامزد پولیس کمشنر کرنل اسٹیڈ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ سارجنٹ ٹویڈ اور ڈیٹکٹیو میکلیگ اور اس جیسے پولیس افسران کے خلاف ضروری کارروائی کریں اور اس بات کا پورا خیال رکھیں کہ آئندہ پولیس یا عوام دونوں میں سے کوئی اپنی قانونی حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

”تقریباً صحیح ہے۔“ کیپٹن برانڈی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”مگر میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔“ کرنل اسٹیڈ نے زور دے کر کہا۔ ”ان دونوں آدمیوں کو بلاؤ۔ میں انہیں فوراً معطل کرنا چاہتا ہوں۔“

”ذرا سکون سے کام لو۔“ کیپٹن بولا۔ ”ٹویڈ اور میکلیگ دونوں ایک بہت اہم کیس کے سلسلے میں آج صبح قصبے سے باہر چلے گئے ہیں اور میں کم سے کم دو دن تک ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی انہیں معطل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دراصل تمہیں اس معاملے کے تمام حقائق کا علم نہیں ہے۔“

”اور تمہیں ہے؟ معلوم ہے کہ تم یہاں اس کرسی پر بیٹھ کر ان قاتلوں کا دفاع کررہے ہو۔“ کرنل اسٹیڈ چیخا۔ ”کیا تم نہیں جانتے کہ اس میکلیگ نے ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا، گھونسا مار کر اس کا منہ لہولہان کردیا اور پھر انتہائی بے رحمی سے اس کے ساتھی کو سر پر ضرب مار کر بے ہوش کردیا۔ جبکہ سارجنٹ ٹویڈ نے ایک ایسے شخص کو زخمی کیا جو بغیر کسی تشدد کے اپنے آپ کو قانون کے سپرد کرنا چاہتا تھا اور پھر دوسرے شخص کو گرفتار کرنے کے بجائے گولی مار کر ہلاک کردیا اور گولی بھی اس کی پیٹھ میں ماری۔ کیا یہی ہے وہ ڈیٹکٹیو بیورو جو تمہاری ماتحتی میں کام کررہا ہے۔“

کیپٹن برانڈی دونوں ہاتھوں کے درمیان اپنا سر پکڑے کرنل اسٹیڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے جذبات سے خالی تھا۔

”میری ماتحتی میں اس ملک کا ایک بہترین ڈیٹکٹیو بیورو اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور اگر تم ٹھنڈے دل سے میری بات سنو تو میں تمہیں ایسے حقائق بتاؤں جنہیں نوجوان مارٹن اپنے جذباتی اداریہ میں دانستہ نظر انداز کرگیا ہے۔ وہ بدمعاش جن کے لیے تم اس قدر تاؤ کھا رہے ہو ساگل کے گروہ کے نام سے مشہور ہیں، اس عورت کا نام مٹی ہے، ناجائز نشیات کی عادی۔ اس کا پولیس ریکارڈ تمہارے تصور سے بھی زیادہ طویل ہے گزشتہ ماہ سینٹ لوئیس میں جب اس کے ساتھی ایک گارڈ کو اپنی اذیت پسندی کا نشانہ بنا رہے تھے تو یہ عورت گارڈ کے ننگے پیروں کو جلتے ہوئے سگار سے داغ کر قہقہے بلند کررہی تھی اور جب بالآخر انہوں نے اس گارڈ کو قتل کردیا تو اس عورت نے اس کی پیشانی پر اپنے بوسے کی مہر ثبت کی۔ بڑی محبت کرنے والی خاتون ہے!..... اس کا ساتھی جسے میکلیگ نے ریوالور کے دستے سے مارا تو وہ تین قتل کرچکا ہے اگر ان دونوں کا بس چل جاتا تو وہ میکلیگ کو اپنے دانتوں سے کچا چبا لیتے۔ سارجنٹ ٹویڈ کے حصے میں آنے والے دو بدمعاشوں کا حال اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ جس آدمی کو اس نے گولی ماری اس کا نام ساگل تھا۔ وہ ایک ڈاکو اور بہت سے بے گناہوں کا قاتل تھا جن میں ایک پولیس افسر بھی شامل ہے اگر اسے مارا نہ جاتا تو وہ فرار ہوجاتا اور نامعلوم اور کتنے بے گناہوں کا خون بہاتا۔ وہ دوسرا غنڈا ٹونی جو تمہارے بقول بغیر کسی تشدد کے خود کو پولیس کے حوالے کررہا تھا، تشدد پسندی میں ماہر ہے۔ گروہ کے ہاتھوں میں پڑنے والے بدقسمت افراد کے لیے اذیت رسانی کے نت نئے طریقے وہی ایجاد کرتا ہے اور ان پر اپنے سامنے عملدرآمد کراتا ہے۔“

”اگر ساگل اتنا ہی برا اور خطرناک آدمی تھا تو اسے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے عدالت میں پیش کیا جانا چاہیے تھا۔“ کرنل اسٹیڈ نے کہا۔ ”جس طرح اب اس بدمعاش انگر پر مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔“

”انگر ابھی تک عدالت میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔“ کیپٹن برانڈی نے سرد لہجے میں بتایا۔ ”اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم معقول تعداد میں پولیس فورس کے ساتھ بلچر اسٹریٹ کے اس مکان پر چھاپا مارتے اور اس گروہ کو حتی الامکان سکون اور خاموشی سے گرفتار کرلیتے مگر ہوا یہ کہ سارجنٹ ٹویڈ کو اپنے ایک خاص مخبر سے اطلاع ملی کہ ساگل اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ اس مکان میں چھپا ہوا ہے اور بہت جلد وہاں سے کسی دوسری جگہ فرار ہورہا ہے۔ ٹویڈ نے پولیس اسٹیشن فون کیا، تو یہاں صرف ڈیٹکٹیو میکلیگ ہی موجود تھا۔ وہ دونوں فوراً بلچر اسٹریٹ پہنچے اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا عین وقت پر پہنچے۔ ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوجاتی تو وہ سب کے سب دوبارہ پولیس کی نظروں سے اوجھل ہوجاتے۔ سارجنٹ ٹویڈ یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہاں صرف یہی چار آدمی ہیں یا کچھ اور بھی چھپے ہوئے ہیں۔ موقع ملنے پر ان میں سے کوئی بھی قتل کرتے نہیں ہچکچاتا۔ ان حالات میں اس نے وہی کیا جو بہتر اور مناسب تھا۔“

''کچھ بھی سہی مگر یہ لوگ بہر حال انسان تھے۔''

کرنل اسنیڈ اب بھی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ٹوینڈ اور میکلنگ کو بلا تاخیر معطل کر دیا جائے۔ میں تمہاری ان وضاحتوں سے مطمئن نہیں ہوں، بہتر ہوگا کہ ہم لوگ ابھی ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ تم کس طرح اپنا شعبۂ انتظام چلاتے ہو؟ یہ بلاشبہ تمہاری ذمے داری ہے اور میں بلاوجہ تمہارے معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتا، لیکن جب تک میں پولیس کمشنر ہوں اور اس اعتبار سے عوام کے سامنے جواب دہ ہوں۔ تمہیں اور تمہارے تمام ماتحتوں کو ہر معاملے میں قانون کی پابندی کرنا پڑے گی۔''

''تم ایک کامیاب بزنس مین ہو کرنل۔'' کیپٹن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی بمشکل تین ہفتے گزرے ہیں کہ میئر نے تمہیں پولیس کمشنر نامزد کیا ہے اور پولیس کے ساتھ کام کرنے کا تمہارا تجربہ بھی صرف تین ہفتے پرانا ہے جبکہ میں تیس سال سے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کام کر رہا ہوں۔ میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کا چیف ہوں کیونکہ میرے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ میں اپنے فرائض اور ذمے داریوں کو پہچانتا ہوں۔ اب تم تین ہفتوں کے تجربے کے ساتھ، ایک اخبار کا جذباتی، حقائق سے گریزاں اداریہ پڑھ کر میرے دفتر میں قدم رکھتے ہو اور مجھے بتانا چاہتے ہو کہ میں کس طرح اپنے فرائض انجام دوں۔''

کرنل اسنیڈ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تم تیس سال سے پولیس میں ملازم ہو یا تین سو سال سے۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر پورا زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جو آدمی بھی قانون شکنی کرتا ہے وہ مجرم ہے، خواہ اس کے بازو پر پولیس کا کوئی بیج لگا ہو یا نہ لگا ہو، تم اس محکمے کا کام ان ہی قوانین کے مطابق چلانے کے پابند ہو کیپٹن، جن کی وفاداری کا تم نے حلف اٹھایا ہے ورنہ خدا کی قسم میں دیکھوں گا کہ تم کب تک اس کرسی پر بیٹھے رہ سکتے ہو۔''

کیپٹن برانڈی نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے کندھے اچکائے۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولا ''تم پولیس کمشنر ہو۔ جس طرح چاہو گے اس طرح کیا جائے گا۔''

''میرے آفس میں اخباری نمائندے سرکاری بیان جاری کرنے کے منتظر ہیں۔'' کرنل اسنیڈ نے کسی قدر نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ''میں انہیں یہی بیان دوں گا جو اس وقت تمہیں بتا رہا ہوں کہ ٹوینڈ اور میکلنگ کو معطل کر دیا جائے گا اور آئندہ اس محکمے کے افراد خواہ وہ افسران ہوں یا عام پولیس کانسٹیبل، قانون کے نفاذ میں اس کی حرف بہ حرف پابندی کریں گے۔''

جب کرنل اسنیڈ چلا گیا تو کیپٹن برانڈی نے بیل بجا کر اپنی سیکریٹری سیلی کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ سارجنٹ ٹوینڈ اور ڈیٹکٹیو میکلنگ کو بلا تاخیر اس کے پاس آنے کی ہدایت کرے۔ کچھ ہی دیر کے بعد آفس کے باہر ایک گشتی پولیس کار رکنے کی آواز سنائی دی۔ کیپٹن اس آواز سے مانوس تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ گشتی کار نمبر سات ہے، اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ فوراً ہی آفس کا دروازہ کھلا اور ٹوینڈ اور میکلنگ اندر داخل ہوئے۔

''ابھی کرنل اسنیڈ آیا تھا۔'' کیپٹن نے ان دونوں کو بتایا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم دونوں کسی جگہ مچھلی کے شکار پر چلے جاؤ۔''

میکلنگ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ ہنسی نمودار ہوئی۔ اگرچہ اسے کھیتی باڑی چھوڑے ہوئے بیس برس سے زیادہ مدت ہو چکی تھی، لیکن وہ اب بھی اپنے چہرے سے کوئی دیہاتی ہی نظر آتا تھا۔

''جب بھی کوئی نیا کمشنر آتا ہے ہمیں مچھلی کے شکار پر جانا پڑتا ہے۔'' وہ بولا اور ٹوینڈ کی طرف دیکھا۔ ''اس مرتبہ کہاں چلو گے؟''

''اگر میری پنشن میں ڈیڑھ سال باقی نہ رہ گیا ہوتا۔'' ٹوینڈ نے جواب دیا۔ ''تو میں سیدھا اس اخبار کے دفتر جاتا اور اس مارٹن کے بچے کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا۔'' اس نے اپنی بغل سے ''دی نیوز'' کا تازہ پرچہ نکالا۔ ''میں تقریباً بیس برس سے اس قسم کی تحریروں کو برداشت کر رہا ہوں اور اب میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔''

''تمہیں تو اب تک اس کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔ ''مجھ سے کسی ہمدردی کی امید مت رکھنا، میرے لیے میری اپنی ...... پریشانیاں ہی بہت کافی ہیں۔ اب آئندہ ہم کہیں چھاپا ماریں گے تو پہلے ہمیں تلاشی کا وارنٹ حاصل کرنا ہوگا۔ سوائے اس صورت کے کہ تم خود اپنی آنکھوں سے کوئی جرم ہوتے دیکھو۔ آئندہ کسی کو بغیر وارنٹ گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ گرفتاری کے فوراً بعد تمام مشکوک و مشتبہ افراد کو جیل لایا جائے گا، انہیں پولیس اسٹیشن کی حوالات میں نہیں رکھا جا سکتا اور ہر قیدی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دے تو اس سے جبراً کوئی بات نہیں اگلوائی جائے۔''

میکلنگ نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔

''مگر ہمارا محکمہ اس انداز میں کام نہیں کر سکتا۔'' وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں۔'' کیپٹن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مگر کرنل اسنیڈ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہے۔ میں صرف ایک دفتر میں ملازم ہوں۔ ہمیں یا تو وہی کچھ کرنا پڑے گا جو وہ کہتا ہے یا پھر اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے اور میں اب اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ تنزلی یا بے روزگاری کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ بہرحال زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کرنل جلد یا بہ دیر اپنا سبق سیکھ لے گا۔''

''ضرور مگر اس دوران میں......'' ٹوینڈ نے کہنا شروع کیا لیکن کیپٹن نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اس دوران میں ہم احکامات کی پابندی کریں گے۔'' وہ بولا ''مجھے یاد ہے کہ جب میں نیا نیا ملازم ہوا تھا تو ہمارا کمشنر ایک ایسا ہی آدمی تھا جیسا کرنل اسنیڈ، جسے اصلاحِ معاشرہ کی ایک تحریک کے نتیجے میں کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔ ہماری ایک محکمانہ پالیسی یہ تھی کہ کسی شہری کو اس وقت تک شراب کے نشے میں نہ سمجھا جائے جب تک وہ ہمیں کسی گٹر وغیرہ میں پڑا ہوا نہ ملے لیکن اس نئے کمشنر نے ...... میں اس وقت اس کا نام بھول رہا ہوں۔ یہ حکم جاری کیا کہ تمام شرابیوں کو گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کیا جائے اور شرابی کی تعریف یہ ہے کہ پولیس کانسٹیبل اس کے منہ سے شراب کی بدبو آتی ہوئی محسوس کر لے۔''

''معلوم ہوتا ہے وہ بھی اتنا ہی بے خبر تھا جتنا کرنل ہے۔'' ٹوینڈ مسکرایا۔

''ان زمانے میں بوڑھا ریلوٹ پولیس چیف تھا۔ چنانچہ ان نے ہم سب کو بلا کر ضروری ہدایات جاری کر دیں۔ اب اتفاق سے کمشنر کا یہ نیا حکم جمعرات کے دن آیا تھا۔ ہفتے کی رات کو تمام چھٹیاں کینسل کر کے سب کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم دے دیا گیا اور ہم سب پولیس اسٹیشن سے نکل پڑے۔ جیسے ہی تھیٹر اور سنیماؤں کے شو ختم ہوئے ہمارا کھیل شروع ہو گیا۔ پولیس کے جوانوں نے ہر اس شخص کو گرفتار کر لیا جس کی سانس سے ذرا بھی شراب کی بو محسوس ہوئی۔ ان گرفتار شدگان میں خود ڈسٹرکٹ اٹارنی اور میئر کا والد بھی شامل تھے۔ عدالتیں اور دفاتر ہفتہ اتوار کے لیے بند ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ سب پیر کی صبح تک جیل میں بند رہے، نتیجہ اس کارروائی کا یہ ہوا کہ پورے قصبے میں نئے کمشنر کا مذاق اڑایا گیا۔ اس پر اتنی تنقید کی گئی کہ اس نے تنگ آ کر اپنے عہدے سے استعفا دے دیا اور اس کے بعد پھر وہی پالیسی چالو ہو گئی کہ کسی شخص کے بارے میں اس وقت تک یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ اس نے شراب پی ہے یا شراب کے نشے میں ہے جب تک وہ گٹر میں پڑا ہوا نہ پایا جائے۔''

اتنا کہہ کر کیپٹن کچھ دیر کے لیے رکا اور پھر ٹوینڈ اور میکلنگ کی طرف دیکھا۔

''اب تم یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ۔ ایک دو دن کے لیے کسی کو نظر نہ آنا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن سیلی کے پاس کوئی ایسا فون نمبر چھوڑ جاؤ جہاں میں ضرورت پڑنے پر تم سے رابطہ قائم کر سکوں۔ اس درمیان میں ممکن ہے کچھ ایسے واقعات پیش آ جائیں کہ ہم دوبارہ اپنے معمول کے مطابق کام کرنے لگیں۔''

☆☆☆

پھر واقعی ایک ایسا حادثہ پیش آ گیا۔ کیپٹن کی توقع سے بھی کہیں پہلے، اخبار میں ''ہماری پولیس کی لاقانونیت'' کا اداریہ شائع ہونے کے چھتیس گھنٹے کے اندر اندر اس کے مصنف اخبار کے ایڈیٹر مارٹن کو اغوا کر لیا گیا۔ کرنل اسنیڈ کا پیغام پا کر کیپٹن برانڈی ایمرجنسی اسپتال پہنچا جہاں اس نے مارٹن کی نوجوان بیوی کے سوجے ہوئے ہونٹوں سے اس اغوا کی داستان سنی۔ وہ پٹیوں میں لپٹی ہوئی ایک پلنگ پر لیٹی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کی تکلیف کم کرنے کے لیے اسے سکون کی دوا کا ایک انجکشن دے دیا تھا۔

''میں اور مارٹن تھیٹر دیکھنے گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''جب واپسی میں مارٹن نے گیرج کے سامنے کار روکی اور گیرج کا دروازہ کھولنے کے لیے نیچے اترا تو اچانک باڑھ کے تاریک سایوں سے تین آدمیوں نے نکل کر اسے گھیر لیا......'' اس نے ایک سسکی لی۔

''پھر کیا ہوا؟'' کیپٹن نے نرمی سے پوچھا۔

''انہوں نے مارٹن کو پکڑ لیا۔ میں اس کی مدد کے لیے دوڑی۔ ایک آدمی نے میرے بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور کوئی چیز میرے منہ اور ناک پر ماری۔ میں نے مارٹن کو غصے میں تیز تیز بولتے سنا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کسی نے میرے سر پر لگاتار ضربیں لگانا شروع کیں اس کے بعد میں بے ہوش ہو گئی۔''

''مجھے امید ہے کہ تم ان لوگوں کو پہچان لو گی۔'' کرنل اسنیڈ نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے پوچھا مگر مارٹن کی بیوی نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہاں بہت زیادہ اندھیرا تھا۔'' اس نے کہا۔

''پریشان مت ہو مسز مارٹن!'' کرنل نے ایک نگاہ

کیپٹن برانڈی پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں تمہارا شوہر ضرور واپس ملے گا۔ میں ذاتی طور پر خود اس کیس کا چارج لے رہا ہوں۔“

”اوہ شکریہ۔“ وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم اسے ان لوگوں کے قبضے سے ضرور چھڑا لاؤ گے کرنل، مارٹن کو تم پر اعتماد ہے اور وہ تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔“

”اگر تم انہیں شناخت نہیں کرسکتیں تو کوئی بات نہیں۔“ کیپٹن برانڈی نے بستر پر جھکتے ہوئے پوچھا۔ ”لیکن ذرا غور سے سوچ کر جواب دو کہ کیا ان میں سے کسی نے کوئی بات کی تھی؟“

”میرا خیال ہے کہ ان میں سے کسی نے مارٹن کے اداریہ کے بارے میں کچھ کہا تھا۔“ مسز مارٹن نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

”بہت خوب۔“ کیپٹن نے ہمت افزائی کی۔ ”اب یہ بتاؤ کہ یہ گفتگو کسی خاص لہجے میں کی گئی تھی مثلاً سرسری طور پر یا جوش کے ساتھ تیزی سے؟“

”مجھے تو معمولی ہی آواز لگی تھی اور لہجے میں بھی کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔“

مسز مارٹن سے کوئی اور بات معلوم نہ ہوسکی۔ ہیڈ کوارٹر واپس جاتے ہوئے کرنل اسمیڈ برابر اس موضوع پر بول رہا تھا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ اب اغوا کنندگان کی جانب سے مطالبۂ زر کا کوئی خط وغیرہ موصول ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”مارٹن بہت دولت مند آدمی ہے۔ ہمیں ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔“

اس نے کیپٹن کی طرف دیکھا۔

”تمہیں میری بات سے اتفاق ہے یا نہیں؟“

”مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو، اس کیس کا چارج تو تم نے لے لیا۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”مگر تم غلط اندازہ لگا رہے ہو۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو مارٹن کا اغوا اس کے اس اداریے کا براہ راست نتیجہ ہے، جس پر تم بڑے جوش میں آگئے تھے۔ مسز مارٹن نے ان لوگوں کو اداریہ کے بارے میں جو باتیں کرتے سنا ہے، اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔“

”ذرا وضاحت سے بتاؤ۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”بہت خوب۔“ کیپٹن سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”دی نیوز نے اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے ایک پبلسٹی مہم شروع کر رکھی ہے اور مارٹن اپنے نظریات پر لوگوں کو ہم نوا بنانے کی کوشش کر رہا ہے، وہ ابھی نوجوان ہے اور دوسرے بہت سے افراد کی طرح اسے ابھی زندگی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ بہرحال پبلسٹی کے خیال سے اصول پرستی کے پروپیگنڈے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مارٹن نے اپنے اداریوں میں انگر اور اس کے گروہ کی خبر لینا شروع کر دی۔ عوامی رائے اس پبلسٹی سے متاثر ہوئی اور یہ دباؤ اس حد تک بڑھا کہ ایک نئے ڈسٹرکٹ اٹارنی کا انتخاب عمل میں آیا اور ایک نئے پولیس کمشنر کا تقرر کیا گیا۔“

”کیپٹن، مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ تم......“

”مجھے امید بھی نہیں تھی کہ تم اسے پسند کرو گے۔“ کیپٹن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے میری رائے پوچھی تھی اور وہی میں بتا رہا ہوں۔ نام نہاد اصلاح کی اس مہم کے دوران اخبار ”دی نیوز“ نے کچھ ایسے ثبوت و شواہد حاصل کر لیے جن کی بنیاد پر انگر کے خلاف کارروائی کی جاسکتی تھی۔ خاص طور پر اس کی محبوبہ اسٹیلا کا بیان جو اس نے انگر کے خلاف دیا تھا۔ اگر وہ یہ بیان عدالت کے سامنے حلف اٹھا کر دے دے تو انگر کو موت کی سزا ہوسکتی ہے سوائے اس صورت کے کہ خود اسٹیلا کو کوئی حادثہ پیش آجائے اور وہ بیان نہ دے سکے، انگر کے بچنے کا کوئی امکان نہیں۔“

”کیا بیکار باتیں کر رہے ہو۔“ کرنل نے ناگواری سے کہا۔ ”اسے کوئی حادثہ کس طرح پیش آسکتا ہے اور اسی اندیشے کے پیش نظر اسٹیلا کو کہیں بہ حفاظت چھپا دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ خود انگر بھی جیل میں ہے۔“

”اگر تمہیں یاد ہو تو مارٹن نے ٹھیک یہی بکواس اپنے اداریہ میں بھی کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ پر اعتماد کرنے کے بجائے اخبار ”دی نیوز“ نے خود اسٹیلا کی حفاظت کی ذمّے داری لے لی ہے اور اخبار نے اسے بہ حفاظت چھپا رکھا ہے تاکہ مقدمے کے دوران عدالت میں پیش کر سکے۔ یہ اس کی حماقت تھی کہ اس نے اپنے جوش میں انگر کے گروہ کو وہ بات بتا دی جس کے بارے میں وہ ابھی شک وشبے میں مبتلا تھے انہیں یقینی طور پر نہیں معلوم تھا کہ اسٹیلا کس کے پاس ہے۔ یہ قیمتی اطلاع مارٹن نے انہیں فراہم کر دی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت بھی انگر کے آدمی مارٹن پر جبر و تشدد کر رہے ہوں گے کہ وہ انہیں اسٹیلا کا پتا بتا دے۔ اب چونکہ اس کیس کا چارج تمہارے پاس ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ پہلے اس کی فکر کرو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ مارٹن نے اسٹیلا کو کہاں رکھا ہے؟“

”نہیں۔“ کرنل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ بات مارٹن

نے صرف اپنی حد تک رکھی ہے۔“

اس نے کیپٹن کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کیا اور جب وہ خاموش رہا تو خود اس نے سوال کیا۔ ”انگر کے گروہ میں اس کا نائب سردار کون ہے؟“

”ایک اور بدمعاش جس کا نام ڈونو وان ہے۔“ کیپٹن نے بتایا۔ ”انگر جیل سے اپنے احکامات اپنے وکیل ریکارڈو کے ذریعے بھیجتا ہے اور ڈونو وان ان پر عملدرآمد کراتا ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ یہ آدمی ڈونو وان کہاں رہتا ہے؟“ کرنل نے پوچھا۔

”ہم چاہیں تو اس کا پتا لگا سکتے ہیں۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔ ”صرف اپنے مخبروں سے بات کرنا ہوگی۔“

”اسے فوراً ہیڈ کوارٹر بلاؤ۔“ کرنل نے ناگواری سے کہا۔ ”اور کیپٹن، میں چاہتا ہوں کہ مخبروں کے ذریعے کام لینے کا طریقہ ایک دم ختم کر دیا جائے۔ یہ اسی نوعیت کی چیز ہے جس طرح تھرڈ ڈگری۔ ایسی باتیں محکمے کی نیک نامی کو دھبا لگاتی ہیں۔“

کیپٹن کو ڈونو وان کا پتا لگانے اور اسے ہیڈ کوارٹر پکڑ کر لانے میں دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے۔ اور چونکہ اب قانون پر حرف بہ حرف عمل ہو رہا تھا اس لیے ڈونو وان کا وکیل ریکارڈو بھی اس کے ساتھ تھا۔ پولیس کمشنر نے سوال و جواب کی ذمے داری خود اپنے سر لے لی۔

”دیکھو ڈونو وان، میں تم سے سچ بولنے کی توقع رکھتا ہوں۔“ کرنل نے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم انگر کا دایاں ہاتھ ہو۔“

”یہ انگر کون ہے؟“ ڈونو وان نے آنکھیں چندھیاتے ہوئے پوچھا۔ کرنل کو یہ دانستہ تجاہل ناگوار گزرا۔

”انجان بننے کی کوشش مت کرو۔“ وہ چیں بہ جبیں ہو کر بولا۔ ”دی نیوز کے ایڈیٹر مارٹن کو گزشتہ رات اغوا کر لیا گیا ہے اور ہمیں شبہ ہے کہ اس میں تمہارا کچھ نہ کچھ ہاتھ ضرور ہے۔“

ڈونو وان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کا وکیل ریکارڈو بول اٹھا۔

”کوئی جواب مت دینا۔“ اس نے اپنے مؤکل کو مشورہ دیا اور پھر کمشنر کی طرف دیکھا۔ ”سنو کرنل، تم میرے مؤکل پر کوئی الزام تراشی نہیں کرسکتے۔ وہ یہاں اس لیے آیا ہے کہ تم نے اسے بلایا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم

اسے اپنے کسی جال میں پھانسنے کی کوشش کرو۔"

"یہاں کوئی ڈونووان کو کسی جال میں پھانسنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔" کرنل اسنیڈ نے غصے سے کہا۔ "ہم صرف سچائی جاننا چاہتے ہیں۔"

ڈونووان کے چہرے پر ایک طنزیہ تاثر نمودار ہوا ہی تھا کہ کیپٹن برانڈی کی سخت نگاہیں دیکھ کر غائب ہوگیا۔

"بہر حال میرا موکل اس بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔" ریکارڈو بولا۔ "اور اگر تمہیں صرف اتنا ہی کہنا تھا تو ہم اب اجازت چاہتے ہیں۔" وہ دونوں جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔

کرنل اسنیڈ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

"ٹھہرو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے تم دونوں کے ساتھ پوری صفائی اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش آنا چاہا تھا لیکن اگر ڈونووان نے میرے سوالات کا جواب نہیں دیا تو میں اسے گرفتار کرنے کا حکم دے دوں گا۔"

"کس جرم میں؟" ریکارڈو نے چیلنج کیا۔

"اگر تم سستی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی اور احمق آدمی کو تلاش کرو۔" ڈونووان نے ترشی سے کہا۔ "میرے خلاف تم کوئی بھی الزام ثابت نہیں کر سکتے۔"

"اس آدمی کو گرفتار کر لو کیپٹن۔" کرنل چلّایا۔

کیپٹن برانڈی اپنی کرسی سے اٹھا۔ ڈونووان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ کیپٹن نے دفعتاً اپنی ہپ پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تو ڈونووان گھبرا کر ایک کرسی سے الجھتا ہوا پیچھے ہٹا مگر کیپٹن نے اپنی جیب سے صرف رومال نکالا تھا۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔" ڈونووان سینہ تان کر بولا۔ لیکن جیسے ہی کیپٹن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ سکڑ سا گیا۔

"گھبراؤ نہیں ڈونووان۔" ریکارڈو نے اپنے موکل کو تسلی دی۔ "اپنا منہ بند رکھنا۔ میں ایک گھنٹے کے اندر تمہیں آزاد کرا لوں گا۔"

اس نے اپنا ہیٹ اور دستانے اٹھائے اور طنز آمیز انداز میں کیپٹن اور کرنل اسنیڈ کو سر کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے آفس سے باہر نکل گیا۔ کیپٹن نے اسکواڈ روم کا دروازہ کھول کر ایک ڈیٹکٹیو کو بلایا۔

"کمشنر اس آدمی کو بند کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اسے لے جاؤ اور حراست برائے تحقیقات کا اندراج کر کے جیل بھیج دو۔"

ڈونووان کے جانے کے بعد جب دروازہ بند ہوا تو کرنل اسنیڈ جیب سے رومال نکال کر پیشانی کا پسینا خشک کرنے لگا۔

"بے حد ذلیل آدمی ہیں دونوں۔" اس نے کہا۔ "میں نے ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کی کوشش کی تھی۔ خیر، اب ڈونووان کو اس وقت تک بند رکھو جب تک وہ شرافت اور تہذیب کی زبان نہ سیکھ لے۔"

"وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر آزاد ہو جائے گا۔" کیپٹن نے پیش گوئی کی۔ "ریکارڈو جج بے جا کی درخواست دے گا اور تمہیں یا تو ڈونووان کو آزاد کرنا ہوگا یا عدالت کے سامنے اس کی گرفتاری کی معقول وجوہات بتانا ہوں گی اور ظاہر ہے کہ تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے، نہیں کرنل میری بات لکھ لو وہ کچھ ہی دیر میں جیل کے باہر کھڑا ہوگا اور پھر غالباً تمہیں حبس بے جا کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا کہ تم نے اس کی گرفتاری کا حکم تو دے دیا مگر اس کے خلاف کوئی فردِ جرم عائد نہیں کر سکے۔"

"لیکن..... لیکن تم تو روزانہ یہ ہی کچھ کرتے رہتے ہو۔" کرنل نے کہا۔

"ضرور... لیکن ہم اس وقت تک کسی سوراخ میں داخل نہیں ہوتے جب تک ہمیں اس سے باہر نکلنے کا یقین نہ ہو۔"

☆☆☆

اگلے اڑتالیس گھنٹے غالباً کرنل اسنیڈ کی زندگی کے سب سے طویل گھنٹے تھے۔ جیسا کہ کیپٹن برانڈی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ حبسِ بے جا کی درخواست کے جواب میں عدالت کی طرف سے جاری کردہ فیصلے کے نتیجے میں ڈونووان جیل سے آزاد ہوگیا اور پھر اگرچہ پولیس کمشنر نے اپنا ایک پرائیویٹ سراغ رساں اس کی نگرانی کے لیے لگا دیا تھا مگر ڈانووان اسے جل دے کر نکل گیا۔ جیل سے قدم نکالتے ہی وہ یوں غائب ہوگیا جیسے کبھی موجود ہی نہیں تھا۔ لیکن کرنل کے لیے صرف ایک یہ ہی مشکل نہ تھی۔ تمام قومی پریس کسی فوری اور موثر کارروائی کا مطالبہ کر رہے تھے خاص طور سے "ڈی نیوز" جو کہ مارٹن کا اپنا اخبار تھا اس کے رپورٹر سائے کی طرح کرنل کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ان سے تنگ آ کر اسے کیپٹن برانڈی کے آفس میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔

"آخر تمہارے کارکنوں کو کیا ہوگیا ہے؟" وہ کیپٹن پر چڑھ دوڑا۔ "پورے دو دن مارٹن کو غائب ہوئے ہوچکے ہیں اور تمہارے آدمی اس سلسلے میں ذرا سی بھی پیش رفت نہیں کر سکے۔"

کیپٹن نے بے پروائی کے انداز میں کندھے اچکائے لیکن بہ ظاہر وہ کتنا ہی غیر متعلق نظر آ رہا ہو حقیقت یہ تھی کہ جب سے مارٹن کو اغوا کیا گیا تھا، اس نے اپنی یونیفارم نہیں اتاری تھی۔

"دوسروں کا نزلہ مجھ پر گرانے کی کوشش مت کرو۔" اس نے کرنل سے کہا۔ "تم اس کیس میں بالکل کسی کتابی جاسوس کی طرح کام کر رہے ہو۔ تمہیں اصرار ہے کہ میرے آدمی ہر طرف کسی سراغ کی تلاش کرتے رہیں، ڈاک پر نظر رکھیں کہ کب اغوا کنندگان کی طرف سے مطالبۂ زر کا خط آتا ہے اور کس طرح آتا ہے۔ تم نے سارجنٹ ٹویڈ اور ڈیٹکٹیو میکلیگ کو معطل کرنے کا حکم دے دیا جو کہ میرے بہترین کارکن تھے۔ تم نے مجھے تمام بدمعاشوں کو پولیس اسٹیشن پکڑ کر لانے سے روک دیا کیونکہ تمہارا احمقانہ حکم تھا کہ کوئی گرفتاری وارنٹ کے بغیر نہیں ہونا چاہیے، تم نے عام پبلک میں بیان دیا کہ آئندہ پولیس اپنے مخبروں کو استعمال نہیں کرے گی اور یوں ان سے ہمارا رابطہ ختم ہوچکا ہے۔ تم نے غلط طریقہ اختیار کر کے پورے کیس کا بیڑا غرق کر دیا ہے اور اب مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میرے کارکنوں کو کیا ہوگیا ہے۔"

کرنل نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تک اغوا کرنے والوں کی طرف سے ہمیں کوئی مطالبہ کیوں نہیں موصول ہوا۔" اس نے کہا۔ "آج مسز مارٹن نے مجھے بلایا تھا۔ وہ بہت بگڑ رہی تھی اور اس کی باتوں سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ذاتی طور پر اس کے شوہر کی گمشدگی کا ذمے دار ہوں۔"

"پھر تمہیں اس سے اور کس ردعمل کی توقع تھی؟" کیپٹن نے جواب دیا۔ "کیس سامنے آتے ہی ساری ذمے داری تم نے سنبھال لی اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو اس وقت نوجوان مارٹن انتہائی تکلیف دہ تجربے سے دوچار ہو رہا ہوگا۔ بدمعاش اس کی زبان کھلوانے کی پوری کوشش کر رہے ہوں گے، اسے مجبور کر رہے ہوں گے کہ وہ اس جگہ کا پتا بتائے جہاں اس نے اسٹیلا کو چھپا کر رکھا ہے اور اب تک ہم اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کر سکے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مارٹن اور تم جیسے لوگوں نے پولیس کے محکمے پر عوام کے اعتماد کو مجروح کر دیا ہے۔ اگر مجھے اسٹیلا کا پتا معلوم ہوتا تو میں اس کی حفاظت کے لیے ایک اسکواڈ تعینات کر دیتا۔ موجودہ صورت حال میں تو سوائے انتظار کرنے کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"انتظار..... انتظار..... انتظار مگر کب تک؟" کرنل اسنیڈ نے بیچارگی سے کہا اور بڑبڑاتے ہوئے آفس سے نکل گیا۔

اسے گئے ہوئے نصف گھنٹا ہوا تھا کہ ہیوی سائڈ اسکواڈ کے سارجنٹ میتھیوز کا فون آیا۔

"میں یہاں لوناسینی ٹوریم سے بات کر رہا ہوں۔" اس نے کیپٹن کو بتایا۔ "تقریباً بیس منٹ ہوئے کہ تین مسلح بدمعاش زبردستی اسپتال میں داخل ہوئے اور اسپتال

سنہرے موتی

☆ کسی بھی چیز کی قدر دو وقتوں میں ہوتی ہے ایک ملنے سے پہلے اور دوسرا کھونے کے بعد۔

☆ ہر رشتہ رشتہ نہیں بناتا پر کچھ بنا رشتوں کے ہی رشتے نبھاتے ہیں، شاید وہی لوگ دوست کہلاتے ہیں۔

☆ چار چیزیں کبھی نہ توڑو اعتماد، وعدہ، رشتہ، دل کیونکہ وہ جب ٹوٹتے ہیں تو شور نہیں ہوتا۔

☆ دوستی ایک ایسا پھول ہے جو ہمیشہ اعتماد و خلوص کی شاخ پر کھلتا ہے۔

☆ حق پر چلنے والے کا پاؤں شیطان کے سینے پر ہوتا ہے۔

☆ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھلا دے پر کسی کی دی ہوئی محبت کبھی نہ بھلائے۔

☆ جو خطرات سے کھیلنے کی ہمت نہیں رکھتا وہ زندگی بھر کچھ نہیں کر سکتا۔ جو گرتا نہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

مرسلہ۔ عثمان انصاری،
ہائی سیکیورٹی نیو سینٹرل جیل، ملتان

کے چوکیدار کو قتل کر کے زبردستی ایک مریضہ کو پکڑ کر لے گئے۔ بہ ظاہر اسپتال میں اس مریضہ کا نام میری ڈوئل درج کیا گیا تھا مگر پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اسٹیلا تھی۔"

"مجھے کسی ایسی ہی بات کی توقع تھی۔" کیپٹن نے افسردگی سے جواب دیا۔ "پھر ان کا کوئی سراغ ملا؟"

"بالکل نہیں۔ انہوں نے چہرے نقابوں سے چھپا رکھے تھے، اس لیے اسپتال میں کوئی انہیں شناخت نہیں کرسکا۔"

"تم دیکھو کہ اس سلسلے میں کیا کیا جاسکتا ہے۔" کیپٹن نے ہدایت کی۔ "جب تک تمہیں میری طرف سے کوئی واضح ہدایت نہ ملے، اس بارے میں اپنی زبان بند رکھو اور کسی کو کوئی رپورٹ نہ دو۔ ہمیں کم سے کم چند گھنٹوں تک اس خبر کو دبائے رکھنا ہے۔ مجھ سے برابر رابطہ قائم رکھو اور اپنی کارروائیوں سے مطلع کرتے رہو۔"

اس نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ کرنل اسٹیڈ دفتر میں داخل ہوا اور تھکے تھکے انداز میں ایک کرسی پر گر پڑا۔ کیپٹن اپنی کرسی سے اٹھا، کرنل کے سامنے آیا اور جھک کر سخت لہجے میں بولا۔

"جیسا کہ مجھے توقع تھی، ہمیں اسٹیلا کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے۔"

"بہت خوب۔" کرنل سیدھا ہو بیٹھا۔

"خوب کچھ نہیں، اسے اسپتال میں مریضہ بنا کر رکھا گیا تھا اور شناخت کو چھپانے کے لیے پٹیاں لپیٹ دی گئی تھیں، اس کے باوجود بدمعاش اسے پکڑ کر لے گئے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انگر کے آدمیوں نے اذیت پہنچا کر مارٹن کو اپنی زبان کھولنے پر مجبور کردیا۔ اور اب جبکہ وہ اسے پکڑ کر لے گئے ہیں، ان کے نزدیک مارٹن کا کوئی مصرف باقی نہیں رہ گیا۔"

"تمہارا مطلب ہے ...... کہ ...... کہ وہ مارٹن کو قتل کردیں گے؟"

"ممکن ہے۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے شبہ ہے۔ وہ اس وقت تک انتظار کریں گے جب تک انہیں ڈونووان کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں ملتی۔"

"تم چارج سنبھالو کیپٹن۔" کرنل نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اب یہی کرنے لگا ہوں۔" کیپٹن نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "اور اگر تم نے دوبارہ مداخلت کی کوشش کی تو میں تم سے بری طرح پیش آؤں گا۔ جب یہ سب کچھ ختم ہوجائے گا پھر جو تمہارا جی چاہے میرے خلاف کرتے رہنا لیکن کام کے دوران آرام سے یہاں بیٹھو اور پولیس کے کام کا کچھ تجربہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کیا جاسکتا ہے۔" کرنل نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا۔ "کاش ہمیں ڈونووان کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ کہاں چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔"

کیپٹن نے کرنل کو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ پلٹ کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔

"ریڈیو براڈ کاسٹ روم سے کنکشن دو۔" اس نے آپریٹر کو ہدایت کی۔ چند لمحوں میں رابطہ قائم ہوگیا۔

"ہیلو...... بیرن۔" اس نے براڈ کاسٹ روم کے انچارج سے کہا۔ "پولیس کی گشتی کار نمبر 42 کے لیے پیغام نشر کرو کہ وہ فوراً ہیڈ کوارٹر واپس پہنچے...... کیا؟...... ٹھیک ہے مجھے پتا ہے کہ کار نمبر 42 گزشتہ دو دن سے ضروری مرمت کے لیے ورکشاپ گئی ہوئی ہے، تم بحث کرنا بند کرو اور جو میں کہہ رہا ہوں کرو۔ فوراً پیغام نشر کرو۔"

ریسیور واپس کریڈل پر رکھتے ہوئے اس نے بیل بجا کر اپنی سیکریٹری سیلی کو بلایا۔

"سیلی! ذرا دیکھو کہ اسکواڈ روم میں کون کون ہے۔ اگر اشتر یا کرستان میں سے کوئی موجود ہو تو ان سے کہہ دو کہ دو چار تجربہ کار تندخو جوانوں کو جمع کریں۔ انہیں ضروری سامان سے لیس کریں۔ پھر میکی اور ٹراسک کو ہدایت کرو کہ وہ پولیس کے ہنگامی اسکواڈ کو تیار رکھیں، ہم ابھی کچھ دیر میں اپنی کارروائی کا آغاز کرنے والے ہیں اور دیکھو جیسے ہی ٹویڈ اور میکلیگ پہنچیں انہیں میرے پاس بھیج دینا اور خیال رکھنا کہ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے، بس جاؤ۔"

اور اب جبکہ کرنل اسٹیڈ حیرت سے منہ پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا، کیپٹن برانڈی نے میز سے ایک سروس ریوالور نکالا۔ اس کا میگزین چیک کیا۔ عام طور پر وہ پانچ گولیاں بھر کے گھوڑے کے نیچے والی گولی کے خانے کو خالی رکھتا تھا لیکن اس وقت اس نے اس خالی خانے میں بھی ایک گولی بھر لی اور پھر ریوالور واپس دراز میں رکھ دیا۔

کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور کرنل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جب اس نے سارجنٹ ٹویڈ اور ڈیٹکٹیو میکلیگ کے درمیان ڈونووان کو بھی پریشان اور خستہ حالت میں اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ادھر جب ڈونووان کی نگاہ پولیس کمشنر پر پڑی تو اس کی موجودگی سے ہمت پاکر بولا۔

"میرے ساتھ بہت ہی غیر قانونی سلوک کیا گیا ہے۔" مگر کرنل نے شاید اس کی بات نہیں سنی وہ تو سارجنٹ ٹویڈ کی طرف متوجہ تھا۔

"تلاش کرلیا۔" ڈونووان چیخا۔ "اے، یہ لوگ تو دو دن اور راتوں سے مجھے ایک گشتی کار میں لیے پھر رہے ہیں۔ میں صرف سینڈوچز کھا کر اور کافی پی کر گزارہ کررہا ہوں اور انہوں نے مجھے پوری طرح سونے بھی نہیں دیا ہے۔ مجھے اغوا کرلیا گیا تھا۔ میں اس کے خلاف مقدمہ......"

کیپٹن برانڈی میز کے گرد گھوم کر کرنل کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"میں جانتا تھا۔" اس نے کہا۔ "کہ آخرکار تم یہ کیس میرے سر ڈال دوگے۔ چنانچہ جیسے ہی ریکاڈو یہاں آیا میں نے ٹویڈ اور میکلیگ کو ہدایت کی کہ وہ ڈونووان کے جیل سے باہر قدم نکالتے ہی اسے اپنے قبضے میں کرلیں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ رہا ہوتے ہی ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاتا کہ پھر ہم کبھی اسے تلاش نہ کرسکتے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔" کرنل کی آنکھیں ڈھیلی ہوئی تھیں۔ "کہ تم نے واقعی اسے اغوا کرلیا تھا اور دو دن سے اسے گشتی کار میں جگہ جگہ لیے گھومتے رہے ہو۔"

"نہیں، پہلے دن ہم اسے مچھلی کے شکار پر لے گئے تھے۔" میکلیگ نے سادگی سے بتایا۔

کیپٹن نے دفعتاً آگے بڑھ کر ڈونووان کا گریبان پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

"ڈونووان۔" اس نے تیز و تند لہجے میں کہا۔ "تم نے سچ کہا۔ یہ اغوا ہے۔ تمہارے گروہ نے مارٹن کو اغوا کرلیا تھا۔ پھر اسے اذیت دے کر اس سے اسٹیلا کا پتا معلوم کیا، وہاں گئے اور چوکیدار کو قتل کر کے اسٹیلا کو لے گئے۔ اور ہم قدم بہ قدم ان ہی کی پیروی کریں گے۔ اب تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ تمہیں ہم سے کس طرز عمل کی توقع رکھنا چاہیے۔ ابھی ہم دوسرے مرحلے میں ہیں اور میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تمہارے آدمیوں نے مارٹن کو کہاں قید کر رکھا ہے؟"

"تم مجھے کسی جال میں نہیں پھانس سکتے۔" ڈونووان بولا۔ "میں مارٹن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

کیپٹن نے شکایت آمیز انداز سے سارجنٹ ٹویڈ کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے سارجنٹ، تم نے اسے کچھ نرم نہیں کیا۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے پوری قوت سے ایک گھونسا ڈونووان کے پیٹ پر مارا۔

امام غزالی فرماتے ہیں

☆ جتنا لوگ تنگ دستی سے ڈرتے ہیں، اتنا اگر دوزخ سے ڈریں تو دونوں سے بچ جائیں اور جتنا لوگ جنت کی فکر کرتے ہیں اتنی اگر ایمان کی فکر کریں تو دونوں کو پالیں۔

☆ عبادت جنت کے لیے مت کرو اس لیے کرو کہ اللہ عبادت کے لائق ہے۔

☆ رزق اللہ کا وعدہ ہے ملے گا۔

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

غیر ارادی طور پر کرنل اسٹیڈ کا منہ احتجاج کرنے کے لیے کھلا مگر پھر اس نے فوراً ہی اسے بند کرلیا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آکر گزر گیا۔ جیسے کسی کھڑکی پر پردہ ڈال دیا جائے۔ اس کے ہونٹوں پر آہستہ آہستہ ایک زہریلی مسکراہٹ نمایاں ہونے لگی تھی۔ دوسری طرف ابھی کیپٹن کی بات جاری تھی۔

"ڈونووان، تم بہت سخت جان ہو میں جانتا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "مارٹن بھی تمہاری طرح سخت جان تھا بلکہ شاید تم سے کچھ زیادہ کیونکہ تمہارے گوریلا اسے متواتر دو دن تک اذیت دینے کے بعد اس کا منہ کھلوانے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ ہم نے اس معاملے میں بڑے شریفانہ طور پر قانون کی پابندی کرنے کی کوشش کی مگر تم لوگ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے، چنانچہ اب مچھلی کا شکار ختم ہوچکا ہے۔ طوفانی دستہ جنگجو نوجوانوں اور گنوں کے ساتھ اسکواڈ روم میں انتظار کررہا ہے تمہارا نمبر پہلا ہے بولو کیا کہتے ہو؟"

ڈونووان نے باری باری سب کو غور سے دیکھا یہاں تک کہ اس کی نظریں کرنل پر پڑیں جو کہ اس کی آخری امید تھا اور پھر اسے جو کچھ نظر آیا، اسے دیکھ کر اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ عجیب بات تھی کہ وہ کرنل اسٹیڈ جو کہ ایک کامیاب بزنس مین اور قانون کی پابندی کرنے والا پولیس کمشنر تھا، اب غائب ہوچکا تھا اور اس کی جگہ جو شخص بیٹھا تھا، وہ حیرت انگیز طور پر کسی سخت گیر پولیس آفیسر سے مشابہ نظر آرہا تھا۔

"میں اپنے وکیل کو بلانا چاہتا ہوں۔" ڈونووان نے بیچارگی سے کہا۔ "یہ میرا قانونی......"

"جہنم میں جاؤ۔" ٹویڈ کی زبان سے نکلا، ساتھ ہی اس نے ایک الٹا ہاتھ ڈونووان کے منہ پر رسید کیا۔ میکلیگ نے یوں ٹھنڈی سانس بھری، جیسے کوئی شخص اپنی خوشگوار

چھٹیاں ختم ہونے پر افسردہ ہو اور ایک ہاتھ سے ڈونووان کے سر کے بال اچھی طرح جکڑ لیے۔

"ڈ کمشنر صاحب۔" اس نے بڑے احترام کے ساتھ تجویز پیش کی۔ "آپ ایک سگار جلالیں تو اچھا ہے۔ ڈونووان کے آدمی اپنے شکار کے تلوے داغا کرتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں سگار دیکھ کر اسے ہماری بات سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی۔"

کرنل اسٹیڈ نے اگرچہ سگار نہیں سلگایا مگر میکلیک کا اندازہ بالکل درست تھا کہ ڈونووان اسی قسم کی زبان سمجھ سکتا ہے۔ ابھی اس کی بات پوری ہوئی تھی کہ ڈونووان چیخ اٹھا کہ وہ سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہے۔ کیپٹن نے سلی کو بلایا۔ ڈونووان نے بولنا شروع کیا اور سلی اسے شارٹ ہینڈ میں لکھتی رہی۔ دس منٹ بعد ڈونووان کو حوالات بھیج کر کیپٹن برانڈی ریوالور اپنے بغلی ہولسٹر میں رکھتے ہوئے چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

"اب تم یہاں اطمینان سے بیٹھو۔" اس نے کرنل سے کہا۔ "کارروائی کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچتے ہی میں تمہیں فون کردوں گا۔"

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔" کرنل نے جواب دیا اور پھر کیپٹن کے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولا۔ "محض ایک تماشائی کی حیثیت سے کیپٹن۔ میں بہت کچھ سیکھ رہا ہوں۔"

"یہ بات ہے تو پھر آؤ چلو۔" کیپٹن برانڈی نے جواب دیا۔ کیپٹن اور اس کے جوان ہیڈکوارٹر سے باہر نکلے تو تین کاریں ان کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ایک کار میں پولیس سرجن ڈاکٹر ٹراسک بھی موجود تھا۔

"وہیل اسٹریٹ چلو۔" کیپٹن نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ "ہم نے مارٹن کا پتا لگا لیا ہے۔ رفتار تیز رکھنا مگر سائرن بجانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

پھر اس نے جھانک کر دوسری کار کی طرف دیکھا جس میں کرنل اسٹیڈ سارجنٹ ٹویڈ اور دوسرے افراد سوار تھے۔

"تمام ضروری سامان رکھ لیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یس کیپٹن۔" ایک ڈیٹکٹیو نے جواب دیا۔

کرنل اسٹیڈ واقعی بہت تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ جب پولیس نے اس عمارت کو محاصرے میں لے کر حملہ کیا جہاں بدمعاشوں کا گروہ اپنے قیدی مارٹن کے ساتھ چھپا ہوا تھا تو وہ بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ اس نے اس وقت بھی کوئی شکایت نہیں کی جب پولیس نے بدمعاشوں کو ان کی پناہ گاہ سے نکالنے کے لیے...... آنسو گیس استعمال کی اور وہ گیس خود اس کی آنکھوں میں بھی گھسنے لگی اور پھر جس وقت سارجنٹ ٹویڈ نے ایک بدمعاش کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا تو اس نے دل کھول کر داد دی۔

"شاباش سارجنٹ، بہت اچھا نشانہ تھا۔"

لیکن جب اس نے مارٹن کو اس کے اکھڑے ہوئے ناخنوں اور داغے ہوئے پیروں کے ساتھ دیکھا تو برداشت نہ کرسکا اور بے ہوش ہو گیا۔ پھر کیپٹن برانڈی کی ملاقات ایک ہفتے تک کرنل سے نہ ہوسکی لیکن کام اتنا زیادہ تھا کہ اس مصروفیت میں اسے کرنل کی عدم موجودگی کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسپتال سے مارٹن کی کیفیت کے بارے میں روزانہ رپورٹ ملتی تھی۔ کئی دنوں تک وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں لٹکا رہا، لیکن آخرکار ماڈرن طریقۂ علاج نے کامیابی حاصل کی۔ اسے بچا لیا گیا اور جب وہ اپنی داستان بیان کرنے کے قابل ہوا تو اس نے ایک ایسی روداد سنائی جسے سن کر سخت دل رپورٹر بھی کانپے بغیر نہ رہ سکا۔ مارٹن نے صرف بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے اخبار کو تاکید کرکے یہ پوری تفصیلات عام پبلک کی معلومات اور آگاہی کے لیے شائع بھی کیں۔ شاید اسے بھی سبق مل گیا تھا۔

پھر ایک روز سہ پہر کو کرنل اسٹیڈ نے کیپٹن برانڈی کو اپنے آفس میں بلایا۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اس سے ایک طویل گفتگو کی۔ اس ملاقات کے بعد کیپٹن واپس اپنے دفتر پہنچا تو شام کے چھ بج چکے تھے، اس نے سارجنٹ ٹویڈ اور ڈیٹکٹیو میکلیک کو اپنا منتظر پایا۔

"سلی نے ہمیں بتایا تھا کہ تم کرنل سے ملنے گئے ہو۔" سارجنٹ ٹویڈ نے کہا۔ "ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کمشنر نے ہماری معطلی کے بارے میں کیا کہا؟ اس کا ذکر تو ضرور آیا ہوگا۔"

"ہاں آیا تھا۔" کیپٹن برانڈی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اور یہی ایک بات کیا کرنل نے اور دوسری بہت سی باتوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا۔ خلاصہ اس تمام گفتگو کا یہ ہے کہ معطلی کے بارے میں سب کچھ بھول جاؤ اور جہاں تک دیگر احوال کا تعلق ہے تو پھر وہی پرانا طریق کار لوٹ آیا ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک شراب کے نشے میں نہیں ہے جب تک وہ گٹر میں نہ گرے اور کوئی قانون شکنی قابلِ مواخذہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ کارگر ثابت ہو۔"

شہ مات

نظارت نصیر

بساط کوئی بھی ہو کسی کے حصے میں فتح آتی ہے اور کسی کو مات ہوتی ہے... لیکن جو شہ زور ہوتا ہے وہ ہر حال میں فتح مندی چاہتا ہے چاہے زندگی کتنے ہی بڑے نقصان سے دوچار ہو جائے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی زور آور تھا مگر اس امتحان میں وہ بری طرح ناکام ہو گیا۔

جذباتی استحصال کا شکار...... رشتوں کا عجیب گورکھ دھندا

ابھی میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا کہ فون کی منحوس گھنٹی اپنی کرخت آواز کے ساتھ چلّانے لگی۔ میرا بس چلے تو میں اس گھنٹی کا گلا گھونٹ دوں لیکن میری مجبوری ہے۔ میں اس فون کو نکال کر پھینک نہیں سکتا کیونکہ یہ میری اکلوتی لاڈلی بیٹی کے ساتھ رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔ جینی میری بیٹی ہے اور میری کل کائنات بھی۔ یہ الگ بات کہ وہ میرا خیال ذرا کم کم ہی کرتی ہے۔ اسی لیے اس نے پہلے ضد کرکے بورڈنگ میں رہنا شروع کیا پھر وہیں کسی نے اسے ورغلا لیا

اور جینی اس کے بہکاوے میں آگئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ایک سرد شام تھی۔ میں اسٹوو پر اپنے لیے کافی بنانے کی کوشش کر رہا تھا جب فون کی یہی منحوس گھنٹی بجی تھی۔ میں نے سب کام وہیں چھوڑا اور بھاگم بھاگ فون تک پہنچا۔ دوسری طرف میری توقع کے عین مطابق جینی ہی تھی۔ وہ چہک رہی تھی۔

''ڈیڈ! نک بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ شادی کرلی ہے۔ اس کرسمس کی چھٹیوں میں ہم دونوں آپ سے ملنے آئیں گے اور ہاں ڈیڈ مجھے کچھ پیسوں کی مزید ضرورت ہے۔ تو آپ بھیج دیں گے نا۔''

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں نے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں کہ جینی اپنی تعلیم مکمل کرنے کی تو میرے ساتھ مل کر کچھ عرصے تک کمائے گی پھر ہم دونوں مل کر اس کے لیے لائف پارٹنر تلاش کریں گے اور پھر شادی کے بعد بھی جینی مجھے اپنے ساتھ رکھے گی مگر ہوا سب کچھ الٹا تھا۔

میں خاموش کھڑا رہ گیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ریسیور میں سے جینی کی بے چین آواز پھر ابھری۔

''ڈیڈ کیا آپ کو برا لگا ہے؟ میرا خیال تھا کہ آپ بہت خوش ہوں گے کیونکہ آپ کی جینی بہت خوش ہے۔ مگر آپ...... اوہ ڈیڈ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے پاس رقم نہیں ہے اور آپ اس وجہ سے خاموش ہیں، اگر ایسا ہے تو پلیز فکرمند نہ ہوں میں جیسے تیسے گزارا کرلوں گی۔ بس یہ ہوگا کہ کرسمس پر میرے پاس نئے کپڑے جوتے خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوں گے لیکن یہ آپ کی پریشانی سے زیادہ نہیں ہوگا۔''

میں نے خاموشی سے جینی کی طویل تقریر سنی، وہ ہمیشہ کی طرح میرا جذباتی استحصال کر رہی تھی۔ کرتی بھی کیوں نہ آخر بیٹی کس ماں کی تھی؟ جینی کی ماں بھی ایسی ہی خود غرض اور مادہ پرست عورت تھی۔ وہ میرے ساتھ چار سال رہی۔ اس عرصے میں اس نے میرا صحیح معنوں میں خون تک چوس لیا۔ اس کی آئے روز کی فرمائشوں اور شاہ خرچیوں کی وجہ سے میں اچھا خاصا مقروض ہوگیا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میرے پاس اب اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی رقم نہیں ہے تو اس نے جینی کو میرے بستر پر پٹخا اور ایک زبردست جھگڑے کے بعد مجھے چھوڑ کر کسی نئے شکار کی تلاش میں چلی گئی۔ میں نے جینی کو خود پالا۔ ساتھ ساتھ نوکری اور گھر دونوں کو چلانا بہت مشکل تھا مگر میں نے یہ بھی کیا۔

جینی قدرے بڑی ہوگئی تو مجھے بھی سہولت ہوگئی مگر ہائی اسکول پاس کرتے ہی اسے بورڈنگ میں رہنے کا شوق چرایا اور سچی بات ہے میں اس کی کوئی فرمائش ٹال نہیں سکتا تھا۔ سو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خود سے دور بھیج دیا تھا۔

''ڈیڈ! کچھ بولیں نا۔'' جینی کی آواز نے مجھے سوچوں کے گرداب سے باہر کھینچ نکالا۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے بہ مشکل حلق سے آواز برآمد کی۔

''تم فکر نہ کرو جینی! تمہیں رقم مل جائے گی گڈبائے۔''

اس کے بعد میں بہت دیر تک سرہانے فون کے قریب بیٹھا رہا تھا۔ مجھے ایک موہوم سی امید تھی کہ جینی کو احساس ہوگیا ہوگا کہ مجھے شاک لگا ہے۔ وہ مجھے منانے کے لیے دوبارہ فون کرے گی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

پھر مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں جینی کو اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا مگر جب رات گزر گئی تو میری جینی کے لیے محبت ایک بار پھر امڈ کر آئی اور میں اسے پیسے بھجوانے سے خود کو روک نہ سکا۔ پیسے جینی کو مل گئے۔ کرسمس آکر گزر گئی۔ میرا انتظار انتظار ہی رہا۔ نہ ہی جینی آئی نہ اس کا وہ گھٹیا اور آوارہ شوہر آیا۔ بلکہ اس کے بعد جینی کا کوئی فون بھی نہیں آیا۔ میں ہر ماہ معمول کی طرح اسے رقم بھجواتا رہا۔

چار ماہ بعد جب میں اس کی طرف سے اچھی خاصی تشویش میں مبتلا ہوچکا تھا۔ جینی کا فون پھر آگیا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''ڈیڈ! نک دھوکے باز نکلا ہے۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ وہ ایک عادی شرابی اور جوئے باز تھا۔ اس نے مجھے بھی داؤ پر لگا دیا۔ میں بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگ کر اپنی ایک سہیلی کے گھر میں چھپی ہوئی ہوں۔ جیسے ہی حالات سازگار ہوں گے میں آپ کے پاس آجاؤں گی اور ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔''

میرا دل پھڑک کر رہ گیا۔ میں نے اسے تسلی دلاسے دیے۔ اس کے شوہر کو خوب گالیاں دیں اور اسے سمجھایا کہ وہ کورٹ کے ذریعے اس ناہنجار سے طلاق حاصل کرکے ہی میرے پاس آئے، میں جانتا تھا کہ اس کام کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہوگی، سو میں نے اپنی بچت کے سارے کھاتے چیک کیے اور جتنی رقم اب تک پس انداز کی تھی اسے بھجوادی۔

ان دنوں میں بہت خوش رہنے لگا تھا۔ یہ بات میرے گاہکوں نے بھی محسوس کرلی تھی۔ ٹینا ایک شوخ، چلبلی، تقریباً اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔ وہ روزانہ صبح ناشتا میرے پاس کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''ہائے اسٹیفن! بہت خوش ہو، کیا پرائز بانڈ نکل آیا یا تمہاری بیٹی نے تمہارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟''

ٹینا ہی کیا میرے روزانہ کے تقریباً سبھی گاہک جانتے تھے کہ میں جینی سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں نے خوش دلی سے اسے بتایا۔ ''جینی عنقریب اپنے گھٹیا، جوئے باز شوہر سے طلاق لے کر ہمیشہ کے لیے میرے پاس آرہی ہے۔''

وہ ہنسی پھر بولی۔ ''یہ تو واقعی خوشی کی خبر ہے۔ اچھا اب جلدی سے اسی خوشی میں مجھے اسنیکس فری دے دو۔ کیونکہ آج میرے پاس ریزگاری کم ہے۔''

میں بھی چونکہ بہت خوش تھا تو میں نے اس کی فرمائش پوری کردی۔ پھر پورے دن میں سب ملنے والے مجھے مبارکبادیں دیتے اور میری خوشی پہ مسکراتے رہے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری خوشی ماند پڑ گئی کیونکہ جینی کی طرف سے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ ایک تو وہ دوسری ریاست میں رہتی تھی۔ دوسرے یونیورسٹی کے علاوہ اس کا کوئی مستقل نمبر نہیں تھا اور وہاں جب بھی میں فون کرتا وہ کہیں نہ کہیں باہر گئی ہوئی ہوتی تھی اور نک سے شادی کے بعد تو اس نے یونیورسٹی اور اس کا بورڈنگ ہاؤس دونوں چھوڑ دیے تھے۔ اب وہ کہاں رہ رہی تھی مجھے علم نہیں تھا اور خود وہ ہمیشہ مجھے پی سی او سے فون کرتی تھی۔

تین ماہ بعد جب میری امید دم توڑنے لگی تو جینی کا فون ایک بار پھر آگیا۔ وہ اس بار بھی رو رہی تھی۔

''ڈیڈ! نک نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ اس کے کسی دوست کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے اور میں مصیبت میں پھنسی ہوئی ہوں آئندہ کچھ دنوں میں میری ڈلیوری متوقع ہے۔ اس کے لیے ایک خطیر رقم چاہیے۔ ڈیڈ! میں کہاں سے بندوبست کروں گی؟''

یہ خبر سن کر اصولاً تو مجھے ناراض ہونا چاہیے تھا کہ جب جینی نک کو چھوڑنے کا فیصلہ کرچکی تھی تو یہ کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت تھی مگر میرے اندر سرخوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی روتے ہوئے اداس بچے کو کوئی لالی پاپ تھما دے۔ میں نے خوشی سے لرزتی آواز میں کہا۔

''جینی تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی سے قرض لے کر یا کسی بھی طرح تمہیں رقم پہنچا دوں گا۔ بس تم اپنا اور بچے کا بہت خیال رکھنا اور جلد آجانا بلکہ مجھے اپنا پتا بتاؤ میں خود آجاتا ہوں۔''

جینی نے جلدی سے کہا۔

''نہیں ڈیڈ! اس کی ضرورت نہیں میں اپنی ایک سہیلی کے اسٹوڈیو میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ آپ کو کہاں رکھوں گی بس زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی بات ہے پھر میں خود آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔''

چند ایک مزید باتوں کے بعد اس نے فون رکھ دیا اور میں اس کے لیے رقم حاصل کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ جینی کی ماں نے مجھے اچھا خاصا مقروض کردیا تھا۔ اس کے بعد جینی کی فرمائشوں کی وجہ سے کچھ زیادہ جمع کر ہی نہیں پایا تھا۔ جو کچھ جیسے تیسے بچایا تھا وہ بھی پچھلے دنوں اسے بھجوا چکا تھا۔ اب ڈلیوری کے لیے درکار رقم مجھے کسی نہ کسی طرح

حکایات

(1) ہر لفظ میں مطلب ہوتا ہے اور ہر مطلب میں فرق ہوتا ہے۔

(2) زندگی میں 2 چیزیں ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں۔ سانس اور ساتھ۔
سانس ٹوٹنے سے انسان ایک بار مرتا ہے اور ساتھ ٹوٹنے سے انسان بار بار مرتا ہے۔

(3) وقت اور پیار
دونوں زندگی میں اہم ہوتے ہیں۔ وقت کسی کا نہیں ہوتا اور پیار ہر کسی سے نہیں ہوتا۔

(4) نیند اور موت
نیند آدھی موت ہے اور موت کامل نیند۔

(5) وقت اور سمجھ۔
ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ملتی ہے کیونکہ اکثر وقت پر سمجھ نہیں ہوتی اور سمجھ آنے تک وقت نہیں بچتا۔

(6) یقین اور دعا
یقین اور دعا نظر نہیں آتی لیکن ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے (دعا میں یاد رکھنا)

مرسلہ۔ راجہ افتخار علی افتی، چوآسیدن شاہ

اکھٹی کرنا ہی تھی۔ میرے موجودہ کاروبار میں ایسا کرنا کوئی معجزہ ہی ہوسکتا تھا۔ اصل میں ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے اپنے پاس موجود رقم سے ایک اچھی حالت کا سنی ٹرالر خرید لیا تھا۔ یہ ٹرالر ہی میرا سب کچھ تھا۔ دن میں، میں اسے کسی نہ کسی مصروف سڑک کے کنارے روک کر لوگوں کو کافی، اسنیکس اور ناشتے کا سامان بیچتا اور رات میں اسی میں ایک طرف بستر بچھا کر سو رہتا۔

یہ ٹرالر پچھلے نو سال سے میرے پاس تھا اور اب اس کی حالت کافی خستہ ہوچکی تھی۔ اکثر و بیشتر یہ کسی اڑیل ٹٹو کی طرح چلنے سے انکار کردیتا ہے۔ تو مجھے اس دن کی ساری کمائی کسی نہ کسی کلینک کے حوالے کرنا پڑ جاتی ہے۔

میں نے گھور کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ چھ بجنے والے تھے۔ ساری رات جینی کے متعلق سوچتے اور رقم حاصل کرنے کے منصوبے بناتے سوتے جاگتے گزر گئی تھی۔ ابھی منہ ہاتھ بھی نہ دھو پایا تھا کہ گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی۔ میں نے سب کام وہیں چھوڑا اور فون اٹھالیا۔ دوسری طرف جینی تھی۔ اتنی صبح صبح اس نے کبھی مجھے فون نہیں کیا تھا۔ میں مختلف اندیشوں میں گھر گیا۔

”جینی خیریت تو ہے؟ اتنی صبح فون کس لیے کیا ہے؟“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ”ڈیڈ! نک سے شادی کے بعد میری زندگی سے خیریت نام کا لفظ نکل گیا ہے۔“ ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہوگئی۔ پھر بولی ”دراصل کل میں بھول گئی تھی۔ اس لیے آج پھر فون کیا ہے میری سہیلی کا اکاؤنٹ نمبر نوٹ کرلیں کیونکہ پیسے وہی نکلوائے گی تو اسی کے اکاؤنٹ میں بھجوا دیں۔“ اس نے نمبر لکھوا کر فون بند کردیا۔ میں کچھ الجھ سا گیا۔ بہرحال میں نے نمبر نوٹ کرلیا تھا، جب سے نک سے شادی ہوئی تھی جینی نے ہر ہر مرتبہ ایک نئے اکاؤنٹ نمبر میں مجھ سے پیسے منگوائے تھے۔ بہرحال میں نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے چھٹکارا پایا اور روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہوگیا۔ گاہک آنے لگے تھے۔ میں بھی ان کی مطلوبہ چیزیں فراہم کرنے لگا۔ لیکن میرا دماغ بری طرح مصروف تھا۔ میں ایک پینسٹھ سالہ بوڑھا شخص ہوں۔ کوئی جائداد یا بینک بیلنس بھی نہیں ہے۔ لے دے کر ایک یہی ٹرالر ہے میرے پاس، اگر اسے سامان سمیت بیچ دوں تو اتنی رقم ضرور حاصل ہوسکتی ہے جس سے جینی آسانی سے اسپتال اور بچے کے اخراجات پورے کرسکتی تھی مگر پھر میں سڑک پر آجاتا۔ کماتا کہاں سے؟ اور رہتا کہاں؟

اسی ادھیڑبن میں دو دن گزر گئے۔ مجھے کوئی طریقہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ جینی مجھے اتنی عزیز تھی کہ میں اس کی خاطر ڈاکا تک مارنے کے لیے تیار تھا مگر اس میں بھی ایک قباحت تھی۔ میری نظر اس حد تک کمزور تھی کہ چشمہ لگانے کے باوجود بھی مجھے بہت دھندلا دکھائی دیتا تھا اور اسی خرابی کی وجہ سے مجھے اپنی نوکری بھی وقت سے پہلے چھوڑنی پڑی تھی۔ جینی کا فون آئے تیسرا دن تھا، میں صبح صبح کافی تیار کرکے ضروری اشیا کو ترتیب سے رکھ رہا تھا تاکہ رش کے وقت میں دقت نہ ہو۔

”اے مسٹر! ایک کپ کافی ملے گی؟“ میں نے سر اٹھا کر اس کرخت لہجے والے قریباً تیس بتیس سالہ مسٹنڈے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ کسی بیل کی طرح مضبوط اور کسی ہاتھی کی طرح بدمست نظر آرہا تھا۔ نشے کی زیادتی کی وجہ سے اس کی آنکھیں ابھی تک چڑھی ہوئی تھیں، میں نے اس کے گلے میں لٹکی مختلف شبیہوں والی زنجیروں سے نظر ہٹا کر اسے اثبات میں جواب دیا۔

”جلدی سے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لے آؤ۔“ وہ سڑک کنارے میری گاہکوں کے لیے بچھائی گئی میز کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ میں نے شکل سے ہی بدمعاش نظر آنے والے اس آدمی کے لیے کافی تیار کی اور اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“ میں نے بات برائے بات ہی پوچھ لیا۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”دو دن قبل ہی اس ریاست میں آیا ہوں۔ یہاں میرا ایک عزیز رہتا ہے اسی سے ملنے آیا ہوں۔“ اس کا انداز اتنا کرخت تھا اور لہجہ ایسا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”بڈھے اپنا کام کر“ مگر میں نے نظرانداز کردیا۔ وہ سینڈوچ کے بڑے بڑے نوالے اس طرح نگل رہا تھا جیسے کسی قحط زدہ علاقے سے آیا ہو۔ میری تجسس کی رگ ایک مرتبہ پھر پھڑک اٹھی۔ میں نے بہ ظاہر اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے پھر پوچھا۔

”تمہارا جسم بہت شاندار ہے۔ کیا تم باڈی بلڈر ہو یا ایسے کسی کھیل میں دلچسپی رکھتے ہو؟“ اپنی تعریف سن کر بھی اس کے کرخت چہرے پر نرمی آئی نہ ہی مسکراہٹ۔ اس نے ایک گھورتی ہوئی نظر مجھے دیکھا اور پھر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ یعنی وہ میری بات کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اب میرے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں اس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا کیونکہ اس طرح کسی کی کھوج کرنا میری عادت نہیں تھی۔ وہ کھانا ختم کرچکا تھا۔ اس نے منہ کھول کر گنواروں کی طرح ایک لمبی ڈکار لی اور کرسی پر مزید پھیل کر کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ میں اس دوران آنے والے گاہک کی طرف متوجہ ہوگیا۔

گاہک کو اس کا مطلوبہ سامان دے کر میں نے ریزگاری بکس میں ڈالی۔ وہ اتنی دیر میں اٹھ کر میرے پاس آگیا تھا۔ میں ایک کمزور جسامت کا بوڑھا شخص ہوں اس کے سامنے تو مزید مخنی لگ رہا تھا، اس نے بہ غور میری طرف دیکھا پھر حلیمہ لہجے میں بولا۔

”دو چیز سینڈوچ پیک کردو۔“ مجھے اس کا لہجہ بہت برا لگا مگر جب اس نے اپنا پرس کھول کر ایک بڑا نوٹ میری طرف بڑھایا تو میرا منہ خودبخود بند ہوگیا۔ میں نے اپنے تاثرات پر مشکل سے قابو پایا، میں نے نوٹ ہاتھ میں تھام کر اس کا بہ غور معائنہ کیا۔ وہ تقریباً گرجتے ہوئے بولا۔

”بڈھے جلدی کرو میرا وقت ضائع نہ کرو۔“ میں نے جلدی سے اپنے لہجے کو ممکنہ حد تک لجاجت انگیز بنالیا اور کہا۔

”معاف کرنا جناب! میری نظر حد سے زیادہ کمزور ہے۔ یہ پانچ سو ڈالرز کا نوٹ ہے۔ میں اگر بنا دیکھے اسے رکھ لوں تو ایک دن میں فٹ پاتھ پر آجاؤں گا۔ کیونکہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔“ وہ کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے جلدی سے نوٹ بکس میں ڈالا اور اپنے پاس موجود ساری رقم نکال کر گنی۔ وہ چار سو پچاسی ڈالرز تھے۔ میں نے رقم اس کے سامنے ڈال دی۔ میری خواہش تھی کہ وہ رقم قبول کرلے اور مجھے یہ نوٹ اسے واپس نہ کرنا پڑے۔ میں نے لجاجت سے کہا۔

”جناب! اس وقت میرے پاس یہی رقم ہے۔ گیارہ ڈالرز کم ہیں، آپ شام میں لے جانا۔“ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ بگڑ گیا پھر اس نے جھپٹنے کے سے انداز میں رقم اٹھائی اور سینڈوچ کا پیک لے کر چل دیا۔ میرے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ میں اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے اس کے بٹوے میں ایسے پانچ سو ڈالرز کے اور بھی نوٹ دیکھ لیے تھے اور مجھے جینی کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ ابھی میں شش و پنج میں تھا کہ ٹینا آگئی۔ ”ہائے اولڈ مین، کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے چہک کر کہا تو میں جلدی سے آگے جھک کر بولا۔

”ٹینا! میں شام میں تمہیں دس ڈالرز دوں گا اگر تم ہوشیاری سے اس آدمی کا گھر یا رہائش دیکھ آؤ۔ میرا اس کے ساتھ کچھ جھگڑا ہے۔ خیال رہے وہ تعاقب سے آگاہ نہ ہو۔“ ٹینا حیران تو ہوئی مگر اس کے پیچھے چل پڑی، آدھے گھنٹے کے بعد میں Cops کے ہمراہ ٹینا کے بتائے ہوئے رستے سے موٹل کی طرف جارہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس مسٹنڈے کو مجھے دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگے گا کیونکہ وہ مجھ جیسے مجہول بڈھے سے ایسے عمل کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ مگر اس کے کمرے میں پہنچ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا جب میری نظر بیڈ پر بیٹھی ہوئی جینی پر پڑی۔ وہ بھی ہکابکا مجھے دیکھ رہی تھی۔ سارجنٹ نے انہیں گرفتار کرلیا۔

میں روتی ہوئی آنکھوں سے اسے پولیس وین میں بیٹھ کر جاتے دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ بھی جینی نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ وہ کسی طرح جرائم پیشہ گروہ میں شامل ہوگئی تھی۔ اس گروہ میں دو مرد اور دو عورتیں تھیں۔ پانچ ماہ قبل انہوں نے ایک کسینو میں ڈاکا ڈالا تھا اور کامیابی سے روپوش ہوگئے۔ کسینو کے مالک نے اخبار میں اطلاع دہندہ کے لیے انعام کا اعلان کیا تھا۔ جس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ نوٹ نشان زدہ تھا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑتے ہی نشان پہچان لیا تھا کیونکہ میں ایک تجربہ کار بینک کیشیر تھا۔ انہی نشان زدہ نوٹوں کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے جینی کو رقم کی ضرورت تھی جو اسے فراہم کرنے کے لیے میں نے یہ بھاگ دوڑ کی تھی۔

تلقین

سمندر کے کنارے ایک شخص نے دیکھا کہ ایک نوعمر لڑکا گرداب میں پھنس گیا ہے اور بے رحم لہریں اس کی جان کے درپے ہیں۔ وہ دردمند سمندر میں کود پڑا اور لہروں سے لڑتا بھڑتا ڈوبتے ہوئے لڑکے کو کنارے تک لانے میں کامیاب ہوگیا۔

شدید ذہنی صدمے سے لڑکے کو کچھ افاقہ ہوا تو اس نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا۔

اس شخص نے لڑکے کو تلقین کی کہ ”میں نے اپنا فرض ادا کردیا بچے! اب تمہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ تمہاری زندگی واقعی اس لائق تھی کہ اسے بچایا جاتا۔“

مرسلہ۔ اظہر حسین پچار، ہزاری، جتوئی

کسی کے دل میں اترنے کا آسان راستہ محبت کا ایسا زینہ ہے جس کے ہر قدم پر خلوص و وفا کی مہر ثبت کرنی پڑتی ہے مگر کچھ لوگ یہ مہر ثبت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور... بھول بھلیوں میں بھٹکنے والوں کو رستہ نہیں ملتا... یہی ان کی آزمائش اور یہی ان کی مستقل مزاجی کا بھرم ہوتا ہے... زندگی کے کئی مقام پر کتنے ہی چہرے اس کے ذہن کے آئینے میں عکس بن کر رہ گئے تھے۔ جو دھیرے دھیرے وقت کی دھول میں دبتے جا رہے تھے کہ اچانک ایک موڑ ایسا بھی آیا کہ سارے دھندلے چہرے پوری آب و تاب کے ساتھ واضح ہو گئے... مگر وہ ان خدوخال میں بچپن تلاش کر سکا نہ جوانی... زمانے کی چیرہ دستیوں نے اس کی زندگی کا ہر قیمتی لمحہ عفریت بن کر نگل لیا تھا... دل کی خاموش دھڑکنوں نے جب شور مچایا تو اس کی ذات ایک تہلکہ خیز بھونچال کا شکار ہو گئی... آفرین ہے اس ضبط پر کہ تنہا دھڑکنوں کو تھپکنے کا ہنر آ گیا... کوئی رشتہ اس کے پاس نہ تھا لیکن ایک زمانہ اس کا گرویدہ تھا اور وہ جس کا شیدائی تھا وہ چہرہ... وہ لمس... وہ ساتھ تو جانے کہاں کھو گیا تھا... پھر رفتہ رفتہ صبر و استقامت کی انہی منزلوں نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔

بالآخر بشو تھک کر بالکل چور ہو گیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی یا شاید رات ہو چکی تھی۔ بشو کو وقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں تھا، اسے تو صرف اتنا ہی علم تھا کہ وہ بہت دیر تک چلتا رہا ہے۔ جب روانہ ہوا تھا تو تیز چمکیلی، نارنجی دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور اب چاروں طرف اندھیرا مسلط ہو چکا تھا۔ اس کی ٹانگیں درد اور تھکن کے باعث کانپ رہی تھیں اور سر میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ کچھ اس طرح جیسے پاگل ہوا اجاڑ کھنڈروں میں شور مچا رہی ہو۔ اس کا ذہن بھی ایک کھنڈر بن گیا تھا۔ شکستہ، ویران اور آسیب زدہ جس میں مختلف سوچوں کے بھوت چکراتے پھر رہے تھے۔ اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ یہ سوال ایک خوفناک عفریت کی طرح اس کے دماغ میں اچھل پھاند کر رہا تھا مگر کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر وہیں ریلوے لائن کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

دور تک سناٹا اور آسمان سے برستا ہوا ہولناک اندھیرا تھا۔ بشو ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پتا نہیں وہ کون سا علاقہ تھا، کہیں دور تک کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی۔ نہ کہیں روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اس تاریکی اور ویرانے میں دور دور تک اگی ہوئی جھاڑیوں اور درختوں کے سیاہ ہیولے بڑے خوفناک لگ رہے تھے۔ بشو کچھ دیر خاموش بیٹھا اس لرزہ خیز منظر کو دیکھتا رہا پھر اس نے سوچا کہ چلنا چاہیے۔ کیا پتا کبن اور بادشاہ اسے ڈھونڈتے ہوئے آجائیں مگر ارادے کے باوجود وہ تھکن کی وجہ سے اٹھ نہیں سکا اور پھر اگر اٹھتا تو جاتا کہاں۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس جگہ ہے اور وہاں سے قریبی شہر یا گاؤں کس سمت میں اور کتنی دور ہے۔ چنانچہ چپ چاپ بیٹھا رہا اور ہولے ہولے اپنا پیٹ دباتا رہا کیونکہ اب اسے بھوک لگنے لگی تھی۔ پیٹ میں بہت جلن ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی پسلیوں میں درد بھی ہونے لگا تھا مگر وہ کیا کرتا۔ وہاں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ جنگلی پھل وغیرہ تلاش کر سکتا تھا لیکن رات میں یہ بھی ممکن نہ تھا۔

پھر اس کا خیال کبن کی طرف چلا گیا۔ یہ خیال اتنا دہشت ناک تھا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ کر رہ گیا۔ ایک بار پھر اسے گمان گزرا کہ جو کچھ ہوا تھا، وہ حقیقت نہیں سپنا تھا لیکن اگر وہ سپنا تھا تو پھر وہ فرار کیوں ہوا اور اس وقت بھوکا پیاسا، تھکا ماندہ اس ریلوے لائن کے پاس کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ نہیں وہ سپنا نہیں تھا، حقیقت تھی' اس نے واقعی کبن کے سر پر لوہے کی سلاخ سے وار کیا تھا اور پھر گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے دیکھا تھا کہ کبن کا سر پھٹ گیا ہے اور سرخ خون سے اس کا چہرہ اور گردن تر ہو گئے ہیں۔ بشو نے یکایک آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہونٹ زور سے بھینچ لیے۔ اس طرح شاید وہ لاشعوری طور پر کبن کے خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا، تاہم کامیاب نہیں ہوا۔ کبن کا چہرہ اس کی نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اور بڑی بڑی نوکدار مونچھیں بشو کے تصور میں ناچتی رہیں۔ اس وقت سہ پہر ہو رہی تھی، جب کبن نے اسے کمرے میں بلایا تھا۔ بادشاہ، پھلو اور فیکے کو لے کر صبح ہی سے کہیں چلا گیا تھا۔ رحتاں بھی غائب تھی۔ گھر میں صرف کبن اور بشو ہی تھے۔ جب کبن نے اسے آواز دی تو وہ ڈر گیا کہ شاید اب پھر پٹائی ہوگی۔ کبن غصے کا بہت خراب تھا۔ جب بشو، پھلو یا فیکے سے کوئی غلطی ہو جاتی تو کبن آپے سے باہر ہو جاتا، غلیظ گالیاں دیتا اور اس بری طرح مارتا کہ ان کی ہڈیوں میں کئی کئی دن تک درد ہوتا رہتا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”جی، کیا بات ہے؟“

”یہاں آ۔“ خلاف معمول کبن نے مسکرا کر خوش مزاجی سے کہا۔

بشو آگے بڑھا۔ کبن چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر ایک کچھے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ قریب ہی ایک اسٹول پر ٹھرے کی بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ کبن کافی دیر سے پی رہا تھا اور اب ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نشے میں تھا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی، آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی وحشیانہ کیفیت اور سفاکی تھی۔ جب بشو قریب پہنچا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں بے! تو مجھ سے ڈرتا ہے؟“

بشو کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسا سوال ہے۔ اس نے ذرا سہم کر جواب دیا۔ ”نن...... نہیں تو......“

”پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔“ کبن نے کہا اور باچھیں پھیلا کر ہنسا۔ اس کی ہنسی میں عجیب سی کھنک تھی یوں جیسے تانبے کے کئی برتن بج اٹھے ہوں۔ بشو نے کبن کے سیاہ چمکیلے بدن کو دیکھا۔ اس کی سرخ چڑھی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور اس کا دل ہولے ہولے کانپنے لگا۔ کیا بات ہے، آخر کبن نے اسے کیوں بلایا ہے؟ اس نے تھوک نگل کر سوچا اور لرزتی ہوئی آواز میں پھر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

مگر کبن نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے نظر انداز کر دیا۔ گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا، ایک بیڑی جلائی پھر مسکرا کر بشو کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر بشو کی کلائی پکڑ لی اور اسے اپنی جانب کھینچا۔ بشو منمنایا۔

”مجھے جانے دو۔“

”ابے ٹھہر تو سالے! مرا کیوں جا رہا ہے؟“ کبن نے کہا۔

بشو سر سے پیر تک لرز کر رہ گیا۔ خوف اور دہشت کی بنا پر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بشو نے خوف سے تھوک نگلا اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ساتھ ہی اس نے زور سے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ شاید گرفت مضبوط نہیں تھی یا شاید کبن کو بشو کی طرف سے کسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی، اس بنا پر اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ بے تحاشا دروازے کی طرف بھاگا۔ کبن ایک دم برافروختہ ہو گیا۔ گالیاں دیتا ہوا بشو...... کی طرف جھپٹا۔

”ابے رک جا ورنہ تجھے زندہ دفن کر دوں گا۔“

مگر قسمت مہربان تھی۔ کبن کو اتنا موقع نہیں ملا کہ بشو کو پکڑ سکتا۔ شاید زیادہ نشے کی بنا پر یا شاید زیادہ غصے کے باعث اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ بشو نے پلٹ کر دیکھا اور پھر لپک کر وہ سلاخ اٹھالی جو دروازے کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ سلاخ اٹھا کر وہ کبن کی طرف جھپٹا۔ کبن اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، بشو نے سلاخ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوری قوت سے کبن کے سر پر دے ماری۔ سلاخ بھی وزنی تھی اور وار بھی بھرپور تھا۔ کبن کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ بشو نے ایسی تھرا دینے والی چیخ کبھی نہیں سنی تھی۔ اس نے کبن کے سیاہ جسم کو کسی شہتیر کی طرح دوبارہ گرتے ہوئے دیکھا اور خوفزدہ ہو کر دروازے کی طرف بھاگا مگر باہر نکلنے سے پہلے اس نے پلٹ کر ایک بار پھر کبن پر نظر ڈالی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور سرخ سرخ خون اس کے چہرے اور گردن پر پھیل رہا تھا اور اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دوسرے لمحے بشو دروازے سے باہر نکل گیا۔

پھر وہ بے تحاشا بھاگتا چلا گیا۔ یہ سمجھے اور سوچے بغیر کہ کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ ذہن میں بس ایک دھن تھی کہ جلد از جلد، جتنی دور بھاگ سکتا ہے، بھاگ جائے۔ اسی صورت میں جان بچ سکتی تھی چنانچہ وہ جسم و جان کی پوری قوت سے دوڑتا چلا گیا۔ جس جگہ مکان تھا، وہاں سے دائیں سمت کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ بشو چند بار بادشاہ اور رحتاں کے ساتھ وہاں گیا بھی تھا مگر اس وقت جب وہ جان بچا کر بھاگ رہا تھا، اس نے قصداً شہر کا رخ نہیں کیا، جانتا تھا کہ جب وہ لوگ اسے تلاش کریں گے تو سب سے پہلے شہر کی طرف جائیں گے لہٰذا وہ جان کر بائیں طرف روانہ ہوا تھا۔ اس طرف میلوں تک چٹیل میدان پھیلا ہوا تھا۔ صرف کہیں کہیں کچھ کھیت تھے، چونکہ اس علاقے میں بارش برائے نام ہوتی تھی اور نہری پانی کا کوئی بندوبست نہیں تھا، اس لیے بیشتر زمین غیر آباد تھی۔ چند ایک گاؤں ضرور تھے مگر وہ بھی فاصلے پر تھے۔ بشو گرد و پیش کی پروا کیے بغیر بھاگتا رہا۔ جب بہت تھک جاتا تو دھیرے دھیرے چلنے لگتا یا کسی ٹیلے کی آڑ میں بیٹھ کر سستا لیتا، اس کے بعد پھر بھاگنا شروع کر دیتا۔ ہر چند کہ وہ مکان سے بہت دور نکل آیا تھا مگر دل میں بیٹھی ہوئی دہشت کم نہیں ہوئی تھی۔ کبن کا خوف بہ دستور اس کے حواس پر طاری تھا۔ بار بار کبن کا پھٹا ہوا سر اور سر سے بہتا ہوا خون اس کے تصور میں ناچنے لگتا اور وہ وحشت زدہ ہو کر پیچھے گھوم کر دیکھنے لگتا۔ ممکن ہے کبن کو ہوش آگیا ہو اور وہ اب اس کے تعاقب میں آرہا ہو یا پھر ممکن ہے، بادشاہ اور رحتاں واپس آگئے ہوں اور حقیقت حال سے واقف ہونے کے بعد بشو کی تلاش میں نکل پڑے ہوں۔ اگر ایک بار انہوں نے بشو کو تلاش کر لیا تو پھر...... تو پھر......

یہ خیال ایسا ہولناک تھا کہ بشو سر سے پیر تک کانپ کر رہ جاتا۔ ٹانگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی، سینے کے اندر کچھ ایسی تھرتھراہٹ ہوتی جیسے کوئی اس کے دل کو مٹھی میں لے کر دبا رہا ہو۔ گھبرا کر وہ اور تیز بھاگنے لگتا۔ سہ پہر کی سنہری دھوپ رفتہ رفتہ ماند پڑتی گئی۔ آسمان دھندلا گیا اور پھر دھیرے دھیرے اندھیرے کی آہنی چادر حد نظر تک مسلط ہو گئی۔ بشو اس وقت تک بہت تھک چکا تھا۔ ایک ایک قدم یوں اٹھا رہا تھا، جیسے پیروں میں وزنی پتھر بندھے ہوں، پھر اسے ریلوے لائن نظر آئی اور وہ بے دم ہو کر وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

وقت رینگ رینگ کر گزرتا رہا۔ اب ہر طرف تاریکی، سکوت اور ہولناک ویرانی تھی۔ بشو کو اس سناٹے اور اندھیرے سے ڈر لگنے لگا مگر وہ کرتا بھی کیا۔ اسے نہ سمتوں کا کوئی اندازہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ قریب ترین شہر یا گاؤں وہاں سے کتنی دور ہے چنانچہ وہ چپ چاپ بیٹھا

رہا۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات آرہے تھے۔ کبھی سوچتا کہ اٹھ کر پٹری کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردے، کبھی سوچتا کہ واپس چلا جائے اور کمن اور بادشاہ سے معافی مانگ لے۔ وہ لوگ غصے میں ہوں گے اور شاید اسے بری طرح ماریں پیٹیں گے مگر بہرحال معاف کردیں گے پھر اسے خیال آتا کہ ممکن ہے کمن مرچکا ہو، کیونکہ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور اگر ایسا ہوا تو پھر معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بادشاہ بلاتکلف اسے قتل کردے گا۔ قتل کا خیال آتا تو وہ سر سے پیر تک کانپ جاتا۔ وہ سوچتا، پھر گردن گھما کر اندھیرے میں گم ہوتی ریلوے لائن کو دیکھتا، ٹھیک ہے، اگر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کرے تو کبھی نہ کبھی کسی گاؤں یا شہر میں ضرور پہنچ جائے گا۔ مگر کیسے؟ اب اور چلنا ممکن نہیں تھا۔ چند قدم اٹھانا دشوار تھا، میلوں کا سفر بھلا کیونکر طے ہوگا۔ وہ بے بسی سے سوچتا رہا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑتا رہا۔

پھر معاً وہ چونک پڑا۔ اندھیرے میں بہت دور روشنی کا ایک ننھا سا دائرہ نظر آیا، جیسے ایک چراغ ٹمٹما رہا ہو، پھر رفتہ رفتہ روشنی کا وہ دائرہ بڑھنے لگا۔ بشو کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی گاڑی آرہی ہے۔ وہ چند منٹ بڑھتے ہوئے روشنی کے حجم کو دیکھتا رہا پھر جب اس کے کانوں میں پٹریوں کی ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ بھی پہنچنے لگی تو وہ پتھر سے اتر کر اور ذرا دور ہٹ کر ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اب قریب آگئی تھی اور انجن کی ہیڈلائٹ کی تیز روشنی بشو کے قریب پہنچ رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھا دیوہیکل انجن کو دیکھتا رہا۔ گاڑی قریب آتی گئی اور اس کی رفتار بتدریج کم ہوتی گئی۔ بشو نے دیکھا کہ وہ مال گاڑی تھی۔ انجن کے پیچھے کوئی چالیس کے قریب ڈبے تھے جن میں سے چند ایک کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ گاڑی بشو کے سامنے سے گزری اور کچھ آگے جاکر رک گئی۔ بشو کی سمجھ میں نہ آیا کہ گاڑی وہاں کیوں رکی ہے مگر اس وقت جب وہ رات کے اندھیرے میں ٹرین کے پچھلے ڈبے کو گھور رہا تھا، یکا یک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے مانند کوندگیا۔ اگر وہ گاڑی کے کسی ڈبے میں چھپ جائے تو بڑی آسانی سے کسی نہ کسی گاؤں یا شہر پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح نہ صرف وہ بادشاہ اور کمن کی دسترس سے دور نکل جائے گا بلکہ اس ہولناک ویرانے سے بھی نجات مل جائے گی۔ یہ خیال بڑا خوب صورت تھا۔ اسے یکا یک ایسا لگا جیسے اندھیرے میں امید کی کوئی کرن جگمگا گئی ہو، وہ جلدی سے اٹھا اور لپکتا ہوا ٹرین کی طرف بڑھنے لگا۔ پہلے تین ڈبوں کے دروازے بند تھے لیکن چوتھے ڈبے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ بشو چند لمحوں کے لیے رکا ذرا غور سے اس نے انجن کی جانب نظر دوڑائی مگر ہر طرف سکوت طاری تھا۔ کوئی بھی اسے دیکھنے والا نہ تھا، وہ مطمئن ہوکر دروازے پر چڑھ کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر اندھیرا تھا چند لمحوں تک اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا، پھر جب آنکھیں تاریکی سے ذرا مانوس ہوگئیں تو اس نے دیکھا کہ ڈبے کے دائیں حصے میں دو بھینسیں بیٹھی جگالی کررہی ہیں جبکہ ڈبے کے بائیں حصے میں کسی شے کا انبار لگا ہوا تھا۔ فرش پر پیال بچھا ہوا تھا۔ بشو کو دیکھ کر دونوں بھینسیں ڈکرائیں۔ انہیں غالباً یہ مداخلت بے جا پسند نہیں آئی تھی۔ پھر انہوں نے بشو کو نظرانداز کردیا۔ بشو کچھ دیر تو کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر ہولے ہولے بائیں طرف بڑھا۔ ڈبے میں کئی بورے تلے اوپر رکھے تھے اور ان میں کوئی نرم شے بھری ہوئی تھی۔ بشو نے کونے والے بورے ہٹائے اور ان کے پیچھے اس طرح دبک کر بیٹھ گیا کہ اگر کوئی ڈبے میں آئے بھی تو فوراً ہی اسے نہ دیکھ سکے پھر اس نے آنکھیں بند کیں اور گزشتہ واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس کے ذہن میں کئی احساسات بیک وقت گڈمڈ ہورہے تھے۔ خوف، بے بسی، بے چارگی اور بے یقینی، وہ ابھی تک شک وشبے میں مبتلا تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اس نے واقعی کمن کے اوپر سلاخ سے وار کیا تھا اور یہ کہ وہ واقعی کمن اور بادشاہ کے چنگل سے بھاگ نکلا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہیں وہ کوئی سپنا تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس نے سپنے بہت دیکھے تھے۔ پچھلے چند سال میں ان گنت بار، کبھی وہ دیکھتا کہ کمن، بادشاہ اور رحتاں مکان میں بے خبر سو رہے ہیں۔ رات چاروں اور مسلط ہے، وہ چپکے سے اٹھتا اور دبے پاؤں مکان سے باہر آتا اور پھر آسمان سے ایک سفید گھوڑا اترتا ہے۔ پیٹھ پر ہیرے موتیوں سے مرصع زین کسی ہوئی ہے اور گردن میں ایک سنہری پٹا پڑا ہے۔ گھوڑا ہنہناتا ہوا اور شاہانہ انداز میں دلکی چلتا ہوا بشو کے پاس آتا ہے اور پھر بشو اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوجاتا ہے دوسرے لمحے گھوڑا ایک جست بھر کر فضا میں بلند ہوتا ہے اور پھر اوپر ہی اوپر اڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک خیال کی طرح ایک خواب کے مانند اور نیچے، بہت نیچے دنیا ایک گیند کے مانند نظر آرہی ہے۔ بشو آزاد ہوچکا ہے۔ بادشاہ اور کمن کی دسترس سے بہت دور نکل آیا ہے، اب وہ لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

کبھی وہ دیکھتا کہ اس کے ہاتھ میں ایک ہنٹر ہے اور وہ ایک تہ خانے میں کھڑا ہوا ہے۔ تہ خانے کے عین وسط میں ایک ستون سے اس نے کمن، بادشاہ اور رحتاں کو باندھ دیا ہے۔ ان تینوں کے چہرے خوف اور دہشت سے دھواں ہوچکے ہیں۔ وہ لوگ گڑگڑا رہے ہیں کہ بشو انہیں چھوڑ دے لیکن بشو کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوتا...... اس کے اوپر تو جنون سوار ہے۔ برسوں اس نے ظلم سہے ہیں، اب وہ ہر ظلم، ہر ستم کا حساب لینا چاہتا ہے چنانچہ وہ مسلسل ہنٹر چلاتا رہتا ہے۔ ان کے جسموں پر لمبے لمبے، گہرے زخم ہیں، جن سے خون ابل رہا ہے اور وہ بلبلا کر چیخ رہے ہیں، چیخو اور چیخو...... بشو ہنٹر چلاتا ہے، آج مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ آج کا یہ دن، یہ لمحہ میرا ہے اور آج میں تم سے ہر ظلم، ہر کمینگی، ہر درندگی کا حساب لوں گا، یاد ہے تم نے کتنے بچوں کو ان کی ماؤں سے جدا کیا ہے، کتنے بچوں کے ہاتھ پیر توڑے ہیں اور ان کے جسموں پر زخم بنائے ہیں تاکہ ان سے بھیک منگوا سکو اور کس کس طرح تم نے ہمیں بھوکا رکھا ہے، سسکایا، تڑپایا اور ترسایا ہے؟ کس طرح ہمارے بال اکھاڑے اور ناخن توڑے ہیں۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو لیکن مجھے یاد ہے ایک ایک آنسو، ایک ایک ٹیس اور ایک ایک چیخ یاد ہے لہٰذا آج میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ ہنٹر چلتا رہتا ہے۔ تیسرے سپنے میں بشو انسپکٹر تھا۔ وہ دیکھتا کہ وہ بڑا ہوگیا ہے، لمبا چوڑا، تنومند نوجوان۔ پولیس انسپکٹر کی وردی میں وہ بہت شاندار ... پربارعب نظر آتا ہے، مجرم اس کا نام سن کر تھرتھر کانپتے ہیں، جدھر سے گزرتا ہے، لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں، اس نے کمن بادشاہ اور رحتاں کو بھی جیل میں ہمیشہ کے لیے بند کردیا ہے اور اس طرح ان تمام دکھوں اور مظالم کا بدلہ لے لیا ہے جو ان لوگوں نے بشو پر توڑے تھے۔ مگر سپنے تو صرف سپنے ہوتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں۔ بشو کے سپنے بھی ٹوٹ جاتے تھے۔ نہ کبھی آسمان سے اڑنے والا گھوڑا اترا، نہ کبھی اس کے ہاتھوں میں ہنٹر آیا اور نہ ہی اس کے پولیس انسپکٹر بننے کا کوئی امکان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت جب وہ مال گاڑی کے ڈبے میں بوروں کے پیچھے چھپا ہوا آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا تو بھی اس کے ذہن میں شک تھا، ایک بے یقینی کی کیفیت طاری تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں کوئی عجیب اور انہونی بات ہوگئی ہے ابھی یہ طلسم ٹوٹ جائے گا اور وہ ایک بار پھر حقیقت کی سنگین، بدصورت اور بے رحم دنیا میں واپس لوٹ آئے گا۔

اس نے یکا یک زور سے سانس لی۔ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا کیونکہ بھوک کی شدت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ پھر اس نے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ذہن کو ادھر ادھر لگانے کی کوشش کی۔ پلکوں کے تاریک پردے پر کئی دھندلے دھندلے نقوش ابھرے تھے جیسے ادھوری تصویریں ہوں، وہ دم سادھے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ ایک چھوٹا سا آنگن ہے، آنگن میں جامن کا ایک درخت ہے، درخت کے تنے سے ایک چتکبری بکری بندھی ہوئی ہے۔ دائیں طرف کھپریل کی چھت والے صحن میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہے۔ سامنے ایک تسلا دھرا ہے جس میں وہ آٹا گوندھ رہی ہے۔ عورت کوئی زیادہ عمر رسیدہ نہیں لیکن غریبی، دکھوں اور فاقوں نے اسے بالکل خستہ حال کردیا ہے۔ اس کے سر کے بے شمار بال سفید ہوگئے ہیں آنکھوں میں غموں اور محرومیوں کی دھندلاہٹ ہے اور چہرے پر اتنی جھریاں ہیں جتنے زندگی میں غم ہوں گے۔ آٹا گوندھتے گوندھتے وہ اچانک سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتی اور زور سے سانس لیتی ہے اور پھر بشو کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔

”بشو! کیا بہت بھوک لگی ہے؟“

وہ زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھا ہے، گردن ہلا کر کہتا ہے۔ ”ہاں۔“

”بس ذرا دیر اور ٹھہر جا، ابھی روٹی پکاتی ہوں۔“ وہ بوڑھی عورت لہجے میں ممتا کی مٹھاس بھر کر کہتی ہے۔

”اچھا تو میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر بشو اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔

”دیکھ دور کہیں مت جانا اور جلدی واپس آجانا۔“ وہ بشو کی جانب دیکھ کر ایک بار پھر مسکراتی ہے۔

”اچھا...... اچھا......“

تصویر یکا یک تحلیل ہوجاتی ہے جیسے ہوا سے ریت پر بنے ہوئے نقش تحلیل ہوجائیں۔ وہ بوڑھی عورت بشو کی ماں ہے اور اس کی ممتا کے نور سے دمکتی ہوئی مسکراہٹ، آخری یاد ہے جو بشو کے ذہن میں محفوظ ہے۔ پتا نہیں اب اس کی ماں کہاں ہے، کس حال میں ہے؟ زندہ بھی ہے یا...... اور وہ چتکبری بکری اور جامن کا درخت اور وہ گھر...... یکا یک بشو کا دل بھر آیا، آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ چپکے چپکے رونے لگا۔ پلکوں کے تاریک پردے پر بننے والے نقوش آنسوؤں میں بہہ گئے۔ بشو دھیرے دھیرے روتا رہا۔ اس وقت، بے کسی کے اس دل فگار لمحے میں اسے اپنی ماں بہت یاد آئی۔ اس کا جھریوں سے بھرا مگر ممتا کے نور سے روشن چہرہ، وہ دمکتی مسکراہٹ اور آواز کی مٹھاس...... بس ذرا دیر ٹھہر جا،

ابھی روٹی پکاتی ہوں...... اماں...... اماں......! تم کہاں ہو، دیکھو، میں اس وقت، اس تاریک رات میں، اس ویرانے میں تمہیں یاد کررہا ہوں۔ مجھے آواز دو...... اماں مجھے آواز دو...... وہ چپکے چپکے روتا رہا، روتے روتے سسکیاں بھرنے لگا پھر جانے کیسے اسے نیند آگئی اور وہ بے خبر سو گیا۔

جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ڈبے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے بورے ہٹائے اور ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں بھینسیں ڈبے میں نہیں تھیں۔ البتہ بورے اسی طرح رکھے ہوئے تھے۔ وہ بوکھلایا ہوا دروازے پر آیا اور وحشت بھری نظروں سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے دور تک پٹریوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس کے بعد جنگلا اور جنگلے کے باہر اونچے درختوں کے جھنڈ اور دور تک پھیلی ہوئی عمارتیں۔ نارنجی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے تو بشو کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے ذہن میں ساری بات واضح ہوگئی۔ غالباً اس کے سو جانے کے بعد مال گاڑی روانہ ہوئی ہوگی اور پھر ساری رات اور دن کے بیشتر حصے میں سفر کرنے کے بعد اب کسی شہر میں پہنچ گئی تھی۔ بھینسیں تو اتاری جا چکی تھیں لیکن بورے اسی طرح رکھے تھے اور چونکہ وہ بوروں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اس لیے کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

جب یہ ساری بات اس کی سمجھ میں آئی تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ کتنی عجیب بات ہے، وہ سوتا رہا اور میلوں تک کا سفر طے ہوگیا اور اب وہ کسی شہر میں پہنچ چکا ہے۔ پتا نہیں کون سا شہر ہے؟ اس نے سوچا مگر لگتا ہے کوئی بڑا شہر ہے پھر وہ نیچے اترا اور ابھی دو ہی قدم چلا تھا کہ معاً آنکھوں میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ ٹانگیں اس بری طرح لرزیں کہ وہ لڑکھڑا گیا۔ اگر جلدی سے بیٹھ نہ جاتا تو یقیناً گر پڑتا۔ زمین پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ تاریکی تھی اور تاریکی میں ناچتے ہوئے ان گنت دائرے تھے۔ دراصل بھوک کی شدت اب انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ نقاہت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے تھے۔ چالیس گھنٹے سے زیادہ ہوچکے تھے کہ اس کے پیٹ میں ایک دانہ تک نہیں گیا تھا اور ایک گیارہ سالہ لڑکے کے لیے چالیس گھنٹے تک بھوکا رہنا معمولی بات نہیں تھی۔ بشو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن میں ذرا بھی جان نہ ہو۔ پیٹ کے اندر آنتیں یوں اینٹھ رہی تھیں، جیسے کوئی انہیں زور زور سے مچل رہا ہو۔ کئی منٹ...... تک وہ سر تھامے، بیٹھا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا پھر حواس قدرے بحال ہوئے، آنکھوں کی روشنی واپس آئی اور ٹانگوں کی لرزش کم ہوئی تو وہ ہمت کرکے اٹھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نے دائیں جانب دیکھا، قدرے فاصلے پر اسٹیشن تھا، جہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اور پلیٹ فارم پر بے شمار لوگ نظر آرہے تھے۔ بشو نے ہونٹ چاٹے اور ہولے ہولے سے قدم اٹھا کر آگے بڑھا یا۔

جنگلے کی ایک سلاخ ٹوٹی ہوئی تھی لہٰذا اس کو باہر نکلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جنگلے کے دوسری طرف کچھ دور تک کچا میدان تھا پھر ڈھلان اور اس کے بعد سڑک۔ بشو سڑک پر پہنچ کر دائیں طرف چلنے لگا۔ کوئی نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک چوراہا تھا۔ بشو چوراہے پر پہنچ کر خود بخود بائیں جانب مڑ گیا اور آگے چلنے لگا۔ یہ سارا عمل بالکل غیر ارادی تھا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے اور کیوں جارہا ہے...... اجنبی شہر تھا، اجنبی لوگ تھے اور اجنبی سڑکیں اور گلیاں تھیں اور وہ ایک کھویا ہوا لڑکا تھا جو اپنے جامن کے درخت، چتکبری بکری اور بوڑھی ماں سے بچھڑ گیا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ بھوک کی شدت اور جسمانی نقاہت کی بنا پر حواس منتشر ہورہے تھے، ذہن پر تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ اگر اتنی خستہ حالت نہ ہوتی تو شاید وہ کسی سے پوچھ لیتا کہ وہ کس شہر میں ہے اور یہ کہ اسے کیا کرنا چاہیے مگر اسے ہوش ہی کہاں تھا۔ اس کے قدم بھی بغیر ارادے کے اٹھ رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسری سڑک آئی، دوسری کے بعد تیسری سڑک آئی۔ وہ سراسیمہ، پاگلوں کی طرح...... لوگوں کو، عمارتوں کو اور آتی جاتی کاروں، بسوں اور تانگوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا، دھیرے دھیرے دھوپ دھندلانے لگی۔ سنہری ماند پڑ گئی۔ پھر وہ ایک گلی میں داخل ہوا اور حیران ہوکر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ دونوں طرف کھلے دروازوں میں سجی سنوری عورتیں بیٹھی تھیں، اکثر عمارتیں دو منزلہ تھیں اور ان کے چوباروں پر بھی عورتیں بیٹھی تھیں۔ سر سے پیر تک سجی ہوئی، ہونٹوں پر سرخی لگائے، آنکھوں میں کاجل رچائے اور طرح طرح کے خوب صورت لباس اور زیور پہنے ہوئے۔ بعض گھروں سے موسیقی اور گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ”چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے۔“ گلی میں بڑی چہل پہل تھی، میلے کا سا سماں تھا۔ طرح طرح کے لوگ آجا رہے تھے، کسی کے ہاتھ میں پھولوں کے گجرے تھے۔ آنے جانے والے مرد، عورتوں سے ہنسی

مذاق اور فقرے بازی بھی کرتے جارہے تھے۔ بشو بڑا حیران ہوا۔ یہ کیسی دنیا ہے، کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسی عورتیں ہیں۔ یہ عورتیں دروازوں اور چوباروں پر کیوں بیٹھی ہیں۔ اس نے اتنی بہت سی خوب صورت اور دلہنوں کی طرح سجی سنوری عورتیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بڑا تعجب ہورہا تھا۔ اتنا کہ کچھ دیر کے لیے وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ چالیس گھنٹوں سے بھوکا ہے۔ حیران حیران نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ گلی آگے جاکر دائیں طرف مڑ گئی تھی اور موڑ پر قدرے چوڑی ہوگئی تھی۔ بشو یکایک رک گیا اور ہولے ہولے پسلیوں کو دبانے لگا کیونکہ پسلیوں کے نیچے ہلکا ہلکا درد ہورہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں بیٹھ جانا چاہیے، اب اور چلنا مشکل نظر آتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دائیں ہاتھ پر ایک پان سگریٹ کی دکان تھی۔ پھٹے پر ایک گھنے گھنگرالے بالوں والا گورا چٹا، تنومند آدمی بیٹھا پھرتی سے پان لگا رہا تھا۔ دکان کے قریب ہی ایک مدقوق سا سیاہ فام آدمی پھولوں کے ہار اور گجرے بیچ رہا تھا، آس پاس چند ایک دکانیں اور تھیں کہیں کباب، روٹی اور تکے بک رہے تھے، کہیں چاٹ اور کہیں عورتوں کے سنگار کا سامان، البتہ پان کی دکان سے آگے والی دکان بند تھی اور اس کا چبوترا بالکل خالی تھا۔ بشو نے ایک لمحے سوچا پھر حریص نظروں سے کباب تکوں کی دکان کو گھورتا ہوا بند دکان کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا پھٹا خاصا چوڑا تھا۔ برابر میں اوپری منزل کی سیڑھیاں تھیں، بشو پھٹے پر بند دروازے سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ زور سے ایک دوسرے میں پھنسا لیے۔ بھوک کی شدت اور کمزوری اب انتہا کو پہنچ چکی تھی، اس کے ہاتھ پیر سنسنا رہے تھے۔ سر کے اندر کچھ ایسی گونج پیدا ہورہی تھی، جیسے ہوا سیٹیاں بجا رہی ہو۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی ایک چادر سی تنی ہوئی تھی، دھوئیں کی طرح اور اس دھوئیں کے دوسری طرف جو کچھ بھی تھا، دروازے، کھڑکیاں، دکانیں اور چلتے پھرتے لوگ، سب کچھ دھندلا نظر آرہا تھا۔ بشو کچھ دیر دھند کے دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر اس نے تھک کر آنکھیں بند کرلیں اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

پتا نہیں کتنی دیر ہوگئی۔ ایک گھنٹا گزر گیا یا شاید دو گھنٹے گزر گئے، پھر بشو کے کان میں ایک آواز آئی۔ ایک نرم نسوانی آواز اس نے ہولے سے پلکیں کھولیں۔ پہلی نظر میں تو کچھ نظر ہی نہیں آیا پھر اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی سامنے کھڑی ہے۔ سرخ رنگ کے کپڑے پہنے۔ بارہ تیرہ سال عمر رہی ہوگی۔ بشو کو وہ ایک دھندلی تصویر کی طرح نظر آئی۔ اس نے آہستہ سے سر کو جنبش دی اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لڑکی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پھر کہا۔ ”اے کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟“

بشو نے بڑی ہمت کرکے کہا۔ ”بشو۔“

”کیا، بشو...... اچھا...... اچھا۔“ لڑکی اونچی آواز میں بولی۔ ”کدھر سے آئے ہو تم؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟“

بشو نے کچھ کہا لیکن خود اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے کیا کہا۔ شاید لڑکی کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ اس نے پھر اونچی آواز میں پوچھا۔ ”کیا تم بیمار ہو؟ طبیعت خراب ہے؟“

بشو نے پھر کچھ کہا۔ اس کی آواز مدھم تھی، لڑکی کو جھک کر اور دھیان دے کر سننا پڑا۔ پھر وہ بولی۔ ”بھوکے ہو؟“

بشو کا سر شاید آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔ لڑکی نے دوبارہ اس کے شانے پر تھپکی دی پھر ہمدردی سے کہنے لگی۔ ”اچھا...... اچھا...... تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ گھومی اور سیڑھیوں میں غائب ہوگئی۔ بشو نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور دونوں پیر سمیٹ کر بیٹھ گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ لڑکی نے کیا کہا تھا لیکن اگر سمجھ میں آبھی جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ کہیں جاتا۔ ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی، ذہن نقاہت کے باعث ماؤف سا ہوچکا تھا لہٰذا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر گزر گئی پھر اس کے شانے پر دباؤ پڑا اور لڑکی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

”اے...... یہ لو۔“

اس نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے المونیم کا ایک تسلا موجود تھا، جس میں سرسوں کا ساگ، دو روٹیاں اور ایک گلاس پانی رکھا تھا۔ بشو نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گردن اٹھا کر لڑکی کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

بیگم احسان نے بڑے ناز سے ذرا اٹھلا کر کہا۔ ”جانیے بڑے وہ ہیں آپ۔“

شیخ طاہر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ تو محض آپ کا حسن ظن ہے ورنہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”نہیں...... نہیں، آپ ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں۔“

بیگم احسان نے بہ دستور ناز بھرے انداز میں کہا۔ ''ہمیشہ کوئی نہ کوئی مصروفیت، کوئی نہ کوئی بہانہ، یہ فن تو آپ کو خوب آتا ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ کسی کے دل پر کیا گزر جاتی ہوگی۔ ذرا بھی تو خیال نہیں کرتے۔''

''بھلا ایسا کون ہے جسے میرے خیال کی اتنی پروا ہے؟''

''فرض کیجیے، میں ہی ہوں وہ۔'' بیگم احسان پھر اٹھلائیں۔

شیخ طاہر ہولے سے مسکرائے۔ انہوں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن موقع نہیں ملا۔ اچانک دور سے فریدہ شوکت نے زور سے نعرہ لگایا۔ ''ارے طاہر صاحب! آپ یہاں ہیں..... میں آپ کو کب سے تلاش کر رہی ہوں۔''

شیخ طاہر مسکرانے لگے۔ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''بھئی میں تو کافی دیر سے یہاں ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو نظر نہیں آیا۔''

جواب میں فریدہ شوکت بھی مسکرائی۔ ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے کن انکھیوں سے بیگم احسان کی طرف دیکھا۔ ''میں نے سنا تھا کہ آپ کی طبیعت کچھ نصیب دشمناں ناساز ہوگئی تھی؟''

''ہاں۔'' شیخ طاہر نے جواب دیا۔ ''کچھ کھانسی بخار کی شکایت ہوگئی تھی مگر اب اچھا ہوں، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ بیگم احسان آڑی ترچھی نظروں سے فریدہ شوکت کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ناگواری صاف چھلک رہی تھی، جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہوں، یہ کمبخت کیوں نازل ہوگئی ہے۔ یہی کیفیت فریدہ شوکت کی تھی۔ بار بار بیگم احسان کی طرف یوں کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی گویا اسے بیگم احسان کی موجودگی ناگوار گزر رہی ہو اور وہ من ہی من میں دعا کر رہی ہو کہ اب یہ محترمہ یہاں سے دفع ہی ہوجائیں تو اچھا ہے۔ شیخ طاہر دونوں خواتین کی اس کیفیت سے اندر ہی اندر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بیگم احسان اور فریدہ شوکت میں چشمک چلتی رہتی ہے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نہ صرف یہ دونوں خواتین بلکہ اور بھی کئی خواتین ہیں جو ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ رہتی ہیں مثلاً نسرین چودھری جو شہر کے ایک بہت بڑے افسر کی صاحبزادی تھیں اور کچھ ہی عرصہ قبل ایم اے کرکے فارغ ہوئی تھیں اور اب اس بات پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں کہ شیخ طاہر کی منظورِ نظر بن کے رہیں گی، پھر مسز انور علی تھیں۔ عمر بیالیس سال، کئی ہزار ایکڑ زمین اور کئی کارخانوں کی مالک تھیں۔ سانولا رنگ، ناک نقشہ بے حد تیکھا، چند مہینے قبل ہی اپنے شوہر مسٹر انور علی کو مقامی قبرستان میں دفن کرکے فارغ ہوئی تھیں اور اب اپنی تنہا، ویران زندگی کو شیخ طاہر کی قربت سے پر رونق بنانا چاہتی تھیں۔ گو وہ شیخ طاہر سے سال چھ ماہ بڑی ہی تھیں تاہم ان کا خیال تھا کہ ان کی کروڑوں کی دولت اور جائداد نے ان کی ذات میں ایک ایسی خوبی پیدا کردی ہے جو جوانی سے زیادہ کشش انگیز ہے اور انجام کار، وہ شیخ طاہر کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں گی۔ ایک اور خاتون..... تھیں۔ شازیہ نیلوفر، ملک کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کے صوبائی جنرل سیکریٹری کی دختر تھیں اور نیک اختر بھی۔ وہ اس طرح کہ ولایت سے کئی ڈگریاں حاصل کرکے لوٹی تھیں، خوب صورت جوان تھیں اور ذہین بھی اتنی کہ ہمیشہ ہر امتحان میں اول آتی رہی تھیں اور اب ان کا تازہ ترین امتحان شیخ طاہر تھے۔ دوسروں کو شبہ ہوسکتا تھا لیکن خود شازیہ نیلوفر عرف شاذی کو یقین تھا کہ وہ اس امتحان میں بھی آخر کار اول ہی آئیں گی۔ ان خواتین کے علاوہ دو چار خواتین اور بھی تھیں۔ شیخ طاہر ان کی نگاہ انتخاب کا مرکز تھے اور ان خواتین کو بھی یقین تھا کہ لاٹری انجام کار ان ہی کے نام نکلے گی۔ شیخ طاہر یہ ساری باتیں سوچتے سوچتے معاً ہولے سے مسکرائے لیکن ان کی مسکراہٹ میں مسرت کا فقدان تھا۔ کچھ عجیب سی مسکراہٹ تھی، پھیکی، پژمردہ، جیسے خود انہیں اپنے آپ پر ترس آگیا ہو۔ انہوں نے دفعتاً زور سے سانس لی اور فریدہ شوکت کی طرف دیکھا جو بڑی شوخی سے کہہ رہی تھی۔

''خدا کا شکر ہے کہ اب آپ اچھے ہیں، مگر یہ تو بتائیے، یہ آپ نے پارٹی کس خوشی میں دے ڈالی ہے؟''

''میں نے کوئی پارٹی وارٹی نہیں دی ہے.....'' شیخ طاہر نے وضاحت کی۔ ''یہ تو بس خود بخود ہوگیا ہے۔ لوگ ملنے کے لیے آتے گئے اور خود بخود ایک پارٹی سی ہوگئی۔''

اور یہ بات بالکل ٹھیک تھی، شیخ طاہر نے کوئی پارٹی نہیں دی تھی۔ لوگ ایک ایک کرکے ان سے ملنے کے لیے آتے گئے اور اچھا خاصا اجتماع ہوگیا۔ اب اس وقت ان کے وسیع ڈرائنگ روم میں متعدد افراد موجود تھے۔ شہر کے امرا و رؤسا، لاکھوں کا ہیر پھیر کرنے والے تاجر، سرکاری افسر، سیاسی لیڈر اور طرح دار خواتین۔ یہ سب کے سب بڑے لوگ تھے، ایک ایسی دنیا میں رہنے والے جس کا عام انسانوں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ غالیچوں پر چلتے تھے اور کاروں میں سفر کرتے تھے اور صرف بڑے بڑے ہندسوں کی گنتی جانتے تھے، بشرطیکہ اس گنتی کا تعلق نوٹوں اور سکوں سے ہو اور یہ لوگ صرف بڑے بڑے منصوبے بناتے تھے۔ بڑے ہوٹل، بڑے کارخانے اور بڑی عمارتیں۔ جن کے پاس لاکھوں تھے، وہ کروڑوں کی فکر میں تھے اور جن کے پاس کروڑوں تھے، ان بے چاروں کو اپنی انتہا کا خود ہی علم نہیں تھا۔ یہ لوگ اکثر و بیشتر شیخ طاہر کے وسیع اور خوب صورت بنگلے میں جمع ہوجایا کرتے تھے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ بڑے لوگ بڑے لوگوں سے ہی ملتے ہیں اور کچھ اس بنا پر کہ ان میں اکثر کی کوئی نہ کوئی غرض یا کوئی نہ کوئی مفاد شیخ طاہر سے وابستہ تھا۔ مثلاً سیٹھ اکرام تھے، جو ایک بہت بڑا پلازا بنانا چاہتے تھے اور ان کے لیے انہیں شیخ طاہر کی پارٹنر شپ کی ضرورت تھی۔ چودھری رفیق جدید طرز کا ایک بڑا کارخانہ لگانے کے لیے شیخ طاہر کے تعاون اور ساجھے داری کے متمنی تھے۔ پھر سیاسی پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے، جو کئی ماہ سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ شیخ طاہر ان کی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلیں، کیونکہ ان کی پارٹی کی پوزیشن کچھ اچھی نہیں تھی اور یہ بات قریب قریب طے تھی کہ آنے والے الیکشن میں ان کی پارٹی مشکل سے چند سیٹیں ہی حاصل کرسکے گی لیکن اگر شیخ طاہر پارٹی میں شامل ہوجائیں تو صورتِ حال تبدیل ہونے کا نمایاں امکان تھا۔ شیخ طاہر کی دولت اور نیک نامی کی بدولت بے شمار ووٹرز پارٹی کی جھولی میں آسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پارٹی کے جنرل سیکریٹری اکثر شیخ طاہر کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ سیٹھ اکرام، چودھری رفیق اور جنرل سیکریٹری کے علاوہ مزاج پرسی کے لیے آنے والوں میں اور بھی کئی لوگ تھے۔ دوسرے الفاظ میں شیخ طاہر ایک ایسی مرغی تھی جو کئی ملاؤں میں حرام ہو رہی تھی لیکن وہ بھی کسی سے کچھ کہتے نہیں تھے۔ سب کی سنتے تھے اور مسکرا کر چپ ہوجاتے تھے۔

بیگم احسان نے چند باتیں اور کیں پھر خشونت آمیز نظروں سے فریدہ شوکت کو گھورتی ہوئی دوسری طرف چلی گئیں۔ کچھ اس انداز میں، گویا زبانِ بے زبانی سے کہہ رہی ہوں، اچھا چڑیل سمجھوں گی تجھ سے۔ بیگم احسان کے جانے کے بعد فریدہ شوکت نے اطمینان کی..... سانس لی اور ناز بھرے انداز میں بولی۔ ''تو کل آرہے ہیں آپ؟''

''کل، کہاں؟'' شیخ طاہر نے تعجب سے کہا پھر چونک کر بولے۔ ''ارے ہاں، کل تو تمہاری سالگرہ ہے۔''

''دیکھیے، دیکھیے۔ آپ تو ابھی سے بھول گئے تھے۔'' فریدہ شوکت نے مصنوعی خفگی سے شکایت کی۔ ''یہ تو کچھ اچھی بات نہیں۔ آپ کو کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔''

''نہ..... نہ..... ناراض نہ ہو۔'' شیخ طاہر خوش دلی سے مسکرائے۔ ''بے شک میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی لیکن ڈائری میں تو درج ہے، کل سیکریٹری ضرور مجھے یاد دلا دیتا اور میں نے تمہارے لیے تحفہ بھی خرید لیا ہے۔''

''اچھا۔'' فریدہ خوش ہوکر بولی۔ ''بتائیے..... بتایے نا، کیا دے رہے ہیں آپ مجھے؟''

''ابھی نہیں، کل دوں گا، تب دیکھ لینا ورنہ سارا لطف غارت ہوجائے گا۔'' اتنا کہتے کہتے شیخ طاہر نے گردن گھمائی اور ان کی نظر مس شائستہ گلزار پر جم گئی، جو دو تین خواتین کے ساتھ کھڑی تھی لیکن بے تابانہ اور پرشوق نظروں سے شیخ طاہر کو ہی دیکھ رہی تھی۔ شائستہ گلزار ہر چند کہ شہر کے آئرن کنگ کی لڑکی تھی لیکن خود پھولوں کی طرح نرم و نازک تھی گو کہ کچھ ایسی زیادہ خوب صورت نہیں تھی مگر دلکشی اور جاذبیت کی کمی جدید فیشن کے ملبوسات، زیورات اور میک اپ سے پوری کرلیتی تھی۔ شیخ طاہر کی طلب گاروں میں اس کا نمبر ساتواں یا آٹھواں تھا۔ جب شیخ طاہر نے اس کی جانب دیکھا تو اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک اجلی اور تیکھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ہولے سے ایک آنکھ دبائی۔ شائستہ گلزار کی یہ حرکت فریدہ شوکت نے اتفاق سے دیکھ لی۔ اس نے دفعتاً بھویں سکیڑ کر حد درجہ ناگواری اور غصے سے کہا۔

''مجھے یہ عورت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔''

''وہ کیوں؟''

''ارے آپ دیکھتے نہیں، کیسی دیدہ دلیر ہے۔ نہ جانے کمبخت اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ نہ صورت ہے نہ شکل لیکن بھڑکیلے کپڑوں سے ہر وقت لدی رہتی ہے اور میک اپ تو بس اتنا کرتی ہے کہ کچھ پوچھو نہیں۔''

''مگر بھئی سنگار تو عورت کا فطری حق ہے۔''

''میں مانتی ہوں۔'' فریدہ شوکت نے پہلے ہی جیسے تیکھے اور تلخ لہجے میں کہا۔ ''مگر سلیقے اور پھوہڑپن میں کوئی فرق ہوتا ہے طاہر صاحب۔ آخر میں بھی تو ہوں۔ کیا آپ نے کبھی مجھے بھی ایسا سنگار کرتے دیکھا ہے کہ اچھی خاصی اشتہار نظر آؤں؟''

شیخ صاحب نے جواب میں کچھ نہیں کہا، مسکرا کر چپ

ہو گئے، انہیں معلوم تھا کہ فریدہ شوکت کے ان تلخ ریمارکس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر فریدہ کے بجائے شائستہ اس وقت ان کے قریب ہوتی تو وہ فریدہ شوکت پر اسی قسم کے اعتراضات کرتی۔ وہ اس قسم کی باتیں سنتے تھے اور چپ ہو جاتے تھے۔ ضرورت بھی کیا تھی کہ اپنی رائے کا اظہار کرتے۔

فریدہ شوکت نے شائستہ گلزار کے دو چار عیب اور گنوائے۔ جن کا علم کم از کم اس کی دانست میں شیخ طاہر کو نہیں تھا۔ پھر اس نے شیخ طاہر کو مشورہ دیا کہ اگر انہوں نے شائستہ گلزار کو ذرا بھی لفٹ دی تو یہ ایک بھیانک غلطی ہوگی۔ شیخ طاہر نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے مشورے کا ہر حال میں دھیان رکھیں گے۔ پھر وہ بہانہ بنا کر کے دریچے کی طرف بڑھ گئے، جہاں میز پر مشروبات کے علاوہ پان کی نقرئی تھالی بھی رکھی تھی۔ انہوں نے ایک پان اٹھا کر کلے میں دبایا پھر وہ گھوم ہی رہے تھے کہ اچانک رازی نے انہیں گھیر لیا۔

"شیخ صاحب!" اس نے عادت کے مطابق ناک کھجا کر کہا۔ "میں اب تک آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ آخر کب آپ میرے لیے وقت نکالیں گے؟"

"کاہے کے لیے وقت چاہیے بھائی آپ کو؟" شیخ طاہر نے ذرا اچنبھے سے پوچھا۔

"انٹرویو، جناب انٹرویو۔" رازی نے کہا۔ "یاد ہے، میں تین بار آپ سے درخواست کر چکا ہوں لیکن آپ کو وقت ہی نہیں ملتا۔ میرا خیال ہے کہ اب اور نہ ٹالیے۔ لوگ آپ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ آپ کی شخصیت، آپ کی بے مثال کامیابی، آپ کے کارنامے، یہ ساری باتیں لوگ جاننا چاہتے ہیں لہٰذا حضور والا! میں سمجھتا ہوں کہ کسی دن، کچھ وقت مجھے بھی عنایت فرمائیے، صرف چند ہی باتیں پوچھوں گا اور اطمینان رکھیے، ایسا آرٹیکل لکھوں گا کہ آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔ ہاں، تو کب حاضر ہو جاؤں؟"

رازی ایک مقامی اخبار کا رپورٹر تھا۔ خبروں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ نمایاں اور نامور شخصیتوں کے انٹرویو لینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس کی شہرت خاصی متضاد اور متنازعہ تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک جرأت مند اور ایماندار اخبار نویس ہے، لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے میں اسے کمال حاصل ہے۔ کسی تعزیر یا خوف کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ماضی میں اس نے متعدد لیڈروں اور بڑے افسروں کے کچے چٹھے کھولے تھے اور ان کے اصل چہرے عوام کے سامنے رکھے تھے اور ہر چند کہ اسے کئی بار مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا، جیل کی ہوا بھی کھائی تھی مگر اس نے کبھی پروا نہیں کی اور اپنے اصولوں پر کاربند رہا لیکن لوگوں کا ایک حلقہ ایسا بھی تھا جو اس رائے سے متفق نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ رازی دراصل ایک خود غرض، موقع پرست اور حد درجہ چالاک شخص ہے۔ سچ کیا تھا یہ کسی کو علم نہیں تھا۔ انہیں بھی نہیں جو رازی سے بہت قریب تھے جبکہ خود رازی کا کہنا یہ تھا کہ وہ تو ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔

شیخ طاہر نے قدرے توقف کے بعد مسکرا کر خوش دلی سے کہا۔ "مگر بھئی رازی صاحب! میں تو ایک سادہ سا آدمی ہوں، عام قلم کار۔ میرے بارے میں لکھ کر آپ اپنے اخبار کے صفحے کیوں ضائع کریں گے۔ لوگوں کو بھلا مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"خیر حضور، یہ تو نہ کہیے۔ آپ عام ہیں یا خاص، یہ طے کرنا آپ کا نہیں ہمارا کام ہے۔" رازی نے ہنس کر کہا۔ "رہی صفحے ضائع ہونے کی بات تو اطمینان رکھیے کہ صفحے ضائع نہیں ہوں گے۔ ہاں، تو میں کب حاضر ہو جاؤں؟"

شیخ طاہر نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "دیکھیے، ابھی ذرا مصروف ہوں، کچھ دن ٹھہر جائیے، پھر میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔"

"اچھی بات ہے جناب والا! ہم انتظار کر لیں گے۔" رازی خوشی سے مسکرایا، پھر کہنے لگا۔ "ویسے شیخ صاحب! میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ آپ کے اس خوب صورت بنگلے میں مجھے ہر شے اچھی لگتی ہے، یہ کھڑکیاں اچھی لگتی ہیں، پردے، قالین اور یہ جھاڑ بھی اچھا لگتا ہے۔ مگر صرف ایک چیز اچھی نہیں لگتی۔"

"وہ کیا؟" شیخ صاحب نے پوچھا۔

"یہ۔" رازی نے گلاس فضا میں لہرایا۔ "آپ کے یہاں یا تو کوکا کولا پینا پڑتا ہے یا پھر اورنج جوس!"

"کیا کروں بھائی۔" شیخ طاہر نے قدرے معذرتی انداز میں کہا۔ "شراب میں نہیں پیتا اور نہ ہی یہ پسند کرتا ہوں کہ میری چھت کے نیچے کوئی دوسرا پیے۔ مجبوری ہے۔"

رازی ہنسنے لگا۔ "شیخ صاحب! میرا ذاتی خیال ہے، آپ ٹھیک کہتے ہیں، آدمی کو اپنے اصولوں پر سختی سے عمل کرنا چاہیے، یہ بڑی اچھی عادت ہے۔ اچھا خیر، اب میں چلتا ہوں لیکن دیکھیے، بھولیے گا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا پہلا انٹرویو سب سے پہلے میرے ہی اخبار میں چھپے۔"

"ضرور، ضرور۔ میں خیال رکھوں گا، آپ فکر نہ

کریں۔"

رازی مسکراتا اور ہاتھ ہلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی رخصت ہونے لگے۔ کمرے میں کوئی نہیں رہ گیا۔ شیخ طاہر وہیں دریچے کے قریب کھڑے ملازموں کو برتن سمیٹتے دیکھتے رہے۔ اس دوران وحیدہ بیگم کمرے میں آئیں اور انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر شیخ طاہر کو دوا کھلائی۔ پورے شہر میں ایک وحیدہ بیگم ہی ایسی ہستی تھیں، جو شیخ طاہر کو "تم" کہہ کر مخاطب کرتی تھیں، باوجود اس کے کہ وہ محض ایک ملازمہ تھیں لیکن شیخ طاہر کو کبھی وحیدہ بیگم کا طرزِ عمل اور اندازِ تخاطب برا نہیں لگا تھا بلکہ انہیں تو ایک نامعلوم سی مسرت ہوتی تھی۔ ایک بار بیگم احسان نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا۔

"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ یہ عورت آپ کو تم کہہ کر مخاطب کرے۔"

"کیوں؟"

"ارے طاہر صاحب! نوکرانی ہے، اسے اپنی حیثیت اور اوقات نہیں بھولنا چاہیے۔ بھلا نوکر کہیں مالک کو "تم" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور وہ بھی ایسے انداز میں گویا حکم دے رہی ہو۔"

"مگر بھئی، اس لفظ "تم" میں بڑی اپنایت ہے۔"

"تو کیا ہم آپ کے نہیں ہیں۔" بیگم احسان نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ "مگر میں تو ادب آداب کا بڑا خیال رکھتی ہوں۔ آخر تہذیب بھی تو کوئی چیز ہے۔"

شیخ طاہر نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مسکرا کر چپ ہو گئے۔

ملازم برتن لے گئے اور وحیدہ بیگم بھی چلی گئیں تو شیخ طاہر ہولے ہولے چلتے ہوئے عقبی برآمدے میں آ گئے۔ سامنے وسیع و عریض پائیں باغ تھا جو درختوں پر بسیرا کرنے والی چڑیوں کی چہکار سے گونج رہا تھا۔ شیخ طاہر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور خالی خالی نظروں سے پائیں باغ پر اترتے ہوئے ریشمی اندھیرے کو دیکھنے لگے۔ شیخ طاہر اس اندھیرے میں چپ چاپ پودوں کو دیکھتے رہے اور پرندوں کی چہچہاہٹ سنتے رہے اور ہولے ہولے ان کے دل میں ایک سناٹا سا پھیلتا چلا گیا۔ ایک ایسا سناٹا جس میں اداسی اور یاسیت تھی۔ ان کا دل کبھی کبھی ایک بے کنار صحرا بن جاتا تھا، لاانتہا اور بے آب و گیاہ، اس صحرا میں ہر طرف ریت ہی ریت تھی، نہ روشنی تھی نہ کوئی آواز تھی، نہ بارش کا کوئی چھینٹا پڑتا تھا اور نہ کوئی کونپل پھوٹتی تھی۔ ہاں، کبھی کبھی ہوا چلتی تھی، رنج اور بے کسی کے ہلکے ہلکے جھونکے چلتے تھے تو صحرا کی ریت پر طرح طرح کی مبہم تصویریں بنتی تھیں۔ شیخ طاہر چشم تصور سے ان مدھم تصویروں کو دیکھتے رہتے۔ کچھ اس طرح جیسے انہیں سمجھنے، انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں مگر تصویروں کے خدوخال دھندلے ہی رہتے، کبھی واضح نہ ہوتے۔

کافی دیر گزر گئی، شیخ طاہر اسی طرح کرسی پر خاموش اور ساکت بیٹھے رہے اور دور دور تک پھیلے اندھیرے کو گھورتے رہے۔ گم صم اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش سے بے خبر، یوں جیسے وہ وہاں نہیں کہیں اور تھے، ان کے چہرے پر ہلکے ہلکے دکھ کی پرچھائیاں تھیں اور آنکھوں میں آنسو۔ پتا نہیں کیوں ان کی آنکھ بھر آئی تھی۔ پھر معاً وہ چونکے اور گھوم کر برآمدے کی مغربی کارنس کی طرف دیکھنے لگے جہاں سے چوں چوں کی آواز آ رہی تھی۔ دراصل کارنس کے ایک کونے میں گوریا نے ایک گھونسلا بنا رکھا تھا اور چوں چوں کی آواز گوریا کے بچوں کی تھی۔ ایک بار ایک ملازم نے گھونسلا ہٹانے کی کوشش کی تھی مگر شیخ طاہر نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ "آئندہ کبھی ایسی حرکت مت کرنا۔ یہ گھونسلا اس چڑیا کا چھوٹا سا گھر ہے جہاں وہ امن و سکون سے رہتی ہے، اگر اس کا گھر اجاڑ دو گے تو یاد رکھو یہ بات اللہ تعالیٰ کو ہرگز اچھی نہیں لگے گی۔" شیخ طاہر چند ثانیے چڑیا کے بچوں کی موسیقی ریز آواز سنتے رہے، پھر یکلخت وہ اٹھے۔ کرسی اٹھا کر آہستہ سے کارنس کے قریب رکھی اور اس پر چڑھ کر گھونسلے میں جھانکنے لگے۔ چڑا گھونسلے میں نہیں تھا لیکن چڑیا تھی اور دو چھوٹے چھوٹے بچے اس کے پوٹے سے لگے بیٹھے تھے اور چوں چوں کر رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ چڑیا شیخ طاہر کو جھانکتے دیکھ کر اڑی نہیں۔ بس سہمی سہمی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ شیخ طاہر نے چڑیا کی طرف نہیں دیکھا، ان کی نظریں تو بچوں پر جمی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے، سرخ سرخ، ان کے بدن پر ننھے ننھے پر نکلنا شروع ہو گئے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک بے چین لیکن معصوم سی چمک تھی، زندگی کے حسن اور سچائی سے معمور۔ شیخ طاہر چند لمحے ان بچوں کو دیکھتے رہے پھر یکایک ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

بشو نے پانوں کی پڑیا زینت کی طرف بڑھائی تو وہ اٹھلا کر بولی "یہ تم میرے پان میں تین چار الائچیاں کیوں

ڈال دیتے ہو؟"

"پتا نہیں، بس یونہی۔" بشو جھینپ گیا۔

"اور اگر کبھی استاد سمندر کو پتا چل گیا تو؟"

"تو کیا ہوا، وہ کچھ نہیں کہیں گے، مجھے معلوم ہے۔" بشو نے ہنس کر کہا پھر ذرا رک کر بولا۔ "ویسے زینت، تم پان مت کھایا کرو۔"

"کیوں؟"

"تمہارے دانت اتنے اچھے ہیں۔" بشو ذرا شرما کر بولا۔ "پان کھاؤ گی تو خراب ہو جائیں گے۔"

"چل، چل، بڑا آیا نصیحت کرنے والا، تو کیوں میرے دانتوں کی فکر کرتا ہے۔" زینت نے شوخی سے کہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر چٹکی میں سونف اٹھائی اور منہ میں ڈال کر بولی۔ "مچھلی کھائے گا؟"

"اس وقت مچھلی کہاں سے آئی؟" بشو نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے رات میں وہ چھوٹے چودھری آئے تھے نا۔" زینت بتانے لگی۔ "انہوں نے ہی مچھلی، کباب، مٹھائی اور نہ جانے کیا کیا منگوایا تھا۔ وہ جب بھی آتے ہیں، ایسا ہی کرتے ہیں۔ بڑے آدمی ہیں، اسی لیے خوب پیسا خرچ کرتے ہیں۔ رات میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بہت سا کھانا بچ گیا تھا۔ اگر تو کہے تو مچھلی لے آؤں۔ سچی، بہت اچھی مچھلی ہے۔"

بشو نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر کچھ عجیب سی نظروں سے زینت کو دیکھتا رہا۔ پھر گردن جھکا کر بولا۔ "خیر تم کہتی ہو تو میں مچھلی کھا لوں گا، ابھی کھانا بھی نہیں کھایا ہے میں نے، لیکن ایک بات کہوں؟"

"کیا؟"

"یہ جو تمہارے چھوٹے چودھری ہیں، یہ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے چھوٹے چودھری نہیں ہیں۔" زینت نے پھر ہاتھ بڑھایا، سونف اٹھا کر منہ میں ڈالی۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ......" اس نے اپنا جملہ پورا کیا۔ "وہ تجھے بھلا اچھے کیوں نہیں لگتے؟"

"پتا نہیں۔" بشو کے لہجے میں ہلکی سی بے بسی تھی۔ "شاید اس لیے کہ وہ بڑا آدمی ہے اور خوب پیسا خرچ کرتا ہے۔"

"ارے تو کیا ہوا؟" زینت نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "تجھے یا مجھے اس سے کیا، وہ تو بڑی آپا کے پاس آتے ہیں ان کا مجرا سننے کے لیے، بھلا تیرے لیے ان میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

"پتا نہیں، بس یوں ہی۔"

"تو تو یونہی بے فضول کی باتیں کرتا ہے۔" زینت ہنسی۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔ ورنہ چاچی ابھی چوبارے سے چلائیں گی۔"

زینت اپنے چوبارے کی سیڑھیوں کی طرف چل پڑی۔ بشو اسے دیکھتا رہا۔ کچھ اس طرح محو ہو کر، گویا اسے آس پاس کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔ جب وہ سیڑھیوں میں غائب ہو گئی تو بشو نے ایک زور سے سانس لی اور بے دھیانی سے اپنے چونے کتھے سے رنگے ہوئے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ اس سمے اسے ایک عجیب سی اداسی نے گھیر لیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دل میں کوئی ہولے ہولے چٹکیاں لے رہا ہو۔ ایسا کیوں ہوتا تھا، یہ بشو کو نہیں معلوم تھا لیکن ایسا اکثر ہوتا تھا۔ خاص طور پر جس رات چھوٹا چودھری آتا اور زینت کے چوبارے پر خوب دھوم دھام سے مجرا ہوتا تو بشو کو ایک بے چینی سی گھیر لیتی۔ چودھری کی عمر کوئی چالیس سال یا اس سے اوپر تھی۔ بڑا سرخ و سفید، لمبا چوڑا آدمی تھا، سونے چاندی کے کام والا ملتانی کھسا پہنتا تھا اور اس کی پگڑی کا شملہ بہت اونچا تھا اور اس کے پیچھے خوشامدیوں اور ملازموں کی ایک پوری فوج ہوتی تھی۔ جب بھی بشو اسے دیکھتا تو اس کے دل میں ایک نامعلوم سا خوف سر ابھارنے لگتا۔ حالانکہ اس خوف کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ زینت نے خود کہا تھا کہ اسے چودھری سے بھلا کیا لینا دینا ہے، وہ تو بڑی آپا کے پاس، جو زینت کی بڑی چچی زاد بہن تھی، آتا ہے مگر اس کے باوجود بشو کو ڈر لگتا تھا چودھری سے، اس کے ملتانی کھسے سے اور اس کے اونچے شملے سے اور اس کے ملازموں سے۔ اس نے کئی بار چودھری کی طرف سے اپنے دل میں پیدا ہونے والے اس خوف اور ناپسندیدگی کو سمجھنے کی کوشش کی مگر اس کی سمجھ میں کبھی کچھ نہیں آیا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر گردن موڑ کر زینت کے چوبارے کی طرف دیکھا جو خالی پڑا تھا، اس نے ہاتھ اٹھا کر ناک کھجائی اور زور سے سانس لے کر پانوں کی ڈلیا اپنی طرف کھینچی۔ اسی وقت کرم داد منیاری والے نے زور سے آواز دی۔

"ارے بھئی بشو! کیا ہو رہا ہے پتر؟"

کرم داد منیاری والے کی دکان بالکل سامنے تھی۔ بشو نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور اونچی آواز میں بولا۔

"کچھ نہیں جی، پان لگا رہا ہوں۔"

"استاد کدھر گیا؟"

"جی، وہ اپنی بہن سے ملنے گئے ہیں۔"

"اچھا، اچھا۔" کرم داد نے اپنے گنجے سر کو زور زور سے ہلایا۔ "استاد سمندر بڑا اچھا آدمی ہے۔ اس کا دل سمندر کی طرح بڑا ہے۔ سب کا خیال رکھتا ہے، اللہ اسے خوش رکھے۔ کب آئے گا وہ؟ مجھے ذرا کچھ کام تھا۔"

"کیسا کام؟" بشو نے پوچھا۔

"اب پتر تجھے بتانے کی بات نہیں۔ کچہری عدالت کا معاملہ ہے۔ استاد سمندر تھوڑی سی مدد کر دے گا تو میرا بڑا کام بن جائے گا۔"

"وہ تو چار پانچ بجے تک آئیں گے۔"

"اچھا تو میں شام کو ہی اس سے بات کر لوں گا۔" کرم داد نے کہا، پھر رک کر بولا۔ "بشو! ایک پان مجھے کھلا دے پتر، منہ بڑا پھیکا ہو رہا ہے۔ اللہ تجھے خوش رکھے، بہت اچھا بچہ ہے تو۔"

"اچھا جی، ابھی لایا۔" بشو نے ہنس کر کہا۔

بشو کرم داد کو پان دے کر آیا اور پھر مزید پان لگانے میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی وہ گردن اٹھا کر ادھر ادھر بھی دیکھ لیتا۔ گلی میں سناٹا اور ویرانی تھی۔ چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس تیز چمکیلی دھوپ میں کبھی کبھار کوئی شخص گزر جاتا، کسی وقت کوئی گاہک رک کر پان یا سگریٹ خریدتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس کے بعد پھر وہی سناٹا اور خاموشی۔ بشو نے پھرتی سے پان کے اوپر کتھا لگاتے لگاتے گردن اٹھا کر زینت کے چوبارے کی طرف دیکھا مگر وہ خالی پڑا تھا۔ پھر اس نے طائرانہ انداز میں گرد و پیش میں نظر ڈالی۔ زینت کے بعد سرداراں کا کوٹھا تھا، اس کے بعد صابرہ اور پھر پنا امرتسر والی کے چوبارے تھے مگر سب کے چھجوں پر پردے پڑے تھے۔ کرم داد منیاری والے کی دکان کے عین اوپر ریشماں کا چوبارہ تھا اور وہ اپنے چھجے پر کرسی پر بیٹھی دھوپ میں اپنے بال سکھا رہی تھی۔ گہرے سانولے رنگ والی دبلی پتلی ریشماں جب رات میں بن سنور کر چوبارے میں بیٹھتی تھی تو اچھی بھلی کوہ قاف کی پری نظر آتی تھی مگر اس وقت اسے دیکھ کر کسی عمر رسیدہ بھتنی کا خیال آتا تھا۔ ریشماں کے برابر میں منظور استاد جی کا چوبارہ تھا، جہاں سے تو تکار کی اونچی اونچی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید منظور استاد جی کی دونوں بیویوں مہرن اور ناصرہ میں پھر جھگڑا ہو گیا تھا۔ منظور استاد کی پہلی بیوی مہرن تھی، بعد میں وہ کہیں سے ناصرہ کو پکڑ لایا۔ لوگ کہتے ہیں کہ منظور استاد نے اسے کسی سے چند ہزار روپے میں خریدا تھا۔ حقیقت کیا تھی، یہ کسی کو علم نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو یہ جاننے کی فرصت یا ضرورت تھی۔ اس بازار سے تعلق رکھنے والوں کا اپنا ایک رویہ ہوتا ہے، ان کے اپنے خاص نوعیت کے تہذیبی اور معاشرتی تقاضے ہوتے ہیں جن پر وہ شعوری یا لاشعوری طور پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ ناصرہ نے بھی اس بازار... ... کے رویوں اور تقاضوں کو قبول کر لیا تھا مگر یہ دوسری بات ہے کہ منظور استاد جی کی پہلی بیوی مہرن نے ناصرہ کو قبول نہیں کیا تھا۔ پہلے وہ ہمیشہ چپ چاپ رہنے والی ایک سیدھی سادی عورت تھی لیکن ناصرہ کے آنے کے بعد بڑی تیز طرار ہو گئی تھی۔ دونوں عورتیں اکثر و بیشتر بڑی باقاعدگی سے اس طرح لڑتیں کہ سننے والے دم بخود رہ جاتے۔ استاد سمندر کبھی کبھی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا اور گھبرا کر بشو سے کہتا۔

"حد ہو گئی پتر! حد ہو گئی۔ ان عورتوں نے تو کمال ہی کر دیا ہے، شیطان بھی اگر یہاں آئے تو دم دبا کر بھاگ نکلے۔"

بشو کچھ دیر منظور استاد جی کے چوبارے کی طرف دیکھتا رہا اور... پھر اس کی نگاہ اگلے چوبارے کی طرف اٹھ گئی جو مختار بیگم کا تھا۔ مشرق اور مغرب میں بیک وقت دیکھنے والی بھاری بھرکم مختار بیگم ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کر رہی تھی۔ بشو نے بلند آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے چاچی؟"

"اے ہے پتر! میرے لال! ذرا دو اچھے سے پان دے جا۔ گلا بہت خشک ہو رہا ہے مگر دیکھ، الائچی ذرا زیادہ ڈالیو، سمجھ گیا نا؟"

"ہاں، چاچی! فکر نہ کرو۔" بشو نے کہا۔ "میں ابھی لایا۔"

بشو مختار بیگم کو پان دے کر آیا اور دکان کے اندر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گلی میں بہ دستور سناٹا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ جیسے جیسے دن ڈھلتا، رونق بڑھنے لگتی، تماش بینوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ پھول والے، کباب، تکوں والے اور چھپی والے آ جاتے۔ مختار بیگم، صابرہ اور زینت کی بڑی آپا کی سریلی آوازیں گلی میں سر بکھیرتیں۔ یہ ہر روز ہوتا تھا کیونکہ اس گلی میں دن اس وقت طلوع ہوتا ہے، جب ساری دنیا میں رات شروع ہوتی ہے۔ بشو خاموش بیٹھا رہا اور گلی کی لکھوری اینٹوں والے فرش

پر چھپاتی دھوپ کو دیکھتا رہا۔ استاد سمندر کے ساتھ رہتے اور اس کی دکان پر کام کرتے ہوئے اسے کوئی ایک سال ہو گیا تھا حالانکہ اس میں اس کی کسی خواہش یا ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بات تو بس خود بخود ہو گئی تھی جیسے انسان کی زندگی میں اکثر باتیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔ بشو کو وہ شام یاد تھی جب وہ بھوکا پیاسا اس گلی میں آیا تھا اور ایک لڑکی نے اسے کھانا دیا تھا۔ وہ پورا منظر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں اس طرح نقش ہو چکا تھا کہ اگر وہ چاہتا بھی تو اس منظر سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس رات کھانے سے فارغ ہو کر کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا تھا۔ لڑکی کچھ دیر بعد آ کر تسلا اور گلاس لے گئی تھی اور اس نے شاید بشو سے کچھ باتیں بھی کی تھیں لیکن بشو کو کچھ ٹھیک علم نہیں تھا کہ لڑکی کیا پوچھ رہی ہے اور وہ جواب میں کیا کہہ رہا ہے۔ دراصل چالیس گھنٹوں کے بعد اس کے خالی معدے میں اچانک کھانا پہنچا تھا اور اس وجہ سے اس پر ایک عجیب سی نقاہت اور نشے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی چنانچہ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا اور حیران حیران سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ عجیب دنیا تھی وہ اور عجیب لوگ تھے۔ سامنے سگریٹ پان کی دکان تھی جس کے اوپر ایک خوب صورت سا بورڈ لگا تھا۔ دُلہا پان ہاؤس۔ پروپرائٹر استاد سمندر...... اور پھر چوباروں اور دروازوں میں سجی سنوری عورتیں جو بشو کو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتی تھیں۔ یہ سب کیا تھا، یہ کیسے لوگ تھے اور چوباروں سے آنے والی موسیقی اور گانے کی آواز کیسی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر کچھ دیر بعد جب اس کے اوسان بحال ہوئے، ٹانگوں میں ذرا جان آئی اور آنکھوں کی دھندلاہٹ دور ہوئی تو وہ اچانک اٹھا اور ایک طرف چل پڑا، اگرچہ خود اسے معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے اور کیوں جانا ہے۔ وہ بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ پھر جب بہت تھک گیا اور نیند بھی ستانے لگی تو ایک پارک میں پڑ کر سو گیا۔

دوسرا دن بھی یوں ہی گزرا۔ ایک آوارہ کتے کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے۔ بے آس، بے امید، بے مقصد، جب شام ہوئی، بھوک نے شدت اختیار کی اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ پھر بازارِ حسن جا پہنچا، یہ حرکت بھی غیر ارادی ہی تھی۔ کوئی اندرونی تحریک ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں لے گئی تھی۔ وہ اسی بند دکان کے پھٹے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہی لڑکی سیڑھیوں سے اتری اور سیدھی استاد سمندر کی دکان پر گئی۔ پھر جب وہ پان لے کر واپس آئی تو اسے دیکھ کر اچانک ٹھٹک گئی۔

''اے! کیا کر رہے ہو یہاں تم؟''

''کچھ نہیں، بیٹھا ہوں بس۔'' بشو ذرا سہم کر بولا۔

''گھر نہیں ہے تمہارا کوئی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

لڑکی نے اسے غور سے دیکھا پھر نرم لہجے میں بولی۔

''بھوک لگی ہے کیا؟ کھانا کھاؤ گے؟''

اس کا سر آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔

یہ دوسرا دن تھا۔ اس کے بعد اگلے تین دن تک یہی ہوتا رہا۔ بشو سارا دن مارا مارا پھرتا اور شام کو بازار میں پہنچ جاتا۔ وہی دکان، وہی پھٹا۔ لڑکی اسے کھانا دے دیتی۔ ان کے درمیان ایک خاموش سمجھوتا گویا خود بخود ہو گیا تھا۔ بشو کو معلوم تھا کہ وہاں کھانا ضرور مل جائے گا اور لڑکی جانتی تھی کہ بشو وہاں آئے گا ضرور۔ یہی وجہ ہے کہ شام ہوتے ہی وہ بار بار نیچے اتر کر دیکھتی کہ بشو نیچے آیا کہ نہیں، چند دن یونہی گزرے۔ اس دوران دوسرے لوگ بھی اسے پہچاننے لگے۔ ایک شام استاد سمندر نے اسے بلایا اور نرمی سے پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا پتر؟''

''جی، بشو۔''

''کہاں سے آئے ہو؟ گھر کہاں ہے تمہارا؟ یہاں کیوں پڑے رہتے ہو؟'' استاد سمندر نے پوچھا۔ اس نے اور بھی کئی سوالات کیے لیکن بشو کوئی معقول جواب نہیں دے سکا۔ اسے تو خود بھی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے، اس کا گھر کہاں ہے۔ اپنے بچپن کی، اپنے گھر کی محض چند تصویریں ہی اس کے ذہن میں محفوظ تھیں اور وہ تصویریں بھی بہت دھندلی تھیں لہٰذا وہ کیا بتاتا۔ استاد سمندر نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا کہ اس بازار کا یہی دستور تھا، دوسرے کی زندگی میں صرف اتنا ہی جھانکو، جتنی وہ اجازت دے۔ خود استاد سمندر نے اپنی زندگی میں زیادہ جھانکنے کی اجازت کسی کو نہیں دی تھی۔ لہٰذا اس نے بشو کو بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ قدرے ٹھہر کر نرم اور مہربان لہجے میں بولا۔

''کام کرو گے؟''

بشو یکایک خوش ہو گیا۔ ''ہاں جی، ضرور کروں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ میری یہ دکان چھوٹی تو ضرور ہے لیکن اچھی چلتی ہے۔ تم اس پر میرے ساتھ کام کیا کرو اور رات میں دکان بند ہونے کے بعد اسی کے پھٹے پر سو جایا

کرو۔ میں تنخواہ کے علاوہ تمہیں کھانا اور کپڑے بھی دوں گا۔'' استاد سمندر نے رک کر اسے غور سے دیکھا۔ ''منظور ہے؟''

بشو کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ تنخواہ کیا ملے گی۔ اسے تو صرف اس بات سے غرض تھی کہ ایک ٹھکانا میسر آجائے گا اور اسے در در بھٹکنا نہیں پڑے گا چنانچہ اس نے فوراً ہاں کر دی۔ اب اس بات کو ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ شروع میں، جیسا کہ استاد سمندر نے کہا تھا وہ دکان کے پھٹے پر ہی سوتا رہا لیکن جوں جوں وقت گزرا، استاد سمندر کے احساسات بھی اس کے لیے بدل گئے۔ وہ بشو کے ساتھ زیادہ شفقت سے پیش آنے لگا۔ چند ماہ بعد وہ اسے اپنے گھر لے گیا جو ایک قریبی گلی میں تھا اور جہاں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔ ''پتر! اب تم یہاں میرے ساتھ رہا کرو۔'' اس نے حسب عادت نرم لہجے میں کہا۔ ''دکان کے پھٹے پر سوتے ہو، یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

استاد سمندر گو اب بڑھاپے کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا، لیکن اب بھی اس کی شخصیت میں بڑا بانکپن تھا۔ اونچا، لمبا قد گھنگرالے بال، تیکھا ناک نقشہ اور سرخ و سفید رنگت، جو اب دھیرے دھیرے زردی مائل ہونے لگی تھی۔ جوانی میں یقیناً بڑا وجیہہ اور شاندار رہا ہوگا۔ جدھر سے گزرتا ہوگا، لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے ہوں گے مگر اب اس کی شخصیت میں وہ زور نہیں رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی عمر اور بیماری نے اس کے قویٰ مضمحل کر دیے تھے اور وہ ایک ایسی عمارت کی طرح نظر آنے لگا تھا جس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ وقت کی دیمک بہرحال ہر شے کو چاٹ جاتی ہے۔ حسن کو، جوانی کو، حکمرانی کو اور غرور و تکبر کو۔ ہاں ایک ایسی شے ہے جو پھر بھی باقی رہتی ہے اور وہ ہے آدمی کا کردار۔ استاد سمندر کی جسمانی شان و شوکت بھلے ہی زوال پذیر ہو چکی تھی مگر اس کے کردار کی بنیادیں ذرا بھی کمزور نہیں ہوئی تھیں۔ کرم داد کے بقول اس کا دل ایک سمندر کی طرح تھا، جس میں دنیا بھر کی غلاظتیں اور کثافتیں تحلیل ہو کر مٹ جاتی ہیں اور سطح پر ان غلاظتوں کا کوئی عکس نظر نہیں آتا۔ استاد سمندر ہر ایک کے کام آنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ وہ برسوں سے اس بازار میں، دلہا پان ہاؤس کی دکان چلا رہا تھا۔ جہاں حسن و جوانی کا کاروبار کرنے والی عورتیں چاروں طرف موجود تھیں اور ان میں سے کئی ایسی تھیں جنہوں نے مختلف اوقات میں استاد سمندر کو شیشے میں اتارنے بلکہ کرم داد کے الفاظ میں اسے شکار کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر کوئی بھی کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ برسوں اس بازار میں گزارنے کے باوجود استاد سمندر آج بھی روزِ اول کی طرح پاک و صاف تھا۔ وہ اکثر بشو سے کہتا تھا۔ ''پتر! آدمی کو زندگی اس طرح گزارنا چاہیے، جیسے کیچڑ میں کنول ہوتا ہے۔ پاک، صاف، اسے کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے کہ روزِ قیامت اپنے رب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔''

اور استاد سمندر نے بلاشبہ ساری زندگی اس طرح گزاری تھی کہ کنول کی طرح اس کے دامن پر بھی کوئی دھبا نہیں لگا تھا۔

یوں استاد سمندر کی زندگی میں بشو خود بخود شامل ہو گیا تھا۔ یہ بات بھی بس آپ ہی ہو گئی، جیسے قسمت کا نادیدہ ہاتھ اس کا ہاتھ تھام کر اسے بازارِ حسن لے گیا تھا اور جیسے لڑکی نے خود بخود اسے کھانا دیا تھا، ویسے ہی خود بخود وہ استاد سمندر کے چھوٹے سے گھر کا ایک ممبر بن گیا۔ اس نے بہت جلد اپنے کام کو سمجھ لیا۔ کیسے پان لگاتے ہیں، کیسے کتھا تیار کرتے ہیں اور گاہکوں سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ استاد سمندر کو جب پورا اطمینان ہو گیا تو اس نے دکان پر بیٹھنا بھی کم کر دیا۔ خاص طور پر دوپہر کے اوقات میں وہ کبھی اپنی بہن سے ملنے چلا جاتا، کبھی چاچی سے اور کبھی بھتیجے سے۔ بشو اکیلا ہی دکان سنبھالتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دکان پر گزارنے کا شوق اس لیے بھی تھا کہ اس طرح اسے بار بار زینت کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کا موقع ملتا تھا۔

زینت کوئی اور نہیں، وہی لڑکی تھی جس نے اسے کھانا دیا تھا۔ زینت عمر میں بشو سے تین یا چار برس بڑی تھی۔ دبلی، پتلی، رنگ سانولا، لمبے لمبے بال اور تیکھے نقش۔ مجموعی طور پر اسے حسین نہیں کہہ سکتے، ہاں قبول صورت تھی تاہم اس کے باوجود وہ بشو کو بہت اچھی لگتی تھی۔ اتنی اچھی کہ اس کا جی کرتا، وہ ہر وقت زینت کو دیکھتا رہے، اس کی آواز سنتا رہے۔ وہ دکان پر بیٹھا ہوتا تو وقفے وقفے سے بار بار چوبارے کی طرف دیکھتا رہتا۔ جب بھی زینت چوبارے پر آتی تو اس کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جاتی۔ اس کے علاوہ زینت دن میں کئی بار نیچے آتی۔ اکثر اس کی دکان پر، پان یا سگریٹ لینے۔ بشو اس سے دو چار باتیں کر لیتا اور جب بھی وہ زینت کو دیکھتا یا اس سے باتیں کرتا تو ایک عجیب سی مسرت ہوتی۔ ایک ایسی مسرور کن کیفیت اس کے انگ انگ میں دوڑ جاتی جسے سمجھنا خود بشو کے لیے بھی دشوار تھا۔ یہ بات بے حد عجیب تھی۔ بشو صرف بارہ سال کا تھا محبت کیا ہوتی ہے، یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ اس کے باوجود اسے زینت

سے ایک نامعلوم سالگاؤ تھا۔ شاید اس ذہنی ربط کا سبب یہ ہو کہ زینت نے اس وقت اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا تھا جب وہ چالیس گھنٹے کا بھوکا تھا اور اس بنا پر زینت اس کے احساسات کا مرکز بن گئی تھی۔ ان احساسات میں زینت کے لیے عزت و احترام بھی تھا اور اپنایت بھی اور غالباً اسی بنا پر اسے ڈر لگتا تھا۔ جب زینت کے یہاں مجرے کی محفلیں مجتیں یا چھوٹا چودھری آتا یا وہ زینت کی بڑی آپا یا چاچی کو دیکھتا تو اسے بڑا ڈر لگتا۔ کچھ عجیب سے، بے نام سے وسوسے اس کے دل میں سر ابھارتے ایسا لگتا جیسے کہیں کوئی ایسی بات ہے جو غلط ہے اور جسے نہیں ہونا چاہیے مگر وہ ہوجائے گی۔ کچھ کھو جائے گا۔ کچھ چھن جائے گا مگر کیا؟ کیا بات ہے جو ہوجائے گی اور کیا ہے جو کھو جائے گا، بشو کبھی کبھی حیران ہوتا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے، وہ کس بات سے اور کیوں ڈرتا ہے؟ بشو کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی اور وہ ڈر جو اس کے دل میں کئی مہینے سے بیٹھا ہوا تھا، کلبلاتا رہتا۔

دن ڈھیرے ڈھیرے ڈھل گیا، دھوپ ماند پڑ گئی۔ ماشکی آیا اور گلی میں چھڑکاؤ کر کے چلا گیا۔ وہ دکانیں جو دن میں بند رہتی تھیں، رفتہ رفتہ کھل گئیں۔ پھول والے اور کباب تکے والے اور عطر والے آگئے۔ گلی آباد ہوگئی چوبارے اور کمروں کے دروازے سج گئے۔ گلی میں... آمدورفت بڑھ گئی۔ لوگ آنے جانے لگے۔ طرح طرح کے رنگ کالے، گورے، خوش شکل، بدشکل ایسے نوجوان لڑکے جن کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ ایسے عمر رسیدہ لوگ جن کی جوانی مدت ہوئی رخصت ہوچکی تھی اور جو شاید اپنے حلقوں میں بہت شریف اور پرہیزگار سمجھے جاتے ہوں گے۔ آنے والوں میں وہ بھی تھے جو بدنامی اور پشیمانی سے بچنے کے لیے چہرہ رومال سے چھپا کر آتے تھے اور ادھر ادھر دیکھ کر اور نظر بچا کر جلدی سے دروازے میں گھس جاتے تھے اور وہ لوگ بھی تھے جنہیں کسی بدنامی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ایسے لوگ کلائی میں گجرا ڈال کر اور ہونٹوں پر پان کی دھڑی جما کر سینہ تان کر سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے آتے اور بے فکری سے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ شروع میں یہ منظر بشو کے لیے نیا بھی تھا اور تعجب خیز بھی مگر اب وہ اس منظر کا عادی ہوچکا تھا اور اسے معلوم ہوچکا تھا کہ یہاں کیسے لوگ آتے ہیں۔ وہ اس بازار کے مزاج اور طریقوں سے واقف ہوچکا تھا لہٰذا اب وہ متعجب نہیں ہوتا تھا اور اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ اس وقت بھی یہی صورت تھی کہ وہ دھڑا دھڑ پان لگا رہا تھا۔ گاہکوں کو نمٹا رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ گردن موڑ کر زینت کے چوبارے کی طرف بھی دیکھ لیتا جہاں اس کی بڑی آپا بار سنگار سے آراستہ کرسی پر براجمان نیچے جھانک رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ استاد سمندر کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ شام ہوچکی تھی اور وہ اب تک نہیں لوٹا تھا۔ یہ تعجب کی بات تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنی دیر تک غائب رہا ہو۔ وہ شام ہونے سے پہلے ضرور آجاتا تھا۔ بشو کے دل میں الجھن سر ابھارنے لگی۔ پتا نہیں کیا معاملہ ہے کہاں گیا استاد سمندر، کہیں کوئی پریشانی کی بات نہ ہوگئی ہو۔ بار بار سوچ رہا تھا۔

عادت کے مطابق اس نے ایک بار پھر گردن گھمائی، زینت کی بڑی آپا کو دیکھا پھر اس کی نظر نیچے اتری اور سامنے گلی میں چلی گئی اور تب یکایک اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ ہاتھ خودبخود رک گئے اور چہرے پر ایک رنگ سا آکر چلا گیا۔ گلی میں چھوٹا چودھری حسب عادت جھوم جھوم کر چلتا ہوا آرہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے کپڑے بے داغ تھے۔ ہمیشہ کی طرح ان کی پگڑی کا شملہ بہت اونچا تھا۔ بشو یکایک سب کچھ بھول گیا اور حد درجہ کینہ توز نظروں سے چھوٹے چودھری کو گھورنے لگا حالانکہ اپنی اس حالت کا اسے خود کوئی احساس نہیں تھا۔ یہ کیفیت تو غیر ارادی تھی۔ وہ نفرت انگیز نظروں سے چودھری کو گھورتا رہا اور وہ خوف جو مہینوں سے اس کے لاشعور میں موجود تھا، دم بدم بڑھتا رہا۔ چودھری کل بھی آیا تھا، آج پھر آگیا آخر کیوں؟ بشو نے زور سے سانس لی اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔ چودھری مسکراتا ہوا ہاتھ ہلاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ تبھی کسی گاہک نے کہا۔

"ابے لمڈے، کہاں کھو گیا ہے؟ پان دے نا یار اتنی دیر سے کھڑا ہوں۔"

"اچھا جی، اچھا۔" بشو چونک کر اور کسی حد تک خجل ہوکر بولا۔

☆☆☆

شیخ طاہر کے نجی ڈرائنگ روم کی خوب صورت سا گوانی میز پر پنسل سے بنا ہوا ایک وسیع نقشہ پھیلا ہوا تھا جسے وہ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ یکایک ایک مقام پر انہوں نے انگلی رکھ کر کہا۔ "تو یہ ہے فیکٹری؟"

"جی ہاں۔" ان کے منیجر صدرالدین نے جواب دیا۔ "فیکٹری زیادہ بڑی نہیں لیکن آس پاس زمین کافی ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو فیکٹری کو بڑھایا جاسکتا ہے۔"

"اور یہ کیا ہے؟" شیخ طاہر نے ایک اور مقام پر انگلی

رکھی۔

"اصل میں تو یہ پارک ہے۔" صدرالدین بولے۔ "فیکٹری کے بالکل پیچھے واقع ہے لیکن اسے پارک کہنا مشکل ہے۔ بس ایک اجاڑ میدان سمجھ لیجیے۔ گھاس نام کو نہیں کسی کارپوریشن نے کچھ بنچیں رکھوائی تھیں جو ٹوٹ پھوٹ کر غائب ہوگئیں۔ پھول اگر ڈھونڈیے تو دوا کے لیے بھی نہ ملیں گے۔ ایک حوض ہے جو شاید کبھی صاف ستھرا اور خوب صورت رہا ہو مگر اب گندے پانی سے بھرا رہتا ہے اور اس بنا پر مچھروں کی پیداوار کے لیے نہایت موزوں ہے۔"

"تو کیا اس پارک کی کوئی دیکھ بھال نہیں ہوتی؟"

"نہیں بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ بلدیہ والے برسوں سے وہاں یہ دیکھنے بھی نہیں گئے کہ پارک موجود ہے بھی... یا غائب ہوگیا۔"

"مطلب یہ ہے کہ اگر پارک چوری ہوجائے تو کارپوریشن والوں کو پتا بھی نہ چلے گا؟"

"بالکل، بالکل۔" صدرالدین نے کہا اور ہنسنے لگے۔ صدرالدین بڑے مزے کے آدمی تھے۔ عرف عام میں منشی صدرالدین کہلاتے تھے۔ انہوں نے ایک مقامی کالج سے ایم اے کیا تھا پھر سرکاری وظیفے پر کسی قسم کا کورس کرنے کسی مغربی ملک بھی گئے۔ اس وقت تک وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے سوٹ پہنتے تھے لیکن چند ماہ مغربی ملک میں گزار کر واپس آئے تو ان کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ سوٹ چھوڑ کر وہ چوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہننے لگے۔ خوب صورت سی ڈاڑھی بھی رکھ لی۔ پاؤں میں [illegible] ...ے باہر جانے سے پہلے کبھی کبھار نماز پڑھتے تھے۔ واپس آئے تو تہجد بھی پڑھنے لگے۔ لوگوں نے اس تبدیلی کا سبب پوچھا تو مسکرا کر جواب دیا۔

"بھئی، کیا کروں باہر جا کر ہی اپنے آپ کو پہچاننے کا موقع ملا ہے۔"

وہ پچھلے کئی سال سے شیخ طاہر کے پاس ان کے منیجر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ شیخ طاہر کے ایک نہیں بلکہ مختلف قسم کے کئی کاروبار تھے پھر باغات، زمینیں اور متعدد کمرشل بلڈنگز بھی تھیں۔ منشی صدرالدین تقریباً سبھی امور کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بڑے مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ نیک، مخلص اور قناعت پسند۔ اپنی ضرورت سے زیادہ لینا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ گزشتہ سال شیخ طاہر نے ان کی تنخواہ میں پندرہ فیصد اضافے کی پیشکش کی تو گھبرا کر کہنے لگے۔

"ارے نہیں شیخ صاحب ہرگز نہیں۔"

"کیوں؟"

"دیکھیے آپ جو تنخواہ مجھے دیتے ہیں، وہ پہلے ہی میری ضرورت سے زیادہ ہے پھر اور لے کے کیا کروں گا۔" صدرالدین نے جواب دیا۔ "بہتر ہوگا کہ آپ یہ رقم کسی ایسی جگہ لگائیں جس سے مستحق لوگوں کو فائدہ پہنچے۔"

صدرالدین چند ثانیے ہنستے رہے۔ شیخ طاہر بھی لطف اندوز ہوئے۔ کیونکہ پارک چرانے والا لطیفہ کافی دلچسپ تھا پھر انہوں نے کہا۔ "اور یہ فیکٹری کے تین اطراف میں آبادی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کی معلومات کیا ہیں ان بستیوں کے بارے میں؟" شیخ طاہر نے استفہامیہ نظروں سے صدرالدین کو دیکھا۔

"معلومات کی بات نہیں میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔" صدرالدین نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ "یہ بستیاں بغیر کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کے قائم ہوئی تھیں جسے جہاں جگہ ملی وہیں جھونپڑی ڈال لی۔ چٹائیوں، ٹین کی چادروں وغیرہ کی جھونپڑیاں ہیں بعد میں کچھ لوگوں نے دیواریں اٹھا کر پکے مکان بھی بنالیے۔ گلیاں کچی ہیں۔ گندے پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہیں یعنی نالی نام کی کوئی چیز ان بستیوں میں نہیں پائی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گلیوں میں گندا پانی بھرا رہتا ہے جس میں مچھر، مکھی اور طرح طرح کے کیڑے مکوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ روشنی کا کوئی انتظام نہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایک شہری آبادی میں جو سہولتیں ہونا چاہئیں اس سے یہ محلے بالکل محروم ہیں۔"

"مگر بھئی یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔" شیخ طاہر نے قدرے پریشان لہجے میں کہا۔

"یہ تو میں نے صرف پہلا مصرعہ عرض کیا ہے۔" منشی صدرالدین نے جواب دیا۔ "اب مصرعِ ثانی ملاحظہ فرمائیے۔ لوگوں کی روزی کا بڑا ذریعہ فیکٹری ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لوگ اس فیکٹری ہی کی وجہ سے اس علاقے میں آباد ہوئے تھے مگر اب اس وقت صورت یہ ہے کہ فیکٹری محض جز وقتی طور پر چل رہی ہے۔ کافی مشینیں بند کردی گئی ہیں اور اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ بستی میں حد درجہ غربت اور پریشانی کا دور دورہ ہے۔ دوسری سہولتیں بھی ناپید ہیں مثلاً کوئی شفا خانہ یا اسکول نہیں ہے۔ لوگ اپنے

بچوں کو اسکول نہیں بھیجتے یا تنگ دستی کی وجہ سے بھیج نہیں سکتے اور یہ بات شاید ٹھیک بھی ہے۔ جب پیٹ بھرنے کے لالے پڑے ہوئے ہوں تو بچوں کو اسکول بھیجنے کی گنجائش کہاں سے نکلے۔ اب اس شعر کا قافیہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ بستی کے جنوب میں جہاں آبادی خاصی گھنی ہے زمین کا ایک بڑا قطعہ ملک شفیق نے خریدنے کا فیصلہ کیا ہے جہاں وہ غالباً بڑے بڑے گودام بنائیں گے۔"

"اور جو لوگ اس زمین پر آباد ہیں وہ کہاں جائیں گے؟" شیخ طاہر نے پوچھا۔

منشی صدرالدین نے جواب دیا۔ "یہی سوال میں نے ملک شفیق کے منیجر سے کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ لوگ کہاں جائیں گے۔ میرے مزید استفسار پر انہوں نے کہا زمین خریدنے کے بعد آباد کاروں کو زمین خالی کرنے کے لیے قانونی طور پر نوٹس بھجوائے جائیں گے۔ اگر ان لوگوں نے شرافت سے زمین خالی کردی تو ٹھیک ہے ورنہ جبراً انہیں بے دخل کردیا جائے گا۔"

"بھئی صدرالدین صاحب! مجھے تو یہ پوری غزل ہی وزن اور بحر سے خالی معلوم ہوتی ہے۔" شیخ طاہر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یعنی روشنی نہیں، پانی نہیں، ہوا بھی یقیناً کافی کثیف ہوگی۔ اوپر سے بے روزگاری اور پھر بے دخلی کا خوف..... تاہم سوال یہ ہے کہ فیکٹری آخر چلتی کیوں نہیں؟"

"عدم دلچسپی کے سوا مجھے تو اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔" صدرالدین نے کہا۔ "میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر محنت کی جائے تو فیکٹری کامیابی سے چل سکتی ہے۔"

شیخ طاہر تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔ "اس فیکٹری اور متعلقہ زمین کا مالک کون ہے؟"

"فیکٹری اور کچھ زمین کے مالک چودھری ظفر حیات ہیں جبکہ باقی زمین کارپوریشن کے قبضے میں ہے۔"

شیخ طاہر نے چند لمحے غور کیا پھر سر ہلا کر بولے۔ "میں ساری صورت حال کو بخوبی سمجھ گیا ہوں۔ یہ واقعی بڑی افسوس ناک بات ہے کہ تہذیب و ترقی کے اس دور میں کچھ انسان کسمپرسی، بے سروسامانی اور بدحالی کے عالم میں زندگی گزاریں اور کوئی بھی ان کے لیے کچھ نہ کرے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کے تمام آدرش اور انسانی ارتقا کی پوری کہانی ایک الم ناک لطیفہ بن جاتی ہے۔" وہ رکے پھر کہنے لگے۔ "خیر اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم لوگ اس ضمن میں کچھ کرنا چاہیں تو آخر کیا کر سکتے ہیں؟"

منشی صدرالدین نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ لمحہ بھر خاموش رہے پھر انہوں نے ڈبیا کھول کر ایک پان نکالا، کلّے میں دبایا پھر شیخ طاہر کی جانب دیکھا۔ "شیخ صاحب!" انہوں نے کہا۔ "آپ غریبوں اور مستحقین کے لیے اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں۔ ساری دنیا آپ کے امدادی کاموں سے واقف ہے۔ اس بستی میں بھی آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ پہلا کام تو یہ ہے فیکٹری کو صحیح خطوط پر چلایا جائے۔ دو ایک چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں اور کھولی جائیں۔ ان سے لوگوں کو روزگار ملے گا۔ اس کے بعد پانی، بجلی کا انتظام کیا جائے۔ گلیاں پختہ کی جائیں اور نالیاں بنوائی جائیں۔ کم از کم ایک اسکول اور شفاخانے کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ شیخ صاحب، یہ ایک بڑا منصوبہ ہے وقت بھی بہت لگے گا اور روپیہ بھی بہت خرچ ہوگا مگر آپ مرکزی حکومت سے مناسب امداد لے سکتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ جب یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو پھر آپ کے اوپر کوئی مالی بوجھ نہیں رہے گا۔ یہ فیکٹری ان شاء اللہ بہت منافع دے گی اور غریبوں کی جو دعائیں ملیں گی جناب ان کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔"

شیخ طاہر، صدرالدین کے آخری جملے پر ہنسنے لگے پھر بولے۔ "خیر بھئی، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کیا چودھری ظفر حیات اور کارپوریشن زمین اور کارخانہ بیچنے پر تیار ہو جائیں گے؟"

"کم از کم ہم کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔" صدرالدین نے کہا۔

"تو پھر ضرور کوشش کیجیے۔" شیخ طاہر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ اس بستی کے مکینوں کی جانب سے مجھے ایک درخواست موصول ہوئی تھی جس میں ان لوگوں نے اپنے مصائب کی تفصیل بیان کرنے کے بعد مدد کی درخواست کی تھی۔ اس پر تین سو سے زائد افراد کے دستخط ہیں۔ مجھے تبھی سے بڑی فکر تھی چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کام کو جتنی جلد ہو سکے تکمیل تک پہنچایے۔"

"ضرور، ضرور آپ بالکل فکر نہ کریں۔" صدرالدین نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا پھر ذرا رک کر رواروی کے انداز میں اضافہ کیا۔ "ویسے شیخ طاہر صاحب، سیاسی پارٹی کے جنرل سیکریٹری آج صبح پھر دفتر آئے تھے۔"

"اچھا کیوں؟"

"آپ تو جانتے ہیں۔" صدرالدین نے مسکرا کر ذرا شوخی سے کہا۔ "ان کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ آپ ان کی پارٹی

میں شامل ہو جائیں اور غالباً دوسرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی آپ کے ساتھ کرنے کی فکر میں ہوں۔ اسی لیے دونوں باپ بیٹی آئے دن چکر لگاتے رہتے ہیں۔"

شیخ طاہر ہنسنے لگے۔ "میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"ویسے شیخ طاہر، آخر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ کب تک یوں تنہا زندگی گزارتے رہیں گے؟ اور آپ کے لیے تو کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ شہر کی ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں آپ کی ایک نگاہ التفات کی منتظر رہتی ہیں۔ میری مانیے تو آپ شادی کر ہی ڈالیے۔"

شیخ طاہر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اب تم نے بھی لیکچر شروع کر دیا، وحیدہ بیگم کی طرح وہ بھی دن رات مجھے ڈانٹتی رہتی ہیں کہ آخر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ کب تک یوں چھڑے چھانٹ پھرتے رہو گے۔ اگر اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کرو۔ میں اب بوڑھی ہو گئی ہوں کب تک گھر سنبھالوں گی وغیرہ وغیرہ۔"

"تو پھر آخر آپ کر کیوں نہیں لیتے؟"

"کرلوں گا بھائی، کرلوں گا جب دل راضی ہوگا۔"

"اور دل کب راضی ہوگا؟"

یہ جملہ صدرالدین نے اگرچہ بڑی سادگی سے کہا تھا مگر اس جملے میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ شیخ طاہر نے یکایک دونوں ہاتھوں کی انگلیاں زور سے ایک دوسرے میں پھنسا لیں اور کچھ عجیب سی نظروں سے صدرالدین کو دیکھنے لگے۔ دل کب راضی ہوگا، ہاں یہ دل، یہ کمبخت، نامراد دل کب راضی ہوگا..... زندگی کے سنگلاخ راستے پر دل کا یہ تنہا مسافر کب سے آبلہ پا بھٹک رہا ہے اور کب وہ دن آئے گا جب یہ دل، یہ دیوانہ دل کسی آنچل کے سہارے اور گھنی زلفوں کے مرطوب و معطر سائے کا متمنی ہوگا۔ شیخ طاہر آخر کیسے بتائیں کہ ان کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اپنی تمام تر دولت و امارت کے باوجود وہ ایک تنگدست و تہی داماں آدمی ہیں۔ یہ سوال تو سب کرتے ہیں کہ وہ شادی کب کریں گے اور کس سے کریں گے اور کبھی کبھی وہ اس نیت سے مختلف خواتین کو دیکھتے بھی ہیں۔ شائستہ گلزار کو اور زبیدہ شوکت کو اور نسرین چودھری کو اور بیگم احسان کو مگر کوئی بھی ان کی نگاہ میں نہیں جچتی اور وہ کسی کو یہ بتا بھی نہیں سکتے کہ کیوں نہیں جچتی۔ وہ کچھ دیر تک بے چینی اور تذبذب کے ساتھ صدرالدین کو دیکھتے رہے پھر زور سے سانس لے کر بولے۔

"خیر فی الحال اس ذکر کو چھوڑو۔ جب دل راضی ہوگا تو میں بتا دوں گا۔ آج تو میں تم سے سیاسی پارٹی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں مجھے شمولیت اختیار کر لینا چاہیے؟"

صدرالدین نے ڈبیا سے ایک اور پان نکالا، کلّے میں دبایا۔ "دراصل۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "پارٹی والوں کا خیال ہے کہ اگر آپ ان کی پارٹی میں شامل ہو گئے تو ان کی پوزیشن بہت مضبوط ہو جائے گی۔ نہ صرف یہ کہ انہیں آپ سے مالی امداد ہی ملے گی بلکہ آنے والے الیکشن میں آپ کی شہرت اور نیک نامی کے باعث ان کی جیت کے امکانات بھی بہت بڑھ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ کو الیکشن جیتنے کے بعد وزیراعلیٰ بنانا چاہتے ہیں۔ اب رہ گیا سوال میری رائے کا تو میں کہوں گا۔ ہاں آپ کو شامل ہو جانا چاہیے۔"

"صرف اس لیے کہ وہ مجھے وزیراعلیٰ بنانا چاہتے ہیں؟"

"اور شیخ صاحب، یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ترقی اور کامرانی کی اس بلندی پر بھلا کتنے لوگ پہنچتے ہیں؟"

"خیر، جسے تم ترقی کہہ رہے ہو ضروری تو نہیں کہ دوسرے کی نظر میں بھی وہ ترقی ہی ہو۔" شیخ طاہر نے جواب دیا۔ "میں تو اس معاملے کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"دیکھو، مجھے وزیراعلیٰ تو کیا کسی قسم کا بھی وزیر بننے کا کوئی شوق نہیں لیکن میرے مشاغل اور دلچسپیوں سے تم واقف ہو۔ لوگوں کی فلاح و بہبود میرا مطمح نظر ہے۔ چنانچہ اگر میں وزیراعلیٰ بن گیا تو مجھے زیادہ اختیارات مل جائیں گے اور میں زیادہ آزادی سے اپنے پروگراموں کو زیر عمل لاسکوں گا۔ جب کہ ابھی کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر کام یا تو شروع ہی نہیں ہو پاتے یا پھر ادھورے رہ جاتے ہیں۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے اور اسی لیے میں کہتا ہوں کہ آپ کو فوراً پارٹی میں شامل ہو جانا چاہیے۔"

"خیر، میں چند روز اور غور کرلوں پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔" شیخ طاہر نے کہا۔ "فی الحال تو آپ اس کام کو شروع کیجیے، یہ زیادہ ضروری ہے۔"

اسی وقت یکایک دستک ہوئی پھر دروازہ کھلا اور وحیدہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔ حسب عادت ان کے چہرے

پر تھوڑا سا غصہ تھا جو سراسر مصنوعی تھا۔ انہوں نے معمول کے مطابق ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں پوچھا کہ شیخ طاہر نے دوا کھائی یا نہیں۔ جواب اثبات میں ملنے پر انہوں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور پھر کہنے لگیں۔ ''ایک صاحب آئے ہیں، تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''کون ہیں؟''

''میں کیا جانوں، پہلے کبھی یہاں نہیں آئے۔ اپنا نام بشیر احمد بتاتے ہیں۔''

''اوہ۔'' معاً صدرالدین نے کہا۔ ''شیخ صاحب، یہ وہی بشیر احمد ہیں جن کا آپ سے میں نے ذکر کیا تھا۔ شریف اور قابل اعتماد آدمی ہیں۔ میں نے آج ہی کے لیے ملاقات کا وقت دیا تھا انہیں۔''

''اچھا اچھا۔'' شیخ طاہر نے کہا پھر وحیدہ بیگم کی طرف گھومے۔ ''آپ انہیں بیرونی کمرے میں بٹھائیں اور چائے وغیرہ کا بندوبست کریں، میں چند منٹ میں آتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' یہ کہہ کر وحیدہ بیگم دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

کوئی دس منٹ بعد شیخ طاہر بیرونی کمرے میں داخل ہوئے۔ نووارد جس کا نام بشیر احمد تھا صوفے پر نیم وا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے سیاہ پتلون اور بھورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر گہرے رنگ کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ گو اس کی عمر زیادہ تھی لیکن صحت حیرت انگیز طور پر اچھی تھی اور اس کی کشادہ پیشانی سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے شائستہ انداز میں شیخ طاہر سے مصافحہ کیا پھر خوش گوار لہجے میں کہنے لگا۔

''شیخ صاحب، میں غائبانہ طور پر آپ سے خوب واقف ہوں اور ایک میں ہی کیا، ایک دنیا آپ کو جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صدرالدین نے بتایا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ فرمایئے، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ پولیس میں تھے؟'' چند لمحے کے توقف کے بعد شیخ طاہر نے پوچھا۔

''جی ہاں، برسوں پہلے پولیس میں رہا پھر کئی سال سی آئی ڈی کی کرائم برانچ میں گزارے۔ ابھی چند سال پہلے ریٹائر ہوا ہوں۔ گاؤں میں کچھ زمین ہے جو گزراوقات کا ذریعہ ہے لیکن پرانے پیشے سے اب بھی تھوڑا بہت تعلق ہے۔ باضابطہ طور پر نہیں بلکہ بالکل نجی طور پر کیونکہ ہمارے یہاں قانونی طور پر پرائیویٹ سراغ رسانوں کی گنجائش نہیں ہے مگر میں صرف عام نوعیت کے کام ہاتھ میں لیتا ہوں جیسے گم شدہ افراد یا پرانی دستاویزات کی تلاش وغیرہ......''

''کیا میں آپ پر بھروسا کر سکتا ہوں؟'' شیخ طاہر نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''بے شک آپ کر سکتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا۔ کبھی بے ایمانی اور وعدہ شکنی کا مرتکب نہیں ہوا کہ یہ میرے مسلک کے خلاف ہے۔ اگر آپ کوئی ایسی بات مجھے بتانے والے ہیں جس کا افشا ہونا آپ کو پسند نہیں تو اطمینان رکھیں، آپ کا راز میرے سینے میں ہمیشہ دفن رہے گا اور کبھی کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگے گی۔''

''میں۔'' آخر کار شیخ طاہر نے طویل سانس لی۔ ''ایک بہت اہم کام آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

وقت کا بے نیاز دریا بہتا رہا۔ بے آواز، چپکے چپکے حتیٰ کہ تین سال گزر گئے۔ ایک ہزار پچانوے دن، ایک ہزار پچانوے راتیں۔ یہ مدت کچھ ایسی زیادہ طویل نہیں۔ تاہم یہ اور بات ہے کہ بشو پر یہ وقت بہت بھاری گزرا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی تپتے ہوئے صحرا میں سفر کر رہا ہے۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، سر پر کڑی دھوپ ہے اور نیچے جھلتی ہوئی ریت اور دور دور تک کہیں کوئی سایہ نہیں کہ جہاں وہ دو گھڑی سستا لے۔ بس ہر طرف، دور تک ریت ہی ریت ہے۔ تپتی ہوئی جھلتی ہوئی اور اسے اس ننگے، ویران صحرا میں یونہی گھسٹ گھسٹ کر سفر حیات طے کرنا ہے۔ تین سال میں اس پر کئی قیامتیں گزریں، کئی چھوٹے بڑے دکھ دینے والے دل آزار واقعات بھی اور گو زندگی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے لیکن یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں کی زندگی میں دھوپ ہی دھوپ ہوتی ہے جس میں ان کی زندگی کی ساری خوشبو جل جاتی ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں اور آس کے سارے جگنو اپنی روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان تین برسوں میں بشو جن قیامتوں سے گزرا، ان میں پہلی قیامت یہ تھی کہ استاد سمندر نے ایک دن یکا یک رخت سفر باندھا۔ ان گنت نیکیوں، محبتوں اور دعاؤں کا زادراہ ساتھ لیا اور اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔

اس روز وہ اچھا بھلا اپنی چاچی سے ملنے گیا تھا جو شہر کی کسی مضافاتی بستی میں رہتی تھی، واپس آیا تو طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سینے میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا چنانچہ وہ سر شام ہی گھر چلا گیا۔ باقی وقت بشو نے دکان سنبھالی لیکن کوئی

ساڑھے بارہ بجے کے قریب جب وہ دکان بند کر کے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ استاد سمندر چارپائی پر بے سدھ پڑا ہے۔ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور تھا اور چہرہ شدت تکلیف سے سرخ ہو رہا تھا۔ بشو ایک دم گھبرا گیا اور اس کے قریب کرسی پر بیٹھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''استاد کیا بات ہے یہ...... یہ اتنا پسینا کیوں نکل رہا ہے؟''

استاد سمندر نے آنکھوں کا زاویہ بدل کر بشو کو دیکھا۔ اس کے سفید ہوتے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس سے شدید کرب و اذیت کا اظہار ہو رہا تھا پھر اس نے زور سے سانس لے کر کہا۔ ''شاید یہ موت کا پسینا ہے پتر؟''

بشو اور بھی گھبرا گیا۔ ''کیسی باتیں کر رہے ہو استاد؟''

استاد سمندر نے پھر کئی لمبی لمبی سانسیں لیں اور دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر زور زور سے دباتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں پتر! شاید میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا شاید میں غلط کہہ رہا ہوں مگر تو فکر نہ کر۔ ذرا مجھے ایک گلاس پانی دے۔''

بشو بھاگ کر پانی لایا پھر چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر اس نے استاد سمندر کو اٹھنے میں مدد دی۔ استاد سمندر نے پانی پیا جو آدھا اس کے حلق میں گیا' آدھا باچھوں سے ادھر ادھر ہو گیا۔ بشو نے ایک اور تکیہ رکھ کر اسے لٹایا پھر کہنے لگا۔

''تم نے دوا کھائی استاد؟''

''ہاں پتر دو دفعہ کھا چکا ہوں۔'' استاد سمندر نے تکلیف سے سر کو دائیں بائیں گھمایا۔ ''مگر درد کم نہیں ہو رہا بلکہ شاید بڑھتا ہی جا رہا ہے۔''

بشو کرسی پر ہکا بکا سا بیٹھا، سہمی سہمی نظروں سے استاد سمندر کو دیکھتا رہا۔ استاد سمندر کے چہرے کی سرخی اب کچھ اور بڑھ گئی تھی پسینا بھی زیادہ نکل رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اسے بہت زیادہ اذیت محسوس ہو رہی ہے حالانکہ سینے کا یہ درد کوئی نئی بات نہیں تھی کافی پرانا مرض تھا۔ اکثر اس کے سینے میں درد اٹھتا تھا مگر نہ تو اتنی دیر رہتا تھا اور نہ اتنی تکلیف ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک ٹیبلٹ تجویز کی تھی جو ہر وقت استاد سمندر کے پاس رہتی تھی۔ جب بھی درد شروع ہوتا، وہ دو گولیاں کھا لیتا اور کچھ دیر میں آرام آ جاتا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ دوا کھانے کے بعد بھی کئی گھنٹے تک درد رہا ہو۔ یہ کیفیت تو پہلی ہی بار ہوئی تھی اور اگرچہ بشو کو معلوم نہیں تھا کہ موت کی علامات کیا ہوتی ہیں پھر بھی اسے ڈر لگ رہا تھا۔ کوئی ایسی بات کہیں نہ کہیں ضرور تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی مگر جو یقیناً غلط تھی اور جسے نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا ہونا شاید طے پا چکا تھا اور بشو خواہش کے باوجود اسے نہیں روک سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بشو نے کہا۔ ''استاد اور دوا دوں؟''

''نہیں، اب شاید اس کا کوئی فائدہ نہیں۔'' استاد سمندر نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے پتر اب میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' بشو یک لخت چونک کر تڑپ کر قریب قریب رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''ایسا مت کہو استاد۔ ایسا مت کہو۔''

''ہاں پتر، شاید مجھے کہنا تو نہیں چاہیے پر یہ حقیقت ہے جب اپنے رب کی طرف سے بلاوا آ جائے تو بندے کو جانا ہی پڑتا ہے۔ یہی سچ ہے۔ بندہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی شاید مالک نے بلا بھیجا ہے۔''

بشو کو معاً ایسا لگا جیسے اس کا دل سکڑ کر یکا یک چھوٹا ہو گیا ہے۔ اس کا پورا بدن دفعتاً زور زور سے کانپنے لگا پھر وہ کچھ سوچ کر ایک دم جھپٹ کر اٹھا اور دروازے کی طرف بھاگا تو استاد سمندر نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''بشو! کہاں جا رہے ہو پتر؟''

''میں...... میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں۔''

''نہیں...... نہیں اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ پتر۔ یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو اور میری باتیں ذرا دھیان سے سنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

بشو دروازے میں رک گیا اور گومگو کے انداز میں استاد سمندر کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کرے پھر استاد کے چہرے پر پھیلے ہوئے التجائیہ تاثرات نے اسے مجبور کر دیا چنانچہ وہ پلٹ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور استاد سمندر کا سینہ ہولے ہولے سہلانے لگا۔ استاد سمندر چند لمحے آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور پورا منہ کھول کر لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا پھر اس نے آنکھیں کھولیں، حسرت سے بشو کو دیکھا اور کمزور لہجے میں بولا۔

''پتر! شاید میرا وسوسہ غلط نکلے شاید ابھی زندگی کے کچھ دن باقی ہوں لیکن اگر میں نہ رہوں تو......''

''نہیں، نہیں استاد! ایسا مت کہو۔ تم...... تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے......'' بشو نہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز بھرا گئی۔ الفاظ حلق میں ہی پھنس کر رہ گئے۔ استاد سمندر نے ہولے سے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی پھر کہنے لگا۔

’’بیچ میں مت بول پتر۔ میری بات دھیان سے سن۔ اگر میں مرجاؤں تو میری لاش میرے گاؤں میں دفنانا۔ وہاں میری ماں کی قبر ہے میری قبر میری ماں کے قدموں میں بنانا۔ برسوں پہلے میں گاؤں سے آیا تھا پھر کبھی پلٹ کر نہیں گیا۔ اب مرنے کے بعد جانا چاہتا ہوں۔ اس بات کا خیال رکھنا اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا جو کچھ بھی ہے دکان، مکان اور روپیا پیسا سب تیرا ہے۔ میں نے تجھے بیٹے کی طرح چاہا ہے پتر۔ افسوس میں تیرے لیے کچھ نہیں کرسکا۔ اب جو کچھ بھی ہے وہ سب تیرے حوالے کرتا ہوں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ہمیشہ اچھا آدمی بننے کی کوشش کرنا۔ کبھی جھوٹ نہ بولنا، کبھی کسی کو دکھ نہ دینا اور ہمیشہ ان کے کام آنے کی کوشش کرنا جو مدد کے محتاج اور مستحق ہوں۔ بول پتر! میری یہ بات یاد رکھے گا نا؟‘‘

بشو کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دل کسی خشک پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کی گزشتہ زندگی اس کے تصور میں ایک تصویر کے مانند گزرتی چلی گئی۔ وہ دن یاد آیا جب وہ اپنی ماں سے اور بہن سے اور جامن کے درخت سے اور چتکبری بکری سے بچھڑا تھا پھر بادشاہ، کیمن، رجھتاں اور مال گاڑی کا اذیت بھرا سفر، کیسی کیسی قیامتیں اس پر گزری تھیں۔ کیا وہ اب ایک اور قیامت سے دوچار ہونے والا تھا؟ نہیں، نہیں وہ استاد سمندر سے بچھڑنا نہیں چاہتا۔ وہ ایک بار پھر بے سہارا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہاتھ جوڑ کر استاد سمندر سے کہے۔

استادا ایسا مت کہو، تم مر نہیں سکتے۔ ابھی تم بہت دن جیو گے لہٰذا میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا مگر استاد سمندر کے چہرے پر چھائی ہوئی بے بسی اور التجا نے اس کی زبان روک لی۔ اس نے اپنی دانست میں صرف استاد سمندر کا دل رکھنے کے لیے کہا۔

’’ہاں، میں وعدہ کرتا ہوں مگر......‘‘

’’مگر کیا؟‘‘

’’مگر تم یہ سب کچھ مجھے کیوں دے رہے ہو، تمہارے اپنے رشتے دار ہیں۔ چاچی، بہن اور بھتیجا انہیں دے دو یہ تو ان کا حق بھی ہے۔‘‘

’’نہیں پتر! اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔‘‘

’’مگر......‘‘

’’سنو، سنو آج میں تمہیں بتاتا ہوں۔‘‘ استاد سمندر نے پھر اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ’’پتر میں آج وہ کہانی تمہیں سناتا ہوں جس کا کسی کو علم نہیں۔ برسوں گزرے، جب میں اپنے گاؤں میں تھا تب مجھے ایک عورت ملی تھی۔ بنجارن تھی اور میرے مذہب کی نہیں تھی مگر وہ بہت اچھی تھی۔ بہت محبت اور خدمت کرنے والی۔ خوب صورت تو اتنی تھی کہ ایک نظر اسے دیکھو تو بس دیکھتے رہو۔ کبھی تم نے آدھی رات کو آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھا ہے پتر، جسے دیکھ کر مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں؟ وہ بھی بس اندھیری راتوں میں راستہ دکھانے والے چاند کی طرح تھی۔ اس کا نام شالی تھا۔ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کیا تو میرے رشتے دار اور گاؤں کے کچھ دوسرے لوگ میرے مخالف ہوگئے۔ میرا ایک رشتے کا ماما تھا۔ وہ سب سے زیادہ مخالف تھا کیونکہ اس کی بھی ایک بیٹی تھی اور وہ اس کی شادی مجھ سے کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت میں اکیلا تھا۔ ماں باپ مرچکے تھے اور مامے کا خیال تھا کہ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کرکے آہستہ آہستہ وہ میری زمین، باغ اور مکان پر قبضہ کرلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سب کو بھڑکایا اور وہ سب میرے مخالف ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک غیر مذہب اور غیر برادری کی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا مگر میں نہیں مانا اور شالی سے شادی کرلی۔‘‘ استاد سمندر ذرا یک رکا۔ اس نے زور زور سے کئی سانسیں لیں۔ چند لمحے آنکھیں بند کیے سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔ ’’شالی بہت اچھی تھی۔ بڑی نیک، خدمت گزار اور محبت کرنے والی۔ اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ وہ اتنی اچھی تھی کہ ہر روز صبح پانچ بجے اٹھتی تھی اور گھر میں اگربتی جلاتی تھی پھر مجھے جگاتی تھی تاکہ میں فجر کی نماز پڑھوں حالانکہ وہ مسلمان نہیں تھی پھر بھی یہ سب کچھ کرتی تھی۔ اس نے میرے رشتے داروں اور گاؤں والوں کا دل جیتنے کے لیے سب ہی کچھ کیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا پتر، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان لوگوں کے دل نہیں پسیجے۔ مامے نے دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے خوش نہیں رہنے دے گا اور وہی ہوا کہ میری خوشیاں چھن گئیں کیونکہ ایک دن شالی اچانک مرگئی۔‘‘

’’مرگئی......!‘‘ بشو سسناکر بولا۔ ’’کیسے، کیسے؟‘‘

’’آگ لگ گئی تھی پتر میرے گھر میں اور شالی سر سے پیر تک بری طرح جل گئی تھی۔‘‘ استاد سمندر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ’’میں اس روز پاس کے ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا اور رات وہیں رک گیا تھا۔ جب میں واپس آیا تو شالی مرچکی تھی اور میرا گھر آدھے سے زیادہ جل کر برباد ہوچکا تھا۔ یہ واقعہ ایسا تھا پتر کہ میرا دل ٹوٹ گیا۔ زندگی سے جی اچاٹ ہوگیا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ شالی جیسی

محبت کرنے والی عورت بار بار نہیں ملتی پتر۔ وہ تو ایک انمول ہیرا تھی جو مجھ سے چھن چکا تھا۔ میں بہت دن گاؤں میں رہا مگر وہاں کی ہر چیز مجھے کاٹنے کو دوڑتی تھی لہٰذا میں نے اپنا سب کچھ بیچ دیا اور شہر میں چلا آیا۔ پہلے ادھر ادھر کچھ کام کیے پھر اس بازار میں دکان کرلی۔ یہ صرف اتفاق تھا مجھے وہاں کی عورتوں سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ میں نے تو وہاں کیچڑ کے کنول کی طرح زندگی گزاری ہے پتر! پاک صاف، شالی کے بعد پھر کبھی کوئی عورت مجھے اچھی نہیں لگی۔ میں نے ساری عمر اسی کی یاد میں بتائی ہے۔ اس نے مجھ سے وفا کی تھی میں نے اپنے آپ سے کہا دیکھ استاد سمندر تو بھی بے وفا مت بننا اور پتر میں نے کبھی اپنی شالی سے بے وفائی نہیں کی۔" استاد سمندر ایک لمحے کے لیے رکا پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "ایک بات کہوں پتر؟"

"ہاں کہو استاد۔"

"دیکھ تو بھی اس بازار میں ہے۔ روز صبح سے رات تک دکان داری کرتا ہے۔ وہاں قدم قدم پر ترغیب اور لالچ موجود ہے لیکن تو اپنے دامن پر کبھی دھبا نہ لگنے دینا۔ پتر! آدمی وہی ہے جو کیچڑ میں چلے تو بھی بے داغ گزر جائے۔"

"اطمینان رکھو استاد، میں اپنا دامن ہمیشہ صاف رکھوں گا۔" بشو نے کہا۔ "مگر استاد کیا تم نے پتا کرنے کی کوشش کی تھی کہ آگ کیسے لگی تھی؟"

"آگ لگی نہیں تھی پتر لگائی گئی تھی۔" استاد سمندر تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "یہ کام میرے رشتے داروں کا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنی اس توہین کا بدلہ لیا تھا جو میں نے ایک غیر برادری کی لڑکی سے شادی کرکے کی تھی۔ شاید ماے کا یہ بھی خیال رہا ہو کہ اگر شالی مرگئی تو میں اس کی لڑکی سے شادی کرلوں گا۔ بہرحال صرف اس بنا پر ان کمینوں، ظالموں نے میری شالی کو مار ڈالا۔ مجھے یہ بات معلوم تھی مگر میں پولیس کے پاس نہیں جاسکتا تھا کیونکہ ثبوت ناکافی تھے مگر پتر! میں ایک کام کرسکتا تھا یعنی ان لوگوں سے انتقام لے سکتا تھا اور میں انتقام لیتا بھی ضرور اس طرح کہ ان یزید کے بچوں پر زمین و آسمان تنگ ہوجاتے۔ میں ان کے کھلیانوں میں آگ لگا دیتا، ان کے کھیت اجاڑ دیتا اور شالی کی ایک ایک چیخ کے بدلے میں ایک ایک کا نرخرہ کاٹ ڈالتا۔ میں ایسا ہی آدمی تھا پتر۔ بہت جوشیلا اور غصہ ور مگر میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک بار شالی نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ اگر کبھی کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو میں کسی سے بدلہ نہیں لوں گا بلکہ اپنے دشمنوں کو معاف کردوں گا چنانچہ میں نے انہیں معاف کردیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بدلہ لیتا ہوں تو کہیں میری شالی کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور یہ مجھے منظور نہ تھا لہٰذا میں نے انہیں کچھ نہیں کہا اور گاؤں چھوڑ کر چلا آیا۔ اس کے بعد میں اپنے کسی رشتے دار سے کبھی نہیں ملا۔ یہ جو بہن، بھتیجا اور چاچی وغیرہ ہیں یہ میرے کوئی نہیں ہیں بس بے چارے غریب اور ضرورت مند لوگ ہیں اور اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دیتا ہے، میں اتنی ان کی مدد کردیتا ہوں۔ بھتیجا تو خیر اب کہیں چلا گیا ہے۔ بہن جلد ہی دوسری شادی کرنے والی ہے۔ انہیں اب میری مدد کی ضرورت نہیں رہے گی ہاں چاچی رہ جاتی ہے بے چاری بیوہ ہے، کوئی اولاد بھی نہیں۔ بہت اکیلی اور دکھی عورت ہے میری طرح اور تیری طرح اس کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں۔" استاد سمندر ذرا یک رکا پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ "ایک بات کہوں پتر؟"

"ہاں استاد کہو۔"

"دیکھ جب میں نہیں رہوں گا تو، تو اکیلا رہ جائے گا۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے تیرے سر پر کسی بڑے کا ہاتھ ہونا ضروری ہے۔ اگر مناسب سمجھے تو چاچی کو یہاں اپنے پاس لے آنا، تجھے اس کا پتا تو معلوم ہی ہے نا...؟"

"نہیں استاد، مجھے اس کا پتا نہیں معلوم۔ تم نے بھی بتایا ہی نہیں۔"

"کرم داد سے پوچھ لینا، وہ جانتا ہے۔ اگر چاچی یہاں آجائے گی تو بڑا اچھا رہے گا۔ تم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن جاؤ گے۔"

استاد سمندر نے جملہ پورا کیا ہی تھا کہ معاً اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ سینے کا درد ایک دم بڑھ گیا اور چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر بشو ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے استاد سمندر کو دو گھونٹ پانی پلایا اور پھر یکایک اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا۔ استاد سمندر نے تھکی تھکی آواز میں اسے آواز دی۔ واپس آنے کے لیے کہا مگر بشو نہیں رکا۔ اس نے بے حد عجلت میں دروازہ کھولا اور وحشت بھرے انداز میں اندھا دھند گلی میں دوڑتا چلا گیا...

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور ساری گلیاں ویران پڑی تھیں۔ آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھا جسے دیکھ کر مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ بشو چمکتے چاند کے نیچے ہر طرف سے بے خبر ہوکر دوڑتا چلا گیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سارا بدن پسینے سے شرابور تھا اور ٹانگیں خشک پتے کی طرح کانپ رہی تھیں مگر

اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس نے ایک گلی عبور کی پھر دوسری پھر تیسری اور پھر وہ سڑک پر جا پہنچا جہاں ڈاکٹر رضا کا مطب تھا۔ اوپر کی منزل میں ان کی رہائش تھی۔ بشو نے تیزی سے سیڑھیاں طے کیں اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔

کوئی پانچ منٹ بعد دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر رضا سوتے سے اٹھ کر آئے تھے۔ اس لیے کافی برہم تھے لیکن بشو پر نظر پڑتے ہی ان کی پیشانی کی شکنیں غائب ہوگئیں۔ گھبرا کر بولے۔ "کیا بات ہے بشو، کیا بات ہے تم رو کیوں رہے ہو؟"

بشو نے جلدی جلدی ساری بات بتائی۔ "اچھا ٹھہرو میں اپنا بیگ لے کر آتا ہوں۔"

لیکن دس منٹ بعد جب ڈاکٹر رضا اور بشو گھر میں داخل ہوئے تو استاد سمندر جا چکا تھا۔

☆☆☆

استاد سمندر کی موت کوئی ایسا سانحہ نہیں تھا جسے بشو آسانی سے جھیل جاتا۔ بہت دن تک وہ گم صم سا رہا۔ کوئی شے اسے اچھی نہ لگتی۔ ہر شخص اسے اجنبی اور بے مہر نظر آتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی گھنے جنگل میں کھو گیا ہے اور جستجو کے باوجود اپنا راستہ تلاش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے شب و روز کا معمول بڑا میکانکی سا ہوگیا۔ صبح اٹھتا، ناشتا کرتا اور دکان پر چلا جاتا۔ رات گئے گھر جاتا اور چارپائی پر لیٹے لیٹے چھت کی کڑیاں گنتا رہتا مگر وقت دھیرے دھیرے ہر زخم کو مندمل کردیتا ہے۔ بشو بھی بالآخر دکھ اور بے سہارے پن کے گرداب سے نکل آیا۔ اس کے کئی سبب تھے۔ احساسِ ذمے داری کے ساتھ اس کے اردگرد ایسے کئی لوگ موجود تھے جو اسے سہارا دیتے تھے۔ کرم داد اور دوسرے کئی لوگ تھے اور پھر زینت بھی جو اس کے لیے اندھیری رات میں چمکنے والے اس چاند کے مانند تھی جسے دیکھ کر مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ بشو بھی زینت کے چاند جیسے چہرے کو دیکھتا تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا۔ مایوسی کی تاریکی چھٹ جاتی اور اسے زندگی کا راستہ نظر آنے لگتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا اگر زینت نہ ہوتی، ہاں اگر زینت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ اس کے چاروں طرف کتنی تاریکی ہوتی۔ گہری، دم گھونٹ دینے والی تاریکی جس میں وہ ساری عمر بھٹکتا رہتا مگر زینت موجود تھی...... اندھیری رات میں چمکنے والا چاند، جس کی روشنی میں مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں اور اس چاند کی موجودگی بشو کے لیے یہ سب سے بڑا سہارا تھا اور ہرچند کہ ان کے درمیان ایک بڑا بے نام اور غیر واضح ربط تھا جس کی کوئی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ ایک ایسا لگاؤ جو کم از کم بشو کے دل میں ممنونیت کے احساس کی بنا پر پیدا ہوا تھا لیکن بشو خود اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اسے تو صرف اس بات سے غرض تھی کہ زینت اسے اچھی لگتی ہے اور بس لاشعوری طور پر اس کی خواہش تھی کہ زینت ہمیشہ اسی طرح اس کے آس پاس موجود رہے۔

ایک اور سہارا چاچی کا تھا۔ استاد سمندر کی خواہش کے مطابق وہ چاچی کو اپنے گھر لے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چاچی کوئی عمر رسیدہ عورت ہوگی مگر اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی چونکہ استاد سمندر اس کے شوہر کو جو استاد سمندر سے عمر میں بڑا تھا چاچا کہہ کر مخاطب کرتا تھا لہٰذا اسی ناتے سے وہ اسے چاچی کہنے لگا تھا حالانکہ وہ عمر میں استاد سمندر سے چھوٹی تھی۔ چاچی کا رنگ سانولا تھا۔ ناک نقشہ اتنا اچھا تھا کہ اگر وہ چاہتی تو اب بھی کسی اچھے آدمی سے اس کی شادی ہوسکتی تھی مگر اسے اپنے مرحوم شوہر سے بڑی محبت تھی۔ اسی بنا پر وہ دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بہت نیک اور خدمت کرنے والی عورت تھی۔ گھر کو اپنے ہاتھوں کی برکت سے جنت بنا دینے والی۔ جب وہ بشو کے گھر آئی تو شروع میں چند دن تھوڑا سا تکلف رہا پھر وہ گھل مل گئے اور ایک دوسرے کے ہمدم و دم ساز بن گئے۔ چاچی کو دیکھ کر اور اس سے باتیں کرکے بشو کو اپنی ماں یاد آجاتی کیونکہ وہ بھی ویسی ہی نیک اور مہربان تھی۔ کبھی کبھی بشو سوچتا ایسا تو نہیں کہ قدرت نے چاچی کی شکل میں میری ماں مجھے واپس کردی ہے لیکن اس نے اپنے اس احساس کا ذکر کبھی چاچی سے نہیں کیا۔

وہ ایک جلتی ہوئی دوپہر تھی۔ بشو دکان میں پاؤں پسارے بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی ایک کاپی اور قلم رکھا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے کوشش کرکے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ گلی میں حسبِ معمول ویرانی تھی۔ بشو کتاب پڑھتے پڑھتے کسی کسی وقت نظر اٹھاتا اور ادھر ادھر دیکھ لیتا۔ کرم داد اپنی دکان میں آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اس کی دکان کے نیچے نالی میں فقیرے کا دم کٹا کتا بیٹھا بڑی سی زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ سارے چوبارے خالی تھے اور اکثر دکانیں بند تھیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ابھی اس گلی میں صبح نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی تو آدھی رات تھی اور جب تک صبح نہیں ہوگی چوبارے ویران اور گلی سنسان ہی رہے گی۔ بشو نے ہاتھ اٹھا کر کان کھجایا اور گردن اٹھا کر زینت کے چوبارے کی

طرف دیکھا مگر زینت چوبارے پر نہیں تھی، سیڑھیوں سے اتر رہی تھی۔ بشو اسے آتے دیکھ کر یکایک سنبھل کر بیٹھ گیا۔

زینت نے گلابی شلوار جمپر پہن رکھا تھا۔ دوپٹا بھی اسی رنگ کا تھا۔ سیاہ بالوں کی ایک موٹی سی چوٹی اس کی کمر پر لہرا رہی تھی۔ وہ اب بڑی ہوگئی تھی۔ سترہ سال کے لگ بھگ مگر ابھی بھی ویسی ہی دبلی پتلی تھی۔ چہرے کے ایک تاثر سے اگر بدستور لڑکپن کا اظہار ہوتا تھا تو دوسرا تاثر فوراً اعلان کرتا تھا کہ اب وہ جوانی کی وادیوں میں قدم رکھ رہی ہے۔ سانولی رنگت کے باوجود اس کے نین نقش اب زیادہ تیکھے ہوگئے تھے اور اس بنا پر وہ زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ کم از کم بشو کو تو بہت زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی ہوئی دکان پر آئی اور مدھم لہجے میں بولی۔ ''بشو سگریٹ کی ایک ڈبیا دے اور چار پان، ایک میں قوام زیادہ ڈالنا۔''

بشو کو ایک نامعلوم سی خوشی محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے کتاب بند کی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''آج تو صبح سے تمہیں دیکھا ہی نہیں، کہاں تھیں تم؟''

''گھر ہی میں تھی اور کہاں ہوتی؟'' زینت نے بشو کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''چھجے پر بھی نہیں آئیں؟''

''چھجے پر آکر کیا کرتی؟''

''کچھ نہیں، میں نے تو ویسے ہی کہا۔ کیا آج کہیں جارہی ہو؟''

''نہیں تو کیوں؟''

''یہ اتنے اچھے اچھے کپڑے جو پہنے ہیں آج تم نے۔''

''کہاں جانا ہے بشو۔'' زینت نے کہا۔ اس کے لہجے اور چہرے دونوں ہی سے ایک عجیب سی تھکاوٹ اور بیزاری کا اظہار ہورہا تھا۔ ''بس ویسے ہی کپڑے پہن لیے ہیں کہیں جانا نہیں ہے۔ لا جلدی سے پان دے، دیر نہ کر۔''

یکایک بشو کو زینت کے بدلے ہوئے رویے کا احساس ہوا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ زینت نے ایسے تھکے تھکے انداز میں بات کی ہو بغیر مسکرائے ہوئے بغیر اسے چھیڑے ہوئے۔ ''کیا بات ہے زینت اتنی مضمحل کیوں نظر آرہی ہے؟'' اس نے غور سے زینت کے اداس چہرے کو دیکھا پھر تشویش بھرے انداز میں بولا۔

''کیا بات ہے زینت، تم اتنی پریشان کیوں ہو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''کوئی بات نہیں بشو میری طبیعت ٹھیک ہے تو ذرا جلدی سے پان دے دے۔''

''نہیں، نہیں۔'' بشو بچوں کی طرح مچل گیا۔ ''پہلے بتاؤ کیا بات ہے ورنہ میں پان نہیں دوں گا۔''

زینت نے پہلی بار گردن اٹھائی اور بشو کو دیکھا۔ اس کا چہرہ واقعی دھندلایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں گہری یاسیت تھی جیسے وہ اندر ہی اندر کسی شدید اذیت سے دوچار ہو۔ وہ چند ثانیے کچھ تذبذب اور کچھ حسرت سے بشو کو تکتی رہی پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''دیکھ بشو، تنگ نہ کر جلدی سے پان دے دے۔''

''نہیں، پہلے بتاؤ۔ پہلے بتاؤ۔'' بشو نے پھر ضد کی۔

زینت نے بشو کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے لمبے سفر پر جانے والا آدمی اپنے پیاروں کو حسرت سے دیکھتا ہے پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگی۔

''کیا بتاؤں بشو! تیری کیا سمجھ میں آئے گا۔ دیکھ، جلدی سے پان دے دے میرے اچھے بشو! تجھے میری قسم۔''

بشو نے پھر کچھ نہیں کہا۔ زینت نے اپنی قسم جو دے دی تھی۔ اس نے پانوں کی پڑیا زینت کی طرف بڑھائی پھر ایک پان میں چار الائچیاں ڈال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''لو یہ تم کھا لو میری طرف سے۔''

زینت گردن جھکائے ہوئے واپس ہوگئی۔ تھکے تھکے قدموں سے اس نے گلی طے کی۔ بشو اسے الجھی الجھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

زینت نے کہا تھا۔ ''تیری کیا سمجھ میں آئے گا۔'' بشو بے شک ابھی لڑکا تھا اور ساری نہ سہی کچھ باتیں تو بہرحال سمجھ ہی سکتا تھا۔ زینت کی اداسی اور بیزاری کا سبب دوسرے دن اسے معلوم ہوگیا۔ جب اس نے یونہی روا روی میں کرم داد سے کہا۔

''چاچا، پتا نہیں یہ زینت کو کیا ہوگیا ہے۔ ٹھیک سے بات ہی نہیں کرتی؟''

''تجھے نہیں معلوم؟'' کرم داد نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، کیا کوئی خاص بات ہے؟''

کرم داد نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ ''پتر بات یہ ہے کہ زینت کی شادی ہورہی ہے۔''

''شش...... شادی ہورہی ہے۔'' بشو حیرت سے بولا۔ ''کب، کس سے مجھے تو پتا ہی نہیں چلا؟''

''چھوٹے چودھری سے۔'' کرم داد نے اطمینان

سے کہا۔ ''مگر یہ وہ شادی نہیں ہے پتر جو تو سمجھ رہا ہے۔ یہ دوسری طرح کی شادی ہے اور یہ صرف علامتی ہوتی ہے مگر یہ تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

بشو وم بخود سا بیٹھا تھا۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں پھیلی ہوئی اور ان میں کچھ ایسی بے اعتباری تھی جیسے اسے کرم داد کی ہوش مندی پر شبہ ہو۔ کئی لمحے اسی حالت میں گزر گئے پھر وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''چاچا، میری سمجھ میں واقعی تمہاری بات نہیں آئی۔ تم کہہ رہے ہو کہ اس کی شادی چھوٹے چودھری سے ہورہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی؟''

بشو کئی لمحے تک چپ رہا اور گومگو کے عالم میں کرم داد کو دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ ''تو کیا زینت بھی راضی ہے؟''

''زینت کی رضامندی یا نارضامندی سے بھلا کیا ہوتا ہے؟'' کرم داد حیرت سے بولا۔ ''میں نے کہا نا کہ یہ تو ایک رواج ہے جسے ہر خاندان پورا کرتی ہے۔ اس میں رضامندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا پتر۔''

بشو کی سمجھ میں پھر بھی کچھ نہیں آیا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک کئی سوال موجود تھے۔ مثلاً یہ کہ اگر زینت رضامند نہیں ہے تو کوئی جبراً اسے شادی پر کیسے مجبور کرسکتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ کیسی شادی ہے کہ وہ شادی کے بعد بھی بیوی نہیں ہوگی اور تیسری بات یہ ہے کہ زینت چھوٹے چودھری سے کم از کم پچیس سال چھوٹی ہے پھر اس کے گھر والے اس کی شادی چھوٹے چودھری سے کیوں کررہے ہیں مگر اس نے یہ سارے سوال نہیں کیے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے صرف اتنا ہی پوچھا۔

''یہ شادی کب ہے چاچا کرم داد؟''

''پرسوں۔''

دو دن کسی کیڑے کی طرح رینگ کر گزرے۔ بشو بہت متوحش اور ہراساں تھا۔ کچھ ایسی کیفیت تھی اس کی جیسے وہ کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول گیا ہو اور باوجود کوشش کے یاد نہ آرہا ہو کہ وہ کیا چیز تھی اور اسے وہ کہاں رکھ کر بھول گیا ہے۔ چاچی نے کئی بار اسے ٹوکا۔

''کیا بات ہے بشو، تم اتنے کھوئے کھوئے سے کیوں ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' فریدے نے بھی ٹوکا جسے اس نے دکان پر جز وقتی کام کے لیے ملازم رکھا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دے۔ اسے تو اپنی حالت کا خود ہی ادراک نہیں تھا پھر کسی اور کو کیا بتاتا۔ دو دن یونہی گزرے پھر تیسرا دن آیا اور وہ تیسرا دن بھی بہت طویل، بہت ویران اور بہت اداس کردینے والا تھا۔ بشو سارا دن دکان میں بیٹھا رہا اور بار بار زینت کے چوبارے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے ایک پان بڑے چاؤ سے لگا کر رکھا تھا۔ اس میں چار الائچیاں ڈالیں اور منتظر رہا شاید زینت آجائے...... صرف ایک بار تو اسے پھر پان کھلا دے گا۔ شاید آخری بار مگر زینت نہیں آئی۔ وہ سارا دن چوبارے پر بھی نظر نہیں آئی۔ جب شام ہوئی اور گلی کی رونق میں اضافہ ہوا تو اس نے چھوٹے چودھری کو دیکھا۔ حسب معمول وہ جھوم جھوم کر چلتا ہوا آرہا تھا۔ اس شام اس کی سج دھج کچھ نرالی ہی تھی۔ جسم پر گلابی ریشم کا کڑھا ہوا کرتا اور سفید لاچا تھا۔ پگڑی بالکل نئی تھی اور اس کا شملہ پہلے سے بھی اونچا تھا۔ اس کے گلے میں گلاب اور چنبیلی کے کئی ہار تھے۔ کلائیوں میں پھول تھے اور کانوں میں بھی کلیاں اڑسی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل رچا تھا اور ہونٹوں پر پان کی سرخی اس کے پیچھے اس کے کئی مصاحب تھے۔ بشو یکایک سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس نظر سے چھوٹے چودھری کو گھورنے لگا جس نظر سے آدمی اپنے بدترین دشمن کو گھورتا ہے۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ بدن سنسنا رہا تھا اور دل میں کچھ ایسی تکلیف ہورہی تھی جیسے کوئی سوئیاں چبھو رہا ہو۔ یہ ساری کیفیت غیر شعوری اور غیر اختیاری تھی۔ اگر وہ اپنی حالت کا تجزیہ کرسکتا تو شاید اسے خود تعجب ہوتا کہ وہ ایسا کیوں محسوس کررہا ہے۔ اگر چھوٹا چودھری زینت سے شادی کررہا ہے تو اسے کیا؟ زینت آخر اس کی کون تھی؟ اس کا زینت پر کیا حق ہے اور اگر زینت چھوٹے چودھری سے شادی نہ کرے تو اسے کیا حاصل ہوگا؟ مگر اسے ان باتوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ چھوٹا چودھری ایک لٹیرا ہے اور اس کی دنیا لوٹنے آیا ہے۔

چھوٹا چودھری مسکراتا ہوا کسی فاتح کی طرح آیا۔ کئی لوگوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس سے ہاتھ ملایا پھر وہ اپنے مصاحبین کے جلوس میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔

بشو کچھ دیر خاموش بیٹھا جلتی ہوئی نظروں سے چوبارے کو گھورتا رہا پھر یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے فریدے کو آواز دے کر دکان دیکھنے کے لیے کہا اور خود اتر کر ایک طرف چل پڑا۔ کچھ دیر میں وہ سڑک پر آگیا جہاں شام کا ہجوم رواں دواں تھا۔ ہوٹل اور دکانیں آباد تھیں لیکن بشو کو کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ وہ ایک عالم وحشت میں سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلنے لگا، اس بات سے بے نیاز

اور بے خبر کہ اسے کہاں جانا ہے اور کیوں جانا ہے؟ پیروں کے نیچے سنگین زمین تھی سر پر کہن آسمان تھا جہاں چمکتا ہوا چاند موجود تھا جسے دیکھ کر مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ بشو اسی چاند کے نیچے بہت دیر تک بھٹکتا رہا۔ گمشدہ، بے خبر۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک گلی سے دوسری گلی اور رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے دبیز ہوتا گیا۔

اس رات جب وہ بہت دیر سے گھر پہنچا اور سونے کے لیے لیٹا تو اچانک اس نے چاچی سے کہا۔

''چاچی، میں دکان بیچ رہا ہوں۔''

☆☆☆

ایک باب پورا ہوا۔ ورق پلٹا گیا اور وقت نے کتاب زندگی پر نیا باب لکھنا شروع کیا۔ اگلی سطر میں کیا ہوگا، اگلے پیراگراف میں کیا ہوگا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ بشو بھی نہیں جانتا تھا۔ مستقبل ایک تاریک سمندر ہے اور اس سمندر میں کہاں کہاں سطح پرسکون ہے اور کہاں کہاں مدو جزر ہے یہ کسی کو نہیں معلوم، شاید زندگی کی ساری کشش اور سارا حسن اسی میں ہے کہ آدمی کچھ نہیں جانتا۔ وہ تو بس تاریک سمندر میں اپنی ناؤ دھکیلتا رہتا ہے۔ کبھی ساحل تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی کسی بھونچال یا طوفان میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ بشو نے دکان بیچی تو اس نے شہر کے ایک خاصے اچھے علاقے میں دوسری دکان حاصل کر لی۔ وہی پان کے پتے، چونا، کتھا اور سگریٹ کے پیکٹ اس کے چاروں طرف تھے اور بشو بالکل مطمئن تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہی اس کی انتہا ہے۔ اس نے کبھی آگے بڑھنے اور کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں مگر یہ تو اسے معلوم ہی تھا کہ اگلی سطر میں کیا ہے۔

بشو کی دکان بہت ہی اچھی چلنے لگی تھی۔ اتنی کہ خود اسے گمان تک نہ تھا۔ اس کی آمدنی اخراجات سے کئی گنا زیادہ تھی، حالانکہ اسی سڑک پر پان سگریٹ کی اور بھی دکانیں تھیں مگر وہ لوگ بیٹھے مکھیاں مارا کرتے اور بشو گاہکوں کو نمٹاتے نمٹاتے تنگ آجاتا۔ فرید بدستور اس کے ساتھ تھا۔ کبھی کبھی وہ ہنس کر کہتا۔

''بشو بہادر، تیرے ہاتھوں میں چمتکار ہے۔ مٹی کو بھی ہاتھ لگائے گا تو سونا بن جائے گی۔'' یہ اس کی عادت تھی کہ وہ بشو کو ہمیشہ بشو بہادر کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

شاید فرید کی بات درست تھی۔ بشو نے اتنی ترقی کی کبھی کبھی خود اسے تعجب ہوتا پھر وہ یہ سوچ کر تھوڑا سا دکھی بھی ہو جاتا کہ یہ کیسی خوش نصیبی ہے کہ وہ اپنی ماں اور بہن سے بچھڑ گیا۔ استاد سمندر جیسی مہربان ہستی کو کھو بیٹھا اور زینت کی دید سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا لیکن دوسری طرف کاروبار میں بے حد کامیاب ہے۔ یہ واقعی خوش نصیبی ہے یا قسمت کا کوئی انوکھا ستم۔ ویسے کاروبار میں جو کامیابی اسے حاصل ہوئی اس میں اس کی خواہش یا ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ تو بس خود بخود ہوتا گیا تھا جیسے اور بہت سی باتیں اس کی زندگی میں ہوتی گئی تھیں۔ کچھ مدت بعد اس نے جوتے چپل کا ایک کارخانہ مستری عبدالجبار کے مشورے پر خرید لیا۔ کارخانہ چھوٹا تھا اور مسلسل نقصان میں چل رہا تھا۔ مستری عبدالجبار نے جو کارخانے میں فورمین تھے اور بشو کے پڑوس میں رہتے تھے' بشو سے کہا کہ کارخانہ اچھا ہے اور منافع بخش ہے چنانچہ بشو نے کارخانہ خرید لیا۔ اس کے ہاتھ میں واقعی بڑی چمتکار تھا۔ ادھر کاغذات پر مالک کا نام تبدیل ہوا ادھر کارخانے کی قسمت بدل گئی۔ کچھ ہی دن بعد مزید مشینیں لگائی گئیں۔ مزید ملازم رکھے گئے اور وہ چھوٹا سا کارخانہ ایک بڑے کارخانے میں تبدیل ہو گیا۔ کارخانے کے سمندر شو اور زینت سینڈل تو اتنے مقبول تھے کہ دن بدن ان کی مانگ بڑھتی گئی اور پروڈکشن پوری کرنے کے لیے پھر اور مشینیں منگوائی گئیں۔

یہ سب کچھ بشو کے لیے ایک خواب کی طرح تھا۔ ایک خوب صورت اور نشاط انگیز خواب جو ہر شخص دیکھتا ہے لیکن جو عموماً پورا نہیں ہوتا مگر بشو کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ اس کے خواب جو اس نے جان کر نہیں دیکھے تھے پورے ہو رہے تھے۔ کارخانے کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد اس نے ایک ادھوری کمرشل بلڈنگ خرید کر مکمل کی جس میں نیچے دکانیں اور اوپر دفاتر تھے۔ یہ مرحلہ طے ہوا اور کچھ مدت گزری تو اتفاق سے کپڑے کا ایک کارخانہ اسے مل گیا۔ اگرچہ وہ اس معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا مگر بینک منیجر نے کہا۔ ''بشارت صاحب، آپ فکر کیوں کرتے ہیں ہم آپ کو پوری پوری سپورٹ دیں گے۔''

''مگر بھئی، اس کارخانے کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔'' بشو نے اعتراض کیا۔

''بے شک لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کارخانہ خرید لیں گے تو اس کی حالت بدل جائے گی۔''

چنانچہ بشو نے کپڑے کی مل خرید لی اور اس کا نام بدل دیا۔ اب کارخانے کے وسیع گیٹ پر ایک نیا سبز رنگ کا بورڈ لگا یا گیا۔ سمندر ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ' کچھ ہی دنوں میں کارخانے کی حالت واقعی بدل گئی۔ نقصان منافع میں تبدیل ہو گیا۔

مزید مشینیں لگیں۔ مزید کاریگر رکھے گئے۔ سمندر ٹیکسٹائل ملز کی بنی سمندر زین اور زینت ساٹن تو بہت مقبول تھی۔ بشو نے مل کے عقب میں ایک بہت بڑی کالونی بھی بنائی۔ جہاں صرف ان کاریگروں اور مزدوروں کو مکان اور کوارٹر دیے گئے جو تنگ دستی کے باعث زیادہ کرایہ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کالونی میں تمام بنیادی سہولتیں بھی مہیا کی گئی تھیں۔ اسکول، شفاخانہ، فیئر پرائس شاپ ایک خوب صورت پارک اور ایک مسجد۔ بشو کے ذہن میں مسجد کا ایک خاص مقام تھا بچپن میں جب وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا تو اس کی گلی میں ایک چھوٹی سی خوب صورت سی مسجد تھی جس کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ اس کے گنبد کے ساتھ چار کے بجائے صرف ایک ہی مینار تھا اور دوسری خصوصیت یہ تھی کہ چھوٹی ہونے کے باوجود اس کے پانچ دروازے تھے۔ درمیانی دروازہ جو محرابی تھا سب سے بڑا اور بلند تھا اور اس کے اوپر سنگ مرمر کی ایک سل نصب تھی۔ جس پر پوری سورۂ رحمٰن نقش تھی۔ بشو نے اسی مسجد کے سائے میں کھیل کود کر بچپن کے چند سال گزارے تھے۔ وہیں اپنی زندگی کی پہلی نماز پڑھی تھی اور وہیں الف لام میم شروع کی تھی۔ تبھی سے اس کے ذہن میں یہ اعتقاد بیٹھ گیا تھا کہ مسجد برکت کی علامت ہوتی ہے اور جس طرح وہ اپنی ماں اور بہن کو کبھی نہیں بھول سکا تھا، اسی طرح واحد مینار اور پانچ دروازوں والی مسجد کی یاد اس کے حافظے سے کبھی محو نہیں ہوئی تھی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ جب اس نے کالونی بنائی تو سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی۔

ایک شام وہ اپنے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے، قالین پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس ایم اے کے کورس کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ تبھی چاچی ایک گلاس میں دودھ لے کر آئیں اور اس کے قریب بیٹھ کر کہنے لگیں۔

''بشو، میں نے سنا ہے کہ تم کچھ زمین خرید رہے ہو؟''

بشو نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھی۔ ''ہاں چاچی۔'' اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مگر کچھ نہیں بلکہ کئی سو ایکٹر زمین ہے۔ حکومت نیلام کر رہی ہے۔ میں نے سوچا، کیوں نہ میں خرید لوں۔''

''مگر تم زمین کا کیا کرو گے؟''

''کچھ تو کاشت کاری کے لیے استعمال ہوگی' کچھ میں پھلوں کے باغات لگیں گے اور باقی زمین پر ایک بڑا پولٹری فارم بنے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہیں ضرورت کیا ہے؟'' چاچی نے اگلا سوال کیا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں چاچی۔ ضرورت تو کوئی نہیں۔'' بشو کہنے لگا۔ ''مگر پھر بھی میں خرید رہا ہوں' وجہ یہ ہے کہ استاد سمندر مرحوم کو گاؤں اور زمینوں سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ ان کی باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوا تھا اور صرف اسی بنا پر میں زمین خریدنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ اس سے استاد مرحوم کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن مجھے خوشی ہوگی۔''

''چلو ٹھیک ہے، خوشی کی بات ہے تو ضرور خریدو۔'' چاچی نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''مگر تمہیں زمین یا کاشت کاری کا تو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی پریشانی میں پڑ جاؤ۔''

''مجھے تو کسی بات کا تجربہ نہیں تھا لیکن دیکھیے دھیرے دھیرے سب ہی کچھ ہوتا چلا گیا۔'' بشو ہنس کر کہنے لگا۔ ''بات دراصل یہ ہے چاچی کہ جب اللہ تعالیٰ کرم کرتا ہے تو ہر کام کے لیے مناسب وسیلہ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ چپل کا کارخانہ خریدا تھا تو مستری عبدالجبار مل گئے تھے۔ اسی طرح ٹیکسٹائل مل کے موقع پر ہوا تھا کہ مجھے قابل اور دیانت دار لوگ مل گئے تھے۔ اب ایک صاحب ملے ہیں صدر الدین، بہت ایمان دار اور قابل آدمی ہیں۔ ولایت سے کئی ڈگریاں لے کر آئے ہیں۔ بزنس ایڈمنسٹریشن اور ایگری کلچر دونوں ہی میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف زمینوں کو بلکہ میرے دوسرے کاروبار کو بھی دیکھیں گے۔ دراصل انہی کے مشورے پر میں نے زمینیں خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''خیر تم جانو۔'' چاچی گلاس لے کر چلی گئیں۔

یہ ساری ترقی اور کامیابی بلاشبہ بے حد حیرت انگیز تھی۔ کسی معجزے کی طرح اور فطری طور پر بشو کو بے حد خوشی بھی ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اداس بھی ہو جاتا تھا۔ کسی ویران، تنہا لمحے میں جب یادوں کے قبرستان میں بنی چھوٹی چھوٹی قبروں پر ننھے ننھے دیے جل اٹھتے تو وہ اداس ہو جاتا۔ اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا اسے محسوس ہوتا کہ وہ ابھی تک وہی بھوکا اور کنگال لڑکا ہے جو زینت کے چوبارے کے نیچے، بند دکان کے پھٹے پر نیم غشی کی حالت میں پڑا رہتا تھا۔ وہ پورا منظر اس کی آنکھوں میں گھوم جاتا، اس کی ڈوبتی ہوئی نظریں، زینت کا دھندلایا ہوا چہرہ، المونیم کا تسلا اور اس میں رکھا ہوا ساگ اور روٹیاں۔ اس کے دل میں یکایک ایک ہوک سی اٹھتی۔ خدایا...... خدایا آخر میں کیا کروں؟ آخر کیا حاصل ہے اس دولت

وامارت ہے۔ اس عزت وشہرت اور اس شان وشوکت سے، کچھ نہیں۔ سب بے کار ہے، لاحاصل ہے۔ اس بھکاری کی طرح جس کی گدڑی میں لعل ہوتے ہیں لیکن جو دن رات فاقے کرتا ہے۔ اسے اپنی ماں یاد آتی، اس کی ممتا کے نور سے دمکتا ہوا چہرہ یاد آتا پھر چھوٹی بہن یاد آتی۔ سیدھی سادی اور معصوم، جس کی آنکھوں میں ان گنت سپنے ہر وقت جاگتے رہتے تھے۔ پتا نہیں وہ اب کہاں ہوں گی۔ زندہ بھی ہوں گی یا نہیں؟ شاید زندہ ہوں مگر وہ انہیں کہاں اور کیسے تلاش کرے۔ اسے تو اپنے شہر یا اپنے محلے کا نام تک . یاد نہیں۔ پتا نہیں کون سا شہر ہے اور نہ جانے ملک کے کون سے حصے میں ہے۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے پر یاد نہیں آیا تو پھر وہ انہیں کیسے ڈھونڈے اور کہاں ڈھونڈے۔ بشو سوچتا رہتا اور اس کے تصور میں بے شمار ہیولے بنتے بگڑتے رہتے۔ مسجد اور اس کا بلند مینار اور پانچ دروازے اور ماں، بہن۔ نہیں چاہیے مجھے یہ سب دولت، شہرت اور عزت، کچھ بھی نہیں چاہیے۔ یہ سب کچھ مجھ سے لے لو اور مجھے میری ماں اور بہن دے دو۔ ان کے سوا مجھے اور کسی شے کی تمنا نہیں مگر کون ہے جو بشو کی یہ آرزو پوری کرے؟

جوں جوں کاروبار بڑھا بشو نے وہ مکان بھی چھوڑا اور ایک خوب صورت بلڈنگ میں منتقل ہو گیا لیکن جب زمینیں خریدی گئیں تو اس کے کچھ عرصے بعد اس نے شہر کے سب سے خوب صورت علاقے میں ایک بنگلا بنوانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ خود اسے بنگلے میں رہنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ تو ایک سادہ سا آدمی تھا۔ ایک چھوٹا سا مکان ہی اس کے لیے کافی تھا لیکن جس اونچے طبقے میں وہ از خود شامل ہو گیا تھا کچھ تو اس کا تقاضا تھا اور کچھ چاچی، فریدے اور صدرالدین کا مشورہ کہ اس نے بنگلا بنوانے کا ارادہ کر لیا۔ زمین حاصل کی گئی، نقشہ بنا اور تعمیر شروع ہو گئی۔ یہ ایک بڑا بنگلا تھا۔ بہت وسیع پائیں باغ، کوئی درجن بھر کمرے، ڈرائنگ روم، لائبریری، تینوں اطراف میں وسیع برآمدے، دو ڈرائنگ روم۔ جب بنگلا تیار ہو گیا اور آرائشی کام بھی ختم ہو گیا تو بنگلے کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس دن شہر کے عمائدین، روسا اور کئی بڑے سرکاری افسر موجود تھے۔ سارا بنگلا دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسا لمحہ تھا جسے کامیابی کا نقطۂ عروج کہا جاسکتا ہے مگر یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ ان کرشموں کو دیکھ نہیں سکتے کیونکہ وہ دیدۂ بینا سے محروم ہیں۔

مہمان مسکرا مسکرا کر بشو سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ اسے مبارک باد دے رہے تھے اور اسے نیا گھر مبارک ہونے کی دعا دے رہے تھے۔ لوگ یقیناً خوش تھے، بشو بھی خوش نظر آرہا تھا کم از کم اس کے بشرے سے یہی پتا چلتا تھا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ وہ اندر سے بے حد ٹوٹا ہوا، بے حد دکھی تھا۔ اس وقت جب وہ شہر کے بڑے بڑے رئیسوں اور خوب صورت اور طرح دار خواتین کے جھرمٹ میں گھرا ہوا تھا تو اسے اپنی ماں اور بہن یاد آرہی تھیں۔ کاش وہ بھی اس وقت یہاں ہوتیں۔ اس جشن میں، مسکراہٹوں اور قہقہوں کے اس جشن میں شریک ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ سب کچھ اسے مل جاتا جس کی تمنا کوئی بھی انسان اس دنیا میں کرسکتا ہے۔

جب سارے مہمان جمع ہو گئے اور مبارک باد کے مراحل بھی طے ہو گئے تو بشو کی معیت میں وہ سب گیٹ پر آئے۔ گیٹ کے دائیں اور بائیں ستون سنگ مرمر کے تھے اور ان پر سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ بشو کی فرمائش پر شہر کے ایک بڑے عالم نے آیت کریمہ کی تلاوت کرنے کے بعد . . ایک پردہ ہٹایا۔ ستون پر ایک سنہری پلیٹ کا پردہ ہٹایا گیا۔ ویسی ہی سنہری پلیٹ تھی اور خوب صورت لفظوں میں درج تھا۔

''شیخ بشارت طاہر۔''

کسی نے پوچھا۔ ''شیخ صاحب! آپ نے بنگلے کا نام آسیہ ہاؤس کیوں رکھا ہے؟''

''کیونکہ آسیہ میری ماں کا نام تھا۔''

اس رات جب سارے مہمان چلے گئے اور بنگلے میں چاچی، فریدے اور دو چار نوکروں کے سوا کوئی نہیں رہ گیا تو شیخ بشارت طاہر کی فرمائش پر چاچی وحیدہ بیگم نے بڑے اہتمام سے سرسوں کا ساگ اور روٹی پکائی اور خاص طور پر خریدے گئے المونیم کے تسلے میں رکھ کر بشو کو کھانا دیا جو اس نے زمین پر بیٹھ کر کھایا اور برسوں کے بعد اس کھانے میں اسے وہی لذت ملی جو برسوں پہلے اس وقت ملی تھی جب چالیس گھنٹوں سے فاقے کے مارے ہوئے بشو کو زینت نے کھانا دیا تھا اور بشو اس کھانے کی لذت اور نشے کو کبھی نہیں بھول سکا تھا۔

☆☆☆

شیخ بشارت طاہر کے نجی ڈرائنگ روم میں گہری خاموشی تھی۔ اتنی گہری کہ اگر سوئی گرتی تو اس کی آواز بھی سنی جاسکتی تھی۔ لمبی چوڑی ساگوانی میز کے ایک طرف شیخ طاہر اور دوسری طرف بشیر احمد بیٹھے تھے۔ میز پر چائے کا سامان

رکھا تھا اور دو پیالیوں میں چائے بھری ہوئی تھی مگر دونوں میں سے کسی نے بھی چائے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کئی منٹ یونہی گزر گئے پھر شیخ طاہر نے طویل سانس لی اور مدھم لہجے میں بولے مگر بشیر احمد صاحب، آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟''

بشیر احمد نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ بے چین سا نظر آرہا تھا۔ جیسے اسے یہ طے کرنے میں دشواری ہو رہی ہو کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ کچھ دیر تک تذبذب کے عالم میں میز کی سطح بجانے کے بعد اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور قدرے جھکتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

''شیخ صاحب! ایک ماہ ہوا جب آپ نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا۔ اس ایک ماہ میں، میں نے ہزاروں میل کا سفر کیا ہے۔ ان گنت چھوٹے موٹے شہروں میں گیا ہوں، کسی ایسی مسجد کی تلاش میں، جس کا صرف ایک مینار اور پانچ دروازے ہوں، آسان بھی ہوسکتی ہے اور مشکل بھی۔ بدقسمتی سے اس معاملے میں یہ تلاش خاصی وقت طلب ثابت ہوئی کیونکہ مجھے گلیوں کی بناوٹ اور کچھ دوسری باتوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ آپ کی یادداشت میں کئی باتیں غلط ملط ہو گئی تھیں۔ اس بنا پر بھی مجھے بڑی دشواری ہوئی لیکن میری یہ عادت ہے کہ جب بھی کسی کام کو ہاتھ میں لیتا ہوں، اسے تکمیل تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں چنانچہ اس معاملے میں بھی میں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ شیخ صاحب، قصہ یہ ہے کہ اس دوران اخبارات برابر میری نظر سے گزرتے رہے جن سے مجھے پتا چلا کہ آپ نے ایک بڑی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی ہے اور آنے والے انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یہ بھی قیاس آرائی ہو رہی ہے کہ پارٹی آپ کو عنقریب وزیراعلیٰ کے طور پر نامزد کرے گی اور آپ اسی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیں گے۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں یہ سچ ہے۔'' شیخ طاہر نے الجھ کر کہا۔ ''مگر ابھی آپ نے کہا تھا کہ میں اپنے بچپن کے گھر، ماں، بہن اور زینت کی تلاش کو اگر ترک نہ کروں تو کم از کم کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دوں۔ آخر اس بات کا میرے الیکشن میں حصہ لینے یا نہ لینے سے کیا تعلق ہے؟''

''شیخ صاحب، مجھے یہ بات کس طرح کہنی چاہیے، یہ میں نہیں جانتا۔ تاہم کوشش کرتا ہوں۔'' بشیر احمد نے کہنا شروع کیا۔ ''بات یہ ہے۔ شیخ صاحب کہ آپ کی شخصیت کوئی معمولی نہیں۔ آپ ایک ممتاز سماجی مرتبے کے مالک ہیں۔ گزشتہ ان گنت برسوں میں آپ نے اس شہر کے بے شمار غریب اور دکھی لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب بھی کر رہے ہیں اور یہ طے ہے کہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور شاید آپ نے اسی نیت سے وزیراعلیٰ بننا قبول کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اس شہر میں ایک خاص عزت اور احترام کے مالک ہیں اور مجھے خوف یہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی ماں، بہن اور زینت کی تلاش آپ کے مستقبل کے لیے ضرر رساں ثابت ہو۔''

شیخ طاہر نے پرسوز نظروں سے بشیر احمد کو گھورا۔ ''میں سمجھا نہیں کہ آپ کے خوف کا سبب کیا ہے؟ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ ان کے ملنے سے میری نیک نامی کو نقصان پہنچے گا، میں الیکشن ہار جاؤں گا، آج جو نظریں مجھے احترام سے دیکھتی ہیں، حقارت سے دیکھنے لگیں گی تو آپ کا خیال بے شک درست ہے مگر آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔''

بشیر احمد نے تجسس آمیز نظروں سے شیخ طاہر کی طرف دیکھا۔

شیخ طاہر کے چہرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ ان کے اعصاب کشیدہ ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر جو ہلچل مچی ہوئی تھی، ان کے ہاتھوں، ہونٹوں اور آنکھوں کی ایک ایک حرکت سے اس کا اظہار ہو رہا تھا۔ انہوں نے بشیر احمد کو قریب قریب گھورتے ہوئے کہا۔ ''بشیر صاحب! یہاں، اس سینے کے اندر ایک دل ہے۔ اس دل کے اپنے کچھ اصول ہیں۔ کچھ اپنے معیار اور پیمانے ہیں اور یہ دل باہر کے کسی اصول، کسی پیمانے کو نہیں مانتا، نہ کسی لالچ، مصلحت اور خوف کو خاطر میں لاتا ہے لہٰذا آپ میرے مستقبل کی فکر نہ کریں۔ یہ بتائیں کہ آپ نے انہیں تلاش کرلیا ہے؟''

''میں نے آپ کا گھر ڈھونڈ لیا ہے۔''

''اچھا۔'' شیخ طاہر یکایک آگے جھک گئے اور میز کے کنارے کو انہوں نے زور سے پکڑ لیا۔ ''کہاں ہے میرا گھر؟''

''ایک چھوٹا سا شہر ہے کچھ ایسا زیادہ معروف نہیں، یہاں سے بہت دور ہے۔''

''اور میری ماں؟''

بشیر احمد نے دفعتاً زور سے سانس لی اور گردن جھکا کر مدھم آواز میں جواب دیا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ شیخ صاحب! آپ کی ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

شیخ طاہر کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی آواز نکلی جو

واضح نہیں تھی۔ آیا وہ شخص ایک سسکی تھی یا انہوں نے کچھ کہا تھا پھر وہ پیچھے سرک کر بیٹھ گئے اور کچھ اس طرح بشیر احمد کی طرف دیکھنے لگے جیسے دور کہیں خلا میں دیکھ رہے ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھالنے میں انہیں کئی منٹ لگ گئے پھر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور آہستہ سے کہا۔ ''اور میری بہن؟''

''وہ اب وہاں نہیں رہتی۔'' بشیر احمد نے جواب دیا۔ ''اپنی تحقیق کے نتیجے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی دس بارہ سال ہوئے جب آپ کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت آپ کی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد آپ کی بہن اپنے شوہر کے ساتھ نہ صرف مکان بلکہ شہر ہی چھوڑ کر کہیں چلی گئی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تنگدستی کے باعث آپ کی بہن کی شادی ایک بوڑھے آدمی سے ہوئی تھی جس کی پہلی بیوی مر چکی تھی......''

چند لمحے چپ رہ کر شیخ طاہر نے پوچھا۔ ''اور زینت کے بارے میں آپ نے کیا معلوم کیا؟''

''شیخ صاحب، زینت کی تلاش کچھ آسان بات نہیں۔ اب اس بات کو چوبیس سال گزر گئے ہیں جب وہ چھوٹے چودھری کے ساتھ گئی تھی۔ میں چھوٹے چودھری کی زمینوں پر گیا تھا۔ بڑی چھان بین کے بعد یہ معلوم ہوا کہ زینت کوئی پانچ سال چھوٹے چودھری کے پاس رہی تھی پھر وہاں سے چلی گئی۔ خود گئی یا چودھری نے اسے نکال دیا۔ یہ مجھے نہیں معلوم ہو سکا۔ اس باب میں مختلف لوگوں کے مختلف بیان تھے مگر ایک بات طے ہے کہ وہ اس شہر میں نہیں آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس دوران اس کی چاچی اور بڑی آپا یہاں سے کہیں اور چلی گئی تھیں چنانچہ زینت بھی کہیں اور چلی گئی۔'' بشیر احمد ذرا رکا، غور سے شیخ طاہر کو دیکھا پھر نرم لہجے میں اس نے پوچھا۔ ''شیخ صاحب! آپ کی ماں اور بہن کی بات تو خیر ٹھیک ہے لیکن آپ زینت کو کیوں تلاش کرنا چاہتے ہیں؟''

شیخ طاہر اٹھ کھڑے ہوئے اور سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ان کی ایک ایک حرکت سے عیاں تھا کہ ان کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ ان آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز میں تھرتھراہٹ۔

''بشیر احمد!'' وہ کہہ رہے تھے۔ ''اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ کو میرے دل میں جھانکنا ہوگا، میرے احساسات کو پرکھنا ہوگا میرے دکھ اور اس کے ردعمل کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو پورے انتیس، تیس سال تک احساس کی سولی پر مصلوب رہا ہو۔ ہر آدمی شاید نہ سمجھ سکے۔ آپ پہلے آدمی ہیں جس کے سامنے میں نے اپنے چہرے کے کئی نقاب اٹھائے ہیں بہتر ہوگا کہ میں پوری کہانی ہی آپ کو سنا دوں۔ اس طرح غالباً آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔'' شیخ صاحب ٹہلتے رہے اور کہتے رہے اور ان کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آواز کمرے کے نیم روشن، نیم تاریک ماحول میں اس طرح گونج رہی جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی ہو۔ ان کی آواز ایک تصویر بنا رہی تھی جو دھندلی لیکن دھیرے دھیرے واضح ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے دائرے اور خطوط ابھر رہے تھے۔ ایک ویران سی سڑک پر ایک اجاڑ سا گودام ہے جس کی چھت گر چکی تھی۔ گودام سے کچھ فاصلے پر ایک گلی ہے۔ گلی کے اندر کہیں ایک مسجد ہے جس کا صرف ایک مینار نظر آ رہا ہے۔ جو بہت بلند ہے۔ گودام کے کھلے در میں ایک سات سالہ لڑکا ربر کی گیند سے کھیل رہا تھا۔ تبھی ایک آدمی یکایک وہاں آتا ہے۔ وہ لڑکے سے کچھ باتیں کرتا ہے پھر لڑکے کو کچھ ٹافیاں دیتا ہے اور اسے سائیکل پر بٹھا کر سیر کروانے کی پیشکش کرتا ہے۔ لڑکے کے انداز سے گو جھجک کا اظہار ہو رہا ہے مگر وہ سائیکل پر بیٹھ جاتا ہے اور سائیکل ایک جانب روانہ ہو جاتی ہے۔ یہ ایک منظر ہے جو دھیرے دھیرے بنا ہے پھر معدوم ہو جاتا ہے۔ اب شیخ طاہر کے الفاظ سے ایک منظر بنتا ہے...... ایک اجاڑ سا گھر ہے۔ گھر کے اردگرد جھاڑیوں سے اٹے ہوئے میدان ہیں یا پھر کہیں کہیں کھیت ہیں، آبادی کوئی نہیں، گاؤں وہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔ اس گھر میں اس لڑکے کے علاوہ دو مرد ہیں۔ بادشاہ اور کمبن اور ایک عورت ہے رحتاں، دو بچے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور بھی ہیں۔ جو مختلف مقامات سے بہکا کر یا اغوا کر کے لائے گئے ہیں۔ دراصل بادشاہ، کمبن اور رحتاں کا پیشہ ہی یہ ہے کہ وہ چھوٹے بچوں کو اٹھا لاتے ہیں۔ ان کو طرح طرح سے اذیت پہنچاتے ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو ان میں دو ایک جسمانی عیب پیدا کر دیتے ہیں اور پھر ان سے بھیک منگواتے ہیں یا چوری کرواتے ہیں۔ اگر لڑکی ہو تو اسے تیرہ چودہ سال کی عمر تک حفاظت سے پالتے ہیں اور پھر کسی بدقماش قسم کے زمین دار کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ نیا آنے والا لڑکا جو بشو کے سوا اور کوئی نہیں تھا بہت خوف زدہ تھا۔ وہ روتا ہے اور کئی بار بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اسے طرح طرح سے زد و کوب کیا جاتا ہے، اذیتیں دی جاتی ہیں اور یہ اس مار پیٹ اور خوف و دہشت کا

ہی نتیجہ ہے کہ اس کی یادداشت مجروح ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے شہر کا نام پتا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ بچپن کے سارے منظر اس کی یادداشت میں دھندلے ہو جاتے ہیں۔ اسی خوف و ہراس اور کرب و اذیت کے عالم میں چار سال گزر جاتے ہیں۔ یہ دوسرا منظر تھا۔ اب تیسرا منظر شروع ہوتا ہے جو چھوٹے چھوٹے کئی ٹکڑوں میں ہے۔ شیخ طاہر کمرے میں ٹہل رہے ہیں اور ان کی آواز اگلے مناظر کو بیان کر رہی ہے۔

کمبن کی لاش کا منظر پھر بشو کے فرار ہونے کا منظر پھر اس کا مال گاڑی میں سوار ہونا، اب وہ بڑے شہر میں پہنچ گیا ہے اور سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکتا پھر رہا ہے پھر بازار حسن میں بھوکا پیاسا بند دکان کے پھٹے پر نیم غشی کی حالت میں پڑا ہے اور زینت اس سے پوچھ رہی ہے۔

''اے کون ہو تم، کیا نام ہے تمہارا؟''

شیخ طاہر یکایک چپ ہو گئے اور یکایک کمرے میں اتنا گہرا سکوت چھا گیا کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سنی جا سکتی تھی پھر شیخ طاہر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے اور خالی خالی نظروں سے میز کی سطح کو گھورنے لگے۔ دونوں خاموش بیٹھے اور گزرتے لمحوں کی ماتمی چاپ کو سن رہے تھے۔ کچھ دیر اسی کیفیت میں گزری پھر آخرکار شیخ طاہر نے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھیں خشک کیں اور تھکی ہوئی آواز میں کہنے لگے۔

''بشیر صاحب! یہ ہے پوری کہانی اور یہ ایسی کہانی ہے کہ آپ نے شاید پہلے نہ سنی ہو۔ اس سے آپ میرے احساسات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ماں اور بہن کی طرح زینت بھی میرے لیے ایک ناگزیر حیثیت رکھتی ہے حالانکہ خود مجھے نہیں معلوم کہ اگر زینت مل جائے تو میں کیا کروں گا لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ ایک بار وہ مجھے مل جائے۔ جب وہ چھوٹے چودھری کے ساتھ گئی تھی تو میں لاشعوری طور پر ہر وقت اس کا منتظر رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ چھوٹے چودھری کے ہاں سے ایک دن وہ ضرور واپس آئے گی۔ اسی لیے میں کئی بار اس بازار میں بھی گیا مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا حتیٰ کہ چھ سال گزر گئے۔ زینت کی بڑی آپا اور چاچی اس شہر کو چھوڑ کر کہیں چلی گئیں پھر میں ایک بار چھوٹے چودھری کی زمینوں پر گیا مگر جیسا کہ آپ نے بیان کیا، زینت اس وقت وہاں سے جا چکی تھی۔ اس کے بعد میں نے اپنے طور پر مختلف ذرائع سے اپنی بہن، ماں اور زینت کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی۔ اخباروں میں اشتہارات بھی دیے مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی پھر میں نے چاہا کہ انہیں بھول جاؤں اور صبر کر لوں تاہم یہ بھی ناممکن ثابت ہوا۔ مجھے ماں، بہن اور زینت کے تصور سے کبھی چھٹکارا نہ مل سکا۔ ان تمام برسوں میں، میں انہیں یاد کرتا رہا ہوں اور انہیں پانے کی تمنا کرتا رہا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں انہیں کہاں اور کیسے تلاش کروں پھر ایک دن اتفاق سے صدرالدین صاحب نے آپ کا ذکر کیا، تب مجھے خیال آیا کہ شاید آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں۔''

بشیر احمد نے پیالی اٹھائی اور ٹھنڈی چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''مجھے آپ کی اس اذیت ناک اور دکھ بھری کہانی کا کوئی علم نہیں تھا لیکن یقین مانیے، آج میں نے یہ کہانی سنی ہے تو میرے دل میں آپ کی عزت گھٹی نہیں اور بڑھ گئی ہے۔''

شیخ طاہر کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''بشیر صاحب!'' وہ سر ہلا کے کہنے لگے۔ ''یقیناً یہ باتیں آپ کو عجیب سی لگیں گی مگر صورت یہ ہے کہ اب میں چالیس برس کا ہو چکا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں شادی کیوں نہیں کرتا۔ چاچی وحیدہ بیگم بھی دن رات اصرار کرتی ہیں اور میں خود بھی چاہتا ہوں کہ شادی کر لوں۔ میرے اردگرد اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوب صورت اور دولت مند عورتوں کا ایک ہجوم موجود ہے اور میں جس سے بھی چاہوں شادی کر سکتا ہوں لیکن ان میں سے کسی کو بھی جب میں اپنے تصور میں بیوی کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو فوراً زینت یاد آ جاتی ہے۔ ایک ندامت سی گھیر لیتی ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نہ صرف زینت کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ بھی دھوکا کر رہا ہوں۔ گو یہ بات عجیب ہے، مگر میں کیا کروں اپنے احساس کے حصار سے نکلنا میرے لیے ناممکن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار...... ہاں صرف ایک بار زینت مجھے مل جائے تو شاید مجھے اس خلش سے نجات مل جائے اور شاید میں اس قابل ہو سکوں کہ کوئی فیصلہ کر سکوں۔''

''میں سمجھتا ہوں.... شیخ صاحب! میں سمجھتا ہوں۔'' بشیر احمد نے سر ہلا کر کہا۔ ''میرا مقصد تو صرف یہ تھا کہ اگر آپ اس ارادے کو الیکشن تک ملتوی کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اگرچہ اس سارے قصے سے میرے اور آپ کے علاوہ کوئی بھی واقف نہیں لیکن فرض کیجیے......''

''میں فرض نہیں کر سکتا۔'' شیخ طاہر نے بے حد مضطرب ہو کر کہا۔ ''اور نہ ہی مزید انتظار کر سکتا ہوں۔ اگر

آپ نے میرا گھر تلاش کرلیا ہے تو میں فوراً وہاں چلنا چاہتا ہوں۔"

بشیر احمد نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا، چند لمحے شیخ طاہر کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے کچھ ایسا اظہار ہوتا تھا جیسے دل ہی دل میں شیخ طاہر کو داد دے رہا ہو پھر اس نے طویل سانس لے کر کہا۔

"اچھی بات ہے شیخ صاحب، اب تو خیر رات ہو چکی ہے ہم کل صبح چلیں گے۔"

"کل نہیں۔" شیخ طاہر اور زیادہ بے چین ہو کر بولے۔ "میں صرف آج پر یقین رکھتا ہوں لہٰذا ہم آج ہی چلیں گے، ابھی اور اسی وقت......"

دس منٹ بعد شیخ طاہر کی لمبی سیاہ کار بنگلے سے باہر نکلی جسے وہ خود ہی چلا رہے تھے۔ بشیر احمد ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کار دائیں طرف مڑی اور رات کے اندھیرے میں آگے بڑھنے لگی۔ ٹھیک اسی وقت بائیں جانب، بنگلے سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر ایستادہ ایک گھنے درخت کی آڑ سے ایک شخص نکلا اور لپک کر سرمئی رنگ کی ایک پرانی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ دوسرے لمحے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شیخ طاہر کی کار کے پیچھے چل پڑا۔

☆☆☆

وہ ایک قدیم طرز کا بازار تھا۔ لکھوری اینٹوں والی سڑک دونوں طرف خستہ حال دکانیں، کہیں ریڑھے اور کھوکھے۔ شیخ طاہر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے، ہراساں، متجسس، مضطرب، کشاکش میں مبتلا۔ یہ کیا ہے، یہ سب کیا ہے؟ یہ دکانیں، یہ آتے جاتے لوگ، گھنے درخت اور خوانچے والوں کی آوازیں، کیا وہ اس پورے منظر کو پہچانتے ہیں؟ کیا وہ کبھی اس بازار سے گزرے ہیں؟ ہاں شاید گزرے ہیں کیونکہ یہ منظر کچھ کچھ شناسا سا محسوس ہوتا ہے۔ یہ بھینسوں کا باڑا لگتا ہے کہ پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس کے بعد ایک پرانا مندر ہوگا جو ہمیشہ بند رہتا تھا، کیونکہ وہاں پوجا پاٹ کے لیے کوئی نہیں آتا تھا۔ پھر آگے جا کر یہ سڑک ایک جگہ ختم ہوگی جہاں برگد کا ایک پرانا اور گھنا درخت ہوگا۔ شیخ طاہر سوچتے رہے اور آگے قدم بڑھاتے رہے۔ پھر سڑک ختم ہوئی اور یکایک برگد کا درخت سامنے آگیا۔

'اب کیا کریں'...... شدید اضطراب اور تذبذب کے عالم میں شیخ طاہر نے سوچا، دائیں طرف چلیں یا بائیں طرف چلیں؟ نہیں نہیں، دائیں طرف ہی چلنا چاہیے۔ یہ سڑک کچھ مانوس سی لگتی ہے۔ شاید اس طرف ایک پرانا سینما گھر ہوگا اور پھر کافی آگے جا کر وہ گودام آنا چاہیے، جہاں میں گیند سے کھیل رہا تھا۔ بشرطیکہ وہ اب بھی موجود ہو۔ شیخ طاہر نے دل ہی دل میں طے کیا اور پھر آگے بڑھے۔

یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جو قریب ترین بڑے شہر سے کوئی ستر میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ شیخ طاہر کو اس شہر تک پہنچنے کے لیے ساری رات سفر کرنا پڑا تھا۔ اگر راستے میں پیٹرول ختم نہ ہوتا اور جگہ جگہ سڑکیں حد درجہ خراب نہ ہوتیں تو وہ صبح چھ سات بجے ہی پہنچ گئے ہوتے مگر مذکورہ دونوں دشواریوں کی بنا پر انہیں شہر تک پہنچتے پہنچتے دس ساڑھے دس بج گئے تھے۔ بشیر احمد انہیں خود ان کے گھر تک لے جانا چاہتا تھا مگر شیخ طاہر نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنا راستہ خود تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ بشیر احمد ان کے احساسات کو بخوبی سمجھتا تھا لہٰذا اس نے اصرار نہیں کیا۔ لاریوں کے اڈے کے پاس ہی ٹھہر گیا۔ البتہ اس نے یہ تاکید ضرور کر دی تھی کہ اگر شیخ طاہر کو ذرا بھی دشواری ہو تو وہ فوراً اس کے پاس واپس آجائیں۔

شیخ طاہر آگے بڑھتے گئے۔ ان کا ایک ایک قدم کچھ اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے وہ خواب میں چل رہے ہوں مگر ان کی یادداشت دھیرے دھیرے لوٹ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس سڑک کے مختلف حصوں کو پہچان رہے تھے۔ کچھ آگے بڑھے تو وہ سینما آگیا۔ اس کی عمارت ابھی تک پہلے ہی کی طرح خستہ حالت میں تھی اور اس میں کوئی پرانی فلم دکھائی جارہی تھی۔ سینما کو دیکھ کر شیخ طاہر کو ایک عجیب سی طمانیت اور مسرت محسوس ہوئی۔ اس بچے کی طرح جو امتحان میں پہلی بار کامیاب ہوا ہو۔ وہ چند سیکنڈ سینما کی عمارت کو دیکھتے رہے، پھر انہوں نے قدم آگے بڑھایا۔ کوئی ایک فرلانگ آگے جا کر ایک پرانا کنواں تھا۔ اس کی جگہ کے قریب ایک بوڑھا خستہ حال فقیر بیٹھا تھا۔ شیخ طاہر نے اسے عبرت آمیز نظروں سے دیکھا۔ فقیر کی حالت بے حد قابل رحم اور گھناؤنی تھی۔ اس کی ایک آنکھ غالباً کسی بیماری کے سبب ختم ہوگئی تھی۔ بدن پر کئی زخم تھے۔ وہ ایک بوسیدہ اور انتہائی گندی گدڑی اوڑھے ہوئے تھا۔ شیخ طاہر کو متوجہ پا کر اچانک اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بابو، اللہ کے نام پر کچھ دے دو، کل سے بھوکا ہوں۔"

شیخ طاہر نے ایک روپیا نکال کر اس کے پھیلے ہوئے

رعشہ زدہ ہاتھ پر رکھا اور آگے بڑھ گئے۔

مگر ابھی وہ دس قدم ہی گئے تھے کہ یکایک اس طرح رک گئے جیسے زمین نے ان کے قدم پکڑ لیے ہوں۔ ان کے اعصاب میں ایک شدید سنسناہٹ سی ہوئی، دل زور سے دھڑکا۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا، شاید انہیں دھوکا ہوا ہے، مگر کیوں نہیں ہوسکتا۔ زندگی اتفاقات سے بھری پڑی ہے اور ان کی زندگی میں تو یوں بھی بے شمار اتفاقات ہوتے رہے ہیں۔ عجیب و غریب، ناقابل فہم، تو پھر یہ بھی ہوسکتا ہے۔ شیخ طاہر پلٹے، دھیرے دھیرے قدم اٹھائے اور فقیر کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ فقیر انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

شیخ طاہر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گئے۔ بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا۔ "تم...... تم کبن ہو نا؟"

فقیر نے چونک کر شیخ طاہر کو دیکھا، پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم کون ہو بابو؟"

"میری بات کا جواب دو، تمہارا نام کبن ہے نا؟"

"بابو میں کون ہوں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے......"

فقیر سر ہلا کر کہنے لگا...... "اب تو میں اپاہج فقیر ہوں۔ سب کچھ چلا گیا، کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اب یہاں پڑا رہتا ہوں۔ کچھ مل جاتا ہے تو کھا لیتا ہوں۔ ایک دن مر جاؤں گا، مگر تم کون ہو، تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

شیخ طاہر اسے نفرت انگیز اور کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تو یہ ہے اس شخص کا انجام، جس نے مجھے میری ماں سے محروم کیا تھا جس نے مجھ پر ان گنت ظلم توڑے تھے، فاقے کرائے تھے اور اذیتیں دی تھیں اور یہ سارے ستم صرف مجھ پر ہی نہیں اور بھی کتنے بچوں پر کیے تھے۔ کیسی اکڑ تھی اس کی گردن میں اور کیسا گھمنڈ تھا اس کی آواز میں مگر اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ سب کچھ مٹ گیا۔ اب یہ ایک تصویر عبرت ہے، ایک عذاب ہے، ایک سزا ہے، ایک گالی ہے۔ وقت کبھی کسی کو معاف نہیں کرتا، گن گن کر ایک ایک گناہ کا حساب لے لیتا ہے۔ اب یہ شخص جب تک جیے گا، اپنے جرموں کی سزا کے طور پر جیے گا۔ شیخ طاہر کو نفرت کے ساتھ ساتھ ایک بے نام سا ترحم بھی محسوس ہوا۔ انہوں نے دھیرے سے سانس لے کر کہا۔

"اور بادشاہ اور رحتاں کہاں ہیں؟"

کبن ایک بار پھر زور سے چونکا۔ "تم انہیں بھی جانتے ہو؟"

"ہاں......"

کبن چند لمحے چپ رہا اور اپنی واحد دھندلائی ہوئی آنکھ سے شیخ طاہر کو دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔ "دونوں مر گئے بابو، دونوں مر گئے۔ رحتاں کو بادشاہ نے قتل کر دیا تھا۔ اسے عمر قید ہوگئی، لیکن وہ جیل سے واپس نہیں آیا، وہیں مر گیا۔ اس کی لاش پر کوئی رونے والا بھی نہیں تھا۔ میری لاش پر بھی کوئی نہیں روئے گا، مگر تم کون ہو، بتاتے کیوں نہیں، مجھے کیسے جانتے ہو؟"

اس سے شیخ طاہر کے احساسات کچھ ناقابل بیان سے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کہیں، کیا کریں۔ کبھی ان کے رگ و پے میں ایک آتشیں لہر سی اٹھتی۔ نفرت، حقارت اور انتقام کے زہر سے بھری ہوئی، کبھی انہیں ترس آتا۔ وقت نے پہلے ہی کبن کو بہت سزا دے دی تھی۔ انہوں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "تمہیں یاد ہے کبن! ایک دن تم نشے میں تھے۔ تب تمہارے سر پر ایک لڑکے نے سلاخ سے وار کیا تھا اور تم......"

کبن یکایک ہکا بکا بولا۔ "تو...... تو کیا تم بشو ہو؟"

شیخ طاہر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ اس دن تم مر گئے تھے۔"

"مر ہی گیا ہوتا بابو تو اچھا تھا، نہ اور جیتا، نہ اور زیادہ گناہ کرتا اور نہ ہی یہ سزا ملتی۔"

شیخ طاہر چند ثانیے چپ رہے، پھر انہوں نے کہا۔ "اچھی بات ہے کبن! گو کہ تم نے مجھ پر بہت ظلم کیے تھے، لیکن میں تمہیں معاف کرتا ہوں اور خدا سے دعا کروں گا کہ وہ بھی تمہیں معاف کردے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ عجیب دن تھا۔ ایسا کہ ایسے دن بہت کم لوگوں کی زندگی میں آتے ہیں۔ پتا نہیں قسمت کی دیوی ان پر مہربان تھی، یا نامہربان، ان کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی تھی یا نمک چھڑک رہی تھی۔ اس دن قسمت کی دیوی نے شاید طے کرلیا تھا کہ سارے پردے اٹھا دے گی اور کوئی بھی راز باقی نہیں رہے گا۔ جب شیخ طاہر آگے گئے تو انہیں اپنی گلی ملی۔ البتہ گودام نہیں تھا۔ اس کی جگہ اب ایک عمارت بن گئی تھی۔ شیخ طاہر دیوانوں کی طرح اپنی گلی میں گھومتے رہے۔ اپنے گھر کو باہر سے دیکھا جہاں اب جامن کا درخت نہیں تھا اور مکان میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوگئی تھیں۔ پھر انہوں نے مسجد دیکھی۔ اس کا خوب صورت مینار اسی طرح پرشکوہ انداز میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ پانچوں دروازے بھی موجود تھے اور درمیانی دروازے کے اوپر سورۃ رحمٰن بھی نقش تھی۔

انہوں نے سورۂ رحمٰن پڑھی اور واپس ہوئے۔ گلی میں آتے جاتے کئی لوگوں نے انہیں غور سے دیکھا مگر انہوں نے کسی سے کچھ پوچھا نہیں۔ فائدہ بھی کیا تھا چنانچہ جس طرح چپ چاپ گئے تھے، اسی طرح پلٹ آئے۔ بشیر احمد کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ شیخ طاہر نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اب آپ مجھے میری بہن کے پاس لے چلیں۔''

''بہن کے پاس، مگر میں نے تو آپ سے کہا تھا......''

''جی ہاں، مجھے معلوم ہے، آپ نے کیا کہا تھا۔'' شیخ طاہر نے بات کاٹ کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''مگر میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ آپ سچ نہیں کہہ رہے ہیں۔ ورنہ آپ کو میرے مستقبل اور انتخابات کی اتنی فکر نہ ہوتی اور پھر شاید اس لیے بھی کہ آپ میرا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن بشیر صاحب، اگر آپ مجھے میری بہن کے پاس نہیں لے جائیں گے تو یقین کیجیے، زیادہ دل دکھائیں گے۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکے، پھر انہوں نے اضافہ کیا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے نہ صرف میری بہن کو ہی تلاش کرلیا ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ زینت کو بھی ڈھونڈ لیا ہو۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

بشیر احمد نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا جیب سے سگریٹ نکالی۔ ''شیخ صاحب!'' آخرکار اس نے کہا...... ''اگر آپ یوں چاہتے ہیں تو یونہی سہی، مگر پہلے میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔''

''لیکن میں کوئی کہانی نہیں سننا چاہتا۔'' شیخ طاہر نے الجھ کر کہا۔

''مگر یہ کہانی تو آپ کو سننا پڑے گی کیونکہ اس کا بلاواسطہ تعلق آپ کی اس تلاش و جستجو سے ہے، جس میں آپ برسوں سے مبتلا ہیں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ درمیان میں نہ بولیں۔ چپ رہیں اور سنتے رہیں۔ شیخ صاحب، یہ کہانی بڑی المناک اور بڑی سنگدل ہے۔ اسے سن کر احساس ہوتا ہے کہ زندگی کبھی کبھی کتنی بے مہر اور سنگدل اور کبھی کبھی کتنی ذلیل ہوسکتی ہے۔ میں جب آپ کی بہن نازیہ سے ملا اور اس کی کہانی سنی تو مجھے خود اپنے آپ سے اور اپنی زندگی سے نفرت ہوگئی۔ میں نے سوچا، کاش آپ نے یہ کام میرے سپرد نہ کیا ہوتا تو کیا ہرج تھا۔ مگر خیر، میں آپ کو پوری کہانی سناتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ کا گھر نہیں ملا تھا بلکہ اس کا پتا مجھے آپ کی بہن نازیہ نے بتایا تھا۔''

''کیا...... کیا......؟'' شیخ طاہر تڑپ کے بولے۔

''جی ہاں، مگر آپ بیچ میں مت بولیں، بس سنتے رہیں۔ شروع میں، میں نے آپ کا گھر ہی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی تو میں نے اپنی توجہ زینت کی طرف مبذول کی۔ میں چھوٹے چودھری کی زمینوں پر گیا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، چھوٹا چودھری کئی سال پہلے مرچکا ہے مگر ایسے کئی آدمی وہاں موجود ہیں جو زینت کے واقعے سے واقف ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ جب چھوٹے چودھری کا دل زینت سے بھر گیا تو اس نے زینت کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ اصولاً زینت کو اپنی بڑی آپا اور چاچی کے پاس جانا چاہیے تھا مگر وہ وہاں نہیں گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑی آپا اور چاچی نے ہی اسے چھوٹے چودھری کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ لہٰذا قدرتاً اسے ان دونوں سے شدید نفرت تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر وہ وہاں نہیں گئی تو پھر کہاں گئی؟ میں نے اس پر بہت غور کیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پھر میں نے سوچا کہ چونکہ اس کا تعلق بازارِ حسن سے تھا، لہٰذا بازارِ حسن سے ہی مل سکتا ہے۔ یہ ایک بڑی پریشان کن اور صبر آزما جستجو تھی مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ شہروں شہروں بھٹکتا رہا۔ طریقہ یہ تھا کہ میں ہر شہر کے بازارِ حسن میں جاتا تھا، طوائفوں سے ملتا تھا اور نہایت ہوشیاری سے ان سے زینت کے بارے میں پوچھتا تھا۔ میں یہاں یہ ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آپ نے اگر اتنا زیادہ روپیا مجھے فراہم نہ کیا ہوتا تو یہ کام میرے لیے قریب قریب ناممکن ہوتا، لیکن آپ کے دیے ہوئے روپے سے بڑی مدد ملی۔ خیر، تو اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ ایک جگہ سے زینت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ پھر مجھے دو تین دوسرے شہروں میں جانا پڑا، جہاں زینت نے کچھ وقت گزارا تھا۔ یہاں میں زینت کے شب و روز کی داستان مختصر بیان کردوں تو مناسب رہے گا۔ دراصل زینت جب چھوٹے چودھری کے یہاں سے رخصت ہوئی تو اس کا گناہ کی زندگی کی طرف دوبارہ جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ اس کوشش میں لگی رہی کہ شریفانہ زندگی گزارے لیکن کسی سہارے کے بغیر ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس نے ایک آدمی کا ہاتھ تھام لیا، اس امید پر کہ وہ بالآخر زینت سے شادی کرلے گا مگر کچھ عرصے بعد وہ شخص دھوکا دے گیا۔ بدنصیبی کہ اس عمل نے خود کو کئی بار دہرایا۔ زینت کئی شہروں میں بھٹکتی پھری، کئی لوگ اس کی زندگی میں آئے اور دھوکا دے کر نکل گئے پھر صابر نامی ایک شخص اسے ملا، جو دراصل

ایک نہایت لالچی، بے حس اور سنگ دل غنڈا تھا۔ زینت اس کے چنگل میں پھنسی تو پھر نہ نکل سکی اور اسے اپنی خواہش کے خلاف بازارِ حسن جائے بغیر اپنے پیشے کی طرف واپس لوٹنا پڑا۔ کوئی ایسا ستم نہیں ہے جو صابر نے زینت پر نہ کیا ہو۔ بھوکا رکھنا، اسے زدوکوب کرنا، پیسے پیسے کو ترسانا، یہ معمولی باتیں تھیں۔ زینت نے کئی بار صابر کے دامن سے جان چھڑانے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہیں ہوسکی۔ صابر جیسے غنڈوں سے چھٹکارا حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ پھر اس کہانی میں آپ کی بہن شامل ہوئی۔''

''میری بہن...... نازیہ...... وہ کیسے، وہ کیسے؟'' شیخ طاہر ایک دم چونک کر بولے۔

''سنتے رہیے شیخ صاحب، سنتے رہیے۔'' بشیر احمد نے جواب دیا۔ پھر سلسلۂ کلام آگے بڑھایا۔ ''زینت اب جس شہر میں مقیم ہے، وہ یہاں سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس شہر میں صابر اسے لایا تھا۔ وہ لوگ مزدوروں کے ایک محلے میں ایک خستہ حال مکان میں رہتے تھے۔ اب نازیہ کے واقعات بیان کرتا ہوں۔ جب آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا تو نازیہ بھی اتفاق سے اپنے شوہر کے ساتھ اسی شہر میں پہنچی۔ اس کی زندگی کے کئی سال نہایت کسمپرسی اور عسرت میں گزرے۔ نازیہ کے شوہر کے ملنے والوں میں ایک شخص عبدل شامل تھا جو اکثر گھر آتا جاتا تھا۔ جب نازیہ کے شوہر کا انتقال ہوگیا تو عبدل نے کسی نہ کسی طور نازیہ کو راضی کرکے اس سے شادی کرلی اور یہیں سے ساری خرابی شروع ہوئی۔ یہ عبدل دراصل صابر کا بہت گہرا دوست تھا۔ دونوں مردوں کا مزاج، مصروفیات اور دلچسپیاں ایک تھیں۔ شادی کے بعد عبدل، نازیہ کو بھی صابر والے مکان میں لے گیا۔ میرا خیال ہے، مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پھر کیا ہوا ہوگا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ نازیہ نے ہرچند کہ پوری مزاحمت کی لیکن اس کے دکھ اور مجبوری کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو خود بھی ایسی مجبوری اور بے کسی سے دوچار ہوئے ہوں۔ ایک طرف ایک تنہا کمزور عورت تھی اور دوسری طرف دو لالچی اور انتہائی کمینہ خصلت غنڈے۔ انجامِ کار نازیہ ہار گئی اور اسے بھی اسی راستے پر چلنا پڑا جس پر زینت چل رہی تھی۔ شیخ صاحب، گو یہ بڑی ہی عجیب بات ہے کہ جن دو عورتوں کو پانے کے لیے آپ برسوں سے بے چین تھے اور جو ایک دوسرے سے قطعاً واقف نہیں تھیں، قسمت کے ایک ناقابلِ یقین اتفاق نے انہیں ایک ہی جگہ اکٹھا کردیا تھا مگر ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا میں اس سے بھی زیادہ بعید از عقل واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ بہرحال اب میں قصہ مختصر کرتا ہوں۔ نازیہ اور زینت ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہ رہی تھیں اور ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھیں اور وقت جس کا ایک ایک لمحہ دونوں پر بھاری تھا، رفتہ رفتہ گزر رہا تھا۔ حتیٰ کہ کئی سال گزر گئے۔ پھر حالات نے ایک اور کروٹ لی۔ ایک رات صابر نے عبدل کو چاقو مار دیا۔ عبدل مرگیا اور صابر کو عمر قید ہوگئی۔'' بشیر احمد ایک منٹ کے لیے رکا۔ ''تو یہ ہے پوری داستان شیخ صاحب! جب میں زینت کو تلاش کرتا ہوا اس کے گھر پہنچا تو بالکل خوش نہیں ہوا تھا، آپ بھی نہیں ہوں گے کیونکہ آپ نے بربادی و حسرت کی ایسی تصویریں کبھی نہیں دیکھی ہوں گی، جیسی وہ دونوں ہیں۔ اب وہ تنہا رہتی ہیں۔ نازیہ سلائی کرکے کچھ کمالیتی ہے جو ان کے گزارے کا ذریعہ ہے۔ زینت بیمار ہے، کینسر کا موذی مرض اسے لاحق ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ موت کے دروازے پر کھڑی ہے۔ شاید چند روز سے زیادہ نہیں جیے گی۔ کوئی چھ ماہ پہلے ڈاکٹروں نے اسے بتایا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہے گی مگر ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک سال بھی شاید اس کی قسمت میں نہیں......'' بشیر احمد یکایک چپ ہوگیا۔

شیخ طاہر کئی منٹ تک گردن جھکائے بیٹھے رہے پھر انہوں نے سر اٹھایا، آنکھیں پونچھیں اور زور سے سانس لے کر کہا۔ ''بشیر صاحب! میں وہاں لاکھوں کما رہا تھا اور میری مجبور بہن یہاں اپنی عزت بیچ رہی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے یہ۔''

''جی ہاں۔'' بشیر احمد نے سر ہلایا۔ ''اتفاقات کا اس سے زیادہ ظالمانہ ستم اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

''اچھا، اب آپ چلیے۔''

بشیر احمد نے ڈرائیونگ سیٹ پر آکر گاڑی اسٹارٹ کردی۔

☆☆☆

کمرے میں خاموشی تھی، دلوں میں خاموشی تھی، روحوں میں خاموشی تھی اور باہر زمین سے آسمان تک، کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خاموشی ہی خاموشی تھی۔ شیخ طاہر یوں کھڑے تھے، جیسے وہ گوشت پوست کے انسان نہیں، پتھر کے بت ہوں، حرارت و زندگی سے محروم۔ ان کی آنکھ ساکت تھی اور دل شاید دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ان کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی، گہرے

سانولے رنگ کی۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے، آنکھوں کے گرد حلقے تھے، جسم گویا ہڈیوں کا پنجر تھا اور اس کے چہرے پر دکھ درد کی اور بے کسی، بے چارگی اور ذلت و نامرادی کی ان گنت کہانیاں لکھی ہوئی تھیں، جنہیں پڑھنا شیخ طاہر کے بس کی بات نہیں تھی۔ گو وہ بڑے دولت مند تھے، بڑے جاہ و حشم والے اور بہت عزت و توقیر والے تھے لیکن اس لمحے انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان سے زیادہ بے مایہ، بے وقعت اور کنگال اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

وہ عورت نازیہ تھی، وہ اسے پہچانتے نہ تھے۔ تین سال کی تھی جب وہ اس سے جدا ہوئے تھے مگر خون کی پکار نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ ان کی بہن ہی ہے۔ نازیہ کی بھی عجیب حالت تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کا ایک بھائی ہے جو کہیں گم ہو گیا ہے مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اب وہ اتنا بڑا آدمی بن چکا ہے۔ نہ ہی اسے کبھی سپنے میں بھی یہ گمان ہوا تھا کہ وہ بھائی یوں اچانک مل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اچانک شیخ طاہر کو اپنے سامنے پا کر بے حد نروس ہو گئی تھی۔ کبھی اس کا بدن ایک دم ساکت ہو جاتا اور کبھی یوں تھرتھرانے لگتا، جیسے دوسرے لمحے وہ گر پڑے گی۔ دونوں یونہی کھڑے رہے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور لمحے گزرتے گئے۔ جانے کتنی دیر گزر گئی، شاید صدیاں بیت گئیں پھر شیخ طاہر نے ہاتھ بڑھایا، نازیہ آگے بڑھی اور شیخ طاہر کے سینے سے لگ گئی اور پھر دونوں بہن بھائی رونے لگے۔

بہت دیر بعد شیخ طاہر نے کہا۔ ”نازیہ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا تھا۔“ وہ رکے پھر بولے۔ ”اور ماں اور زینت کو بھی۔“

”ماں کا تو انتقال ہو گیا۔“ نازیہ نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

”ہاں بشیر احمد نے بتایا تھا۔“

”بھیا! میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ ہم دونوں نے، زینت اور میں نے۔ زندگی حرام ہو گئی تھی ہم دونوں پر۔“ نازیہ رو کر بولی۔

”مجھے معلوم ہے۔“ شیخ طاہر نے محبت سے نازیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”مگر ابھی کچھ نہ کہو۔ ابھی تو میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد نازیہ نے پوچھا۔ ”اور بھیا، تم زینت کو کیسے جانتے ہو؟“

”کیا کہوں؟“ شیخ طاہر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”ہم سب کی زندگی ایک ایسی ناؤ کی طرح رہی ہے نازیہ، جو اتفاقات کے شوریدہ سر سمندر میں تیز و تند لہروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ میں زینت کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میرا کوئی بھی سہارا نہیں تھا۔ اس وقت زینت نے میری طرف ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا۔ بعد میں وہ مجھ سے بچھڑ گئی، جیسے میں تم سے اور ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ پھر برسوں گزر گئے مگر اس کا کوئی پتا نہیں ملا اور اب اتنی مدت کے بعد.....“ شیخ طاہر چپ ہو گئے۔

”زینت نے بھی بڑے غم اٹھائے ہیں۔ بس ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔“ نازیہ کہنے لگی۔ ”بہت بیمار ہے وہ بچنے کی کوئی امید نہیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔“

شیخ طاہر کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ”مجھے معلوم ہے۔ بشیر احمد نے بتایا تھا، کہاں ہے وہ؟“

”اس کمرے میں، آؤ میں تمہیں لے چلوں۔“ نازیہ نے ایک بغلی دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

”نہیں، نہیں، میں خود ہی جاتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر بعد آنا۔“

”اچھا، تو میں تمہارے لیے چائے بناؤں؟“ نازیہ نے پوچھا۔

”ضرور......ضرور......“ شیخ طاہر نے کہا۔ ”آج پہلی بار تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیوں گا۔“

نازیہ صحن میں چلی گئی۔ شیخ طاہر نے اردگرد دیکھا۔ خستہ حال دیواروں اور کھپریل کی، جالوں سے بھری چھت کو دیکھا۔ وہ مکان کہاں تھا، ایک آسیب زدہ کھنڈر سا لگتا تھا۔ اس مکان کی ہر شے زبان حال سے مجبور اور تنگ دستی کی کہانیاں کہہ رہی تھی۔ شیخ طاہر کچھ دیر کھڑے رہے اور اپنے دل کو سنبھالتے رہے۔ پھر جی کڑا کر کے قدم اٹھایا، دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ چھوٹا سا کمرا تھا۔ نیم تاریک دیواروں پر برسوں سے سفیدی نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں جو سامان تھا، وہ بھی بوسیدہ تھا۔ سامنے جھلنگی سی چارپائی تھی اور چارپائی پر ایک عورت لیٹی تھی، ایک میلا سا کھیس اوڑھے ہوئے۔ اس کے خشک بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے اور گو وہ محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہی نظر آ رہی تھی اور شیخ طاہر نے اسے پورے چوبیس سال بعد دیکھا تھا پھر بھی کسی دشواری کے بغیر پہچان لیا......وہ زینت تھی۔

شیخ طاہر ایک شکستہ سی کرسی پر چارپائی کے قریب بیٹھ گئے اور زینت کو پلک جھپکائے بغیر دیکھنے لگے۔ زینت کے

چہرے پر چھائیاں تھیں...... آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے، گال پچک گئے تھے اور ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ ایک شدید گہرے دکھ اور پچھتاوے نے یکا یک شیخ طاہر کو گھیر لیا۔ خدایا، یہ کیسا ستم ہے؟ کیسی بدنصیبی ہے؟ یہ وہ عورت ہے جو ہمیشہ ان کے تصور میں بسی رہی، جس کے خیال سے وہ کبھی غافل نہ ہوسکے مگر یہ عورت اب ملی ہے تو اس حالت میں کہ زندگی سے منہ موڑنے والی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان کی ساری دولت، شہرت اور عزت لے لی جائے اور اس عورت کو زندگی کے چند سال عطا کردیے جائیں، آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

معاً زینت کو احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب بیٹھا ہے۔ اس نے گردن موڑی اور حیران نظروں سے شیخ طاہر کو دیکھنے لگی۔ ''آپ...... آپ کون ہیں......؟''

''میں۔'' شیخ طاہر نے محبت سے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں بشو ہوں زینت! یاد ہے وہ لڑکا جو پان کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا۔''

زینت کے چہرے پر الجھن کی جھلک نظر آئی۔ نقاہت نے اس کے ذہن کو دھندلا دیا تھا، اس لیے اسے سوچنا پڑا۔ پھر یکا یک اس کے چہرے پر حیرت کی ایک لہر سی چمکی۔ ''تم...... تم بشو ہو مگر تم یہاں کیسے آئے؟''

اس کا جسم معاً زور سے لرزا، ساتھ ہی اس نے اپنا سر دائیں بائیں زور زور سے ہلایا۔ شیخ طاہر کو نہ صرف افسوس ہوا بلکہ ڈر بھی لگا، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حیرت کا یہ جھٹکا زینت کے لیے ضرر رساں بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ انہیں زینت کے سامنے آنے کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا مگر شکر ہے کہ زینت اس صدمے کو سہہ گئی۔ اس نے چند لمحوں میں خود کو سنبھال لیا۔ شیخ طاہر نے اس کا سیاہ استخوانی ہاتھ اپنے .... ہاتھ میں لے لیا، پھر مدہم لہجے میں کہا۔ ''زینت! میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتا تھا۔''

''اچھا۔''

''ہاں۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں تمہیں کبھی نہیں بھولا اور میں نے تمہیں تلاش بھی بہت کیا تھا۔ برسوں اسی جستجو میں گزر گئے۔ میں چھوٹے چودھری کی زمینوں پر بھی گیا تھا، لیکن تمہارا کوئی پتا نہیں ملا۔ اب اتنے برسوں بعد تم ملی ہو۔''

''ہاں اب ملی ہوں کہ جب مرنے والی ہوں۔''

''نہیں، نہیں ایسا مت کہو۔''

زینت نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''نہ کہوں تو کیا فرق پڑے گا۔ ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا ہے۔ بس کچھ ہی سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔ شاید چند دن اور جیوں......'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ ''مگر تم تو اچھے ہو نا؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہی ہوں۔'' شیخ طاہر بڑی محبت سے کہنے لگے۔ ''اور زینت، تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں تمہیں لے چلوں گا۔ کراچی، لاہور یا لندن میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تم اچھی ہوجاؤ گی زینت، تم اچھی ہوجاؤ گی۔''

زینت کی ویران آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''ایسے محبت بھرے بولوں کے لیے میں بہت ترسی ہوں بشو۔''

شیخ طاہر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے۔ ''روؤ نہیں زینت! حوصلہ کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' پھر انہوں نے سوچا کہ اسے نازیہ کے بارے میں بتائیں لیکن ارادہ بدل دیا۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ زینت کے لیے یہ انکشاف کچھ زیادہ بھاری ثابت ہو۔ انہوں نے طے کیا کہ مناسب وقت آنے پر اسے یہ بات بتائیں گے۔ چند لمحے توقف کے بعد انہوں نے کہا...... ''زینت! یاد ہے تمہیں، میں تمہارے پان میں چار چار الائچیاں ڈالا کرتا تھا؟''

زینت کے ہونٹوں پر ایک پھیکی، پژمردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ہاں یاد ہے۔''

''اور کیا تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ کتنے برس گزر گئے ہیں، ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے؟'' شیخ طاہر نے زینت کو محبت سے دیکھا۔ ''چوبیس سال، پورے چوبیس سال۔''

زینت نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور شیخ طاہر کی جانب دیکھا۔ اس کی اندر کی جانب دھنسی ہوئی آنکھوں میں کرب بھی تھا، اذیت بھی تھی اور حسرت بھی۔ پھر وہ یکا یک رونے لگی...... ''اور تم نہیں جانتے بشو! ان چوبیس برسوں میں مجھ پر کیا گزر گئی ہے، کتنی قیامتیں، کیسے عذاب اور کتنی اذیتیں۔ زندگی ایک ایسا ناسور بن گئی جس سے ہر وقت پیپ رستی رہتی ہے۔ ایک ایک پل، ایک ایک سانس بھاری تھی۔ مرنا چاہتی تھی، پر موت بھی نہیں آتی تھی۔ نازیہ نہ ہوتی تو جانے کیا ہوتا۔ بس ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھیں، ایک دوسرے کی غم گسار تھیں۔ ہم دونوں روتی تھیں۔ پھر ایک دوسرے کے آنسو پونچھتی تھیں اور پھر روتی تھیں۔ یونہی رو رو کر اتنے برس گزر گئے۔''

شیخ طاہر نے سوچا، زینت کو چپ کرائیں، اسے تسلی دیں مگر پھر ارادہ بدل دیا یہ سوچ کر کہ...... زینت کو رونے دیں، اپنا دکھ بیان کرنے دیں۔ دل کا غبار نکل جائے گا تو اس کی طبیعت بہتر ہو جائے گی، چنانچہ وہ چپ رہے اور زینت روتی رہی اور رو رو کر کہتی گئی۔ ''بشو! میرے ماں باپ میرے بچپن میں مر گئے تھے۔ چاچی نے مجھے پالا تھا، اس بازار میں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس بازار سے اور وہاں کی ہر شے سے، ہر بات سے نفرت تھی۔ میں سوچتی تھی کہ جب میں بڑی ہوجاؤں گی تو اس ماحول سے نکل جاؤں گی۔ کسی اچھے سے آدمی کا ہاتھ پکڑ لوں گی اور شریفانہ گھریلو زندگی گزاروں گی۔ چاہے یہ زندگی کسی جھونپڑی میں ہی کیوں نہ گزرے، لیکن میں خوش رہوں گی۔ کم از کم اپنا گھر تو ہوگا، اپنی چادر، اپنی چار دیواری مگر قسمت نے میرے ساتھ بڑی دغا کی بشو۔ ابھی میں نے اچھی طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ چاچی اور بڑی آپا نے مجھے چھوٹے چودھری کے ہاتھ بیچ دیا۔ پانچ سال اس جیل میں گزارے، جو چھوٹے چودھری کی حویلی کہلاتی تھی۔ پھر اس نے مجھے نکال دیا۔ اب اتنی بڑی دنیا تھی اور ایک اکیلی میں۔ کیا کرتی، کس کا سہارا ڈھونڈتی۔ پہلے میں نے سوچا، بڑی آپا کے پاس واپس چلی جاؤں مگر یہ اچھا نہیں لگا۔ ویسے بھی وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے پھر میں ادھر ادھر بھٹکنے لگی۔ تنہا، بے آسرا اور آبلہ پا۔ اب بھی یہ خواہش تھی کہ اس بازار میں واپس نہ جانا پڑے مگر شاید یہ میرے نصیب میں ہی نہ تھا، جو بھی مجھے ملا اور جس پر بھی میں نے بھروسا کیا، وہی دھوکا دے گیا۔ زندگی یونہی محرومی، خوف اور بے کسی کے عالم میں گزری۔ پھر بیماری نے مجھے گھیر لیا۔ بشو! میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی لیکن یہ جو نازیہ ہے نا، بے چاری بڑی اچھی عورت ہے، شاید اس لیے کہ میری ہی طرح بدنصیب ہے۔ اس نے میرا بہت ساتھ دیا۔ بے چاری بیڑیاں بناتی ہے، کپڑے سیتی ہے اور میرا علاج کراتی ہے مگر کوئی فائدہ نہیں، اب وقت پورا ہوچکا ہے۔ بس گھڑیاں گن رہی ہوں۔ وہ چار دن اور ہیں۔ پھر نہ میں ہوں گی، نہ دکھ ہوں گے......'' آخری الفاظ کہتے کہتے زینت کا لہجہ حد درجہ استہزائی اور طنزیہ ہوگیا۔ جیسے وہ خود اپنے آپ پر طنز کررہی ہو۔ پھر وہ رونے لگی۔ شیخ طاہر چپ چاپ بیٹھے رہے اور ہولے ہولے زینت کا ہاتھ تھپکتے رہے۔ پھر زینت کہنے لگی۔ ''ایک بات بتاؤں بشو؟'' وہ کچھ دیر سانس لینے کے لیے رکی۔ ''پتا نہیں کیوں...... لڑکپن ہی سے مجھے دلہن بننے کا بہت ارمان تھا۔'' زینت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر ایک پھیکی مگر حسرت آمیز مسکراہٹ تھی۔ ''مگر ویسی دلہن نہیں، جیسی اس بازار والیاں آئے دن بنا کرتی تھیں۔ یا جیسی دلہن مجھے چھوٹے چودھری نے بنایا تھا بلکہ سچ مچ کی دلہن۔ ویسی ہی جیسی چادر اور چار دیواری والی شریف عورتیں بنتی ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟ ہاتھوں میں مہندی رچی ہو، ڈھیر ساری چوڑیاں، زیور، ٹیکا، جھمکے اور سرخ جوڑا۔ اور باقاعدہ میرا نکاح ہو، مگر بشو! کتنے دکھ کی بات ہے، میری یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔''

زینت پھر رونے لگی۔

شیخ طاہر ہونٹ پر ہونٹ جمائے خاموش بیٹھے تھے اور کچھ عجیب، حسرت اور دکھ سے زینت کو دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے بعد انہوں نے زینت کے آنسو پونچھے، اس کا ہاتھ تھپتھپایا پھر آہستہ سے کہا۔ ''زینت، تم آرام سے لیٹی رہو، میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر بھاری قدموں سے باہر آئے۔ صحن میں نازیہ اور بشیر احمد چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ طاہر نے بشیر احمد سے کہا۔ ''بشیر صاحب، آپ کسی طرح سے فوراً پیغام بھجوائیے اور چاچی، فریدے اور صدر الدین کو یہاں بلوائیے بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ خود جا کر انہیں لے آئیں۔''

☆☆☆

رات خوب صورت، پُرسکون اور پُرفسوں تھی۔ آسمان پر پورا چاند تھا جیسے دلہن کے ماتھے پر جگمگاتا ہوا جھومر اور اس کنارے سے اس کنارے تک ستاروں کی برات سجی تھی جیسے دلہن کی پیشانی پر چمکی ہوئی افشاں۔ ہر سو خاموشی کا طلسم طاری تھا۔ آبادیوں پر، ویرانوں پر ہوائیں چپکے چپکے محوِ خرام تھیں جیسے سہاگ رات کی سیج پر دلہن شرما کر ہولے سے انگڑائی لیتی ہے۔ اس رات زمین، آسمان، چاند اور ستارے، سب کے سب ایک خوب صورت رنگین خواب کا حصہ بن گئے تھے۔ کیونکہ اس رات، زینت دلہن بنی تھی۔ سر سے لے کر پاؤں تک، اس کے بدن کا پور پور اور انگ انگ مرصع تھا۔ اس کی پیشانی پر دمکتا ہوا جھومر تھا، کانوں میں طلائی جھمکے اور گلے میں ہفت لڑی ہار کے ساتھ منقش گلوبند۔ اور اس کی کلائیاں چوڑیوں سے اور کڑوں سے بھری ہوئی تھیں اور پاؤں میں پازیب تھی اور ہاتھوں اور پیروں میں مہندی رچی ہوئی تھی، سرخ، لپکتے، شعلۂ فروزاں کی طرح اور اس کے بدن پر لباسِ عروسی تھا، سنہری اور طلائی کام اور موتیوں سے مرصع۔ حنا رنگ اور عطر بند۔ اور اس کی

آنکھوں میں، ان آنکھوں میں جہاں برسہا برس دکھوں اور محرومیوں نے بسیرا کیا تھا۔ اور جو حزن و یاس کو سدا کے لیے حرز جاں کر چکی تھیں، انہی آنکھوں میں اس رات ایک جہان رنگ و نور آباد تھا اور ایسی طمانیت تھی ان میں، جیسے ان آنکھوں نے زندگی کو تسخیر کر لیا ہو۔

زینت نے کہا تھا۔ ”تمہیں ایک بات بتاؤں..... مجھے بڑا ارمان تھا کہ دلہن بنوں۔ ویسی ہی دلہن جیسی چادر اور چار دیواری والی نیک بیبیاں بنتی ہیں۔“

اس رات قاضی کے سامنے اس نے کہا تھا۔ ”ہاں، میں نے قبول کیا۔“

رات کے ریشمی لمحے بھیگ رہے تھے۔ چاند محو سفر تھا اور ستارے سوتے جاگتے، جاگتے سوتے پلکیں جھپک رہے تھے۔

تبھی حجلۂ عروسی میں شیخ طاہر کے سامنے بیٹھی ہوئی بیمار و ناتواں زینت نے آہستہ سے کہا۔ ”سنو! اب مجھے اپنے مرنے کا کوئی افسوس نہ ہوگا۔“

”ایسی باتیں نہیں کرتے۔“ شیخ طاہر نے محبت سے فہمائش کی۔

زینت مسکرائی۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ ”جانتے ہو، یہ رات..... یہ رات میری زندگی کا حاصل ہے۔“

دوسرے لمحے اس کی آنکھوں کے سورج ہمیشہ کے لیے تاریک ہو گئے۔

☆☆☆

شیخ طاہر جب واپس ہوئے تو ان کا عجب حال تھا۔ شکستہ، اجڑے ہوئے، ہراساں اور غمزدہ، ہر شخص کو شک کی نظر سے گھورتے۔ کبھی کبھی خود اپنے آپ سے بھی انہیں ڈر لگتا۔ اپنے ہاتھوں کو یوں گھورتے جیسے ان کے ہاتھ ہی زینت کی موت کے ذمے دار ہوں۔ گھر میں بیٹھے ہوتے تو در و دیوار انہیں تنگ و تاریک زنداں کی طرح محسوس ہوتے۔ باہر جاتے تو ہجوم سے وحشت ہونے لگتی۔ کبھی کبھی شہر سے باہر نکل جاتے اور کھیتوں کے درمیان سنسان پگڈنڈیوں پر مارے مارے پھرتے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد ویرانی اور تنہائی بھی کاٹنے کو دوڑتی۔ انہیں اپنا وجود، اپنی زندگی اور اپنی تمام دولت و عزت بالکل فضول، واہیات، لایعنی اور بے قیمت اشیا معلوم ہوتیں۔ کیا فائدہ ایسی دولت کا جو زینت کی زندگی نہ بچا سکی۔ کبھی کبھی وہ کسی گداگر کو دیکھتے تو انہیں ایسا لگتا جیسے وہ گداگر ان سے زیادہ دولت مند ہے۔ ان کا یہ غم، یہ پچھتاوا کچھ ایسا بے جا بھی نہیں تھا۔

گزشتہ چند دنوں میں وہ جن حالات اور اتفاقات سے پے در پے دو چار ہوئے تھے، انہیں سہارنے اور جھیلنے..... کے لیے پتھر کے جگر کی ضرورت تھی، جو ان کے پاس نہیں تھا۔ اپنے بچپن کے گھر کا ملنا، ماں کی موت کی خبر، پھر کبین سے ملاقات اور اس کے عبرت ناک حالات، یہ سب قیامتیں تھیں جو ان کے دل پر سے گزری تھیں۔ پھر نازیہ اور زینت کا ایک ہی جگہ ملنا، ان کی المناک زندگی کے شب و روز کی درد ناک کہانی..... وہ دولت کما رہے تھے اور عزت اور مرتبہ اور شہرت..... اور ان کی بہن عزت بیچ رہی تھی۔ خدایا..... خدایا، اس سے زیادہ ستم اور کیا ہوگا؟ اس سے زیادہ بدنصیبی اور کیا ہوگی؟ بلکہ شاید بدبختی کو بھی ان پر ترس آتا ہوگا۔ شیخ طاہر کو یقین نہ آتا کہ یہ سب کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا..... ممکن ہے یہ سب خواب ہو۔ ہاں ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی خواب ایسے بے تکے، ڈراؤنے اور غیر عقلی بھی تو ہوتے ہیں مگر نہیں، اگر یہ سب کچھ خواب ہوتا تو نازیہ اس وقت ان کے بنگلے میں موجود نہ ہوتی۔ تو گویا یہ سب سچ ہے۔ زینت اور نازیہ انہیں ملی تھیں اور انہوں نے زینت سے شادی کی تھی۔ (بچپن سے مجھے بڑا ارمان تھا کہ دلہن بنوں۔ سچ مچ کی دلہن، جیسی چادر اور چار دیواری والی نیک بیبیاں بنتی ہیں) چنانچہ وہ دلہن بنی تھی اور پھر دو گھنٹے بعد ان کے سامنے سکون سے مر گئی تھی۔

چوبیس سال کی تلاش و جستجو اور انتظار کا حاصل یہ تھا کہ زینت انہیں ملی تھی..... پر نہیں ملی تھی۔

بنگلے میں فریدے، چاچی اور نازیہ موجود تھیں اور وہ ہر ممکن طریقے سے شیخ طاہر کا دل بہلانے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ شروع شروع میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ چاچی، نازیہ اور صدر الدین تو حد درجہ فکر مند ہو گئے تھے کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مگر پھر شیخ طاہر دھیرے دھیرے سنبھلنے لگے۔ اس لیے نہیں کہ ان کے سینے میں سلگتی، دکھ اور پچھتاوے کی آنچ مدھم پڑ گئی تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی خود اختیار کردہ ذمے داریوں کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ صدر الدین نے ان سے کہا۔ ”ذرا ان لوگوں کا تصور کریں، جنہیں آپ کے سہارے کی ضرورت ہے، اسکولوں میں پڑھنے والے یتیم اور غریب بچے، بیوہ عورتیں اور وہ تمام پریشان حال لوگ جو آپ کی امداد کے سہارے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔“ شیخ طاہر کو احساس ہوا کہ زندگی کے ان گنت معنی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کبھی اپنے لیے نہیں، دوسروں

کے لیے جیتا ہے۔ انہیں بھی دوسروں کے لیے جینا چاہیے چنانچہ انہوں نے رفتہ رفتہ خود کو سنبھال لیا اور پہلے کی طرح ایک بار پھر اپنے شب و روز کے معمولات میں دلچسپی لینے لگے۔

کچھ دن گزرے پھر ایک شام پارٹی کے جنرل سیکریٹری صاحب تشریف لائے۔ علیک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد سیکریٹری صاحب نے کہا۔ ”آپ نے آج کے اخبارات دیکھے؟“

شیخ طاہر ہولے سے مسکرائے۔ ”ہاں دیکھے ہیں۔ آپ لوگ میرے نام کی کچھ زیادہ ہی پبلسٹی کر رہے ہیں۔“

”یہ ضروری ہے شیخ صاحب۔“ جنرل سیکریٹری نے کہا۔ ”آپ کا نام پارٹی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کی بدولت ہم کم از کم اپنے صوبے میں تو ضرور الیکشن جیت لیں گے۔ حال ہی میں ہم نے ایک سروے کیا ہے جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ لوگ اس بات سے بے حد خوش ہیں کہ آپ انتخابات کے بعد صوبے کے وزیر اعلیٰ ہوں گے۔“

”خیر، یہ بات تو آپ لوگ بہت دن سے کہہ رہے ہیں۔“ شیخ طاہر ہنس کر بولے۔

”مگر اب اس کے اعلان کا وقت آ چکا ہے۔ کل شام پارٹی کی میٹنگ طلب کی گئی ہے جس میں باضابطہ طور پر آپ کی نامزدگی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ یہ عام پبلک میٹنگ نہیں ہے، محض ایک پریس کانفرنس ہے جس میں پارٹی کے عہدے دار، شہر کی کچھ اہم ہستیاں اور اخباری نمائندے شریک ہوں گے۔ آپ کو اس موقع پر ایک مختصر تقریر بھی کرنا ہے جو ہم نے تیار کر لی ہے.....“ جنرل سیکریٹری نے ایک لمحہ رک کر اپنے بیگ سے ہلکے گلابی رنگ کے دو صفحے برآمد کیے اور شیخ طاہر کی طرف بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”آپ اسے دیکھ لیں اور مناسب سمجھیں تو اس میں کچھ ترمیم و اضافہ بھی کر لیں۔“

شیخ طاہر نے تقریر پر ایک سرسری نظر ڈالی پھر کہا۔ ”کس وقت پہنچنا ہے؟“

”چھ بجے۔“ جنرل سیکریٹری نے جواب دیا۔ پھر وہ معاً اس طرح رک گئے جیسے کسی تذبذب میں مبتلا ہوں۔ انہوں نے گردن موڑ کر دروازے پر نظر ڈالی جو بند تھا۔ پھر شیخ طاہر کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے کہا۔ ”شیخ صاحب، آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟“

”ضرور پوچھیے۔“ شیخ طاہر نے کہا۔

”پچھلے کچھ دنوں سے آپ کے بنگلے میں ایک خاتون رہ رہی ہیں۔“ جنرل سیکریٹری نے شرمندگی اور کشمکش و پیچ کے ملے جلے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”میں ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو بار خاطر نہ ہو۔ گو وہ آپ کی بہن ہیں۔ جیسا کہ آپ نے بتایا تھا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ پردے میں رہتی ہیں۔ لیکن شیخ صاحب، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے کہیں بھیج دیا جائے؟ دیکھیے، آپ مجھے غلط نہ سمجھیے گا۔ میرا مقصد برا نہیں۔ ایسا میں صرف احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔“

شیخ طاہر یکایک چونکے اور خشمگیں نظروں سے جنرل سیکریٹری کو گھورتے ہوئے بولے۔ ”میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔ ذرا وضاحت کیجیے، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

جنرل سیکریٹری کے ماتھے پر پسینا پھوٹ آیا تھا اور وہ خاصے حواس باختہ سے نظر آ رہے تھے۔ ”بات یہ ہے شیخ صاحب!“ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنا شروع کیا۔ ”کہ انتخابات اب زیادہ دور نہیں اور ہمیں اس موقع پر احتیاط کرنا چاہیے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ الیکشن کے بعد آپ کو وزیر اعلیٰ بننا ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم انہیں الیکشن کے انعقاد تک کہیں باہر بھیج دیں اور ان کے بارے میں کوئی چہ چا نہ ہونے دیں تو یہ ہم سب کے حق میں سود مند ہوگا۔“

”مگر کیوں، آخر ایسی کیا بات ہے؟ وہ تو میری بہن ہے بھئی۔“ شیخ طاہر اتنے حیرت زدہ تھے کہ ان کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

جنرل سیکریٹری نے گھبرائے ہوئے انداز میں ہتھیلیاں ملتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں لیکن لوگوں کا کیا کیا جائے، وہ باتیں بناتے ہیں۔ اب دیکھیے نا، آپ کی بہن یہاں نہیں تھیں تو ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا مگر اب وہ اچانک آ گئی ہیں تو لوگوں میں تجسس پیدا ہو گیا ہے۔ اگرچہ کسی کو ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں معلوم مگر آپ لوگوں کی ذہنیت سے واقف ہیں، خوامخواہ بات سے بات نکالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل.....“

”لوگ آخر کیا باتیں بنا رہے ہیں؟“ شیخ طاہر نے برہم ہو کر پوچھا۔

”اب میں کیا کہوں، بس یوں سمجھ لیں کہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔“

”اور اگر لوگ بدستور باتیں بناتے رہے تو کیا

ہوگا؟"

"شیخ صاحب، مجھے بے حد افسوس ہے اور شرمندگی بھی کہ یہ باتیں کر رہا ہوں لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ سیاست کس قسم کا کھیل ہے۔ اگر یہ قیاس آرائیاں اور افواہیں اسی طرح اڑتی رہیں تو اپوزیشن والے ان کی اور تشہیر کر کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اس بنا پر یہی مناسب سمجھا گیا اور پارٹی کے صدر کی بھی یہی خواہش ہے کہ انہیں کچھ مدت کے لیے کہیں بھیج دیا جائے اور عام لوگوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ وہ......"

"کہ وہ میری کوئی نہیں ہے۔ محض ملنے ملانے آئی تھی اور اب جا چکی ہے، یہی بات ہے نا......؟" شیخ طاہر کا لہجہ غصے کی شدت سے جل رہا تھا۔

"دیکھیے، اس میں کوئی ہرج نہیں۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد ہم انہیں واپس لے آئیں گے۔" جنرل سیکریٹری نے بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "شیخ صاحب! یہ ہم سب کے حق میں بہتر ہوگا۔ امید ہے کہ آپ اس پر غور کریں گے۔"

شیخ طاہر بدستور حیرت زدہ تھے اور حد درجہ غصے میں بھی اور وہ جنرل سیکریٹری سے ابھی کچھ اور پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے مگر انہیں موقع نہیں ملا۔ جنرل سیکریٹری فوراً ہی چلے گئے کہ انہیں اسی میں اپنی عافیت نظر آئی تھی۔ شیخ طاہر وہیں بیٹھے رہے۔ ہکا بکا، غصے میں اور ذہنی طور پر منتشر۔ جو کچھ انہوں نے سنا تھا، اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ لوگ کیوں باتیں بنا رہے ہیں، افواہیں کیوں اڑ رہی ہیں اور یہ افواہیں کس قسم کی ہیں؟ نازیہ تو ان کی بہن ہے۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے زینت اور نازیہ کی تلاش، زینت سے شادی اور پھر اس کی موت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کی بہ ظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی مگر انہیں گمان تک نہ تھا کہ لوگ ان کے گھر میں نازیہ کی موجودگی کو لے کر بات کا بتنگڑ بنانا شروع کر دیں گے مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟ انہیں اپنی کوئی پروا نہیں، مگر اپنی بہن کی رسوائی وہ گوارا نہیں کر سکتے اور اگر اس سلسلے میں کچھ نہ کیا گیا تو اس میں شک نہیں کہ اپوزیشن والے یقیناً کچھ اور کھوج لگائیں گے اور تشہیر کریں گے اور یوں نازیہ کی بدنامی ہوگی۔ تو پھر وہ کیا کریں؟ کیا جنرل سیکریٹری کی بات مان لیں اور نازیہ کو کہیں بھیج دیں؟ ایسا کرنے سے بے شک پارٹی کو اور خود ان کی ذات کو فائدہ پہنچے گا مگر سوال یہ ہے کہ پھر وہ اپنے ضمیر کو کیا جواب دیں گے؟

شیخ طاہر سوچتے رہے، مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن یہ تو محض ایک چھوٹا سا کنکر تھا جو جنرل سیکریٹری ان کے ذہن کے پُرسکون سمندر میں پھینک کر چلے گئے تھے۔ دوسرے دن کسی نادیدہ ہاتھ نے ایک بہت بڑی چٹان لڑھکا دی اور ان کا ذہن ایک شدید مدوجزر کا شکار ہو گیا۔ یہ چٹان ایک خط کی شکل میں تھی جو دوپہر کی ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ ہلکے بھورے رنگ کے ایک عام سے کاغذ پر کسی اخبار سے الفاظ کاٹ کر اس طرح چپکائے گئے تھے کہ پورا مضمون تیار ہو گیا تھا۔ شیخ طاہر نے خط پڑھنا شروع کیا اور دم بہ دم ان کا چہرہ زرد ہوتا گیا جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ ان کے بدن سے خون نچوڑ رہا ہو۔ خط میں لکھا تھا:

"شیخ طاہر صاحب!

آپ اس خط کی عبارت پڑھ کر خوش نہیں ہوں گے کیونکہ اس میں خوش ہونے کی کوئی بات نہیں ہے لہٰذا تمہید کے چکر میں پڑے بغیر میں مقصد کی طرف آتا ہوں۔ شیخ صاحب، آپ کے پاس بہت زیادہ دولت ہے، جب کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ دس لاکھ روپے مجھے عنایت فرما دیں۔ یقیناً آپ سوال کریں گے کہ کیوں؟ میرا جواب یہ ہے کہ مجبوری ہے آپ کی بھی اور میری بھی، اور وہ مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس دولت نہیں ہے اور آپ کی زندگی میں کچھ راز ہیں، جن کا افشا ہونا آپ پسند نہیں کریں گے، چنانچہ آپ مجھے روپیا دے دیں۔ میری زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔ یہ قطعی طور پر اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والی بات ہے، جو کہ امید ہے، آپ کے لیے قابل قبول ہوگی۔

"شیخ صاحب! یہاں میں یہ وضاحت کر دوں کہ آپ بشیر احمد پر شبہ مت کیجیے گا۔ وہ بے چارہ شریف آدمی ہے اور اس معاملے میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ دراصل ہوا یہ کہ میں بشیر احمد سے واقف ہوں۔ چنانچہ جب میں نے اسے آپ کے بنگلے میں خاصی احتیاط کے ساتھ آتے جاتے دیکھا تو مجھے شبہ ہوا اور میں اس کے پیچھے لگ گیا اور دن رات اس کے اور بعد ازاں آپ کے تعاقب میں لگا رہا۔ یوں مجھے ساری باتیں معلوم ہو گئیں۔ آپ کے بچپن سے لے کر اب تک کے تمام حالات۔ نہ صرف یہی بلکہ میرے پاس تصویریں بھی ہیں۔ زینت کی اور آپ کی بہن کی اور شادی کے سرٹیفکیٹ کی ایک فوٹو کاپی بھی ہے۔ ان کے عوض میں صرف دس لاکھ روپے طلب کر رہا ہوں جو کہ آپ کے لیے

کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔

"شیخ صاحب، میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے، اس دنیا میں سبھی باتیں اچھی نہیں ہوتیں اور سبھی لوگ شیخ بشارت طاہر نہیں ہوتے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ اخلاقیات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بجائے میں مطلب کی بات کروں۔ شیخ صاحب، آج شام پارٹی کی میٹنگ ہے جہاں ہونے والے وزیراعلیٰ کے طور پر آپ کی نامزدگی کا اعلان کیا جائے گا۔ اس وقت جو سیاسی فضا ہے، اس کے پیش نظر یہ قطعی ممکن نظر آتا ہے کہ آپ کی پارٹی الیکشن جیت لے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک عظیم الشان مستقبل آپ کا منتظر ہے۔ پہلے صوبے کے وزیراعلیٰ اس کے بعد ممکن ہے کہ مرکزی وزیر اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد ازاں اگر قسمت مہربان ہو تو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع ملے۔ یہ کامیابی معمولی نہیں۔ صرف بڑے نصیب والے ہی اس بلندی تک پہنچتے ہیں، لیکن شیخ صاحب، فرض کیجیے، آپ کی زندگی کے تمام راز، پوری کہانی، تصویریں اور نکاح نامے کا عکس اخبارات میں چھپ جائے یا اپوزیشن پارٹیوں کے ہاتھ لگ جائے تو کیا ہوگا؟ ذلت و رسوائی جو ہوگی، سو ہوگی لیکن یہ بات یقینی ہے کہ آپ الیکشن بھی ہار جائیں گے۔ ایک ایسے شخص کو کوئی بھی ووٹ نہیں دے گا جس نے ایک انتہائی گھٹیا طوائف سے شادی کی ہو اور جس کی بہن چند سکوں کے عوض اپنی عزت بیچتی رہی ہو۔

"شیخ صاحب، مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ آپ شام کو میٹنگ میں تشریف لے جائیں۔ میں کل صبح آپ سے رابطہ قائم کروں گا اور یہ بتاؤں گا کہ کب، کہاں اور کیسے آپ مجھے ادائیگی کر سکتے ہیں۔ آپ ایک سمجھ دار آدمی ہیں اور مجھے امید ہے کہ اس موقع پر بھی سمجھ داری کا مظاہرہ کریں گے۔"

خط ختم ہو گیا۔ شیخ طاہر یوں ساکت و صامت بیٹھے رہے جیسے ان کا خون منجمد ہو گیا ہو۔ ان کی رنگت سفید پڑ گئی تھی، آنکھوں کے ڈھیلے اور پلکیں ساکت ہو گئی تھیں اور انہوں نے میز کا کنارہ بائیں ہاتھ سے اتنی قوت سے پکڑ رکھا تھا کہ ناخن گوشت میں دھنس گئے تھے اور انگلیوں سے خون رسنے لگا تھا مگر انہیں اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا۔

یہ ایک اور ستم تھا جو ان کے دل پر ہوا، یہ ایک اور گھاؤ تھا جو ان کی روح پر لگا، یہ ایک اور دوراہا تھا جس پر...... ستم ایجاد قسمت انہیں لے آئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اب وہ کیا

سچے موتی

☆ قرآن ایک ایسا دریچہ ہے۔ جس سے اگلا جہان دیکھا جا سکتا ہے۔

☆ پھٹی ہوئی بوری کبھی بھری نہیں جا سکتی۔ اسی طرح خواہشوں کا اسیر شخص کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

☆ کسی کی مدد کر کے اسے بھول جاؤ۔

☆ جو بلاوجہ ناراض ہوتا ہے۔ خود ہی مان بھی جاتا ہے۔

☆ اپنے بچوں کی خاطر آپ دنیا کے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔

☆ اگر چڑیاں متحد ہو جائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔

☆ زندگی میں ایسا لمحہ بھی آجائے گا۔ جب آنکھوں میں آنسو تو ہوں گے مگر ان کو پونچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

☆ فخر سے بچو، کیونکہ جو مٹی سے پیدا ہوا اور مرنے کے بعد مٹی میں چلا جائے گا۔ کیڑے مکوڑے اسے کھا جائیں گے، ایسے شخص کو فخر کی کیا ضرورت؟

(حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

مرسلہ: ریاض بٹ از حسن ابدال

⁂

☆ اللہ کا خوف ہی سب سے بڑی دانائی ہے۔

☆ حرص سے روزی میں اضافہ نہیں ہوتا مگر آدمی کی قدر میں کمی ہو جاتی ہے۔

☆ عقل مند وہ ہے جو ہر کام میں میانہ روی اختیار کرے۔

☆ ہنر انسان کا بہترین دوست ہے۔

☆ تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے ہم نشین ہیں۔

مرسلہ۔ عاطف نواز شاہین۔ اڈا اروتی

کریں؟

انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے اس خط کا ایک ایک لفظ سانپ بن کر انہیں ڈس رہا ہے۔ اتنا مجبور اور بے بس انہوں نے خود کو کبھی محسوس نہیں کیا، اس وقت بھی نہیں جب گبن نے انہیں اغوا کیا تھا، یا اس وقت جب وہ بھوکے پیاسے نیم غشی کی حالت میں زینت کے چوبارے کے نیچے پڑے تھے اور نہ ہی اس وقت جب استاد سمندر مرا تھا یا زینت نے ان کے سامنے دم توڑا تھا۔ اس وقت تو انہیں ایسے لگ رہا تھا جیسے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیے گئے ہیں اور ایک تیز دھار والا خنجر ان کے نرخرے پر اس طرح لٹکا دیا گیا ہے کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کریں گے تو ان کا نرخرہ کٹ جائے گا، تو پھر وہ کیا کریں؟ کیسے اس عذاب سے نکلیں؟ شیخ طاہر مضطربانہ انداز میں کمرے میں ٹہلتے رہے اور سوچتے رہے۔ کیا وہ اس نامعلوم شخص کی بات مان لیں؟ ان کے پاس بلاشبہ بہت دولت ہے اور وہ بڑی آسانی سے دس لاکھ روپے ادا کر سکتے ہیں مگر کیا یہ مناسب ہوگا؟ لیکن اگر نہیں دیں گے تو کیا ہوگا؟ اخبارات کے صفحات ان کے تصور میں ابھرے جن پر زینت اور نازیہ کی اور خود ان کی بڑی بڑی تصویریں چھپی ہوئی تھیں اور ان کی زندگی کا سارا کچا چٹھا درج تھا۔ وہ تصور کر سکتے تھے کہ اگر یہ سب کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ ذلت، رسوائی، ساری عزت اور مرتبہ خاک میں مل جائے گا۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے، مخالفین کیچڑ اچھالیں گے اور وہ شیخ بشارت طاہر سے یکا یک پھر بشو بن جائیں گے۔ حقیر، بے مایہ، بے عزت...... شیخ طاہر سوچتے رہے اور اپنے آپ سے الجھتے رہے۔ پھر وہ دفعتاً ایک عالم وحشت میں بنگلے سے نکلے اور پیدل ہی ایک جانب چل پڑے۔

جب وہ کانفرنس ہال میں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ تقریباً سبھی لوگ آ چکے تھے۔ چونکہ یہ عام پبلک میٹنگ نہیں تھی، اس لیے صرف خاص خاص افراد ہی مدعو کیے گئے تھے۔ پارٹی کے اہم عہدے دار، شہر کے کچھ معززین اور تمام اہم اخبار نویس۔ شیخ طاہر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور میٹنگ کی کارروائی سننے لگے۔ پارٹی کے صوبائی نائب صدر تقریر کر رہے تھے اور وہ بڑے پُرجوش انداز میں اپوزیشن کے بعض لیڈروں کے قول و فعل کے بخیے ادھیڑنے میں [illegible]

جن پر اخباری رپورٹر بیٹھے تھے۔ پنسلیں، نوٹ بک اور کیمرے سنبھالے ہوئے۔ وہ بار بار تصویریں اتارتے اور پھر نوٹس لینے میں مصروف ہو جاتے۔ پچھلی قطار کے سرے پر رازی بیٹھا تھا اور اس کی انگلیوں میں پھنسی ہوئی پنسل تیزی سے نوٹ بک پر چل رہی تھی لیکن اس کی نظریں بار بار شیخ طاہر کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو ہونٹ پر ہونٹ جمائے خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے کا رنگ پھیکا تھا جس سے ان کے اندرونی کرب کا اندازہ ہوتا تھا۔ جب جنرل سیکریٹری کی رپورٹ ختم ہوئی تو اس نے شیخ طاہر کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں چند الفاظ کہے اور پھر اعلان کیا کہ آئندہ الیکشن جیتنے کی صورت میں وہ وزیر اعلیٰ ہوں گے۔ ابھی جنرل سیکریٹری نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ... یکا یک سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔

دیر تک تالیاں بجتی رہیں، دیر تک کیمروں کی فلیش چمکتی رہیں اور دیر تک لوگ بڑھ بڑھ کر شیخ طاہر کو مبارک باد دیتے رہے۔ اور ہر چند کہ شیخ طاہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن لوگوں کے لیے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ مسکراہٹ کیسی ہے۔ اس مسکراہٹ میں خوشی نہیں تھی، بلکہ ایک افسردگی تھی، ایک لاچاری تھی۔ جیسے کوئی آدمی حد درجہ بے بسی کے عالم میں خود اپنے آپ پر مسکراتا ہے۔ شیخ طاہر کی وہ مسکراہٹ بھی دراصل ایسی ہی تھی۔ تاہم یہ اور بات ہے کہ کسی کو اس کا احساس نہیں ہو سکا۔ جب تالیوں اور مبارک باد کا طوفان تھما تو شیخ طاہر کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

شیخ طاہر اٹھے، آہستہ آہستہ خود کو گھسیٹا اور مائک کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور وحشت بھری نظروں سے حاضرین کو دیکھنے لگے۔ ہال میں خاموشی چھا چکی تھی اور لوگ شیخ طاہر کی آواز کے منتظر تھے۔ وہ کئی لمحے خاموش رہے اور دم بہ دم خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہے۔ پھر انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"خواتین و حضرات!" آخر کار انہوں نے لب کھولے۔ "میں اس عزت افزائی کے لیے آپ سب کا شکر گزار ہوں لیکن شکر گزار ہونا ایک بات ہے اور مستحق ہونا دوسری بات ہے۔ یہاں آنے سے قبل میں خود سے بار بار یہ سوال کرتا رہا ہوں کہ میں اگر عزت اور مرتبے کا [illegible]

جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کے پیش نظر اس تقریر کی اب کوئی ضرورت نہیں اور اب جو کچھ کہنے والا ہوں، وہ صاف، سیدھی اور دو ٹوک باتیں ہیں اور سیاست کے مروجہ اصولوں سے قطعی الگ ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ باتیں آپ میں سے بہتوں کو پسند نہیں آئیں گی۔

"حضرات! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ حیران ہو رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کو حیران ہونا بھی چاہیے، لیکن میری گزارش ہے کہ آپ لوگ صبر و سکون سے میری باتیں سن لیں کیونکہ آج کے بعد اس قسم کا موقع شاید پھر کبھی نہ آئے۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کے بعد آپ میں سے بہت سے لوگ شاید مجھ سے ملنا بھی پسند نہ کریں اور اگر ایسا ہوا تو مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہ ہوگا۔ آپ کا یہی احسان کچھ کم نہیں ہے کہ آپ اس وقت میری باتیں سن رہے ہیں۔ خیر تو میں اب اصل بات کی طرف آتا ہوں خواتین و حضرات! میں گزشتہ ساری رات اور آج سارا دن بے حد پریشان رہا ہوں۔ ایک ناقابلِ بیان کرب و اذیت مجھے گھیرے رہی ہے اور میں مسلسل سوچتا رہا ہوں لیکن یہ طے نہیں کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آج مجھے ایک لڑکا بری طرح یاد آتا رہا ہے۔ حضرات، اس لڑکے کی عمر گیارہ سال تھی، وہ چالیس گھنٹے کا بھوکا تھا اور ایک بدنام طوائف کے چوبارے کے نیچے حد درجہ لاچاری اور نیم غشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت اس لڑکے پر طوائف کی لڑکی نے ترس کھایا تھا جو آگے چل کر خود بھی طوائف بنی۔ شاید آپ جاننا چاہیں گے کہ وہ لڑکا کون تھا اور میرا اس سے کیا تعلق تھا تو میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ لڑکا کوئی اور نہیں، خود میں تھا۔"

ہال میں یکا یک تیز بھنبھناہٹ کی آواز بلند ہوئی۔ کئی لوگوں نے شیخ طاہر کو مخاطب کر کے کچھ کہنا چاہا۔ جنرل سیکریٹری نے آگے بڑھ کر انہیں روکنے کی کوشش کی مگر شیخ طاہر نے سختی سے منع کر دیا اور ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور لوگ خاموش ہو گئے تاہم ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آوازیں پھر بھی گونجتی رہیں۔ شیخ طاہر نے ان آوازوں کی پروا نہیں کی۔ سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتے رہے۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا، ان کا بدن دھیرے [illegible]

رہی تھی۔ شیخ طاہر نے سب کچھ بیان کر دیا، سارے پردے ہٹا دیے، سارے داغ دھبے نمایاں کر دیے۔ بشو کے بچپن سے لے کر زینت سے شادی اور اس کی موت تک...... پھر وہ یکا یک رک گئے اور ہال میں موجود ایک ایک فرد کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ صدر صاحب کو اور جنرل سیکریٹری کو اور رازی اور آئرن کنگ اور کاٹن کنگ اور بادشاہ گر اور تیلو فر کو...... ان سب کے چہرے پھیکے پڑ گئے تھے اور وہ شیخ طاہر کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ جیتے جاگتے انسان نہ ہوں، کوئی آسیب ہوں۔ کئی لمحے تک خاموشی کے بعد آخر کار... انہوں نے پھر کہا۔

"تو خواتین و حضرات! یہ ہے میری کہانی۔ مجھ سے میری پارٹی کے سربرآوردہ لوگوں نے کہا ہے کہ میں اس کہانی کو چھپا لوں۔ کوئی بھی زینت اور نازیہ کے بارے میں نہ جاننے پائے کیونکہ اگر یہ کہانی عام ہو گئی اور لوگوں کو میری زندگی کے سارے راز معلوم ہو گئے تو نہ صرف یہ کہ حد درجہ ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ ہم الیکشن بھی ہار جائیں گے لیکن حضرات! بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ایک اور ستم یہ ہے کہ مجھے ایک خط موصول ہوا ہے جس کا مضمون اخبار سے الفاظ کاٹ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ اب چونکہ میں اس اخبار کی کتابت اور طباعت کو پہچانتا ہوں، اس لیے میں جان گیا ہوں کہ خط لکھنے والا کون ہے مگر اس کا نام نہیں بتاؤں گا کہ اس کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس خط میں مجھے دھمکی دی گئی ہے کہ اگر میں نے دس لاکھ روپے ادا نہ کیے تو میرا سارا کچا چٹھا مع تصاویر کے اخبارات میں شائع کر دیا جائے گا پھر نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی تحقیر، رسوائی اور انتخابات میں شرمناک شکست......" شیخ طاہر نے یکا یک رک کر زور سے سانس لی اور جیب سے خط نکال کر فضا میں لہرایا۔ "حضرات! یہ ہے وہ خط اور جب یہ خط مجھے ملا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ مجھے اپنی پارٹی کی اور بلیک میلر کی بات مان لینا چاہیے۔ زندگی میں ایسے مواقع بار بار نہیں آتے جب آدمی کامیابی اور مرتبے کی ایسی بلندی پر پہنچ سکے۔ اگر ہم الیکشن جیت جائیں تو میں وزیر اعلیٰ بنوں گا۔ اس کے بعد ممکن ہے، مرکز میں وزیر لے لیا جاؤں اور پھر [illegible]